

میں کہاں آپ ہیں جگ پتیاں

سرگزشت

نومبر 2011

کراچی

معراج رسول

عید مبارک

PDFBOOKSFREE.PK

ڈائری: شگفتہ پیرائے میں ایک دلچسپ سچ بیانی

راکھ کا آسیب: اس حادثے نے آدھے یورپ کی معیشت کو ہلا کر رکھ دیا

گل تازہ: اس قلم کار کو انگلینڈ میں پڑھائی ملی، وطن عزیز میں ٹھوکر پڑی

اس کے علاوہ بھی بہت سی دلچسپ کہانیاں، جگ پتیاں، سچے قصے، نئے نئے



206	انعامی مقابلہ	203	شعروادب	162	معاشرت
علی اکبر	ہیت بازی	سراب	ادارہ	قارئین	کاشف زبیر
ذہین قارئین کے ذوق جستجو کی تسکین کے لیے منفرد انعامی سلسلہ	شعروادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک دلچسپ سلسلہ	بے مثل اولوں سے گندمی تہلکہ خیز داستان، ایک دلچسپ تحریر			
244	تیسری سہ ہجائی	225	دوسری سہ ہجائی	208	پہلی سہ ہجائی
میک لے وٹ	گلاب روڑگی	ڈائری	ضیاء الرحمن صدیقی	شمسہ فرخ	مفتی اعظم
اس محصوم بچے کے دل میں کسی کے قتل کی خواہش اٹھائیاں لیتی تھی	اس نے اپنے بڑے پن کو لکھوں میں ضائع کر دیا	اس کے باپ نے ورثے میں ایک ڈائری چھوڑی تھی جس نے زندگی بدل دی			
265	چھٹی سہ ہجائی	259	پانچویں سہ ہجائی	253	چوتھی سہ ہجائی
پل کی خبر نہیں	چاہت کے رنگ	ناز طالع	بارون اشرف	نیر رانی شفق	فیاض الحسن
انسان کیسے کیسے خوب دیکھتا ہے مگر مستقبل سے نہ آشنا ہوتا ہے	وہ گاؤں کی لڑکی تھی مگر کس طرح مالک کو بے وفائی بنا گئی	وہ ناموں کے الٹ پھیر میں پھنس کر ایک بڑی غلطی کر بیٹھا			
281	توہین سہ ہجائی	275	آٹھویں سہ ہجائی	269	ساتویں سہ ہجائی
چھوڑ سلسل	محسنہ	سوئے کے گنگن	اجالہ سعید	محمد سلیم اختر	غزالہ شاہین عبدالقیوم
اس نے تعلیم کے ہتھیار سے اپنا انتقام لے لیا	ایک ذرا منفر انداز کا جگ بیتی، سوچنے کے دروازہ کر دینے والی تحریر	اس نے انجانے میں لیو وٹ ایک بھول بولا مگر سزا کیسی دل دوڑ ملی			

24	شخصیت	16	گفت و شنید	15	سرگزشت
گل خانہ	شہر خیال	انیم شانس	ڈاکٹر ساجد امجد	مدیر اعلیٰ	ادارہ
اس مصنف کی داستان جس نے انگریزی ادب میں بڑا مقام پیدا کیا	آپ کی باتیں آپ کے مشورے اور آپ کے سوال	ایک صفحے میں نکل ایک نادر روزگار کا تعارف خاص			
75	سیر پاکستان	51	آفات	71	سہ ماہی
خونناک بھینسا	سہ ماہی	راکھ کا آسیب	انوار الحق ساحلی	زلفی شاہ	ابن کبیر
شہر اور پیتھ کے شکار سے زیادہ خطرناک شکار کھینے کا ہے	اپنے وطن کی شان، وطن پرستوں کا ایک اور کانام	آدھے یورپ کی معیشت کو لرزا دینے والے حادثے کا بیان			
112	مقام و حوصلہ	87	فکر و صبا	80	خدا کا تحفہ
عمر محکم	فکر و صبا	سرکا شہنشاہ	ڈاکٹر عبدالربہ	علی سعید انصاری	زین مہدی
وہ سب برف کے سمندر پر موت سے برسر پیکار تھے	فکر و صبا کی کہی ان کی کہانیاں قلم نگری کی باتیں، یادیں	جگجگت سنگھ کے جہد مسلسل کی مختصر داستان			
141	سفر کھانی	127	محکم جونی	121	جرم و سزا
ایک اور ایگا	انتظار	نشان	الطاف شبنم	مریم کے خان	سید احتشام
ایک الگ انداز کی سفر کہانی مختلف انداز سے امریکا درشن	کبھی کبھی ہم جوئی زندگی داؤ پر لگا دینے کا سبب بن جاتی ہے	جرم کتنے ہی پردے میں کیوں نہ ہو قانون سے مخفی نہیں رہتا			

ایٹم شناس

سرگزشت

460 قبل مسیح میں یونان کا ایک چھوٹا سا ساحلی شہر تھا جسے ”آب درہ“ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ یہ تاجروں کی بستی تھی۔ تاجرانہ سوچ رکھنے والے ہی یہاں آباد تھے۔ دولت کماتا اور ہر وقت حصول دولت میں مگن رہتا ہی ان لوگوں کا مقصد حیات تھا۔ خود اس کا باپ بہت بڑا جاگیردار اور دولت مند شخص تھا۔ وہ جب تک بچہ تھا، اس وقت تک تو سونے کی اینٹوں سے بہکتا رہا لیکن جیسے ہی کچھ ہوش سنبھالا، اس کے اندر کچھ ایسی تبدیلی آئی کہ اسے یہ جاگیریں گندگی کا ڈھیر نظر آنے لگیں۔ اب وہ ایک لمبی سی چادر اپنے شانوں پر ڈالے اور ادھر گھومتا رہتا اور لوگوں کو تلقین کرتا پھر تاکہ یہ جاگیریں اور زمینیں روح کو مردہ کر دیتی ہیں۔ ان کے پکرے لنگو اور علم حاصل کرو۔ لوگ اس کی باتوں پر ہنستے تھے۔ اسے خطی اور دیوانہ کہہ کر اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ پھر اس نے خاموشی اختیار کر لی۔ ہر وقت اپنے خیالوں میں ڈوبا رہتا۔

اس کی جوانی مئی کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ بس اسے موقع مل گیا کہ ان نادان تاجروں سے دور چلا جائے اور تحصیل علم کے لیے کوشاں ہو جائے۔ اس نے ساری زمینیں اور جاگیریں اپنے بھائیوں میں بانٹ دیں اور خود نقد رقم جیب میں ڈال کر سیاحت پر روانہ ہو گیا۔

دستِ طویل کے بعد واپس آیا تو یہ کہنے میں حق بجانب تھا ”میرے ملک میں کوئی شخص مجھ سے بڑا سیاح نہیں۔ میں نے اتنے زیادہ ملک دیکھے ہیں، اتنے دانائوں سے کسبِ علم کیا ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔“

اب اس کی جوانی، بڑھاپے میں داخل ہو رہی تھی۔ اب وہ ایک بوڑھا مفکر تھا جسے اس کے اقارب دیوانہ اور بخنوں کہہ رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ سیاحت کے دوران اس کی دماغی حالت بگڑ گئی ہے۔ اس کا علاج ہونا چاہیے۔ یونان کا مشہور طبیب بقراط ابھی زندہ تھا چنانچہ اس کے علاج کے لیے بقراط کو بلایا گیا۔

بقراط نے اس سے تہائی میں ملاقات کی۔ خدا جانے کیا باتیں ہوئیں کہ واپس آیا تو اس دیوانے کا عقیدت مند ہو چکا تھا۔ آہ درہ کے لوگوں سے یہ کہتا ہوا رخصت ہوا:

”جو شخص اسے دیوانہ سمجھتا ہے اسے خود اپنے دماغ کا علاج کروانا چاہیے۔“

بہت سے لوگ اسے جادوگر کہنے لگے جس نے بقراط کو بھی اپنے بحر میں گرفتار کر لیا تھا۔

وہ دیوانہ تھا نہ جادوگر بلکہ ایک سائنس دان تھا جس نے پہلے پہل دنیا کے سامنے ”ایٹم“ کا نظریہ پیش کیا۔

موجودہ زمانے میں وہ تمام تحقیقات جو ایٹم پر ہو رہی ہیں ان تمام تحقیقات کی داغ بیل اسی عظیم مفکر کے ہاتھوں دو ہزار سال پہلے پڑ چکی تھی۔ ایٹم کا نام بھی اسی کا تخلیق کردہ ہے۔ ایٹم یعنی تقسیم نہ ہونے والا۔

اسی نظریے کو انیسویں صدی میں جان ڈالٹن نے زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش کیا تھا اور اسی پر جدید کیمیا کی بنیاد پڑی۔

وبائی امراض کے متعلق اس کا خیال تھا کہ یہ فضا سے آئے ہوئے اینٹوں سے پیدا ہوتے ہیں جنہیں وہ امراض کے ایٹم کہتا تھا۔ اس نظریے میں وبائی امراض کے جراثیم کی ایک جھلک نظر آتی تھی جس کی دریافت موجودہ دور میں عمل میں آئی۔

نیند اور موت کے متعلق اس نے یہ دلچسپ خیال پیش کیا کہ جب انسانی بدن میں سے روح کے بعض ایٹم نکل جاتے ہیں تو انسان پر زندگی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اس حالت میں روح کے باقی ایٹم خارج شدہ اینٹوں کو واپس لانے کے لیے کوشاں رہتے ہیں اور جو بھی یہ ایٹم واپس آتے ہیں، انسان نیند سے جاگ اُٹھتا ہے اور جب روح کے تمام ایٹم انسانی بدن سے نکل جاتے ہیں اور کوئی ایٹم باقی نہیں رہتا جو خارج شدہ اینٹوں کو واپس لاسکے تو انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

ایک ایسے زمانے میں جب مشاہدے اور تجربے کے لیے نہ تو ساز و سامان موجود تھا نہ لیبارٹریز کا رواج ہوا تھا اس نے محض اپنی قوتِ فکر سے ”ایٹم“ کے وجود کو ثابت کیا جس کی تصدیق آنے والے زمانوں میں تجربے اور مشاہدے سے ہوئی۔

اس عظیم مفکر کا نام دقراط تھا۔ وہ جب 460 ق۔ م میں پیدا ہوا تو ایک دولت مند باپ کا بیٹا تھا لیکن جب بانوے سال کی عمر پر 368 ق۔ م میں فوت ہوا تو تنگ دستی کے سوا اس کے پاس کچھ نہیں تھا لیکن اس حالت میں بھی وہ ان لوگوں پر حقارت کی لمبی ہنستا تھا ان کے پاس دولت تھی۔ اس کی یہ لمبی اسے تاریخ میں زندہ کر گئی۔

☆☆☆

نومبر 2011ء

[15]

ماہنامہ سرگزشت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قارئین کرام!
السلام علیکم!

آزادی کی نعمت یوں ہی حاصل نہیں ہو جاتی، ہزاروں قربانیوں کے بعد آزادی نصیب ہوتی ہے۔ پاکستان کے لیے تو ہم نے دنیا کی تمام قوموں سے زیادہ قربانیاں دی ہیں تب ہمیں یہ ارضِ پاک ملی ہے۔ نئی پود تو تصور بھی نہیں کر سکتی کہ اس ملک کے قیام کی خاطر ہم نے کیسے کیسے مصائب جھیلے ہیں..... مگر آج اس تحفہ خداوندی جو ہمیں عین شبِ قدر میں نصیب ہوا، اس کی ہم کیسی ناقدری کر رہے ہیں۔ ہر قدم پر ایک نیا مسئلہ منہ پھاڑنے لگا نظر آتا ہے جو خود ہمارا اپنا پیدا کردہ ہے۔ پانی، بجلی، گیس کی عدم فراہمی کا مسئلہ، ہوش رہاگرانی اور قوت خرید کے کم ہو جانے کا مسئلہ لیکن یہ سب مسائل اپنی جگہ، ایک اور خطرناک مسئلہ جس نے ہر شہری کی زندگی پر سوالیہ نشان کھڑا کر دیا ہے، وہ ہے قانون کے رکھوالوں کی غیر قانونی حرکتیں۔ آئے دن اخبارات ایسی دل دہلا دینے والے واقعات سے بھرے رہتے ہیں جو یہ سوچنے پر مجبور کر رہے ہیں کہ محکمہ پولیس میں ایسی کالی بھیڑیں کہاں سے آگئیں؟ افسران بالا ان باتوں کا سختی سے نوٹس کیوں نہیں لیتے؟ کچھ دنوں پہلے ایک ٹی وی چینل پر ایک دہنگہ تھانے دار کو دکھایا جا رہا تھا۔ اسے ایک دوسرے تھانے والوں نے ڈکیتی ڈالتے ہوئے گرفتار کیا تھا۔ جب قانون کے محافظ ہی قانون شکنی کرنے لگیں تو پھر اس محکمہ کا مصروف کیا رہ جائے گا بقول ساغر صدیقی۔

جس دور میں لٹ جائے غریبوں کی کمائی
اس دور کے سلطان سے کوئی بھول ہوئی ہے

معراج رسول

جلد 22 شمارہ 01 نومبر 2011ء

ماہنامہ
سرگزشت

مدیر: اعلیٰ: عذرا رسول
مصور: شاہ حسین

شعبہ اشتہارات

نیشنل اشتہارات: 0333-2256789
نمائندہ کراچی: 0333-2168391
راولپنڈی: 0323-2895528
لاہور: 0300-4214400

♦♦♦♦

قیمت فی پرچہ: 50 روپے ♦ روزانہ 600 روپے

پبلشر: پروپرائٹر: عذرا رسول

مقام اشاعت: C-63، فیز II ایکسپریشن
پرنس کمرشل ریٹین کوئٹہ روڈ
کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

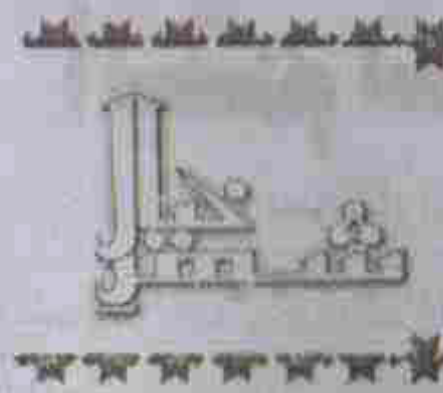
مطبوعہ: ابنِ جن برٹنگ پریس

ہائی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتہ: پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone: 35804200 Fax: 35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com





اتر رہی دیکھے ہیں، ان کے بولنے اور باتوں کا انداز بیان بہت سادہ اور مخصوص تھا۔ سچ بیانوں میں وہ ایک لمحہ آئینہ اور دیدہ و عبرت پسند آئیں۔“

✉ الف، جیم صدیقی، کراچی سے "آؤ تو برا شمارہ بروقت ملا۔ بعد از اسلام سب سے پہلے اپنا تعارف کراؤں کہ میں سرگزشت کا شمارہ آؤں سے قاری ہوں لیکن خط لکھنے کا اتفاق کبھی نہیں ہوا آپ خاموش قاری کہہ سکتے ہیں۔ اس بار بھی خط کی لکھنے کی وجہ پر اسراریت غبر کے حوالے سے کھواں، ہاشمہ کے علی مغل کا تہرہ ہے۔ پچھلے شمارے میں انہوں نے ہاشمہ ابن مہدی کی تعریف اور سرائش کی تعریف لکھا آپ نے جواباً مختصر وضاحت کی جو کہ میرے خیال میں کافی تھی نتیجتاً اس ماہ نہ صرف یہ کہ علی مغل صاحب نے معذرت کر کے دوبارہ اپنے موقف کا اعادہ کیا ہے بلکہ ان کے خیالات سے ہاشمہ کی کیا ذرا حق صاحب نے بھی بھرپور اتفاق کیا ہے۔ لہذا مجھے یہ خط لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی تاکہ مزید اپنے اذہان اس روش پر کامزن نہ ہوں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ مغل اور اسی صاحبان نے قرآن کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ قرآن نے علم اور تحقیق پر زور دیا ہے تو عرض یہ ہے کہ قرآن کی پہلی آیت میں ہی پڑھنے یعنی علم حاصل کرنے کا حکم دیا گیا لیکن اللہ کی توحید کے اقرار کے ساتھ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے۔ جبکہ ابن مہدی نے چاند کو ام الناس کی تلاش جو وہود کے لیے نہیں بلکہ اپنی جھوٹی خدائی کے پیغام کو مستحکم کرنے کے لیے بھروسے کے طور پر تخلیق کیا تھا جبکہ ہم سب جانتے ہیں کہ اعمال کا واروند ازیت پر ہے لہذا یہ کہنا کہ اس نے رات کے اندھیرے میں روشنی پھیلائی بالکل غلط ہے کیونکہ اس نے تاریکی میں نہیں بلکہ اصل چاند کی موجودگی میں یہ شعبدہ گردی کی تھی اور محدود روشنی دکھا کر مصدوم ذہنوں کو لامحدود وحیرگی کے اندھیروں میں دھکیل کر ان کی عاقبت بھی تباہ کر دی۔ یہاں یہ امر بھی غور طلب رکھنا چاہیے کہ نبوت سے قبل ابو جہل جو اپنی وادائی، شکست اور صاحب رائے ہونے کے باعث ابو الکلم کہلاتا تھا لیکن بنیادی علم یعنی اللہ کی وحدانیت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے انکار کے باعث قیامت تک کے لیے ابو جہل کہلایا۔ علی مغل صاحب نے یہ بھی حوالہ دیا ہے کہ ابن مہدی کے ساتھ معاشرے نے بڑا سلوک کیا جس کے باعث وہ اس کیفیت کا شکار ہوا تو عرض ہے کہ ہمارے دین میں اللہ سے عمل کی کوئی توجیہ اور توجیح نہیں ہے۔ چوری چاہے بھوک کے باعث ہو یا شوق، ہر ایک ہی ہے۔ اسلامی تعلیمات میں کہیں کسی چھوٹے سے چھوٹے گناہ کا کوئی عذر قبول نہیں کیا گیا لہذا ابن مہدی کے متعلق یہ بھی کسی رعایت کا مستحق نہ تھا، یہ شخص مغل صاحب کی خام خیالی ہے۔ پچھلے خط میں انہوں نے ذکر کیا کہ اگر وہ اس زمانے میں ہوتے تو اس کی سرائش کرتے۔ میرا خیال ہے کہ اگر وہ اس زمانے میں ہوتے تو یہی اس کی جھوٹی خدائی پر قربان ہوتے۔ اسے دیکر افراد میں سے ہی ایک ہوتے۔ اس موقع پر مرحوم جون ایلیا کا ایک شعر براہ مغل کی تذکرہ کر دیا کہ "نام کیا، انسان ہی کیا، خواب و خیال ہو گئے۔ ان کی مثال کوئے کے ٹم ان کی مثال ہو گئے۔ دوسری بات یہ کہ دعا اور ایمان ہے کہ خدا سب سے بڑا مصلحت ہے تو یہ جوں کی توں لکھا اور نہ وہاں ہے کہ پوری ایمانی آواز نہیں گئی تھی۔ ایک اعمال کے ہوں اور تاریخ میں وہ بدنام زمانہ ظہر اچھا پھر کوئی ہے مل و بدل، ٹیکہ کار مشہور ہوا کیونکہ ایسا ممکن ہی نہیں ہے۔ میرے ان خیالات پر مغل اور اسی صاحبان یہ کہہ سکتے ہیں کہ میں انتہا پرست یا شدت پسند ہوں جبکہ بنی زائد بنیاد پر حق کو شدت پسندی کہہ کر ساری مشربی دنیا اس کے خلاف پروپیگنڈا اور دوا بیا بیا کر رہی ہے حالانکہ یہ دو الگ الگ صفات و کیفیات ہیں، بنیاد پرستی ایک خوبی ہے نہ کہ خرابی۔ پھر آخر میں مغل صاحب نے قارئین کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ "میں اپنی وہی غلطی پھر دہراؤں گا۔" تو عرض ہے کہ ہم نے سن رکھا ہے کہ ایک ہی نوعیت کی غلطی اگر دوبارہ کی جائے تو وہ ممانعت کہلاتی ہے۔ امید ہے مغل صاحب کا دماغ نہیں ہوں گے اور مندرجہ بالا معروضات پر غور فرمائیں گے۔ پھر بھی اگر وہ دل آزادی محسوس کریں تو میں معذرت خواہ ہوں۔ ان گزارشات کے ساتھ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو، آپ کے اوارے کے تمام اسلاف کو اپنی امان میں رکھے اور ادارے کو کون دو گئی اور رات بوجھنی ترقی عطا فرمائے آمین۔" (امید ہے کہ اس بحث کا خاتمہ اسی خط پر ہو جائے گا تاکہ نئے شماروں میں شامل کیا نہیوں پر تبصرہ چلتا رہے)

احمد خان تو حیدری کا خیال، کراچی سے ”آپ نے نظر پاوالے آم کے چیز کی ترقی کا فرمایا اور جڑ کا درخت گھٹی چھاؤں دیتا ہے، ہم اس کی جڑیں کاٹ کر ترقی سے روک دیتے ہیں۔ شہر خیال میں پہنچے۔ اجازتیں، سفار کر ہی صدارت پر۔ ہمارا بار بار پناہنہ دیکھا، نہ تھرو نہ رہ جانے والوں میں نام۔ حیدری چھٹیوں کے بعد 5 ستمبر بروز جمعہ الحاداک کیا تھا (12 تک پہنچ جانے والے خطوط شامل ضرور ہوتے ہیں) اجازت اور تصدیق طویل تھری۔ طویل نام، مجھے جیسے خاموشی قادی کو لات ناردی۔ کامیڈین اچھی معلوماتی تحریر ہے۔ گل بی، عظیم آرٹسٹ پر خوبصورت تحریر۔ فکیل صدیقی و عثمان ملک و ملت نے گل بی اور نسیم محمد سعید شہید جیسے عظیم لوگوں کو کب ہرداشت کیا ہے؟ واہ لفظی شاہداد، بچپن میں وہ منزل ملی بس دیکھی تھیں، 35 سال پورا کراہی بھی نہ دیکھ سکے، خرام وے کا ہمارے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا، باخبر کرنے کا شکر یہ۔ قلم بہت اچھی شکار کی معلوماتی کہانی تھی مگر مشورہ ہے کہ عمریم کے خان صاحب کہ پر صغیر کے شکاریوں کی کہانیاں بھی لکھیں۔ آفاقی صاحب کو ذیل پختی مبارک ہو۔ آبی دن وے، امریکا اور امریکا، ہوائے فراد بھی اچھی معلوماتی کہانیاں ہیں۔ سرباب کے انجام کے خطر ہیں۔ میرے مسایہ مجھ سے سرگزشت نے کر چڑھتے تھے۔ وہ سرباب کے انجام کی مسرت لیے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ شاید ہمارا بھی یہی انجام ہوگا۔ بچیا نیوں میں وہ ایک لمحہ کے سعید نے وقتی بھائی بن کر دکھایا۔ صدیہ کو کھل کر بروقت جذبات کا اظہار کرنا تھا۔ آئینہ، ضمیر، بٹ کو دینی نقص کا علم نہ تھا۔ شرٹ اُتارنا تو یوں بھی غلط ہے۔ سچا راست، مسخر امام صاحب آپ کی ہر کہانی ایک سے بڑھ کر ایک ہوتی ہے۔ ممکن آخر کے حالات سے آپ باخبر ہیں، کتاب لکھیں۔ فرشتہ، درخشاں نے نوجوان لڑکی ہو کر بہن اور راشہ کو کامیاب انسان بنایا۔ دونوں سے شادی نہ کر کے بھی نیک کام کیا۔ تعلیم نسواں مسلمان ہو کر بھی ہم علم کی اصل روشنی سے محروم ہیں۔ جاگیردار طبقے میں آج بھی فراڈ معلوم ہوتے ہیں۔ البتہ جڑواں سے دھوکا وقتی ہو جاتا ہے۔ جڑواں رشیدہ اور نسیم، شیرخان بچہ کراس کے بھائی امیر خان سے باتیں کرتا رہا۔ برق رفتار، فریج کو حق مل گیا۔ نثار استین کا ساپ ہے۔ کسی کو دانا جتا کر مار دیکھنے کا کہنا ہی اصل غلطی ہے۔ وہ ایک لمحہ سچا راستہ فرشتہ اچھی کہانیاں

طاہر الدین بیک، میرپورخاص سے رقم طراز ہیں "اس دفعہ میرپورخاص میں بارش اتنے زبردست طریقے سے ہوئی کہ بزرگوں نے کہا ایسی بارش اور تسلسل کے ساتھ دس دن بھی نہیں ہوئی، آخری دن جو بارش رات کو شروع ہوئی، اتنی زبردست تھی کہ چاروں طرف سے اذانیں ہونا شروع ہو گئیں۔ ان بارشوں نے ساری کاروباری زندگی منطوق کر کے رکھ دی۔ اب شکر ہے اللہ کا پانی کافی کم ہوا تو کاروبار زندگی پھر شروع ہو رہا ہے، ہمارے بھاری میٹھیٹ کاراگرا اپنے اور گھونٹے پھرنے والے ارباب اقتدار کے لیے کئی فکر یہ ہے صرف کانفرنسوں سے کچھ نہیں ہوگا، محسوس منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ ریلوے کا مسئلہ اس بجلی کا شدید بحران اور پی آئی اے کا وھڑانہ تھوڑا سا ہے، بھاری میٹھیٹ کاراگرا اپنے والوں کا کمال جسے برسوں یاد رکھا جائے گا۔ اب شروع کرتے ہیں شہر خیال سے اور شہار صاحب اور محسن صاحب کے تھیرے جو کافی طویل تھے مگر خوب تھے اور معقولاتی بھی تھے۔ جو یہ قاضی اور مسدود گوری نے بھی جبر سے جھٹکے تھے۔ سرگزشت کی کہانیوں کا جواب نہیں، چند کہانیاں تھیں کہ کھڑے والی کہانیاں اگرچہ کہ یہ بدیہی ہیں مگر لکھنے والے نے کمالی مہارت سے لکھا۔ اور خوب ترجمہ کیا ہے۔ ایک پائلٹ کی عزم و استقلال کی کہانی جس کے جہاز کو ہوائی جہک کر لایا گیا ہوا اس پر کیا گزرتی ہے، آزاد صاحب کی آبی رن وے دوسری زبردست اور ایڈیٹر سے بھرپور کہانی ہے۔ فکیل اور سلیس صاحب کی ہولنا سے طراری، یہ بھی ایک اتر ہو محسوس اور ایک نو جوان کی کہانی جو اتر ہو محسوس کے زبردست خوصلہ اور ہمت کی کہانی ہے اور شکاریات میں قہر، یہ بھی پڑھنے پڑھنے والے کو کھڑے ہو گئے۔ ان اس مردانوں کی جو اس مردانہ کہانی ہے ان تینوں کہانیوں کو بھی سامنے رکھ لو تو سرگزشت کا شمار اکتوبر کا جواب ہو گیا ہے۔ آفاق صاحب اپنے خوبصورت انداز میں غزل و صورت باطن کرتے ہوئے نظر آئے۔ سچی باتوں میں کافی دلچسپ آپ بیتیاں پڑھنے کو پیش۔ فرشتہ حیران کر دینے والا اور برقی رفتار دلچسپ اور سبق آموز تحریر بھی اور آخر میں ایک صاحب کی کہانی کا بیڈین زبردست رہی۔"

اعجاز حسین سٹھار کی نور پر قتل سے خوش بیانی ”اپنے خط کو پہلے نمبر پر دیکھا تو خوشی دو بالا ہو گئی۔ کامیابی میں چار لیڈیں کا بڑا شہر و سٹاؤنر اب تفصیل سے حالات پڑھ کر سزا گیا۔ اس کا تین اور نو جوانی عمر میں سے عبارت ہے لیکن اس نے ہر مشکل کا مقابلہ کیا، ایسا نہیں باری، یہی وجہ ہے کہ دولت، شہرت اور کامیابیوں نے قدم چو سے پھراؤنا کہ قدم مبارک ثابت ہوئے جہاں جتنی آسودگی ملی وہاں اولاد سے گھر بھر گیا اور اس نے طویل عمر پائی۔ اگر محنت سے جی نہ چرایا جائے، مگر جی خیر پاکستان تھے، کتنے اعزازات سیٹھے لیکن ان کا شوق ناک انجام افسردہ کر گیا۔ اسوں اور دو کھ کی بات ہے کہ قانون کے رکوالے کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ کراچی ٹراہم وے پر مضمون پڑھنے کے بعد دل میں خوش بھر گیا ہے۔ یہی تاریخی اور عجائبات دنیا دیکھنے سے ہم محروم رہ گئے ہیں۔

قلبی الف ایلم نے دلچسپی اور جذبات کے ساتھ ریکارڈ توڑ دیا ہے۔ آبی ون وے کے سیاست دان کی کامیابی اور دست کی جتنی داؤدی جاب ہے، کم ہے۔ اس نے کمال برأت اور انسانی زندگیوں کو سستے رکھ کر فیصلہ کیا۔ ہولنا سے فرار میں اگر ہو تو اس کے لئے کھانا ہے، یہ جو گرد اور ادا کیا ہے اسے جتنا سزا دیا جائے، کم ہے۔ سراسر ایک کی موجودہ قسط پر کھانڈ خیر تو نہیں ہے لیکن رفتار میں تیزی ضروری ہے۔ ہر کردار میں حرکت ہے، ہشتاد کی کسی حد تک فتح خان سے جان چھوٹ گئی ہے لیکن راجا عمر دراز کا کل بھی غلطی سے کم نہیں ہے اور راجا صاحب خود بھی آکس ٹیل کی طرح ہیں۔ کچھ قدر میں سراسر کوٹاوان کے واقعات سے جوڑ رہے ہیں یہ سچ نہیں ہے۔ جب کہانی کئی سواقت پر مشتمل ہوگی تو کسی مقام پر واقعات کی مماثلت الحاقی ہو سکتی ہے لیکن اس حد تک بھی نہیں کہ کسی پھر اگر ایک کو گرفت میں لیا جاسکے۔ نہیں طویل کہانیاں لکھنے والے مصنفین کو سزا دینا چاہیے جو بیسیوں کرداروں کی طبیعت، مزاج اور نفسیات پر نظر رکھتے ہیں۔ یکسانیت کا شکار نہیں ہونے دیتے اور ضرورت کے موقع محل کے مطابق انہیں فعال رکھتے ہیں۔ اب کج بیانیوں کا بار لایا لیٹے ہیں، وہ ایک لمحہ نے ہمیں سمجھو کر رکھ دیا ہے۔ طاقت اور سے کے عیاشی جوانوں میں ہوس کا نشا تار ساریت کر گیا ہے کہ دوسرے کی بہن، بیٹی کو بازار میں بچنے کے لیے رکھے، بچوں کے کھلونے کی وقعت نہیں دیتے جسے چند منٹوں میں خرید، اٹھایا اور توڑ دیا۔ اگر سب غیرت مند جوان مزاحمت پر اتر آئے تو روزانہ کتنی لاشیں اٹھیں گی، جیلیں بھر جائیں گی۔ کیا قائد اعظم نے اس کی سزا میں کا خواب دیکھا تھا۔ ہمارے ایسے قابل غیرت کاموں اور کریمہ کردار پر اغیار کی اتنی اٹھیاں اٹھیں گی کہ ہمارے جسم چھلنی ہو جائیں گے۔ ہمیں قذوہوں سے گندنا لانا ہوگا۔ ایسی باعث شرم و استیغاب بدنی ہوں گی تب اللہ کے کرم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحمت کے حقدار ٹھہریں گے ورنہ سیلاب، زلزلے، وبائیں گروہی، آفات جیسی معصیتوں کی زد پر رہیں گے اور آدھ بچا پر کوئی کان نہ دھرے گا۔ آئینہ پڑھ کر کتاب اٹھا ہوں یہاں ضمیر نے تیس فٹ کے فاصلے سے لڑکی سے شرارت کی، لڑکی ہونا دل تھی اس کی اپنی مٹی عمر تھی، ایسی کوٹا ہوں کی توقع رکھی جاسکتی ہے۔ اس تحریر میں جیسے پیغام کوڑکیوں کے باپ یا خدا خواست آئینہ ہمیں اولاد رکھنے والے والدین ہی سمجھ سکتے ہیں جو ان قسمی سے نارمل اولاد رکھتے ہیں۔ قریبی عزیز بھی اس مسئلے سے دوچار نہیں ہیں۔ وہ ایسی ٹیکنیشن اور فائیت کا انداز نہیں کر سکتے۔ بس دعا کرتے رہا کیجئے، اللہ ہمیں گناہوں سے بچائے رکھے۔ نا اٹھکی میں کوئی کمزور لگا آ جاتا ہے تو مکافات عمل سے بچے رہیں، آمین۔ سچا راستہ کی شہنشاہ کا جنوں اسے ہادی کر سکتا تھا۔ جب محبت میں پاگل ہیں اور انتہا پسندی آجائے تو مقابل کی مرضی ہے۔ اسے جیسے استعمال کرے وہ جوش میں کسی معاملے میں پھنس سکتا ہے اس سے ہوشیارانہ عمل کرانی جاسکتی ہے۔ سن چاہی اسی کی رفاقت اور ہم سفر بننے کی خوشی میں غور و فکر کا جوش ہی گسے رہتا ہے۔ اس کیفیت میں یہ پوچھنے کی نوبت ہی نہیں آتی ہے کہ مجھے جو بریف کیس پکڑایا گیا ہے اس میں بلوساٹ ہیں یا کچھ اور ہے، اسے نارمل کرنے اور سیدھی راہ پر لانے کا اصل منظر بھائی کو آخرت میں ضرور دکھائی دے گا۔ لڑائی کی دشمنان پاکیزہ روح ہے کہ درباری مضبوطی بھی، کبھی اپنے عہد کو بڑی جان کر بھلا یا گردن دونوں جوانوں کا روشن مستقبل و کچھ کر کسی کی طرف پھسل سکتی

✍️ **شیر احمد نے کراچی سے لکھا ہے** "امید کرتی ہوں آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ خدا پاک سے آپ تمام لوگوں کی خیریت اور سرگزشت کی ترقی کے لیے دعا گو رہتی ہوں۔ ہر ماہ سرگزشت کا معیار بہترین ہوتا ہے، پڑھنے میں کافی اچھا لگتا ہے۔ میں بھی اپنی ایک تحریر ارسال کر رہی ہوں معیاری ہو تو ضرور شائع کیجئے گا، انتظار رہے گا۔" (اس سے پہلے بھی لکھا ہے، پھر سے مشورہ ہے کہ افسانے پائیزہ میں بھیجا کریں ہرگزشت میں صرف کچھ بیانیات شائع ہوتی ہیں)

✍️ **عبدالعزیز جی آ کی آمد چکوال سے** آپ نے اپنے دل کی بات جو کبھی توجہ ہی لکھی۔ ملک خدا داد کے واسطے ہر محبت وطن پاکستانی کی طرح میں بھی دیکھی ہوں۔ شاید اب ہمارے لیے یہی کام رہ گیا ہے۔ اللہ جی ہمیشہ قوم ہمارے حال پر رحم فرمائے، آمین۔ ایک مٹھی تحریر پبلک سائنس واں بھی خوب تھی۔ مگر جو مزہ چارلی کے حالات زندگی پڑھ کر آیا۔ جواب نہیں۔ یہ ہمارا فورٹ ادا کار تھا ہم نے ماضی میں اس کی بہت سی فلمیں دیکھی تھیں مگر حالات زندگی ماہنامہ سرگزشت میں ہی پڑھنے کو ملے (واقعی وہ 1930ء، 1935ء میں سب سے کامیاب ادا کار تھا، اس کی فلمیں کس کس سینما ہال میں آپ نے دیکھی) پاک وطن کے ایک مایہ ناز مصور کو بھی پڑھنے کا پہلی دفعہ موقع ملا۔ کراچی ٹرام وے اور فی شاہ کی خوبصورت تحریر اے بلکہ ٹرام کے حوالے سے ہمیں ماضی معید میں لے گئے۔ الطاف شیخ کی تحریر امریکا و امریکا کا دوسرا حصہ بھی بہت پسند آیا۔ آخری دس کہانیاں ابھی نہیں پڑھیں کیونکہ وقت محدود ہے اور خط آج 15 اکتوبر کراچی کے لیے روانہ ہوتا ہے۔ پچھلے دنوں ایک نئی کہانی "نوری" سرگزشت کے لیے رجسٹری کی ہے۔ اگر آپ تک پہنچی ہے اور پڑھ چکے ہیں تو پلیز بتائیے کہ قابل اشاعت بھی ہے یا نہیں؟ (آپ سرگزشت کی کچھ بیانیات کو بخیر پڑھیں پھر لکھنے کی کوشش کریں۔ سرگزشت کے قاری صرف کچھ اور ذرا متوجہ ہیں پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ آپ دیکھی سے کوشش تو کریں)

✍️ **محمد فیضان غنی کاہری پور ہزارہ سے** مکتوب "معمود تین سال سے اس ماہنامے کا مستقل مطالعہ کر رہا ہوں اور آج پہلی بار شہر خیال کے لیے قلم اٹھا رہا ہوں، اس امید کے ساتھ کہ اسے سرگزشت کے قیمتی صفحات پر عکس نصیب ہوگی۔ (خوش آمدید) میں بی ایس کا اسٹوڈنٹ ہوں اور سرگزشت میرا ہندو ہر سال ہے۔ اس کی ایک ایک معلومات سے مجھ پر پورا پورا دیر یاد رہ جاتی ہے۔ آپ سے کچھ سوالات پوچھتا چلوں۔ ایک تو یہ کہ سرگزشت کے لیے تبصرہ بھیجے کی آخری تاریخ کون سی مقرر ہوتی ہے؟ (ہر ماہ کی 15 تک موصول ہونے والے خطوط کو مکمل میں شامل کر لیتے جاتے ہیں جبکہ دیر سے ملنے والے خطوط صرف نام کی حد تک شامل ہوتے ہیں جو مکمل کے آخر میں شائع ہوتے ہیں) کیا تبصرہ بھیجے کے لیے آئٹم کی رجسٹری کروانی ضروری ہے یا داخل ڈاک سے ہی؟ (عام ڈاک سے بھی عموماً خطوط بروقت مل جاتے ہیں۔ آپ کا ٹیکہ اکتوبر کا لکھا ہوا خط میں 16 تاریخ کو ملا جو شاید 4 اکتوبر کو پوسٹ کیا گیا تھا) سرگزشت پہلے ہر ماہ کی 24 تاریخ کو ہمارے شہر میں دستیاب ہوتا تھا لیکن اب 28 یا 29 تاریخ کو تاخیر سے ملتا ہے، اس تاخیر کی کیا وجہ ہے؟ (چند وجوہات کی بنا پر اس کی تاریخ اشاعت میں کچھ تبدیلی کی گئی ہے) اب بات کی جائے اکتوبر 2011ء کے تاخیر ہونے کی تو یہ مجھے 28 ستمبر 2011ء کو ملا۔ سرورق قابل دید تھا، اشتہارات پڑھنے کے بعد فہرست پر ایک نظر ڈالی اور معراج رسول اکل کا انشائیہ پڑھا۔ اس بار انشائیے میں آپ نے وطن عزیز کے قوت طلب ایسے کی لٹاندی لی۔ کبھی اقلیتی کا قتل و دل کو شکنجے کر گیا۔ اس کے بعد جلیس نامی سائنس واں کی ایک مٹھی سرگزشت پہلی بار پڑھی۔ ڈاکٹر ساجد احمد کے قلم سے "عظیم کامیابی چارلی" پتلیوں کی زندگی کے مختلف اور دلچسپ واقعات پڑھے۔ بے شک چارلی چپلن آج بھی ہمارے دلوں میں زندہ ہیں۔ آج بھی ان کا صرف نام سننے ہی ہمارے پیروں سے سرکھٹ آ جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا اس انداز میں مشاہیر عالم پر لکھنا ہماری معلومات میں بے پناہ اضافہ کرتا ہے۔ وطن عزیز کا کام روشن کرنے والے اور ازل و ازل میں پاروں کے خالق عظیم مصور گل جی کی زندگی کے حالات تکمیل صدیقی نے بہت عمدگی سے پیش کیے۔ اس قلم و شمشاد سے لذت کرنے والے انسان کے ظالمات و قتل کا بہت دکھ ہوا۔ بہر حال پبلنڈ مصور آج بھی پاکستان میں موجود ہیں لیکن ہماری بددلتی اور وطن عزیز کے حالات نے ان کے ٹیلنٹ کو کھل کر رکھ دیا ہے۔"

✍️ **صدیق احمد کا ای سیل "امریکا و امریکا میں ایک شہر کرانا چاہتا ہوں۔"** اونا سن کے دو بچے تھے، اس کی پوتانی بیوی سے الیکٹرینڈر جس نے 1948ء میں جنم لیا۔ 1973ء میں حادثے کا شکار ہو کر مارا گیا۔ کرینیا 1950ء میں پیدا ہوئی اور 1988ء میں ہارٹ ٹل سے انتقال کر گئی۔ اس کی ایک بیٹی اٹھیا ہے۔
تاخیر سے موصول ہونے والے خطوط: انجم فاروق ساطی، لاہور۔ نصرت جاوید، فیض پور۔ امتیاز الحسن، راولپنڈی، بحر ش ممتاز، حاصل پور۔ راجہ مسیح، لاہور۔ اختر شیخ، نعمان صدیقی، نصر علی خان، فیاض احمد، کراچی۔

☆☆☆

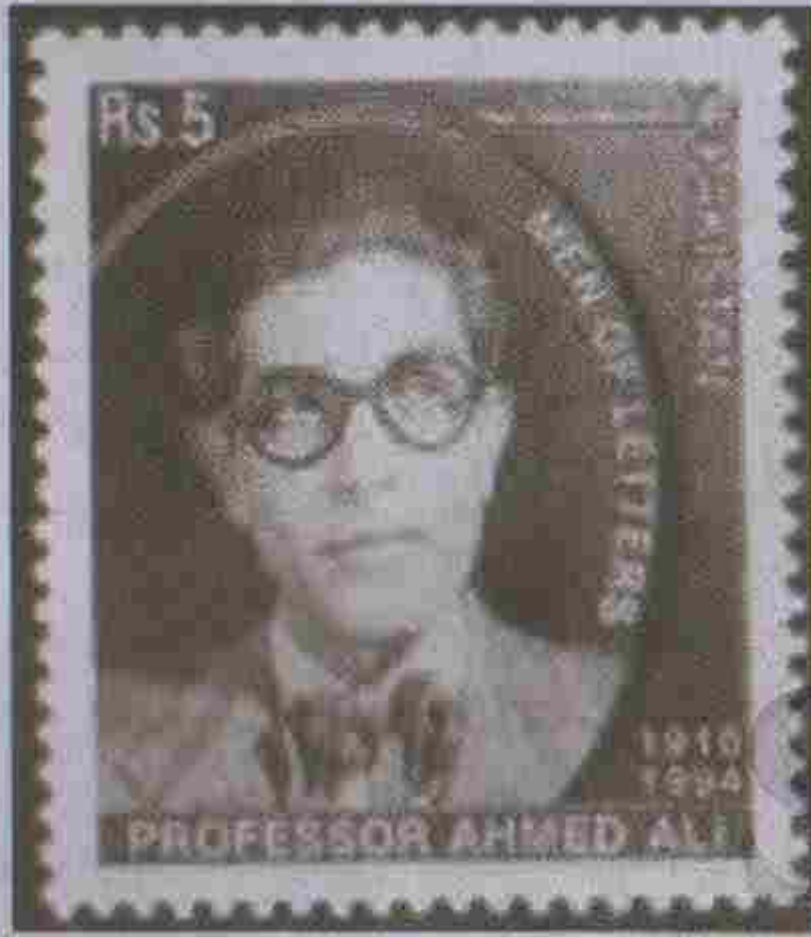
ماہنامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ یہ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔
تمام اشتہارات ٹیک نیجی کی بنیاد پر شائع کئے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ادارہ کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

انتباہ

تھی۔ تعلیم نسواں میں شروع میں خاندان والوں کا رویہ دیکھ کر افسوس ہوا، ان کی بہت دھڑی قابل خدمت تھی لیکن آخری دوڑ کیا خاندان سے باہر بیانیہ لکھیں تو بھی ثابت ہو گیا۔ یہاں ماہ نور کے والدین کے کچھ فیصلے غلط بھی تھے۔ خاندان میں لڑکیاں بغیر جوڑ دیکھے بیادیں لیکن احمر کا علی تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود انکار کر دیا پھر خاندان سے باہر تفریق کو کیا دیا تو بھائیوں کے ساتھ زمین سے بھی ہاتھ دھوئے پڑے۔ جڑواں منجھکہ خیر کہانی ہے۔ ایسی جلد بازی اور سادگی میں ایسے ہی ہوگا۔ حیران کرنے والا جیسے گپ بازار کٹر دیہاتوں میں دیکھنے کو ملتے ہیں حیرانی ہوتی ہے کہ کم تعلیم اور گاؤں میں زندگی گزارنے کے باوجود کتنی صلاحیتوں کے مالک ہیں شاید قدرت نے یہ اوصاف عطا کیے ہوئے ہیں جن کا منتفی استعمال کیا جاتا ہے یا یہ ان کی ذات کی کوئی نفسیاتی کمزوری ہوتی ہے کہ خود کو نمایاں نہ کئے کے لیے بے پڑکی چھوڑتے رہتے ہیں۔ دیدہ و عبرت پڑھ کر حیرت زدہ ہو گیا ہوں، واقعی تمہاری کاہنہ است بڑے بڑوں کو بچھاؤ دیتا ہے۔ سودی معاشرے میں لوگ ایک دوسرے سے دور اور اپنی ذات میں گن رہتے ہیں۔ رشتے دار ایک دوسرے کی خبر گیری کرتے تو حسینہ اس انجام کا شکار نہ ہوتی۔ سوچنے کی بات ہے خالدہ معصوم اور نا بچھ تھا۔ اس راہ پر حسینہ نے لگایا اس نے نوکری میں عورت کی رفاقت سے آشنا ہوا پھر سوچنے سمجھنے کا موقع نہ ملا۔ برقی رفتار کی فریڈ لک ہوتے ہوئے کتنی خود اعتماد، ذہین اور منصوبہ ساز تھی۔ شاید حالات نے اسے ایسا بنادیا تھا، اس نے کس کامیابی سے اشفاق بیگ کی بربادی تک کردار نبھایا پھر اس میں ادارہ کا انتظام چلانے اور دوسروں پر حاوی ہونے کی صلاحیت بھی ہے۔ جہاں تک شام کی بات ہے ہر آدمی اپنے مفادات کے لیے خود غرض اور بے حس بن جاتا ہے۔ دوسروں پر تنقید کرنا آسان ہے لیکن اپنے گریبان میں جھانکیں تو شرمندگی سے آنکھیں مزید جھٹکتی ہیں۔"

✍️ **ملک جاوید محمد خان سرکانی ورائی نے** برہ ذہنی، چمچہ سے لکھا ہے "اللہ تعالیٰ آپ سب کو خیریت سے رکھے (آمین) یونانی سائنس واں جلیس کی ایک مٹھی مولیٰ حیات پڑھ کر کچھ شہر خیال میں داخل ہوئے جہاں اعجاز سخا صاحب سندھ صدارت پر رتی افروز تھے مگر تبصرے میں کوئی نئی بات نہیں تھی، مگر دیگر ساتھی بھی بہترین تبصروں کے ساتھ حاضر تھے۔ محمد ایزد راسی، ناصر حسین رند، علی مغل اور سلطان مسعود کے تبصرے خصوصیت کے ساتھ بہترین تھے۔ ناصر حسین رند صاحب اپنی معلومات کو مضمون کی شکل دے کر ارسال فرمایا کریں تاکہ خط مختصر ہو اور ہم جیسے غریبوں کا کام لکھنے کے لیے جگہ بنی جایا کرے۔ بہر حال آپ اور عبدالقادر جی نے یاد کیا، بہت بہت شکر علی مغل، آپ کی سوچ میں بہت گہرائی اور گہرائی ہے۔ 19 لکڑی صاحب نے اپنے مضمون کو انداز میں چارلی چپلن کی داستان حیات تحریر کی جو کہ طرز بیان کی وجہ سے پڑھنے کے لائق چیز ہے۔ گل جی کے لٹل میں دی لوگ ملوث ہو سکتے ہیں جس کا مقصد پاکستان کی تعلیم اور بااثر شخصیات کو ختم کر کے ملک میں فساد ارجال پیدا کرنا ہے۔ ذہنی شاہ کراچی ٹرام وے کا شہر سرینہ لے کر آئے۔ ماضی قریب میں بی بی این کی سوامی سواری کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا ہے۔ ابھی گل جی کی بات ہے 92-93ء کا دورانیہ تھا ہمارے علاقے میں اینٹوں کے ہمنوں پر مزدوری کرنے والے کالنی چھٹی کرنے کے بعد قبیلہ باندی اڑا کے پاس بی بی این کے انتظار میں کھڑے ہو جاتے اور جب دور سے اس نظر آ جاتی تو وہ دور سے چلاتے۔ جیہا آ گیا، جیہا آ گیا۔ آواز سن کر باقی مسافر اور مزدور بھی پہنچ جاتے۔ ریلوے کا حال بھی یہی ہے کئی سالوں بلکہ دہائیوں سے یہ جگہ خسارے میں جا رہی ہے۔ سنتے ہیں کہ اس جگہ کا تو قلعی بھی اسے کھارہا ہے لیکن ریلوے اسی معاملے میں سخت جان ہے کہ ابھی ختم نہیں ہوا یا پھر اس لیے کہ اسے کھانے والوں کے لیے اس کا وجود باقی رہنا ضروری ہے ورنہ تو یہاں کی فیل ایک دس سالہ سچے کو اڑا لے جاسکتی ہے اور چوہے لوہا کھا جاتے ہیں۔ مریم کے خان، علی سفیان آفاقی، مختار آزاد، الطاف شیخ اور فکیل اور بیس بھی بہترین تنقید کے ساتھ حاضر تھے۔"

✍️ **سدرہ بانو ناگوری، کراچی سے** مرقوم ہیں "امید ہے کہ خیریت سے ہوں گے۔ سرگزشت کا شمارہ 24 ستمبر کو ملا، سب سے پہلے شہر خیال کی طرف نظر دوڑائی۔ ناصر حسین رند سے یہی کہنا چاہوں گی کہ معذرت کے پڑے میں آپ نے جو تبصرہ چلائے ہیں اس کے باوجود آپ کی معذرت قبول، ہم بات کو نہیں دیں گے طول، کیونکہ بحث ہو جائے گی فضول، بہتر ہے کہ ہمارے قلم سے کھلتے رہیں چاہتوں کے پھول بہر حال آئندہ سے ذاتیات سے پرہیز کیجئے گا۔ بھائی علی مغل، آپ بہت جذباتی ہو گئے، یہ تو بھائی قلموں کا فارمولہ جملہ ہے کہ مجھے معاشرے نے بد معاش بنادیا ہے چنانچہ معاشرے کو چھانی دے دی جائے، مجھے کچھ نہ کہا جائے، ابن مسیح کو اپنی شہرت کے لیے ضروری تھا کہ وہ مسلمانوں کے عقیدہ پر حملہ کرتا، خدائی کا دعویٰ کرتا؟ وہ مثبت انداز کی طرف بھی جاسکتا تھا، وہ قرآن و حدیث کا عالم بن جاتا تو آج مسلمان اس کا نام احرام سے لیتے، اسے سوچنا چاہیے تھا کہ اس کی صورت دیکھنے والے بہت کم مگر سیرت دیکھنے والے بہت زیادہ ہوں گے۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ اس کا چاند سلامت رہتا اور اس جیسے اور چاند بھی بنائے جاتے تو اس کا نام مسلمان احرام سے لیتے یعنی ایسے شخص کا جو خدائی کا دعوے دار تھا اچھا ہی ہوا کہ وہ اپنی ایجاد سمیت جہنم واصل ہو گیا۔ ہونا کے سنگاروں کے ذائقے کا چچا سنا اور پڑھا تھا، ہونا سے فرار ان سے بھی مزے دار نکلا۔ ایسی کہانیوں پر لکھ دیا کریں کہ بلڈ پریشر کے مریض۔ پڑھیں، دھڑکتوں پر قابو پانا مشکل ہو جائے گا۔ آئی رن وے بھی ایسی ہی کہانی ہے۔ سب اب اس دفعہ ست رہی۔ قلمی الف لیلہ میں اس دفعہ بارہ شریف چھائی رہیں۔ آفاقی اکل، آپ بڑے شہر ہیں۔ آگے کیا کہوں؟ قلمی الف لیلہ دوبارہ پڑھ لیجئے، خود ہی سمجھ جائیں گے۔ آپ کی مصیبت کا کیا کہنا۔ اکل الطاف شیخ امریکا کو پرت پرت کر کے قارئین کے سامنے کھول رہے ہیں۔ اس میں کرسٹوفر کولمبس کو ڈاکو کہنے کا ہم نے بہت جرم مانا، ہم تو اسے ہیرو سمجھتے تھے گویا ہم غلطی پر تھے۔ قمر زکریا اگل ہی کہانی تھی۔ آئینہ از عکس، پڑھ کر دل کا پ سا گیا۔ ضمیر کو ایک چھوٹی سی غلطی کی اتنی بڑی سزا ملی کہ ساری عمر کے لیے چھتا، مقتدر بن گیا۔ تعلیم نسواں ڈاکٹر ماہ نواری آپ جتنی پڑھی کہ ماں باپ اپنی بیٹیوں کو پڑھا کر اور شوہر اور محل دے کر اپنی خاندانی رسم و رواج کی بحیثیت چڑھا رہے ہیں، آج کے اس تعلیم یافتہ دور میں بھی عورت کو اس کا درست مقام نہیں مل سکا۔ وہ ایک لمحہ اور آئینہ جیسی دردناک داستان پڑھنے کے بعد ارسال ان کی مزاحیہ کہانی جڑواں نے بے اختیار دلوں کو سکرات پر مجبور کر دیا۔ باقی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔"



سپاہیوں کے ظلم و ستم کا شکار ہوا۔ خاندان کے کئی بزرگ قتل ہوئے، جائدادیں چھین گئیں۔ ان کے بزرگوں نے مجبوراً ملازمت کو ذریعہ معاش بنالیا۔ سید شجاع الدین نے بھی سرکاری ملازمت کو عزت بخشی۔ پنجاب سول سروس میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ سرکاری ملازمت اور ایسا اعلیٰ عہدہ۔

گل نازہ

ڈاکٹر ساجد امجد

وقت کی گرد کیسے کیسے باکمال شخصیت کو ذہن سے محو کر دیتی ہے۔ یہی کچھ اس کے ساتھ ہوا کہ لوگ اسے بھی بھولتے جا رہے ہیں جبکہ وہ ایک ایسا قلمکار تھا جس کی دھوم انگلینڈ تک مچی ہوئی تھی۔ پر قسمت کا کیا کہیے کہ اسے چین نہ تھا۔ زندگی بازیچہ بنی رہی۔ وہ واقف تھا کہ گھونٹ کڑوا ہو کہ میٹھا اسے پینا ضروری ہے ورنہ جینے کا قرینہ نہیں آتا۔ موج طوفان میں سفینہ آنے تو اسے حوصلے و کمال چابکدستی کی ضرورت ہوتی۔ ناروا حالات میں سعی مسلسل کی اہمیت ہے۔ وہ بھی مسلسل حالات سے نبرد آزما رہا مگر قسمت کا کیا کہیے۔ کسی سے دل لگایا تو وہ دل لگی کر بیٹھی، ٹوٹے دل کے ساتھ اسے ولایت جانا پڑ گیا۔ بڑے بڑے عہدوں پر رہا مگر نے رنگی حالات نے کسی پل اسے قرار نہ دیا۔ وہ چکی کے دوپٹوں کے بیچ پستار رہا، ہنسنا رہا۔ اسے قرار ملا تو کہاں؟ کراچی کے ملک پلانٹ قبرستان میں۔

ایک بہت بڑے مصنف کی داستان، حرافروزی بیان

یہ جاگیریں نسل در نسل دسترخوان کا سامان مہیا کرتی رہیں۔ قلعے کی دیواریں کمزور ہوئیں تو جاگیریں بھی سستی چلی گئیں۔

بادشاہت کے چراغ گل ہوئے۔ یہ چراغ خود بخود نہیں بجے۔ ایک طوفان اٹھا جو سب کچھ اڑا لے گیا۔ 1857ء کی جنگ آزادی نے سب کچھ خواب و خیال کر دیا۔ خاندان کے خاندان اُڑ گئے۔ جاگیریں چھین گئیں، حویلیاں تباہ ہو گئیں، زمینیں بہہ گئیں، یادیں رہ گئیں۔ بادشاہت کی بہار رخصت ہوئی۔ برطانوی استعمار کے دربار سج گئے۔ اب عزت اس کی تھی جو ملازمت سرکار انگلیش سے وابستہ ہوا اور ترقی کرتا گیا۔ حال کے دروازے پر ماضی کے ہاتھی کھڑے جھومتے تھے۔ عزت و توقیر کا یہی حوالہ تھا جو دہلی کے بہت سے گھرانوں پر صادق آتا تھا۔ کسی خاندان کے بزرگ بغداد سے آئے تھے۔ کوئی ایران سے آیا تھا، کسی کا حوالہ بخارا تھا۔ یہ صرف زبانی دعوے نہیں تھے بلکہ خزاں کا منہ دیکھنے کے باوجود ان پھولوں سے تہذیب و شائستگی کی وہی خوشبو آتی تھی جو بھی ان کے بزرگ اپنے ساتھ لائے تھے۔

سید شجاع الدین کا گھرانہ ایسے ہی خاندانوں میں سے

بات درباروں سے چلی تھی اور ملازمت تک آگئی تھی۔ ملازمت اور وہ بھی انگریزوں کی ملازمت۔ ایک وہ دور تھا جب بادشاہت، ہندوستان کے ماتھے کا جھومر بنی ہوئی تھی۔ مغلوں کی تہذیبی شائستگی نے جب بادشاہت کا ڈاکٹھ چکھا۔ لودھیوں اور سورویوں کے ادوار خاتمے کو پہنچے تو جنگ و جدل کے ساتھ ساتھ علوم و فنون کی بھی گرم بازاری ہوئی۔ ہمایوں کو تو خیر فرصت ہی کم ملی لیکن جب اکبر نے قلعہ آگرہ کو زینت بخشی تو اہل علم سے دربار اکبری آراستہ ہو گیا۔ گردش زمانہ نے اکبر کو کتابوں کے قریب نہیں جانے دیا تھا لیکن اس نے اپنے ارد گرد چلتی پھرتی کتابوں کو کثرت سے جمع کر لیا تھا۔ ایران و بغداد کے علمائے فن کھینچے چلے آ رہے تھے۔ آگرہ سے حج پور سیکری تک کی زمین، آسمان بنی ہوئی تھی۔

بادشاہ جن کی قدر کرے، عوام کی آنکھیں ان کا صدقہ کیوں نہ اُتاریں۔ ایسے لوگوں کو عزت و تکریم سے دیکھا جاتا تھا۔ بادشاہ کی مہربانیوں سے دنیاوی دولت بھی حاصل تھی۔ زمینیں اور جائدادیں عطا ہوئی تھیں کہ ایسے لوگ فکر معاش سے آزاد ہو کر علوم و دین کی خدمت کرتے رہیں۔

سوانحی خاکہ

نام..... سید احمد علی
والد..... سید شجاع الدین
والدہ..... کنیز اصغر بیگم
بیٹے..... ارم احمد علی
عروج احمد علی
دید احمد علی
بیٹی..... شاپنا احمد علی
تعلیم..... ایم اے (انگریزی)
ملازمت..... لکھنؤ یونیورسٹی
آگرہ کالج
الہ آباد یونیورسٹی
پریزیڈنسی کالج کلکتہ
پیدائش..... یکم جولائی 1910ء (دہلی)
وفات..... 14 جنوری 1994ء (کراچی)
تدفین..... ملک پلانٹ قبرستان، کراچی

بلند یوں کو چھو لیں.....
آمین ثم آمین کی صداؤں کے شور میں احمد علی تخت سے
نیچے اترا بلکہ اتارا گیا۔ ایک گود سے دوسری گود میں ہوتا ہوا
ثانی کی گود میں پہنچ گیا۔
روہنگ کی کھلی فضا میں وقت گزارنے کا موقع کم ہی مل
سکا۔ ایک مرتبہ پھر دہلی تبادلوں ہو گیا۔ اس وقت کے میر جید
طریق کے مطابق قرآن مجید کی ناظرہ تعلیم حاصل کرنی تھی۔
یہ ذمہ داری اس کی ثانی نے اپنے سر لی کیونکہ وہ ان سے
بہت مانوس تھا۔ خیال یہی تھا کہ وہ شوق شوق میں بہت جلد
قرآن ختم کر لے گا۔ یہی ہوا بھی۔ اس کا ذوق و شوق دیدنی
تھا۔ جتنا سبق ملتا فوراً یاد کر لیتا۔ شجاع الدین اسے اس کی
ذہانت سے تعجب کرتے تھے جبکہ کنیز اصغر بیگم فرماتی تھیں کہ
میری امی کے پڑ جانے کا طریقہ ہی ایسا ہے کہ جو پڑھاتی
ہیں، بچے کے ذہن نشین ہو جاتا ہے۔
احمد علی ثانی سے ایسا مانوس ہو گیا تھا کہ ایک کلمہ کو ان
سے جدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ ان کے پاس ہی سونے لگا تھا۔
شجاع الدین نے اس کا شوق دیکھا تو مولوی اسماعیل
میرٹھی کی ریڈریس لاکر دے دیں۔ اب اسے اردو بھی
پڑھانی جانے لگی تھی۔

”چلے جائیں؟“
”یہ کیا ضروری ہے کہ تقریب دہلی ہی میں ہو؟“
”سارے رشتے دار یہاں ہیں اور پھر آپ کے
دوست احباب!“
”دہلی سے روہنگ دور کتنا ہے۔ جس کو آنا ہوگا وہاں
بھی آ جائے گا۔ تبادلے کی نوعیت ایسی ہے کہ ہمیں فوراً جانا
ہوگا۔“
”کیا ایسا نہیں ہو سکتا۔“ ان کی بیگم ان کے قریب آ کر
کھڑی ہوئیں ”ہم ابھی تو چلے جائیں، پھر آپ چھٹی لے
لیجئے گا، بسم اللہ یہاں آ کر منائیں گے۔“
”ہاں..... اگر آپ کی ضد ہے تو ایسا ہو سکتا ہے۔“
”میں جھلا کیوں ضد کروں گی۔ میں نے تو ایک تجویز
دی تھی۔“
”میں نے آپ کی تجویز منظور کی۔ فی الحال تو ہمیں
روہنگ جانے کی تیاری کرنی ہے۔“
یہ سارا سا خاندان روہنگ چلا گیا۔ چند مہینوں کی
اوقات ہی گزریں۔ روہنگ کے مکان میں وقت دو بجے پاؤں
گھڑ گیا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا، کنیز اصغر بیگم کو اپنی تجویز یاد دہی
نہیں رہی۔ یہی طے ہوا کہ بسم اللہ کی تقریب روہنگ ہی میں
ہوگی۔
ایک سہ پہر کو محفل آراستہ ہوئی۔ روہنگ کے ایک خوش
صفات و خوش اوقات عالم بلائے گئے۔ گھر کے محن میں ایک
تخت بچھا دیا گیا۔ مشائی کے خوان آراستہ کر دیے گئے۔
عزیزوں اور نوکروں چاکروں کا گروہ حلقہ جما کر بیٹھ گیا۔
مولوی صاحب نے احمد علی کو لے کر تخت پر بیٹھ گئے
”بسم اللہ۔“
بچے ایسے موقعوں پر شرماتے ہیں۔ چپ رہتے ہیں۔
بڑے بڑے لالچ دیے جاتے ہیں تب کہیں جا کر منہ سے
ایک لفظ ادا کرتے ہیں۔ احمد علی ایسا سعادت مند ثابت ہو رہا
تھا کہ مولوی صاحب جو پڑھاتے جا رہے تھے، وہ پڑھتا
ہار ہا تھا۔
وہ جب چند آیتیں دہرا چکا تو ہر طرف سے ماشاء اللہ کی
صدائیں بلند ہوئیں۔ مولوی صاحب نے دعا کے لیے ہاتھ
اٹھا دیے۔
”اے اللہ! اس بچے کو اعلیٰ سے اعلیٰ دینی و دنیاوی علوم
عطا فرما۔ علم کی دولت سے ایسا مالا مال ہو کہ اس کا دامن بھی
خالی نہ ہو۔ اس کی کاوشیں شہرت عام و بقائے دوام کی

پہنچے۔ بسم اللہ ادا ہو، خوشی کا ایک اور موقع آئے۔ تقریب
کا ایک اور بہانا ہاتھ آئے۔
پانچویں سال میں بسم اللہ خوانی کا دستور تھا۔ یہ دستور
اصل میں اس عہد کے متوسط مسلم گھرانوں کے دینی طرز
احساس کی بھرپور نمائندگی کرتا تھا۔
سید شجاع الدین کی ملازمت ایسی تھی کہ مختلف شہروں
میں تبادلے ہوتے رہتے تھے۔ احمد علی کی بسم اللہ کا زمانہ
قریب تھا کہ شجاع الدین کے تبادلے کے احکامات آ گئے۔
وہ دفتر سے گھر آئے تو یہ پیغام بھی ساتھ لائے۔ کنیز اصغر بیگم
اس وقت احمد علی کو گود میں لیے بیٹھی تھیں۔ ایک ملازمہ بھی
قریب بیٹھی تھی۔ احمد علی کی بسم اللہ خوانی کی باتیں ہو رہی
تھیں۔ وہ تھے احمد علی کو بتا رہی تھیں کہ وہ اس کی بسم اللہ کے
موقع پر کس کس طرح اپنے ارمان پورے کرے گی۔ شجاع
الدین نے گھر میں قدم رکھا۔ ملازمہ تو کچھ کر چکی تھی، شجاع
الدین کری کچھ کر بیٹھ گئے۔
”کیا باتیں ہو رہی ہیں ماں بیٹے کے درمیان؟“
”میں اسے بتا رہی تھی کہ اب تمہارے پڑھنے کے دن
آ گئے ہیں۔ پہلے بسم اللہ ہوگی اور پھر تم مولوی صاحب کے
پاس پڑھنے کے لیے بھجوا دیے جاؤ گے۔“
”ہاں بھئی، کیوں نہیں۔ ایسی دھوم دھام سے ہوگی بسم
اللہ کہ دنیا دیکھے۔“
”چند مہینے ہی تو رہ گئے ہیں۔ آپ نے ابھی تک کوئی
تیاری ہی شروع نہیں کی۔“
”اب یہاں کیا تیاری کرنی، روہنگ جا کر ہی تیاری
ہو سکے گی۔“
”روہنگ! وہ جھلا کیوں؟ روہنگ میں کیا کوئی بہت
بڑے مولوی صاحب رہتے ہیں کہ بسم اللہ وہاں ہوگی۔ مولوی
ولی اب اس قابل بھی نہیں رہی؟“
”یہ بات نہیں ہے۔ میرے تبادلے کے احکامات آج
ہی آئے ہیں۔ میرا تبادلہ روہنگ ہو گیا ہے۔“
”تبادلہ ہی تو ہوا ہے۔ حکومت نے یہ شرط تو نہیں رکھی
ہوگی کہ اپنے بیٹے کی بسم اللہ روہنگ میں کرو گے تو تبادلہ ہوگا
ورنہ نہیں ہوگا۔“
”یہ پابندی تو نہیں ہے لیکن ظاہر ہے، ہم جہاں رہیں
گے، تقریب وہیں ہوگی۔“
”اے میں کہوں، کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ یہ تبادلہ کچھ دنوں
کے لیے ٹل جائے۔ احمد علی کی تقریب ہو جائے پھر ہم روہنگ

دنیاوی ساز و سامان کی کون سی شے تھی جو میسر نہیں تھی لیکن تکبر
وغرور قریب ہو کر نہیں گزرا تھا۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ جو
نعمتیں میرے بزرگوں کو میسر تھیں ان کا عشر عشر بھی مجھے نہیں
ملا پھر مجھے غرور ہو تو کس چیز پر؟ ہاں اس بات کا غرور ضرور
ہے کہ میرے خاندان کا شمار دلی کے شرفاء میں ہوتا ہے۔
میرے خاندان میں اب تک وہی تہذیبی روایات ہیں جن پر
میرے بزرگ عمل پیرا تھے۔ مذہب اور تہذیب یہی دو
چیزیں تو میرا فخر ہیں۔
سید شجاع الدین کی شادی کا وقت جب قریب آیا تو
ایسی لڑکی کی تلاش ہوئی جو اس خاندان کی ہم پلہ ہو۔ لڑکیاں
دیکھی جانے لگیں۔ خاندانوں کی چھان پھان شروع ہو گئی۔
تلاش کرنے والے قدم ایک ایسے خاندان میں جا کر ٹھہرے
جس کے بزرگ دوسرے مغل، شہنشاہ ہمایوں کی دعوت پر دلی
آئے تھے۔ اس گھر میں ایک لڑکی کنیز اصغر بیگم تھی۔ یہ لوگ
بھی شجاع الدین کے گھرانے کی طرح یہ اعتبار نبھ سکتے
تھے۔ اس لڑکی سے سید شجاع الدین کی نسبت ملے ہوگی۔
کنیز اصغر بیگم بیاہ کر دہلی کے کوچہ پنڈت میں واقع
جلال منزل میں آ گئیں۔
شادی کے بعد اولاد کی آرزو کیے نہیں ہوتی۔ بڑے
بھائی کے گھر میں اوپر تلے کے کئی بچے کھیل رہے تھے لیکن
شجاع الدین کا آگن اداں تھا۔ جب سال گزرا، دوسرا سال
بھی گزر گیا تو گھر کی عورتوں کے ماتھوں پر ٹکٹیں آنے لگیں۔
مذہبی گھرانہ تھا اس لیے یہ تشفی تو تھی کہ اللہ کی دین ہے وہ جب
چاہے گا، عطا کر دے گا لیکن فکر بہر حال تھی۔ پہلے صرف
دعائیں کی گئیں پھر منتوں مرادوں تک بات پہنچی۔ بلا آخر خدا
نے سن لی۔ اللہ تعالیٰ نے ایک بیٹا عطا کیا۔ سید شجاع الدین
نے اس کا نام احمد علی رکھا۔
پہلا بیٹا تھا اور اتنی مرادوں کے بعد پیدا ہوا تھا۔ جتنی
خوشیاں منائی جاتیں کم تھیں۔ گھر میں جیسے بہاروں کا موسم
مستقل قیام پذیر ہو گیا تھا۔ گھر کے ملازموں کی تو چاندی
ہو ہی گئی تھی، محتاجوں اور فقیروں میں بھی صدقہ خیرات تقسیم
ہوتا رہا۔ ہفتوں تک جلال منزل کی دیواریں مبارک بادوں
کے شور سے گونجتی رہیں۔ وہ تمام رسمیں دھوم دھام سے منائی
گئیں جو دلی کے مسلمان گھرانوں میں رائج تھیں۔ گھر میں
خوش حالی تھی۔ خدا کا دیاسب کچھ تھا، جی بھر کے لٹا یا گیا۔
احمد علی ذرا بڑا ہوا تو خاندان بھر کی آنکھوں کا تارا بن
گیا۔ بے چینی سے انتظار ہو رہا تھا کہ کب وہ پڑھنے کی عمر کو

افسانوی مجموعے

انگارے (شریک مصنف) شعلے، ہماری گلی،
قید خانہ، موت سے پہلے۔

چند افسانے

شعلے، تصویر کے دور رخ، استاد شوخاں، شادی،
چھپر کھٹ، غلامی، موٹر لاری کا سفر، ہماری گلی، شکستہ، مسٹر
شمس الدین، قید خانہ، پریم کہانی، قلعہ، مزرے دونوں کی
یاد، آنکھیں۔

”اب میرے بچنے کی کوئی امید نہیں۔ افسوس میں احمد
علی کو چلتے پھولتے نہیں دیکھ سکوں گا۔“

”شجاع، کیوں ایسی ناامیدی کی باتیں کرتے ہو۔
بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے۔“

”اب ٹھیک ہونا میرے مقدر میں نہیں۔ مجھے فکر ہے تو
احمد علی کی۔ اس کی تعلیم کا کیا ہوگا؟“

”تم فکر مت کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”میں اس کا ہاتھ آپ کے ہاتھ میں دیتا ہوں۔ اس کی
تعلیم و تربیت اب آپ کی ذمہ داری ہے۔ اسے اپنے
ساتھ رکھیں اور اپنے بچوں کی طرح اس کی نگہداشت
کریں۔“

یہ شجاع الدین کی اپنے بھائی سے آخری گفتگو تھی۔ اس
کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ احمد علی اچانک چھاؤں سے
دھوپ میں آ گیا۔

بہاؤ الدین نے اپنے بھائی سے وعدہ کیا تھا لہذا چلتے
وقت وہ احمد علی کو اپنے ساتھ لے گئے۔ بہاؤ الدین یونی میں
ڈپٹی کمشنر کے عہدے پر فائز تھے۔ ان کے گیارہ بچے تھے
اور ان کی اہلیہ سخت گیر منتظمہ تھیں۔ ایک ایک بچے کو دانٹوں
سے پکڑ کر رکھنے والی خاتون۔ گھر کا ماحول نہایت قدامت
پسندانہ اور فرسودہ تھا۔

احمد علی کو دیکھتے ہی ان خاتون کی تیوری پر نکل پڑ گئے۔
سوچ رہی ہوں گی، گیارہ کیا کم تھے، اب بارہواں بھی
آ گیا۔ اسے بھی کھانا ملاؤ۔ تعلیم کے اخراجات الگ۔ شوہر
کی وجہ سے کچھ کہہ تو نہیں سکیں لیکن اندر اندر کھول کر رہ گئیں۔

ادھر احمد علی کا حال یہ کہ گیارہ بچوں کے جہوم میں اس کا
دم گھٹ رہا تھا۔ یہ بچے اس کے ارد گرد اس طرح جمع ہو گئے
تھے جیسے پتھر سے میں کوئی نیا جانور آ گیا ہو۔ تانگی کی آنکھوں

میر باقر علی پھر تشریف لے آئے۔ احمد علی ایک مرتبہ پھر
سر اپا گوش ہو گیا۔ اس مرتبہ وہ سوچ رہا تھا جب اسے اچھی
طرح لکھنا آ جائے گا تو وہ بھی ایسی داستانیں لکھا کرے گا اور
میر باقر علی سے کہے گا ان داستانوں کو اپنے انداز میں پڑھ کر
دوسروں کو سنائیں۔

ایک مرتبہ اس نے اپنی ماں اور چچی کے سامنے
میر باقر علی کی نقل بھی اتاری۔ اپنی طرف سے ایک کہانی
گھڑی اور میر باقر علی کے انداز میں ہاتھ چلا کر سنائی۔
دونوں عورتیں مہی کے مارے لوٹ پوٹ ہو گئیں۔

اس کی ماں تو یہ سمجھ رہی تھیں کہ وہ میر باقر علی کی
داستانوں میں کم ہو کر اپنی تعلیم کی طرف سے غافل ہو جائے گا
لیکن ان کا اندازہ غلط تھا۔ وہ اور بھی زیادہ سرگرمی سے

کتابوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ چاہتا تھا جلد از جلد اچھی
طرح لکھنا پڑھنا سیکھے تاکہ میر باقر علی کی طرح کہانیاں
لکھ سکے۔ وہ اس وقت تک یہی سمجھتا تھا کہ میر باقر علی جو
داستانیں سناتے ہیں خود ان کی لکھی ہوئی ہوتی ہیں۔

مولوی صاحب پڑھانے آتے تھے جن سے اس نے
فارسی کی چند ابتدائی کتابیں پڑھ لیں۔ ابتدائی عربی بھی کسی
حد تک سیکھ لی۔ پھر ایک ہندو استاد آنے لگا جو اسے انگریزی
پڑھاتا تھا۔

ان دنوں انگریزی کا رواج ضرور ہو گیا تھا لیکن فارسی کو
اب بھی تہذیب و شائستگی کی زبان سمجھا جاتا تھا لیکن شجاع
الدین انگریزی کی اہمیت کو سمجھتے تھے۔ انہیں یہ دیکھ کر خوشی
ہو رہی تھی کہ احمد علی میں انگریزی سیکھنے کی غیر معمولی صلاحیت
ہے۔ پھر جب وہ اسکول جانے لگا تو اس کے جوہر مزید کھلنے
لگے۔

شجاع الدین سول سروس میں تھے لہذا ملازمت کے
سلسلے میں انہیں مختلف شہروں میں قیام کرنا پڑتا تھا۔ احمد علی بھی
ان کے ساتھ ساتھ گھومتا رہا۔ جہاں جاتا نیا اسکول ملتا۔ تعلیم
مستثر ضرور ہوتی لیکن چلتی رہی۔

اس نے ابھی عمر کی نو منزلیں طے کی تھیں کہ سید شجاع
الدین سخت بیمار پڑ گئے۔ حالت ایسی ہوئی کہ بچنے کی کوئی
امید نہ رہی۔

انتقال سے ایک روز قبل شجاع الدین کے بڑے بھائی
بہاؤ الدین ان کی پتی سے لگے بیٹھے تھے۔ شجاع الدین
بار بار قیام میں چلے جاتے پھر ہوش میں آتے۔ پھر انہوں نے
اپنے بھائی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

شروع کی تو وہ تھلا کر اٹھ بیٹھا۔
”آپ کو تو کہانی سنائی نہیں آتی۔ میر باقر علی کو دیکھا
تھا کسی اچھی طرح سنا رہے تھے۔“

”اب میں میر باقر علی تو ہوں نہیں۔ اپنے باوا سے کہو
انہیں روز بلالیا کریں۔ آخر کسٹری ہیں۔ انہیں ملازم ہی رکھ
لیں۔ ہمیں تو جیسی آتی ہے ویسی سنائیں گے۔“

”میں ابا جان سے کہوں گا۔ وہ انہیں پھر بلالیں گے۔
آپ خفا کیوں ہوتی ہیں؟“

”میں خفا نہیں ہوں۔ یہ بتاؤ کہانی سننا ہے یا نہیں؟“
”سننا ہے۔“ وہ نہیں پڑا۔

یہ کہانی اس نے کچھ دلی کچھ بے دلی سے سنی لیکن سوچ
ضرور رہا تھا کہ وہ اپنے والد سے کہہ کر میر باقر علی کو پھر اپنے
گھر بلائے گا۔

باپ سے تو ہمت نہیں ہوئی اس نے ماں سے اپنی
خواہش کا اظہار کیا۔ ماں تو حق میں نہیں تھیں کہ میر باقر علی
بار بار آئیں اور منہ پر خراش ہوں، شجاع الدین نے سنا تو احمد علی
کی فرمائش کو مان لیا۔

”پیسے ضرور خرچ ہوئے ہیں لیکن اس کا فائدہ بھی تو
دیکھو۔“ انہوں نے بیوی سے کہا ”بچوں کے کان مختلف
داستانوں کے بہانے مشرقی تہذیبی روایات سے آشنا
ہو جاتے ہیں۔ صحیح اردو بولنا سیکھ جاتے ہیں۔ یہ بھی ایک طرح
کی تعلیم ہی تو ہے۔ اگر احمد علی کو شوق ہے تو ہم بھی کبھی
میر باقر علی کو مدعو کر لیا کریں گے۔“

”میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ موٹی جادو بھری طلسماتی
کہانیاں سن سن کر احمد علی کا دھیان کتابوں سے نہ ہٹ
جائے۔“

”یہ کہانیاں طلسماتی ضرور ہوتی ہیں لیکن ان میں جو
معاشرت بیان ہوتی ہے وہ وہی ہے جو اب سے کچھ دنوں
پہلے تک دلی کے مسلم گھرانوں میں رائج تھی۔ بچوں کو معلوم
ہونا چاہیے کہ ہماری معاشرتی تاریخ کیا ہے۔ ان داستانوں
میں ہمیشہ جھوٹ کی شکست ہوتی ہے اور سچ کو فتح نصیب ہوتی
ہے۔ یہ بھی بچوں کے لیے بلکہ بڑوں کے لیے بڑا سبق ہے۔
اور پھر جیسی اردو سننے کو ملتی اس کا تو کوئی بدل ہی نہیں۔ اردو
اگر زندہ ہے تو ان داستانوں ہی کے دم سے ہے۔“

”آپ تو میرے لیے خود میر باقر علی بن گئے۔ میں
نے کون سا منہ کیا ہے۔ اچھا ہے میر باقر علی کی کچھ آمدنی
ہو جائے گی، انہیں پھر بلالیں۔“

شجاع الدین فارسی شاعری کا عمدہ ذوق رکھتے تھے۔
شیخ سعدی سے خاص قلبی تعلق تھا۔ انہوں نے اپنے طور پر
گستاخ بوستاں پڑھانی شروع کر دی۔

اس سچے میں کچھ ایسی باتیں دیکھی جارہی تھیں جو عام
بچوں میں عموماً نہیں دیکھی جاتیں۔ اسے نہ تو کھیل کود سے کوئی
خاص رغبت تھی اور نہ کھانے پینے کا شوق تھا۔ اس کی اس بے
رغبتی کو دیکھ کر اس کے پلنگ پر ”گھنچینہ“ لگا دیا گیا جس میں
اشیانے خورد و نوش رکھ دی جاتی تھیں۔

دو دن کے بعد اگر اسے کسی سے محبت تھی تو وہ اس کی چچی
تھیں۔ اس محبت کی وجہ یہ تھی کہ وہ بہت اچھے انداز سے
کہانیاں سناتی تھیں۔

احمد علی کو کتابوں کے علاوہ اگر کوئی شوق تھا تو وہ کہانیاں
سننے کا شوق تھا۔ اس کے اس شوق کی سیرابی اس کی یہ چچی کیا
کرتی تھیں۔

میر باقر علی داستان گو کا بہت شہرہ تھا۔ شجاع الدین نے
احمد علی کے شوق کو دیکھتے ہوئے یہ اہتمام کیا کہ میر باقر علی کو
جلال منزل میں مدعو کر لیا۔

شام ہی سے اہتمام شروع ہو گیا تھا۔ صحن میں ایک تخت
ڈال دیا گیا۔ سفید چاندنی کا فرش بچھ گیا۔ دالانوں میں
چیلنوں کے پیچھے عورتیں بیٹھ گئیں، صحن میں مرد۔ احمد علی سب
سے اگلی صف میں۔

میر باقر علی اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ تشریف
لائے۔ ٹبل کا کرتا، چوڑی دار پاجامہ، سر پر دوپٹی ٹوپی، سرخ
وسپید چہرہ۔ ہاتھ میں ایک رجسٹر نما کالی۔ تخت پر بیٹھے اور
داستان آغاز کی تو جلال منزل کے کونے کھدروں تک الفاظ
چنچنے لگے۔ پاٹ دار آواز لیکن ایسی نرم کہ کانوں کو گراں نہ
گزرے۔ ایک ایک لفظ اپنے درست خرچ سے ادا ہو رہا

تھا۔ چہرہ جیسے جذبات کا آئینہ۔ خوشی کا موضوع ہوتا تو چہرہ
کھل اٹھتا، غم کا مضمون ہوتا تو چہرے پر ایسی اداسی طاری
ہو جاتی تھی جیسے یہ آقا خود ان پر ٹوٹی ہو۔ مضمون کو ادا کرنے
میں صرف چہرہ نہیں ہاتھوں کی حرکت بھی ساتھ دے رہی تھی۔

آواز کا اتار چڑھاؤ ایسا تھا کہ سننے والے کی سماعت ادھر ادھر
بھٹک ہی نہیں سکتی تھی۔

احمد علی آنکھیں میاڑے انہیں تک رہا تھا اور غالباً سوچ
رہا تھا کہ کیا کہانی ایسے بھی سنائی جاسکتی ہے۔ کہانی بھی نئی تھی
اور سنانے کا انداز بھی نیا۔

دوسرے دن، رات کو اس کی چچی نے اسے کہانی سنائی

میر باقر علی نے کچھ دلی کچھ بے دلی سے سنی لیکن سوچ
ضرور رہا تھا کہ وہ اپنے والد سے کہہ کر میر باقر علی کو پھر اپنے
گھر بلائے گا۔

باپ سے تو ہمت نہیں ہوئی اس نے ماں سے اپنی
خواہش کا اظہار کیا۔ ماں تو حق میں نہیں تھیں کہ میر باقر علی
بار بار آئیں اور منہ پر خراش ہوں، شجاع الدین نے سنا تو احمد علی
کی فرمائش کو مان لیا۔

”پیسے ضرور خرچ ہوئے ہیں لیکن اس کا فائدہ بھی تو
دیکھو۔“ انہوں نے بیوی سے کہا ”بچوں کے کان مختلف
داستانوں کے بہانے مشرقی تہذیبی روایات سے آشنا
ہو جاتے ہیں۔ صحیح اردو بولنا سیکھ جاتے ہیں۔ یہ بھی ایک طرح
کی تعلیم ہی تو ہے۔ اگر احمد علی کو شوق ہے تو ہم بھی کبھی
میر باقر علی کو مدعو کر لیا کریں گے۔“

”میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ موٹی جادو بھری طلسماتی
کہانیاں سن سن کر احمد علی کا دھیان کتابوں سے نہ ہٹ
جائے۔“

”یہ کہانیاں طلسماتی ضرور ہوتی ہیں لیکن ان میں جو
معاشرت بیان ہوتی ہے وہ وہی ہے جو اب سے کچھ دنوں
پہلے تک دلی کے مسلم گھرانوں میں رائج تھی۔ بچوں کو معلوم
ہونا چاہیے کہ ہماری معاشرتی تاریخ کیا ہے۔ ان داستانوں
میں ہمیشہ جھوٹ کی شکست ہوتی ہے اور سچ کو فتح نصیب ہوتی
ہے۔ یہ بھی بچوں کے لیے بلکہ بڑوں کے لیے بڑا سبق ہے۔
اور پھر جیسی اردو سننے کو ملتی اس کا تو کوئی بدل ہی نہیں۔ اردو
اگر زندہ ہے تو ان داستانوں ہی کے دم سے ہے۔“

”آپ تو میرے لیے خود میر باقر علی بن گئے۔ میں
نے کون سا منہ کیا ہے۔ اچھا ہے میر باقر علی کی کچھ آمدنی
ہو جائے گی، انہیں پھر بلالیں۔“

”میں خفا نہیں ہوں۔ یہ بتاؤ کہانی سننا ہے یا نہیں؟“
”سننا ہے۔“ وہ نہیں پڑا۔

تو گالیاں ہوتی ہیں۔ اس سے کہہ دو یہ غنڈا اگر دی میرے گھر میں نہیں چلے گی۔ عاشقی معشوقی کرتی ہے تو کہیں اور جا کر کرے۔“

”اچھا اسے بلاؤ، میں سمجھائے دیتا ہوں۔“ احمد علی ایک مرتبہ پھر پیش ہوا۔ بہاؤ الدین نے اسے سمجھایا کہ انگریزی میں نظمیں لکھتے ہو، اچھی بات ہے لیکن اس طرح تم اپنی تعلیم سے دور ہو جاؤ گے۔ حصولِ تعلیم کے دوران کوئی نظم نہیں لکھو گے۔“

اس کی تانی نے اس کے سامنے وہ کاپی جلا دی جس پر اس کی نظمیں لکھی ہوئی تھیں اور اس سے عہد لیا کہ وہ آئندہ شاعری نہیں کرے گا۔

اس نے اپنے آپ سے پکا وعدہ کر لیا تھا کہ اب وہ کورس کی کتابوں کے سوا کسی کتاب کو ہاتھ نہیں لگائے گا لیکن وہ اس پر کچھ ہی دن عمل کر سکا۔ ایک روز اسکول کی لائبریری الیگزینڈر ڈوما کا ایک ناول اس کے ہاتھ لگ گیا۔ وہ اس ناول کو گھر لے آیا اور کورس کی کتابوں میں چھپا چھپا کر اسے پڑھنے لگا۔ یہ ناول اس نے کئی قسطوں میں ختم کیا۔ پھر تو اسے ایسا چمکا پڑا کہ ایک ایک کر کے اس نے اس مصنف کے کئی ناول پڑھ ڈالے۔

اس کی چچی کی سنائی ہوئی کہانیاں اور میر باقر علی کی داستانیں اس کے دماغ میں گونج رہی تھیں۔ اس کا جی چاہتا تھا، وہ بھی کہانیاں لکھے۔ ان ناولوں نے اس کے شوق کو ہمیز کیا۔ اس نے کئی چھوٹی چھوٹی کاپیاں بنالیں جن پر وہ انگریزی میں کہانیاں لکھنے لگا۔ اب وہ محتاط ہو گیا تھا۔ ان کاپیوں کو بہت احتیاط سے رکھنے لگا تھا۔ اس کے بعد وہ بھی نہیں پکڑا گیا۔

سرکاری مصروفیات کے سلسلے میں اس کے تایا کو مختلف شہروں میں مقیم ہونا پڑتا تھا۔ احمد علی بھی ان کے ہمراہ گڑھ، مرزا پور اور شاہجہاں پور وغیرہ میں مقیم رہا۔

احمد علی کا تعلیمی سلسلہ مشرقی پنجاب کے گوڑ گاؤں ایلیمنٹری اسکول اور بعد ازاں اعظم گڑھ کے مشن ہائی اسکول (کانونٹ) میں جاری رہا۔

1923ء میں وہ گورنمنٹ ہائی اسکول علی گڑھ میں داخل ہوا۔ میٹرک پاس کرنے کے لیے اسے منٹو سرکل میں داخل ہونا پڑا۔ یہاں ممتاز ماہر تعلیم شیخ عبداللہ موجود تھے جنہوں نے تعلیم نسواں کے لیے قابلِ قدر کوششیں کی تھیں اور خود کو سرسید کے تعلیمی اور اصلاحی مقاصد کے لیے وقف کر دیا

یہ تھا کہ قصے کہانیوں میں پڑ گئے تو امتحان میں فیل ہو جاؤ گے۔ تمہیں تو اردو سے زیادہ انگریزی پر زور دینا چاہیے۔

اس طرف سے بھی حوصلہ شکنی ہوئی۔ اس موقع پر اس کے ذہن رسا نے ایک ترکیب اور وضع کی۔ اسے تایا کا یہ کہنا یاد تھا کہ انگریزی پر توجہ دو۔ یہ انگریزوں کا زمانہ ہے۔ اس نے سوچا اگر وہ انگریزی میں شاعری کرے تو اس کے ذوق کو بھی تسکین ملے گی اور بہت دن تک کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا کیونکہ یہ انگریزی میں ہوگی۔

اس کی یہ ترکیب کارآمد ثابت ہوئی۔ بہت دنوں تک کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ وہ انگریزی میں لکھ رہا ہے۔ اس نے ایک روز ایک نظم لکھی ”فلاور ان دی باسکٹ“ اسے اپنی کاپی پر اتارا۔ نیچے دیکھا کئی کر دیے۔ پھر کسی کام سے اٹھنا پڑا۔ کاپی وہیں پڑی رہ گئی۔ اتفاق سے اس کے بچا زاد بڑے بھائی کی نظر اس کاپی پر پڑ گئی۔ اس نے الٹ پلٹ کر دیکھا تو اس میں کئی چھوٹی چھوٹی انگریزی نظمیں لکھی ہوئی تھیں اور یہ سب ظاہر ہے احمد علی کی لکھی ہوئی تھیں۔ حسد کی ایک لہری اس کے دل میں اٹھی۔ یہ اب اتنا قابلِ ہو گیا کہ انگریزی میں نظمیں لکھنے لگا ہے۔ اس نے کاپی اٹھائی اور ماں کے پاس پہنچ گیا۔

”احمد علی کے بیٹے سے یہ کاپی ملی ہے۔“

”کیا ہے اس میں؟“

”کیا ہو سکتا ہے۔ یہ لڑکا اپنی حرکتوں سے باز آنے والا نہیں۔ پڑھنا پڑھانا کچھ نہیں ہے۔ شاعری کرنے لگے ہیں۔ اس کاپی میں نظمیں لکھی ہوئی ہیں۔ عاشقانہ اور نہایت وہابیات قسم کی نظمیں۔“

ایک دو لفظوں کا اٹنا سیدھا ترجمہ کر کے ماں کو سنا بھی دیا۔ وہ سخت مزاج خاتون تھیں۔ یہ کہاں برداشت تھا کہ احمد علی عاشقانہ شاعری کرتا پھرے۔ انہوں نے یہ کاپی اپنے میاں کے آگے رکھ دی۔

”یہ تو نظمیں ہیں جو احمد علی نے لکھی ہیں۔“

”یہی تو دکھانے لائی ہوں۔ آپ اس کی تعلیم پراستے پیچے خرچ کر رہے ہیں اور وہ ہے کہ شاعری میں اپنا وقت ضائع کر رہا ہے۔“

”یہ تو انگریزی میں ہیں۔ دیکھو اس کی انگریزی کتنی اچھی ہو گئی ہے۔“

”گالیاں اردو میں لکھی جائیں یا انگریزی میں۔ گالیاں

آئیں اور اس کے ہاتھ سے کاغذ چھین لیا۔

”غضب خدا کا، یہ عمر اور یہ حرکتیں۔ تیری ان حرکتوں کا اثر میرے بچوں پر بھی پڑ گیا تو میں تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی۔ آنے دے اپنے تایا کو، وہی تیری حمایت لیتے ہیں۔ اب دیکھیں اپنے بیٹے کے کرتوت۔“

وہ ہاتھ جوڑتا رہا کہ اس کی بنائی ہوئی ادھوری تصویر اسے واپس کر دی جائے لیکن کسی کو اس پر رحم نہیں آیا۔ پھر وہ یہ سوچ کر چپ ہو گیا کہ تصویر کتنی کوئی اچھی بُرائی نہیں جس پر اس کے تایا اسے ڈانٹیں گے لیکن یہ دیکھ کر وہ حیران رہ گیا کہ شام کو جب اس کے تایا آئے تو وہ بھی اس کی تصویر کشی سے خوش نہیں تھے۔ ان کا انداز ڈانٹنے کا نہیں سمجھانے کا تھا لیکن مطلب یہی تھا کہ وہ تصویریں نہ بنایا کرے۔

”آپ تو اس طرح سمجھا رہے ہیں جیسے تصویریں بنانا کوئی بُرائی ہے ہی نہیں۔ غضب خدا کا، میرے گھر میں یہ کام ہو رہا ہے اور آپ ہیں کہ سمجھانے بیٹھ گئے۔“

”بھئی بچہ ہے۔ سمجھاؤں گا تو سمجھ جائے گا۔“

”یہ بچہ ہے۔ ایسے بے ہودہ کام کر رہا ہے اور آپ کہتے ہیں بچہ ہے۔ اس کا اسکول جانا بند کر دایسے ویسے کام یہ وہیں جا کر دیکھ رہا ہے۔“

بہاؤ الدین تو بیوی کی یہ بات سن کا خاموش ہو گئے تھے لیکن احمد علی فوج اٹھا ”مجھے اسکول سے مت اٹھائیے، میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں آئندہ تصویریں نہیں بناؤں گا۔“

بہاؤ الدین کو بھی ہمت ہوئی۔ انہوں نے بھی بیوی سے کہا کہ یہ آئندہ تصویریں نہیں بنائے گا۔ اسے اسکول سے نہیں اٹھانا چاہیے ورنہ یہ اور پکڑ جائے گا۔

احمد علی کو بھی یہ احساس ہونے لگا کہ وہ واقعی غلطی پر تھا۔ تصویریں بنانا بُری بات ہوتی ہوگی۔ اسی لیے تو تایا جان بھی اسے سمجھا رہے تھے۔ اس نے طے کر لیا کہ وہ آئندہ تصویریں نہیں بنائے گا۔

وہ کچھ دن کے لیے پھر اکیلا ہو گیا تھا۔ فارغ اوقات میں کھیتوں کے درمیان گھومنے اور بچنے چرانے میں گزارنے لگا۔ اس کی روح کو تسکین نہیں مل رہی تھی لیکن وہ مجبور تھا۔

وہ اس وقت پانچویں جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ کانونٹ کا طالب علم تھا۔ انگریزی تو اچھی ہوتی ہی چاہیے تھی لیکن اردو میں شاید زیادہ تھی۔ بچپن میں جو فارسی کی چند کتابیں پڑھ لی تھیں، یہ اس کا اثر تھا کہ قصے کہانیوں میں خوب دل لگتا تھا۔ گھر والوں کو پتا چلا تو شدید ناراض ہوئے۔ تایا کا سمجھانا البتہ

میں بھی شفقت نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ یہاں رہنا تو بڑا مشکل ہو جائے گا۔

کچھ دیر بعد اس کی تانی نے کچھ پھل لا کر رکھ دیے ”لو بس یہی ہیں۔ سب ل بانٹ کر کھا لو۔“

یہ گیارہ بچے مل کر تو کیا کھاتے، بانٹ کر کھالیے۔ احمد علی کھڑا منہ تکتا رہ گیا۔ اس کے ہاتھ کچھ بھی نہ آیا۔ بات بھی ایسی تھی کہ شکایت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اسے کھانے پینے کا شوق ویسے بھی نہیں تھا لیکن بھوک تو سب کو لگتی ہے۔ اسے بھی لگتی تھی۔ یہاں یہ حال کہ کھانا آتا تو گیارہ کے گیارہ ٹوٹ پڑتے۔ احمد علی اپنی باری کا انتظار کرتا رہتا۔ بعد میں بھی کوئی پوچھنے والا نہیں تھا کہ تیرا پیٹ بھرا یا نہیں؟

سرکاری افسروں کی رہائش گاہیں شہر کے مضافات میں ہوتی تھیں۔ اس کے تایا کا گھر بھی شہر سے دور تھا۔ گھر کے چاروں طرف کھیت تھے۔ ایک روز وہ ان کھیتوں کی طرف نکل گیا۔ مٹی کی فصل تیار کھڑی تھی۔ اس نے ایک کچا بھٹا توڑا اور اپنی بھوک مٹانے کا سامان کر لیا۔

اب یہ اس کا معمول بن گیا تھا۔ اس کے تایا زاد بھائی اسے اپنے ساتھ کھیل میں بھی شریک نہیں کرتے تھے۔ اس لیے وہ ان کھیتوں کی طرف نکل جاتا تھا۔ تفریح بھی ہو جاتی تھی اور کچھ نہ کچھ پیٹ میں بھی پڑ جاتا تھا۔

وہ ایک قسم کے احساس کمتری کا شکار ہو گیا تھا۔ گھنٹوں اکیلا بیٹھا رہتا۔ کوشش کرتا کہ کسی سے اس کا سامنا نہ ہو۔ تانی کو بھی پروا نہیں تھی کہ وہ کیا کر رہا ہے اور کہاں ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ گیارہ کے ہجوم میں وہ اسے کہاں ڈھونڈتی۔ اس کے تایا نے اسے ضلع کے کانونٹ اسکول میں داخل کر دیا تھا۔ احساس کمتری میں ڈوبا ہوا، عدم توجہی کا شکار احمد علی اسکول سے آنے کے بعد ادھر ادھر ڈولتا رہتا۔ کوئی بھائی اس سے بات کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اس کی تانی کے پاس بھی اس کے لیے ڈانٹ ڈپٹ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس نے اپنے لیے ایک مصروفیت تلاش کر لی۔ جب فرصت ملتی سادہ کاغذ لے کر بیٹھ جاتا اور پینسل سے آڑی ترچھی لکیریں کھینچتا رہتا۔ رفتہ رفتہ اسے اتنی مشق ہو گئی کہ چہرے بنانے لگا۔ بھدے چہرے، سڈول چہرے۔

ایک دن وہ تصویر بناتا تھا کہ اس کے کسی بھائی کی نظر پڑ گئی۔ بس پھر کیا تھا، وہ بھاگا ہوا گیا اور اپنی ماں کو بتایا۔ ایک قیامت ہی تو آ گئی۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ تصویر نہ بناتا ہو، سادے صفحے پر گالیاں لکھ رہا ہو۔ وہ دوڑتی ہوئی

ایک دن وہ تصویر بناتا تھا کہ اس کے کسی بھائی کی نظر پڑ گئی۔ بس پھر کیا تھا، وہ بھاگا ہوا گیا اور اپنی ماں کو بتایا۔ ایک قیامت ہی تو آ گئی۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ تصویر نہ بناتا ہو، سادے صفحے پر گالیاں لکھ رہا ہو۔ وہ دوڑتی ہوئی

ایک دن وہ تصویر بناتا تھا کہ اس کے کسی بھائی کی نظر پڑ گئی۔ بس پھر کیا تھا، وہ بھاگا ہوا گیا اور اپنی ماں کو بتایا۔ ایک قیامت ہی تو آ گئی۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ تصویر نہ بناتا ہو، سادے صفحے پر گالیاں لکھ رہا ہو۔ وہ دوڑتی ہوئی

خراج تحسین

ان سبھی افسانوں (شعلے) میں مجھے وہ تازگی اور گفتگو اور حقیقت ملی جو بہت کم نظر آتی ہے۔ افسانے مفہوم، مذاق، واقعت، طرز بیان ہر ایک اعتبار سے قابل ستائش۔

(فشی پریم چند)

اس مجھ سے (شعلے) میں جتنے افسانے ہیں، سب اس لائق ہیں کہ انہیں ایک سے زیادہ دفعہ پڑھا جائے۔ ان افسانوں میں زندگی کی حدت و سوزش موجود ہے۔ ہر افسانے کا پلاٹ اچھوتا اور اسلوب بیان جدید و لذیذ۔ (شاہد احمد دہلوی)

احمد علی کے افسانے ہمارے اطراف، ہماری گلیوں اور ہمارے ماحول کی بھرپور تصویر پیش کرتے ہیں۔ مکانات اور کمینوں، کتوں فقیروں اور خواجے والوں کے ساتھ۔ احمد علی نے کرداروں کی ایک ایک حرکت پر مبصرانہ نظر ڈالی ہے۔ وہ اپنے کرداروں کے ہمزاد ہیں اور جو کچھ لکھتے ہیں کرداروں کو عمر جاوداں عطا کر دیتے ہیں۔ (ڈاکٹر خالد علوی)

انہوں نے کہا ترقی پسند تحریریں ہمیشہ مزدوروں اور کسانوں کی زندگی کے بارے میں ہوتی ہیں۔ میں نے اس اعلان پر شدت سے احتجاج کیا۔ میرا موقف تھا کہ زندگی کے ہر پہلو میں ترقی پسندی موجود ہے۔ (پروفیسر احمد علی بقلم خود)

اس کی ذہنی مناسبت تھی ہی نہیں۔ وہ بہت جلد ان مضامین سے اکتا گیا۔ اس کا بیشتر وقت فرس تحمیل کی پشت پر بیٹھ کر نظمیں لکھنے میں گزر جاتا۔ اسے اگر تسکین تھی تو یہ کہ وہ محسن عبداللہ اور رشید جہاں سے قریب تھا۔ ادبی نشستیں ہوتی تھیں۔ دنیا بھر کے اہم مصنفین زیر بحث آتے تھے۔

اقتصادی حالات جس تیزی سے تبدیل ہو رہے تھے اس پر بحثیں ہوتی تھیں۔ ہندوستان سے باہر کمیونزم اور سوشلزم کی جو تحریکیں چل رہی تھیں ان سے آگاہی ہوتی تھی۔ پریم چند کے افسانوں پر بات ہوتی تھی جو ان کے نظریات سے قریب تر تھے۔ ان افسانوں کی دیہاتی آب و ہوا، طبقاتی فرق، استحصالی طبقے کی نقاب کشائی یہ سب ان کے نظریات سے قریب تھا۔

کے حق میں ہوتے بھی ہیں یا نہیں یا علی گڑھ کے بجائے لکھنوکا رخ کرتے ہیں۔

”اس میں فکر کی کیا بات ہے۔ دنیا بہت چھوٹی ہو گئی ہے۔ تم کہیں بھی ہو، ریل میں بیٹھنا اور علی گڑھ آ جانا۔“

”وہ تو ہے لیکن بھی کبھی کا آنا ہی رہ جائے گا۔“

”زندگی کا جدید نظریہ یہ ہے کہ مت سوچو کل کیا ہوگا، جو ہوگا اس سے نمٹ لینا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے، تم لکھنو چلے جاؤ۔ وہاں کوئی دوسری رشید جہاں مل جائے، ادھر کا خیال بھی نہ آئے۔“

”میں آپ کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات ہمیشہ یاد رکھوں گا۔“

”یہ ہوئی نامردوں والی بات نا۔“

”میں نے شملہ کے قیام میں دو تین کہانیاں اور کچھ نظمیں لکھی ہیں۔ بتاؤ تو کسی میری یہ کاوشیں کیسی ہیں؟“

”مجھے معلوم تھا تم جیسا لڑکا شملہ جا کر شاعری کیے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔“

احمد علی نے اپنی کہانیاں اور نظمیں اسے سنائیں۔ رشید جہاں بے لاگ تبصرہ کرنے والی تھی۔ کئی لمبی رکعتی ہی نہیں تھی۔ ان کہانیوں پر بھی اس نے کڑی تنقید کی البتہ یہ ضرور کہا کہ یہ کہانیاں عصری قصصوں سے ہم آہنگ ہیں اور ان کی خوبی ہے۔ لکھتے رہے تو تکنیک اور ترتیب پر بھی قابو پالو گے، لکھنا مت چھوڑنا۔

وہ اندیشوں کی بھیڑ میں گرفتار گھر آ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ اب اس کی تعلیم کا خیال کسی کے دل میں نہیں آئے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ خاندان کے تمام لوگوں کا خیال تھا کہ میٹرک تک تعلیم کچھ نہیں ہوتی۔ احمد علی کو تعلیم جاری رکھنی چاہیے۔ کچھ دن اس پر بحث ہوتی رہی کہ مضامین کیا ہونے چاہئیں۔ احمد علی کے تایا زاد بھائی نے فیصلہ کیا کہ وہ میڈیکل کی تعلیم حاصل کرے گا۔

اس فیصلے کو سب نے قبول کر لیا۔ احمد علی نے صرف یہ شرط رکھی کہ وہ میڈیکل کی تعلیم حاصل کرے گا لیکن علی گڑھ میں رہ کر۔ اس کی اس شرط کو قبول کر لیا گیا اور اس نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ فرس، کیمسٹری، بائی اور دہلوی اس کے مضامین تھے۔

وہ خوش تھا کہ ایک مرتبہ وہ پھر علی گڑھ میں ہے۔ رشید جہاں سے ملاقاتیں رہیں گی۔

ان نے داخلہ تو لے لیا تھا لیکن سائنس کے مضامین

کا نتیجہ تھی۔ اس کا کہنا تھا، جب ہم بھوک اور اظلاس پر سب کے سامنے گفتگو کر سکتے ہیں تو جنس پر کیوں نہیں کر سکتے؟

احمد علی کو اگر ان باتوں سے اختلاف بھی تھا تو بھی ایک لڑکی کی زبانی یہ باتیں اچھی لگتی تھیں۔ وہ پابندی سے ان کے گھر جانے لگا تھا۔ اس خاندان سے قربت کا سبب یہی رشید جہاں بن رہی تھی۔ وہ اس وقت میڈیکل کی طالبہ تھی لیکن احمد علی کو اس کے ڈاکٹر ہونے سے غرض نہیں تھی۔ اسے تو وہ اس لیے اچھی لگتی تھی کہ انگریزی کے ان ناولوں پر بحث کر سکتی تھی جو احمد علی کے پسندیدہ ناول تھے۔ اس کا مطالعہ وسیع تھا اور بے جھجک باتیں کرتی تھی۔ اس کی پرورش ایک قدامت پسند ماحول میں ہوئی تھی۔ یہ آزاد ماحول اسے اچھا لگ رہا تھا۔

میٹرک کے امتحان کے بعد وہ چھٹیاں گزارنے شملہ چلا گیا۔ یہاں اس کی والدہ کے ماموں رہتے تھے۔ شملہ کے روح پرور مناظر نے اس کے بحالیاتی طرز احساس کو ایسا نکھارا کہ اس کے قلم کو جنش ہوئی۔ پرانوں کی سیر سے داییں آیا تو اس کا یہ مشاہدہ قلم کی صورت میں کاغذ پر اتر آیا۔ تو اتر سے کی آئیں ہو گئیں۔ ان مناظر کے پس منظر میں اس نے چند کہانیاں بھی لکھ لیں۔

وہ شملہ سے واپس آیا تو اچھا خاصا مالدار تھا۔ اس کی گاڑیوں میں نظمیں اور کہانیاں لکھی ہوئی تھیں۔ وہ گھر جانے سے پہلے علی گڑھ گیا۔ اسے جلدی تھی کہ وہ رشید جہاں سے ملے اور اسے اپنی تصنیفات سنائے۔ رشید جہاں کو بھی اس کی واپسی کا انتظار تھا۔ وہ پہلی مرتبہ شملہ گیا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اس سفر کے بارے میں اس کے تاثرات کیا ہیں۔ احمد علی کو دیکھتے ہی وہ کھل اُٹھی۔ کرید کرید کر شملہ کے بارے میں پوچھتی رہی۔ احمد علی کچھ کم صم سم تھا۔ وہاں کی باتیں بتا ضرور رہا تھا لیکن لگتا تھا کہیں اور کھویا ہوا ہے۔

”کیا بات ہے احمد علی، تم کچھ پریشان سے ہو؟“

”پریشان کی تو بات ہے۔“

”اس میں پریشانی کی کیا بات ہے، تم شملہ گئے تھے، خیریت سے واپس آ گئے۔“

”سوچتا ہوں، اس کے بعد کیا ہوگا؟“

”کیا مطلب؟“

”اب زندگی مجھے نہ جانے کہاں لے جائے۔ آپ لوگوں سے دور ہونے کو جی نہیں چاہتا۔“

”کون کہتا ہے دور ہو جاؤ۔“

”کیا معلوم میرے گھر والے میری تعلیم جاری رکھنے

تھا۔ ان کا گھر اتنا نہایت شانست، مہذب اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا۔ ان کا ایک بیٹا محسن عبداللہ، احمد علی کا ہم جماعت تھا۔ جس طرح اچھی روح اچھی روح کو پہچان لیتی ہے، یہ دونوں بھی ایک دوسرے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ محسن عبداللہ کچھ دن تو اس خاموش طبع لڑکے کو دیکھتا رہا جو اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ ہر وقت کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہتا تھا۔ پھر ایک روز اس نے پہل کی۔

”دوست، تم ہر وقت کیا سوچتے رہتے ہو؟“ محسن نے احمد علی سے کہا۔

”یہی کہ میٹرک کا امتحان کوئی معمولی امتحان نہیں۔ کیا خبر میں پاس ہو بھی سکوں یا نہیں؟“

”کیوں مذاق کرتے ہو۔ بات کچھ اور ہے جواب کچھ اور دے رہے ہو۔ میرے خیال میں تو تم تخلیقی قسم کے لڑکے ہو۔ یا تو شاعری کرتے ہو یا کہانیاں لکھتے ہو۔ تمہارے سوچنے رہنے کا انداز یہی ظاہر کرتا ہے۔“

”ان میں سے کوئی بات بھی درست نہیں۔ نہ میں کہانیاں لکھتا ہوں نہ شاعری کرتا ہوں۔“

احمد علی گھر میں ہونے والی حوصلہ شکنی سے اتنا ڈر گیا تھا کہ اپنی تخلیقات چھپانے کا عادی ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی اسے یہ خوف تھا کہ محسن کو پتا چل گیا تو یہ بات گھر والوں تک پہنچ جائے گی۔ وہ ہاشل میں رہ رہا تھا لیکن گھر والوں سے ڈر رہا تھا۔

محسن عبداللہ اس گفتگو کے بعد اس کے قریب آتا چلا لیا اور پھر دونوں میں گہری دوستی ہو گئی۔ یہ دوستی بہت جلد گھریلو مراسم میں ڈھل گئی۔ احمد علی، محسن عبداللہ کے ساتھ اس کے گھر جانے لگا۔ وہاں اس نے ایک خوبصورت سی لڑکی کو دیکھا جس کا نام رشید جہاں تھا۔ یہ محسن عبداللہ کی بڑی بہن تھی۔ احمد علی سے کوئی پانچ سال بڑی۔ دو چار مرتبہ کے بعد جب ذرا بے تکلفی ہوئی اور آسنے سامنے بیٹھ کر گفتگو ہونے لگی تو احمد علی پر یہ عقدہ کھلا کہ رشید جہاں شعر و ادب پر بڑی اچھی گفتگو کرتی ہے۔ سیاسی اور اقتصادی معاملات پر اس کی معلومات بے پناہ ہیں۔ بہت جلد یہ بھی معلوم ہو گیا کہ محسن عبداللہ افسانے بھی لکھتی ہیں۔

اس دور میں پردے کا رواج تھا لیکن رشید جہاں بے محابا اس کے سامنے آگئی تھی۔ گفتگو بھی ایسی کر لیتی تھی کہ جو بے تکلفی کی حدوں کو چھوٹی تھی خصوصاً جنسی معاملات پر گفتگو کرتے ہوئے نہ اس کے رخسار سرخ ہوتے تھے نہ آواز

ایک مرتبہ مشہور جاسوسی ناول نگار سر آر تھر کاٹن ڈائل کے ذرائع میں ایک اداکار مختصر سا کردار انجام دے رہا تھا۔ اس نے کاٹن ڈائل سے کہا: ”ہم زندگی بھر کے لیے آپس میں یہ معاہدہ کر لیتے ہیں کہ دونوں کو جس قدر آمدنی ہوگی، برابر تقسیم کر لیں گے۔“ کاٹن ڈائل نے اداکار کی اس تجویز کو حقارت سے ٹھکرا دیا کیونکہ اداکار اس وقت ایک ہفتہ میں صرف 3 پاؤنڈ کماتا تھا جبکہ وہ بلاشبہ اس سے بہت زیادہ کماتا تھا۔ آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ وہ اداکار چارلی چپلن تھا جس نے آگے چل کر بے پناہ شہرت کے ساتھ ساتھ بے اندازہ دولت بھی کمائی۔

مرسلہ: نعیم بروہی، جیکب آباد

داروں نے قائم کیا تھا۔ جس وقت احمد علی نے داخلہ لیا اسے یونیورسٹی کا درجن چکا تھا۔

یہاں کا ماحول علی گڑھ اور دلی سے خاصا مختلف تھا۔ یہاں نئے نظریات اور فلسفوں سے اس کا آشنا سامنا ہوا۔ کیونکہ اس نے جب شہر کے تعارف بھی اسی دور میں ہوا۔

اس نے جب شہر کے تعارف کے لیے مشرقت لگایا تو دو لائبریریوں سے خاص طور پر تعارف ہوا۔ ایک رفقاہ عام لائبریری اور دوسری ورما لائبریری۔ سب سے بڑی لائبریری ٹوڈ کا کالج کی تھی۔ اسے تو جیسے کئی خزانے ایک ساتھ مل گئے۔ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ان کتابوں کے پیچھے پڑ گیا۔ اس نے تالستانی، اناطول، بالزاک وغیرہ کے تمام ناول پڑھ ڈالے۔ برنڈرسل کی ”روٹس نو فریڈم“ پڑھی تو کئی نئے دروازے کھل گئے۔ کیونکہ سوشلزم، انارکزم وغیرہ کے بارے میں اس کی قدر و قیمت ہوئی۔ بہت سوالات اٹھے جن کا سہارا لے کر اس نے حیات و کائنات کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ فلسفہ اس کا مضمون نہیں تھا لیکن وہ لائبریریوں کی مہربانی سے ارسطو، سقراط اور ڈیکارٹ وغیرہ کے فلسفے سے بے نیاز نہ رہ سکا۔ ولیم جیمز کی کتب نفسیات کا خوب خوب مطالعہ کیا۔

یہ کتابیں اس کی بہترین استاد ثابت ہو رہی تھیں لیکن کالج میں کچھ ایسے اساتذہ بھی تھے جنہوں نے اس کی ذہنی آبیاری کی، ان میں ایک لارنس برنڈر تھے۔ استاد اور شاگرد کا یہ تعلق بہت جلد پائیدار دوستی میں ڈھل گیا۔

لکھنؤ یونیورسٹی میں قیام کے زمانے میں ہی احمد علی کی ملاقات سر رزیر حسن کے بیٹے سجاد ظہیر سے ہوئی۔ (جن کا شمار

”یار، اس سے اچھی تو کوئی بات ہی نہیں لیکن گھر والے مخالفت کریں گے۔ خاص طور پر میرا تایا زاد بھائی جس کے اصرار پر میں نے سائنس میں داخلہ لیا تھا۔“

”تم اپنی زندگی کے مالک ہو۔ جس میں تمہاری بہتری ہو وہ کرو۔ اگر تمہارے گھر والے تمہیں نکال دیں تو میرا گھر حاضر ہے۔ جب تک چاہو یہاں رہ جانا۔“

”یہ نوبت نہیں آئے گی، میں سنبھال لوں گا۔“

احمد علی کی عمر اس وقت سترہ اٹھارہ سال تھی۔ اور یہ بہت بڑا فیصلہ تھا لیکن حسن عبداللہ کی بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔

رشید جہاں کو معلوم ہوا تو اس نے بھی یہی مشورہ دیا کہ وہ انگریزی ادب میں ایم اے کرے۔

احمد علی نے جب پختہ ارادہ کر لیا اور فیصلے پر پہنچ گیا تو یہ بھی فیصلہ کر لیا کہ ابھی وہ گھر والوں کو کچھ نہیں بتائے گا۔ کہیں اسے مجبور ہی نہ کر دیا جائے۔ وہ خاموشی سے حسن عبداللہ کی ہمرانی میں لکھنؤ گیا اور کیننگ کالج جو اب یونیورسٹی بن چکا تھا، میں داخلہ لے لیا۔

جب ہوٹل میں رہنے وغیرہ کے مراحل طے ہو گئے تو وہ گھر گیا ”میں اب لکھنؤ میں رہ کر تعلیم حاصل کروں گا۔“

اس اعلان کا نشر ہونا تھا کہ جیسے قیامت آ گئی۔ ماں بے چاری کو تو کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔ خاندان کے بزرگوں نے طوفان کھڑا کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ لکھنؤ انھوں کا مرکز ہے اور یہ لڑکا وہاں کے ماحول میں رہنے سے ”آوارہ گرد اور لوفر“ بن جائے گا۔

”ہم نے بہت سے لوہڑے دیکھے ہیں جو لکھنؤ پڑھنے گئے تھے اور کھنٹوں پر وقت گزار کر واپس آ گئے۔“

”لکھنؤ کا آزاد ماحول اسے اس کے ذہرے پر رہنے دے گا؟“

”ہاتھ دھو لو لہڑے سے۔“

طرح طرح کی باتیں کی جا رہی تھیں مگر اس پر حسن عبداللہ کا اٹھ ایسا چڑھا تھا کہ کچھ سننے کو تیار نہیں تھا۔ سب کی زبانوں پر سرسید اور ان کے مسلم ادارے کا نام تھا۔ احمد علی آزاد ہوا تھا کہ وہ انگریزی پڑھے گا اور لکھنؤ میں پڑھے گا۔ کئی روز کی چیخ و پکار کے بعد اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ وہ لکھنؤ آ گیا اور اس عزم کے ساتھ آیا کہ اس کے بزرگوں نے ان ان اندیشوں کا اظہار کیا ہے، وہ ایک ایک کر کے سب کو لگا دے گا۔

کیننگ کالج لارڈ کیننگ کے نام پر اودھ کے تعلقہ

اس نے اس نظم کو کئی مرتبہ پڑھا اور خوب اچھی طرح مطمئن ہونے کے بعد پروفیسر ڈکنسن کی خدمت میں پہنچ گیا۔ انہیں بھی یہ نظم پسند آئی۔ انہی کے توسط سے یہ نظم علی گڑھ میگزین میں شائع ہو گئی۔

یہ اس کی پہلی نظم تھی جو کہیں شائع ہوئی تھی۔ اپنی نظم کو کاغذ پر دیکھ کر خوشی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ حسن عبداللہ کے گھر گیا تو میگزین اس کی بغل میں دبا ہوا تھا۔ اس نے بڑے فخر سے یہ رسالہ رشید جہاں کے سامنے رکھ دیا۔

”میں نے کہا تھا کہ آسمان ادب پر تم ستارہ بن کر چمکو گے۔“

”ایک نظم سے کیا ہوتا ہے؟“

”علی گڑھ میگزین میں ہر ایک کو موقع نہیں ملتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم میں صلاحیت ہے۔ بس مصیبت یہ ہے کہ تم انگریزی میں شاعری کرتے ہو ورنہ اردو میں تو چھینے کے ہزار مواقع ہیں۔ ابھی اردو کو بھی منہ لگایا کرو۔ کہانیاں لکھتے ہو وہ بھی انگریزی میں۔“

اس وقت تو یہ بحث ہنسی میں گم ہو گئی لیکن اس کا دوست حسن عبداللہ کچھ اور سوچ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا احمد علی سائنس کے مضامین لے کر پھنس گیا ہے۔ اسے تو انگریزی ادب پڑھنا چاہیے۔ وہ اسے لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

”یار تم کو کس حکیم نے مشورہ دیا تھا کہ سائنس پڑھو۔“

”یہ حکیم میرا تایا زاد بھائی تھا۔“

”تم اگر اس شعبے میں رہے تو اپنے سال برباد کرو گے اور کچھ نہیں۔“

”اب کیا ہو سکتا ہے۔ انہی دیواروں سے سر ٹکراتا ہے۔“

”تمہاری انگریزی بہت اچھی ہے۔ تمہیں ادب سے دلچسپی بھی ہے۔ اب تو تمہاری انگریزی دانی کو باقاعدہ تسلیم کر لیا گیا ہے۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ انگریزی ادبیات میں ایم اے کرو۔ بہت آسانی سے کر لو گے۔ اتنے کالج ہیں، کہیں نہ کہیں پروفیسر شپ مل جائے گی۔“

”دل تو میرا بھی یہی چاہتا ہے۔“

”بس تو پھر ہمت پکڑ لو۔ میں خود کیننگ کالج لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ لے رہا ہوں۔ تم بھی وہیں داخلہ لے لو۔ دونوں دوست ایک ہی جگہ ہوں گے۔“

اسی ماحول میں دلچسپی کی ایک صورت اور نکل آئی۔ شعبہ انگریزی کے صدر پروفیسر ایرک سی ڈکنسن نے فیصلہ کیا کہ وہ ہر ماہ سائنس کے طلبہ کو بھی دو کلاسیں پڑھائیں گے۔ وہ عمدہ شخصیت کے مالک، آکسفورڈ کے گریجویٹ، شاعر، مصور، موسیقار اور جمالیاتی ذوق رکھنے والے انسان تھے۔ وہ ہر ماہ کلاسیں میں آنے لگے تو ان کی قربت سے احمد علی کی تخلیقی توانائیاں ابھرنے لگیں۔ ان کی شخصیت سے وہ ایسا متاثر ہوا کہ کلاس سے باہر بھی ان سے ملاقاتیں کرنے لگا۔ جلد ہی یہ تعلق دوستی میں بدل گیا۔ وہ انہیں اپنی نظمیں سناتا اور داؤ پاتا۔ ان کے مشوروں پر عمل کرتا اور کھنٹوں پیٹھ کر اپنی نظموں کی نوک پلک درست کرتا رہتا۔ انگریزی سے ایسا شغف تھا کہ اب اس کا بیشتر وقت شعبہ انگریزی میں گزرنے لگا۔ ڈکنسن نے بھی اس کی تخلیقی صلاحیتوں کو دیکھ کر اس بہرے کو تراشنے کا فیصلہ کر لیا۔ اب احمد علی پر ان کی بھرپور توجہ تھی۔ وہ بھی اپنے پروفیسر سے بہت کچھ سیکھ رہا تھا۔ ان کی دی ہوئی کتابیں پڑھ رہا تھا۔ رشید جہاں اس کی ان تبدیلیوں کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی اور خوش ہو رہی تھی کہ وہ کتنی تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ اسے یقین تھا کہ وہ بہت جلد آسمان ادب پر ستارے کی طرح چمکے گا۔

ڈکنسن کچھ دنوں کے لیے حیدر آباد آ گئے ہوئے تھے۔ واپس آئے تو ایک نوجوان راجا راجو ان کے ہمراہ تھے۔ یہ لڑکا فرانس جانے والا تھا۔ فرانس روانگی سے قبل ڈکنسن سے پڑھنے کے لیے علی گڑھ آیا تھا۔ احمد علی سے اس کی دوستی ہو جانا یقینی تھا۔ احمد علی جب بھی ڈکنسن کے پاس جاتا راجا راجو سے بھی اس کی ملاقات ہوتی۔ ڈکنسن تو مصروف آدمی تھے لیکن راجا راجو کے ساتھ وہ گھنٹوں گزارتا۔ راجا راجو کی اس قربت سے وہ فریج ادب سے واقف ہوا۔ وہاں پیدا ہونے والی ادبی تحریکوں سے آشنائی ہوئی۔

پروفیسر ڈکنسن نے اس سے تقاضا کیا کہ وہ علی گڑھ میگزین کے لیے کوئی نظم لکھے۔ میگزین میں اشاعت اس وقت بڑا کارنامہ سمجھا جاتا تھا۔ اس نے اپنی نظمیں ایک ایک کر کے پڑھ ڈالیں کوئی بھی اس قابل نظر نہیں آئی جسے اشاعت کے لیے دیا جاسکے۔ رشید جہاں نے بھی کئی نظموں کی طرف توجہ دلائی لیکن وہ مطمئن نہیں ہوا۔ وہ نئی نظم لکھنے کے لیے بیٹھ گیا۔ کئی راتوں کی سپاہی کاغذ کی سپیدی میں کھل مل گئی تو ایک نظم وجود میں آئی۔

”The Lake of Dreams“

ایک افسانے سے اقتباس

وہ آنکھیں بڑی بڑی، ایک کنول کے پھول کی طرح کھلی ہوتی تھیں۔ ان میں پیارا اور محبت اور نرم بھرا ہوا تھا۔ جب وہ کسی کی طرف دیکھتی تھیں تو اپنی نظر کے ساتھ جان بھی اس میں ڈال دیتی تھیں جیسے برسات کی پہلی بارش خشک اور پیاسی زمین کو تازہ زندگی بخش دیتی ہے۔ ان میں ایک مست ناگ کی خوبصورتی تھی۔ ان کی سفیدی میں شہد کی شیرینی۔ ان کے ہلکے ہلکے شریقی ڈوروں میں شراب کا نشہ۔ دو کرے جن میں سارے عالم کا حسن کوٹ کوٹ کر بھر دیا گیا ہے۔ گویا ایک نرمس کا پھول پانی میں کھلا ہوا تیر رہا ہے۔

(آنکھیں)

ایک رات اور "بادل نہیں آئے" شامل تھے۔ دیگر افسانوں کی وجہ سے وہ بھی بدنام ہوا اور نہ حقیقت یہ تھی کہ فنی اعتبار سے مکمل افسانے اسی کے تھے۔ موضوعات میں بھی کوئی ایسی قابل گرفت بات نہیں تھی۔ ہاں جنس کا ذکر ضرور تھا جو اس زمانے میں بالکل نئی بات تھی۔ کسی حد تک قابل گرفت وہ روایت تھا جو انہوں نے مذہب کے لیے اپنایا۔ "مہاؤوں کی رات" میں انہوں نے متعدد تصویروں کی مدد سے ہندوستانی سماج کی ایک بے کس اور لاچار عورت کی کہانی بیان کی تھی جو سردی اور برسات سے زیادہ غربت کے اس عفریت کا سامنا کر رہی تھی جو تیسری دنیا کے بے شمار افراد کی روزمرہ زندگی کا حصہ ہے۔

مذکورہ افسانے میں متعدد تصویریں ایک دوسرے سے گھل مل کر قارئین کے ذہن پر نقش مرتب کرتی ہیں۔ خیالات کا یہ سلسلہ بظاہر بے ربط نظر آتا ہے مگر احمد علی نے اسے انسانی جبلت کی کہانی بنا کر اسے تین واضح حصوں میں تقسیم کر دیا۔ حصہ اول میں غربت، دوسرے حصے میں تحفظ جبکہ تیسرے حصے میں جنس کی ضرورت و اہمیت کو موضوع بنایا گیا ہے۔

مختلف تمثیلوں کی مدد سے اس عورت کی زندگی کے تشیب و فراز کو واضح کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ بھوک، عدم تحفظ اور جنسی فرسٹریشن عالم گیر مسائل ہیں اور ہندوستانی سماج میں ان کے باعث انسانی صورت حال جس بیچیدگی کا شکار ہے اس کا بروقت تدارک نہیں کیا گیا تو سماج کا شیرازہ بکھر جائے گا۔

برابر کوشش کر رہا ہوں اور مجھے اس میں کامیابی کی بھی امید ہے کہ اس کتاب کی اشاعت فوراً بند کر دی جائے۔" یہ جنگ اخباروں سے نکل کر مسجدوں تک پہنچ گئی۔ ممبروں سے تقریریں کی جانے لگیں۔ اس کتاب کے مصنفین کو ہتھیاریاں ملنے لگیں۔ یہ تک کہا جانے لگا کہ گلیوں میں لوگ حجرے لے کر گھوم رہے ہیں۔ آل انڈیا شیعہ کانفرنس منعقد ہوئی جس میں قرارداد مذمت منظور ہوئی۔

اس کتاب اور اس میں شامل افسانوں کے حق میں بھی تبصرے شائع ہوئے۔ مولوی عبدالحق کی ادارت میں شائع ہونے والے جریدہ "اردو" میں نقاد کے قلمی نام سے اختر حسین رائے پوری کا طویل تبصرہ، زمانہ کانپور میں منشی دیانرائن گم کا مختصر تبصرہ اور "جامعہ" دہلی میں "م" کے قلمی نام سے پروفیسر مجیب الرحمن کا تین صفحات پر مشتمل تبصرہ شائع ہوا مگر یہ مجتہد آوازیں مخالف قوتوں کے طوفان میں دب کر رہ گئیں اور... بلاخر محبوبہ متحده (یو پی) کی حکومت سے اس کتاب کو ضبط کروا دیا گیا۔

اس کی جھپٹی کے بعد محمود الظفر نے "انکارے" کے دفاں میں بہ زبان انگریزی ایک مضمون لکھا جس میں انہوں نے سجاد ظہیر، احمد علی، رشید جہاں اور اپنی کہانیوں کے محرکات اور پس منظر بتاتے ہوئے مدلل انداز میں ان کی حمایت کی۔ انکارے پر علامہ کی مٹی پابندی پر انہیں افسوس کرتے ہوئے تمام ہم مذاق اہل قلم سے اپیل کی کہ "انکارے" کے انجام سے دل برداشتہ نہ ہوں اور مستقبل میں ایسے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے ترقی پسند ادیبوں کی انجمن کی تشکیل کی نوید سنائی۔ اس کے ساتھ ساتھ دلچسپی رکھنے والے تمام ادیبوں کو احمد علی سے رابطہ کرنے کا مشورہ دیا۔

انکارے کے مصنفین نے ان افسانوں کے ذریعے ایک ہنگامہ پرور تحریک کی بنیاد رکھ دی۔ بعد میں یہی خیالات کسی قدر احسانے کے ساتھ بذریعہ سجاد ظہیر ہندوستان اسٹاکس ہوئے اور ایک عرصے تک اردو ادب اس کے بحر میں گرفتار رہا بلکہ بازگشت اب تک سنائی دیتی ہے۔ یہ الگ بات کہ ادیب دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔

اس ہنگامے کے دوران سجاد ظہیر منظر نامے سے غائب رہے۔ ہنگامہ شروع ہوتے ہی ان کے والدین نے انہیں لندن بھجوا دیا۔ احمد علی اور محمود الظفر اس کا مقابلہ کرتے رہے۔

"انکارے" میں احمد علی کے دو افسانے "مہاؤوں کی

مضامین کا کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کوئی اخبار ایسا نہیں تھا جس نے اس کتاب کو مذہب اور شریعت کے خلاف قرار دے کر اس کی جھپٹی کا مطالبہ نہ کیا ہو۔ عبدالمجید دریا بادی کا ہفت روزہ "سچ" جو لکھنؤی سے نکلتا تھا اپنی قلمی معرکہ آرائیوں کے لیے مشہور تھا، سب سے آگے تھا۔

ہفت روزہ "سچ" میں ابھی عظیم بیگ چغتائی کی کتابوں کے خلاف مضامین کا زور پوری طرح ٹوٹا نہیں تھا کہ لکھنؤ کے ایک ناشر نے "انکارے" شائع کر دی۔ ماجد نے ایک کے بعد، دوسری "کانفرہ" لگاتے ہوئے اس کتاب کو بھی آڑے ہاتھوں لیا۔ "ایک شرم ناک کتاب" کے عنوان سے ایک شہرہ لکھا جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ یہ کتاب نفس مذہب پر حملوں کے علاوہ فحاشی، اتہال اور زبان و بیان کی فحاش غلطیوں کے اعتبار سے بھی ایک شاہکار ہے۔

شیعہ مذہب پر حملوں کو دیکھ کر سب سے پہلے لکھنؤی کے ایک شیعہ اخبار سرفراز نے پر زور احتجاج کیا اور مقام مسرت ہے کہ صاحب "طبع" نے فوراً اپنی غفلت و غلطی کا اعتراف کر لیا لیکن زوہر مصنف جو پبلشر بھی ہیں (سجاد ظہیر) شاید ہندوستان سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ (سجاد ظہیر لندن میں تھے) لکھنؤ میں کتاب کے خلاف اچھی خاصی برہمی پھیل چکی ہے اور عجیب نہیں کہ ان سطور کے شائع ہونے تک مظاہرے بھی شروع ہو جائیں۔

"صدیق پک ڈپو اور حضرت مسیح اسال پر اس کتاب کی فروخت اعلانیہ ہو رہی ہے۔ سجاد ظہیر صاحب ولایت چلے گئے ہیں۔ ان کی عدم موجودگی میں نہ ان سے کوئی شکایت ہو سکتی ہے اور نہ ان کے خلاف کوئی قانونی کارروائی سوائے اس کتاب کی جھپٹی کے کوئی چارہ نہیں۔"

(مراسلہ بنام مدیر "سچ" از مدیر "سرفراز" اخبار) ماجد نے انکارے کے خلاف نہ صرف "سچ" میں بلکہ "حقیقت" میں بھی تواتر سے لکھا۔ اس گرما گرمی کو دیکھ کر سجاد ظہیر کے بھائی سید علی ظہیر نے عبدالمجید دریا بادی کے نام ایک خط لکھا جسے معذرت نامہ کہنا چاہیے۔

"میں خود نہایت پریشان اور متحیر ہوں کہ جو صورت واقعہ پیش آئی ہے اس میں کیا کروں۔ آج کل کی ولایت کی تعلیم اور آزادی کے خیالات جو اثر نوجوانوں پر پیدا کر رہے ہیں ان کو روکنا اور بدلنا نہایت اہم کام ہے۔ میان سجاد ظہیر نے بلا میرے یا کسی اور خاندان کے ممبر کے مشورہ کیے ہوئے یہ کتاب چھپو اگر شائع کر دی۔ میں اس وقت سے

آگے جا کر انجمن ترقی پسند مصنفین کے بائیں میں ہوں) احمد علی اور سجاد ظہیر ذہنی ہم آہنگی کے باعث بہت جلد ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ انقلاب اور بہتر دنیا کے خواب کے علاوہ ادب، آرٹ اور اچھے کپڑے پہننے کا شوق دونوں میں مشترک تھا۔ دونوں روسی مصنفوں کے شائق تھے۔ احمد علی اس سے یوں بھی متاثر تھے کہ وہ ایک بہت بڑے باپ کا بیٹا ہونے کے باوجود کسانوں اور مزدوروں کے حق میں تھا اور ایک ایسی دنیا بسانا چاہتا تھا جس میں استحالی طبقے کی منجائش نہ ہو۔

اس ذہنی ہم آہنگی کا نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں نے ملے کیا کہ افسانوں کا ایک ایسا مجموعہ شائع کیا جائے جس میں دونوں کے افسانے ایک ساتھ شائع ہوں۔ احمد علی کے پاس دو قابل ذکر افسانے تھے جبکہ سجاد ظہیر کے پاس پانچ افسانے۔ سجاد ظہیر کا خیال تھا کہ افسانوں کی یہ تعداد کم ہے۔ اگر کچھ اور لوگوں کے افسانے بھی شامل کر لیے جائیں تو بات بن سکتی ہے۔ افسانہ نگار تو بہت سے تھے لیکن انہیں انقلابی افسانوں کی ضرورت تھی۔ ایسے افسانے جن میں مذہب اور جنس کو موضوع بنایا گیا ہو۔ تنقید کے اعتبار سے بھی یہ مختلف ہوں۔ سجاد ظہیر نے اپنے دوست محمود الظفر کا نام پیش کیا۔ ان کی ایک انگریزی کہانی سجاد ظہیر کے ہاتھ لگی جس کا سجاد ظہیر نے ترجمہ کر دیا۔ احمد علی بھی کیوں پیچھے رہتا۔ اس نے اپنی دوست رشید جہاں کا نام پیش کیا۔

رشید جہاں اس وقت ایک اسپتال میں گانا کا لوجسٹ کی حیثیت سے کام کر رہی تھیں اور احمد علی اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی میں تدریسی فرائض انجام دینے لگے تھے۔ ایک نوجوان استاد جس کی عمر صرف بائیس سال کی تھی۔ رشید جہاں نے اپنی دو تخلیقات پیش کیں۔ ایک افسانہ "ولی کی سیر" اور ایک ایکٹ کا ڈراما "پردے کے پیچھے"۔ ان تمام افسانوں کو شامل کر کے جو کل نو افسانے تھے اور ایک ڈراما "انکارے" کے نام سے شائع کر دیا گیا۔

ان نوجوانوں کا خیال یہ تھا کہ یہ مجموعہ افسانوی دنیا میں دھوم مچا دے گا اور افسانہ نگاروں کے لیے ایک نئی راہ متعین کرنے کا سبب بنے گا۔ ان تمام لکھنے والوں کو اپنے علی مرتے کا بھی زعم تھا اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا بھی احساس تھا۔ ان کے یہ خیالات اپنی جگہ لیکن نتیجہ اس کے برعکس سامنے آیا۔ ملک کے طول و عرض میں ہنگامہ بپا ہو گیا۔ اخبارات میں اس مجموعے کے خلاف لکھے جانے والے

ناول (انگریزی)

- i) Twilight in Delhi
- ii) Ocean of Night
- iii) Rats and Diplomats

شاعری (انگریزی)

- i) Purple Gold Mountain
- ii) Remembrance of things Past
- iii) First Voices

ڈراما

- i) Break the Chains
- ii) The land of Twilight

ایک عظیم ترجمہ

ALQURAN- A Contemporary Translation

تنقیدی کتب (انگریزی)

- 1- Mr Eliot
- 2- The Problem of Style and Technique in Ghalib
- 3- Ghalib Two Essays
- 4- The Golden Tradition

رشید جہاں کی بے وفائی نے اس کی حساس طبیعت پر یہ اثر ڈالا کہ وہ آگرہ کالج کی نوکری چھوڑ کر دی آگیا۔ مایوسی کی بجائیں ہر طرف چل رہی تھیں۔ اس نے اپنے ذہن کی کھڑکیاں بند کیں اور اپنے خول میں سمٹ گیا۔ ادبی حلقوں میں جانا چھوڑ دیا۔ ایک گوشہ نشین تھی جو اس نے اختیار کر رکھی تھی۔ وہ کبھی بھی اپنی حالت پر غور کرتا تو اسے خود پر غصہ آنے لگتا۔ یہ کسی قنوطیت ہے جو میں نے خود پر طاری کر لی ہے۔ میں تو آزادی کا علم بردار تھا، پھر کیوں قید ہو کر رہ گیا ہوں؟ اہل ادب کو مجھ سے کیا امیدیں تھیں اور میں کسی کام کا نہیں رہا۔ مجھے حقائق سے سمجھنا کرنا چاہیے۔ اس نے رشید جہاں کی یاد کو اپنے سینے میں اتارا۔ اپنے پُر پھڑھڑانے اور پرداز کے لیے تیار ہو گیا۔

اب وہ الہ آباد یونیورسٹی میں تھا اور افسانے لکھ رہا تھا تاکہ ایک اور افسانوی مجموعہ اپنے پڑھنے والوں کو دے سکے۔ رشید جہاں کی یاد اس کی تخلیقی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کر رہی تھی۔ یہ یادیں مختلف رنگوں اور زاویوں سے اس کی کہانیوں میں نمایاں ہوتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔

”پھر یہ نیک کام آپ کب فرما رہے ہیں؟“
”آگرہ کالج کی طرف سے ملازمت کی پیش کش ہوئی ہے۔ کالج جو ان کرلوں، پھر گھروالوں سے بات کروں گا۔“
”بہت آزاد خیال بننے ہو اور شادی کے لیے گھروالوں سے بات کرو گے؟“

”آزاد خیالی کا مطلب یہ نہیں کہ ہم رشتے اور ان کی اہمیت ہی بھول جائیں۔“

”کبھی زنجیریں تو آگے بڑھنے سے روکتی ہیں۔“
”کوئی درخت اپنی جڑوں کے بغیر پنپ سکتا ہے؟“
”پھر یہ کیوں کہتے ہو کہ اقدار سے بغاوت کے بغیر انقلاب نہیں آ سکتا۔“

”اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر روایت جڑی ہے۔ شادی بھی تو ہماری روایت کا ایک حصہ ہی ہے، اسے بھی مت مانو، کیوں مانتی ہو؟“

”میں تو شادی کے بغیر بھی رہ سکتی ہوں، تم اپنی کہو۔“
”وہ باتیں مت کرو جو فطرت انسانی سے بعید ہوں۔“

”اے لو، ہم تو ابھی سے لڑنے لگے۔ تم تو کہہ رہے تھے ہمارے درمیان جھگڑا نہیں ہوگا۔ مسٹر احمد علی، یہ ذہنی ہم آہنگی وغیرہ سب ڈھونگ ہے۔ ہر شخص کی اپنی رائے اور اپنے معیارات ہوتے ہیں۔“
”کیا تم محبت کی بھی قائل نہیں؟“

”کیوں نہیں۔ جس سے ہو جائے اور جس وقت ہو جائے۔“

”کبھی سمجھ لو کہ مجھے تم سے محبت ہے۔“
”میں تمہارے اس جذبے کی قدر کروں گی۔“

”میں آگرہ جا رہا ہوں، بہت جلد دوبارہ ملنے کے لیے۔“

وہ انگریزی کا استاد مقرر ہو کر آگرہ چلا گیا۔ رشید جہاں سے خط و کتابت ہوتی رہتی تھی۔ اسے یہ تو معلوم ہوتا رہا تھا کہ رشید جہاں اور محمود الظفر ایک ساتھ دیکھے جا رہے ہیں۔ ان کے درمیان قربت بڑھتی جا رہی ہے لیکن وہ اسے ادبی دوستی سے زیادہ اہمیت نہیں دے رہا تھا لیکن اسے یہ گمان نہیں تھا کہ رشید جہاں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ رشید جہاں نے اہل ادب کو مجھ سے کیا امیدیں تھیں اور میں کسی کام کا نہیں رہا۔ مجھے حقائق سے سمجھنا کرنا چاہیے۔ اس نے رشید جہاں کی یاد کو اپنے سینے میں اتارا۔ اپنے پُر پھڑھڑانے اور پرداز کے لیے تیار ہو گیا۔

جائے تو احمد علی اس وقت سے رشید جہاں سے ملتا چلا آ رہا تھا جب میٹرک کا طالب علم تھا اور محسن عبداللہ کے ساتھ اس کے گھر گیا تھا اور رشید جہاں کو وہاں دیکھا تھا۔ اس وقت اتنا کم عمر تھا کہ اس کی پسند کو اس کی محبت نہیں کہا جاسکتا تھا۔ رشید جہاں اس سے بڑی بھی تھی لہذا اظہار کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا یا ہمت نہیں ہو سکتی تھی۔

یہ پسند وقت کے ساتھ ساتھ چنگاری سے شعلے میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔ اب وہ برسرِ روزگار تھا۔ ادبی حلقوں میں جانا پھیلنا جاتا تھا۔ رشید جہاں بھی ڈاکٹر بن چکی تھی۔ ادبی حلقے اس سے بھی ناواقف نہیں تھے بلکہ ترقی پسند خیالات کی حامل خواتین کی تو وہ آئینہ میل تھی۔ جہاں عورتیں سات پردوں میں رہتی ہوں اس کا مردوں سے بے محابا میل جول انوکھا بھی تھا اور دلچسپ بھی۔ اسے ناپسند کرنے والے بھی دل ہی دل میں پسند کرتے تھے۔ احمد علی تو اسے کئی برس پہلے سے پسند کرتا چلا آ رہا تھا۔ اب وقت آ گیا تھا کہ وہ اس کا اظہار بھی کرے۔

وہ اپنے ایک دوست کے گھر آیا ہوا تھا۔ رشید جہاں بھی وہاں آئی ہوئی تھی۔ احمد علی نے کسی تمہید کے بغیر اس کے سامنے شادی کی پیش کش رکھ دی۔

”رشید جہاں، ہم دونوں عام ذہنی سطح کے لوگ نہیں ہیں کہ پہلے چھپ چھپ کر ملنے رہیں، پھر کہیں مجھے تم سے محبت ہے، پھر آہیں بھرتے رہیں، وغیرہ وغیرہ۔ میں تو صرف اتنا کہوں گا کہ مجھے تم اچھی لگتی ہو اور چاہتا ہوں کہ ہم دونوں ایک ساتھ زندگی گزاریں۔ کیا تم میری حوصلہ افزائی کرو گی؟“

”اچھا جی، تو آپ اس لیے ہمارے گھر آتے تھے؟“
”جی ہاں، اسی لیے آتا تھا۔“

”دیکھو احمد علی! رشید جہاں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا ”میں عمر میں تم سے بڑی ہوں۔ مجھے یاد ہے، جب تم پہلی مرتبہ ہمارے گھر آئے تھے تو تم نے مجھے رشید آپا کہہ کر مخاطب کرنا چاہا تھا۔ وہ تو میں نے ہی تمہیں نوک دیا تھا کہ میں ایسے مصنوعی رشتوں کی قائل نہیں۔ عمروں کا یہ فرق تمہیں کسی وقت سمجھتا دے میں جتنا کر سکتا ہے۔ اس پر سوچا ہے تم نے؟“

”جہاں ذہنی ہم آہنگی ہو وہاں یہ فرق کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ ہمارے درمیان بھی کوئی جھگڑا نہیں ہوگا۔ اس شادی کا یہی ایک مثبت پہلو ہوگا۔“

اس افسانے میں دوسرا قابلِ اعتراض موقع وہ آتا ہے جب اس افسانے کی ہیروئن مریم مایوسی کی انتہا کو پہنچ کر خدا کو ”بے انصاف“ اور ”دھوکا“ قرار دیتی ہے۔ یہ ایک ردِ عمل تھا جس پر گرفت ہوئی۔

”ناول نہیں آئے“ یہ احمد علی کا دوسرا افسانہ تھا۔ اس کی کہانی بھی ایک عورت کی ذہنی بغاوت کے گرد گھومتی تھی۔ اس کی شادی اس کی مرضی کے خلاف ایک دین دار مولوی سے کر دی جاتی ہے۔ گھر سے باہر لوگ اسے مٹی اور پرہیزگار سمجھتے ہیں۔ دعائیں اور تعویذ لے کر جاتے ہیں مگر گھر کے اندر اس کا رویہ بے حد جارحانہ ہوتا ہے۔

اس افسانے میں احمد علی نے مذہب اور مولویوں پر خوب خوب طنز کیے تھے۔ اردو شاعری میں تو شیخ وزاہد پر طنز کیے جاتے رہے تھے لیکن اردو نثر کا دامن صاف تھا، احمد علی اور ”انگارے“ کے دوسرے مصنفین خصوصاً سجاد ظہیر نے تشکیک اور الحاد کے بہت سے بیج بو دیے۔ عربی اور بے باکی کے کئی پہلو سامنے آئے۔ البتہ افسانے کی تکنیک اور مواد کی پیش کش کے حوالے سے جو تجربے کیے وہ خاص طور پر قابلِ قدر تھے۔

”احمد علی نے آزاد خیالی کو سرریلوں کے ذریعے پیش کیا اپنی خیال اپنی اصل شکل جبکہ وہ کسی عقلی یا جمالیاتی یا اخلاقی پاسداری یا رکاوٹ کے بغیر انسانی دماغ میں اپنا سلسلہ جاری رکھتا ہے چنانچہ سرریلوں کی اس تحریک سے جو مغرب میں 1919ء میں شروع ہوئی تھی، اردو افسانے کے آغاز ہی میں احمد علی نے روشناس کرادیا۔“ (ممتاز شیریں)

پریم چند نے مثالیت پسندی سے حقیقت نگاری تک کے سفر میں اردو افسانہ کو درجہ کمال تک پہنچا دیا۔

ان کے نوجوان معاصرین میں احمد علی اس حوالے سے قابلِ ذکر تھے کہ انہوں نے نہ صرف اپنے پیش رو افسانہ نگاروں سے استفادہ کیا بلکہ مغربی ادب کے وسیع مطالعہ، تحقیقی امکانات اور تجربوں سے آگہی کے باعث اپنے چند افسانوں میں تلازم خیال، شعور کی رو اور اندرونی خود کلامی جیسے تجربے دہرانے کی ہمت کی۔

☆☆☆

انگارے کی اشاعت اور اس کی بدولت اُٹھنے والے ہنگاموں کے دوران رشید جہاں سے ملاقاتوں کا سلسلہ بہت بڑھ گیا تھا بلکہ اس میں علی گڑھ کی ملاقاتوں کو بھی شمار کر لیا

سجاد ظہیر ابھی تک لندن میں تھے۔ انہوں نے مارکسی خیال کے ہندوستانی طلبہ کا ایک چھوٹا سا حلقہ اپنے گرد جمع کر لیا تھا۔ انہی طلبہ کی کاوشوں سے انجمن ترقی پسند مصنفین کا پہلا حلقہ قائم ہوا۔ لندن کے ٹانگ ریسٹوران میں اس کا منشور تیار ہوا۔ ڈاکٹر جیون گھوش، ڈاکٹر ملک راج آنند، برہم سین گپتا اور سجاد ظہیر وغیرہ نے مل کر اس منشور کے نکات طے کیے اور اسے اشاعت کے لیے ہندوستان بھیج دیا۔

”اس وقت ہندوستان میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ پرانے تہذیبی ڈھانچوں کی شکست و ریخت کے بعد سے اب تک ہمارا ادب ایک گونہ فراریت کا شکار رہا ہے۔ ہندوستانی ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ہندوستانی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا بھرپور اظہار کریں اور ادب میں سائنسی عقلیت پسندی کو فروغ دیتے ہوئے ترقی پسندوں کی حمایت کریں۔ ان کا فرض ہے کہ اس قسم کے انداز تنقید کو فروغ دیں جس سے خاندان، مذہب، جنس، جنگ اور سماج کے بارے میں رجعت پسندی اور باطنی پرستی کے خیالات کی روک تھام کی جاسکے۔ ان کا فرض ہے کہ وہ ایسے ادبی رجحانات کو شوونما یا نئے سے روکیں جو فرقہ پرستی، نسلی تعصب اور انسانی استحصال کی حمایت کرتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے مسائل کو اپنا موضوع بنائے۔ یہ بھوک، پیاس، سماجی ہستی اور غلامی کے مسائل ہیں۔ ہم ان تمام آثار کی مخالفت کریں گے جو ہمیں لا چاری، سستی اور توہم پرستی کی طرف لے جاتے ہیں۔ ہم ان تمام باتوں کو جو ہماری قوت تنقید کو ابھارتی ہیں اور رسوں اور اداروں کو عقل کی کسوٹی پر کھتی ہیں تغیر اور ترقی کا ذریعہ سمجھ کر قبول کرتی ہیں۔“

یہ مینی فیسٹو ہندوستان میں شائع ہوا تو اس میں وہی نکات (تقریباً) شامل تھے جو ”انکارے“ کے دفاع میں لکھے گئے محمود الظفر اور احمد علی کے مشترکہ مضمون میں بیان کیے گئے تھے۔ احمد علی نے ایک مضمون میں وضاحت کی۔

”لندن سے جاری ہونے والا منشور ایک بیان کے سوا کچھ نہیں، جو لندن میں مقیم کچھ لکھاریوں کی جانب سے جاری کیا گیا ہے۔ ان میں سے کوئی اردو اثر نہیں۔“

یہ بیان جسے منشور کہا جا رہا ہے، اس مضمون سے متاثر ہے جو محمود الظفر اور میں نے مشترکہ طور پر لکھا تھا اور ہماری جانب سے قائم کردہ ”پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن“ کی رہنمائی کرتا تھا۔“

یہ سجاد ظہیر سے اختلاف کی پہلی آواز تھی لیکن یہ اختلاف تھا، علیحدگی نہیں۔ احمد علی ترقی پسند تحریک کے ساتھ تھا۔ چنانچہ جب کل ہند کانفرنس کے انعقاد کے سلسلے میں سجاد ظہیر الہ آباد آئے تو احمد علی اسی تپاک اور گرم جوش سے ملا جسے وہ سجاد ظہیر کے لندن جانے سے پہلے ان سے ملا کرتا تھا۔ ترقی پسند تحریک کے بارے میں اس کی آنکھوں میں وہی چمک تھی۔ یہی نہیں بلکہ اس نے اپنے گھر کے دروازے انجمن کے ارکان کے لیے کھول دیے۔ اس کا گھر انجمن کا دفتر بن گیا۔

احمد علی ان دنوں الہ آباد یونیورسٹی میں تھا لہذا اس نے یونیورسٹی کے دوستوں سے بھی سجاد ظہیر کو ملوایا، ان میں فراق گورکھپوری اور ڈاکٹر اعجاز حسین نمایاں تھے۔

اسی دفتر میں بیٹھ کر اس پر بحث ہوئی کہ کانفرنس کی صدارت کے لیے کس کا نام پیش کیا جائے۔ کئی نام زیر غور آئے لیکن یہ بھی دیکھنا تھا کہ انجمن کے منشور پر پوری اترنے والی شخصیت ہو۔ جس کی تخلیقات حقیقت نگاری پر مشتمل ہوں۔ بلاخر عام رائے یہ ہوئی کہ مثنیٰ پریم چند سے صدارت کے لیے درخواست کی جائے۔ اس رائے سے بنگال، ممبئی، احمد آباد، لاہور اور دوسری جگہوں کے سب ہی لوگ متفق ہو گئے۔

پریم چند کو مجبور کرنے کے لیے احمد علی نے پریم چند کو خط لکھا۔ منظم علی کی حیثیت سے اس کانفرنس میں جس کا انعقاد لکھنؤ میں ہوا، وہی پیش پیش رہا۔

سجاد ظہیر تین چار سال کی غیر حاضری کے بعد وطن لوٹے تھے۔ اپنے ہی دیار میں اجنبی ہو چکے تھے۔ احمد علی نے یہاں کے ادیبوں میں اچھا خاصا اثر و رسوخ پیدا کر لیا تھا۔ پریم چند اس کے بارے میں اچھی رائے رکھتے تھے لہذا اس کے بلانے پر وہ کانفرنس میں نہ صرف شریک ہوئے بلکہ اس کی صدارت قبول کی۔ حسرت موہانی، ساغر نظامی، فیض احمد فیض، فراق اور ڈاکٹر عبدالعلیم کے علاوہ ملک کے طول و عرض سے بہت سے ادیبوں نے شرکت کی۔

پریم چند نہ صرف ترقی پسند تحریک کے پیش رو ثابت ہوئے بلکہ ان کی ہمت افزائی کی بدولت نوجوان ترقی پسند مصنفین کو اپنی قسمت کے تعین میں آسانی ہوئی۔

پریم چند نے اپنے خطبہ صدارت میں کہا۔ ”ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں فکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور بے چینی

پیدا کرے، بجلائے نہیں کیونکہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔“

احمد علی کے مقالے کا موضوع آرٹ کا ترقی پسند نظریہ تھا۔ اس مقالے میں احمد علی نے معروضی اور موضوعی انداز نگار کی روشنی میں ترقی پسندی کا تجزیہ کیا اور اسے ایک وسیع اور متنوع اصطلاح قرار دیتے ہوئے طبقاتی کشش اور معاشرتی بہبود میں ادب کے کردار پر روشنی ڈالی۔

پارٹی کی ان مصروفیات کے باوجود احمد علی تخلیق کاری میں مصروف رہا اور اسی سال یعنی 1936ء میں اس نے اپنے پڑھنے والوں کو ایک افسانوی مجموعہ ”شعلے“ کے نام سے دیا۔ انجمن انکارے کی حدت باقی تھی کہ اس کا اولین باقاعدہ افسانوی مجموعہ ”شعلے“ کے عنوان سے چھپ کر منظر عام پر آ گیا۔

ان افسانوں نے بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں بالکل نچا دی اور اردو کا افسانوی ادب حقیقت نگاری کے نئے انداز سے آشنا ہوا۔ ان افسانوں میں احمد علی نے برصغیر کے داخلی و خارجی مظاہر بالخصوص متوسط طبقے کی مسلم معاشرت میں پائے جانے والے تضادات کو بڑی ہنرمندی سے اُجاگر کیا۔

شعلے میں بارہ افسانے شامل تھے جو اپنے بنیادی موضوعات کے حوالے سے مذہب، سماج اور جنس کے گرد گھومتے تھے۔ ترقی پسندی کے وسیع مفہوم کی عکاسی بھی کرتے تھے۔ ”انکارے“ میں شامل افسانوں کے برعکس ان میں تلخی نہیں اعتدال نظر آتا تھا۔

وہ سر سے پاؤں تک ترقی پسند تھا اور اپنی تخلیقات میں اسے ثابت بھی کرتا رہا۔ ترقی پسند تحریک بظاہر آگے بڑھ رہی تھی لیکن اس کے باطن میں انتشار کروٹیں لے رہا تھا۔ یہ ایک ادبی تحریک تھی لیکن آہستہ آہستہ سیاست کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔ سجاد ظہیر، محمود الظفر اور ڈاکٹر عبدالعلیم وغیرہ مارکسی آئیڈیالوجی سے متاثر تھے اور چاہتے تھے کہ ادب اس کے نال یا ترجمان ہو کر رہے۔ اس کے خلاف رد عمل کا پیدا ہونا لازمی تھا۔ ہندوستان میں جو کمیونسٹ انقلابی تحریکیں چل رہی تھیں، سجاد ظہیر ان کے اجلاسوں میں شریک ہوتے تھے۔

کمیونسٹ خیالات کا غلبہ اتنا بڑھ گیا کہ ترقی پسند تحریک اس کا اعلان نظر آنے لگی۔ احمد علی نے اس سے اختلاف کیا۔ ”میں ادب کی تخلیق کو پارٹی مینی فیسٹو کے تابع نہیں

برسوں کے دوست ایک دوسرے کے مقابل تھے۔ ایک دوسرے کے خلاف بیانات دیے جا رہے تھے۔ ایک طرف احمد علی تھے جو یہ کہہ رہے تھے۔ ”زندگی کو کھس ایک جماعت کے نقطہ نظر سے کامل اور وسیع طور پر نہیں دیکھا جاسکتا۔ اسی طرح جیسے ہم سارے عالم اور ارض و سما کو صرف ایک ستارے پر نظر بٹھا کر نہیں دیکھ سکتے۔“

دوسری طرف سجاد ظہیر تھے جو ترقی پسند مصنفین کو ادبی پلیٹ فارم کہتے تھے لیکن اپنے مارکسی نظریات سے دستبردار ہونا ان کے لیے ناقابل قبول تھا۔

”انجمن ترقی پسند مصنفین کسی بھی سیاسی پارٹی نہیں تھی اور نہ اب ہے۔ انجمن کا اصلی کام ترقی پسند ادب، ادب کی تخلیق اور ترویج ہے، سیاسی عمل نہیں۔ اگر انجمن ترقی پسند مصنفین میں ایسے ”عالم“ پیدا ہو گئے ہیں جنہیں دھول اور پسینے سے لت پت عوام، ان کے جلسوں اور مظاہروں، ان کے غیر مہذب طور طریقوں، ان کے میلے کپڑوں اور ان کی اندھیری اور بیمار یوں سے بھری بدبودار بستیوں سے کراہت آتی ہے اور یہ باتیں انہیں غیر ادیبانہ اور غیر شاعرانہ معلوم ہوتی ہیں تو ایسے شہ حضرات کے لیے حلقہ ارباب ذوق اور اسی قسم کی کئی دوسری ادبی انجمنوں کے دروازے کھلے ہیں۔“

”ایسے عالم پیدا ہو گئے ہیں۔“ کے الفاظ ظاہر کرتے تھے کہ اشارہ احمد علی کی طرف ہے۔

یہ تنازع سال بھر چلتا رہا۔ تصفیہ کرانے کے لیے لندن سے ملک راج آنند آئے۔ کئی اجلاس ہوئے، صلح صفائی کی ہر کوشش کی گئی لیکن تصفیہ نہ ہو سکا اور احمد علی اس تحریک سے الگ ہو گئے۔

ان دنوں وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں دوبارہ آ گیا تھا۔ لکھنؤ انجمن کا سیاسی مرکز تھا۔ وہیں یہ تمام محرکے ہوئے۔ رشید جہاں کی بے وفائی نے کچھ کم دل دکھایا تھا کہ انجمن سے قطع تعلیق کرنا پڑا۔ احمد علی کی بغاوت ایک ایسے فرد کی بغاوت تھی جس کا شمار انجمن ترقی پسند مصنفین کے بانیوں میں ہوتا تھا اور جس نے اس پودے کو اپنے لبو سے سینچا تھا۔

وہ گرمیوں کی چھٹیوں میں دلی آیا تو اس کی عجیب حالت تھی۔ کئی بے وفائیوں کے داغ اس کے سینے پر سجے ہوئے تھے۔ اس کے خلوص کا غلط مطلب لیا گیا تھا۔ اس کی تخلیقی صلاحیتوں کا غلط مطلب لیا گیا تھا۔ اسے ”خود پسند“ اور بزرگ

خود عالم ہونے کا طعنہ دیا جا رہا تھا اور الہ آباد نے اسے کیا دیا تھا۔ ہر طرف سے ناامید ہونے کے بعد دلی ہی اس کی امید گاہ تھی۔ اسے پہلے سے کہیں زیادہ دلی پر پیار آ رہا تھا۔ دلی اس کے لیے نئی تھی لیکن اب جو گوشہ چشم واکیا تو دلی محبوبہ نظر آنے لگی۔ اس کے گلی کو پچھلے اسے اپنی طرف کھینچنے لگے۔ اسے میر تقی میر کا مصرعہ یاد آنے لگا ”دلی کے نہ تھے کوچے اور اوراق مصور تھے“ شہنشاہوں، تاجداروں، امراء، شاعروں اور داستان گو یوں کا خیال آیا۔ اپنے بزرگوں کا خیال آیا جو کبھی بادشاہوں کے درباروں سے وابستہ تھے۔ جنگ آزادی کے بارے میں سوچتا رہا جس میں اس کے بزرگ بھی قتل کیے گئے تھے۔

دلی کیا تھی، ایک تاریخ تھی جس کے اوراق وہ ایک ایک کر کے پلٹ رہا تھا۔ پھر اچانک ایک خیال اس کے دل میں بجلی کے کوندے کی طرح لپکا۔ اگر میں اس تاریخ کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دوں؟ ایسا تو بہت سے لوگوں نے کیا ہوگا۔ اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ وہ تاریخ ہوگی۔ میں فلائن لکھوں گا۔ اسے میر باقر علی داستان کو یاد آ گئے۔ فلائن تو وہ چیز ہے جو تمثیل کو حقیقت بنا دیتا ہے۔ میں تو پھر دلی کی چٹا لکھوں گا۔ میں اب تک افسانے لکھتا رہا ہوں لیکن دلی کا درد افسانے میں نہیں سما سکتا۔ اس کے لیے تو مجھے ناول لکھنا ہوگا۔ وہ کئی دن الجھا الجھا گھومتا رہا اور پھر اس کے ذہن میں ایک ناول کا خاکہ تیار ہو گیا۔ وہ کہانی کے تانے بانے بنتا ہے۔

”میر نہال ایک پچاس سالہ آسودہ حال اور معزز مسلمان ہے۔ ناول کی کہانی میر نہال کے بیٹے اصغر اور بلیقیں کی روایتی داستان محبت کے گرد گھومتی ہے۔ اصغر ایک معزز سید گھرانے کا چشم و چراغ ہے جبکہ بلیقیں مغل خاندان سے تعلق رکھتی ہے چنانچہ دونوں کے ملاپ میں رکاوٹ کی بنیادی وجوہات پات کا مسئلہ ہے۔ خاندان کے بزرگ کچھ وقت گزرنے کے بعد اپنے رویوں میں لچک پیدا کر لیتے ہیں اور یوں انتہائی دھوم دھام سے اصغر اور بلیقیں کی شادی ہو جاتی ہے مگر اصغر جو جوہ حق محبت ادا نہیں کرتا۔ بلیقیں اسی صدمے کی تاب نہ لاتے ہوئے بیمار ہو جاتی ہے اور اس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ اس کی موت کے فوراً بعد اصغر، بلیقیں کی چھوٹی بہن سے عشق لڑانے لگتا ہے۔ گو یہ عشق کامیاب نہیں ہوتا مگر اصغر کی کہانی اپنا دائرہ مکمل کر کے اپنے نقطہ آغاز پر پہنچ جاتی ہے۔

ایک سال کی کاوش کے بعد اس نے یہ ناول مکمل کر لیا۔

ناول مکمل ہوا تو فنی اعتبار سے ایک شاہکار ناول تھا۔ اس ناول کے لیے اس نے انگریزی زبان کا سہارا لیا تھا۔ شاید اس لیے کہ دلی کا تعارف دوسری زبان والوں سے ہو سکے۔ یہ ناول ایک مسلمان گھرانے پر مرکوز تھا مگر اس میں ہندوستان کی مجموعی صورت حال، دلی کے بام و در اور تہذیبی رویوں کو اجاگر کیا گیا تھا۔

فرنگی بادشاہ کی رسم تاج پوشی، پہلی عالمی جنگ کے حوالے سے رد عمل، 1920ء میں ہندوستان کے مختلف علاقوں میں جمہوری رد عمل، برطانوی حکومت اور عوام میں اس کا رد عمل کو بھی رنگ آمیزی کے طور پر کہانی کے ساتھ ساتھ چلایا تھا۔ فنی اعتبار سے اس نے مغربی ناول نگاروں کی بیانیہ تکنیک کا سہارا لیتے ہوئے کردار نگاری کی تھی۔

نہایت شعوری طور پر ماضی اور حال کا موازنہ دل کی تاریخ رقم کی تھی۔ میر نہال اگر قدیم کے نمائندے تھے تو ان کا بیٹا اصغر جدید کی ترجمانی کر رہا تھا۔

اس ناول کا عنوان اس نے *Twilight in Delhi* مقرر کیا اور اس کی اشاعت کی فکر میں لگ گیا۔ یہ ناول انگریزی میں لکھا گیا تھا لیکن اس کی اشاعت کے لیے بیرون ملک کسی پبلشر کی تلاش تھی۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے وہ اس ناول کی تکمیل کے چوتھے مہینے میں وہ بمبئی سے اٹلی کے لیے روانہ ہوا۔

اٹلی میں اس نے نیپلز اور جنووا میں تقریباً تین ہفتے قیام کے بعد اس نے پیرس کی سرزمین پر قدم رکھا۔ کیننگ کالج لکھنؤ میں جب وہ انگریزی ادبیات کا طالب علم تھا، اس کی دوستی ایک بنگالی طالب علم ونوبینرجی سے ہوئی تھی۔ یہ ہندو طالب علم انقلابی خیالات کا حامل اور نہایت ذہین تھا۔ ان دنوں پیرس میں مقیم تھا۔ احمد علی نے اسی کے گھر قیام کیا۔ آرٹ اور مصوری کے عظیم مرکز پیرس کی سیر کرتا رہا۔ اس قیام کے دوران اس نے اپنے ناول کے اقتباسات ونوبینرجی کو سنائے۔ یہ ناول ہی ایسا تھا کہ حوصلہ افزائی کے سوا کیا ملتا۔ ونوبینرجی کی تعریف نے اسے اور بھی پُر امید کر دیا۔

پیرس سے وہ لندن آیا۔ لندن اس وقت عظیم ترین مصنفین کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ کئی رائٹنگ گروپ تھے۔ ان میں بلومزبری اور نیوراٹنگ گروپ بہت مشہور تھے۔ احمد علی نے ان گروپوں کے مصنفین سے ملاقاتیں کیں۔

لندن میں سب سے اہم ملاقات برطانوی ادیب ای ایم فارمر سے تھی۔ وہ اس وقت بہ اعتبار عمر بزرگی کی منزل

میں تھے لیکن نوجوان احمد علی نے اپنے حسن اخلاق اور لالیبت سے انہیں اپنا گرویدہ کر لیا۔ اس نے اپنا ناول کئی نشستوں میں انہیں پڑھ کر سنا دیا۔ ناول کے روپ میں ایک نئی دنیا ان کے سامنے تھی۔ دلی کا تہذیبی رچاؤ، رکھ رکھاؤ اور سجاوٹ سب کچھ اس میں تھا۔ دلی کی مخصوص زبان کو اس نے اس طرح انگریزی میں منتقل کیا تھا وہ بھی قابل ستائش تھا۔ ای ایم فارمر اس کے عاشق ہو گئے۔

”آپ کی اس کاوش کو شائع ہو جانا چاہیے۔“

”میں نے اسی مقصد کے لیے دلی سے لندن تک کا سفر کیا ہے۔“

”ہم لوگ دلی سے اس طرح واقف نہیں تھے۔ یہ ناول ہمیں دلی کی اصل صورت دکھا رہا ہے۔“

”اسی لیے میں نے اسے انگریزی میں تحریر کیا ہے۔“

”آپ نے ہندوستانی ہوتے ہوئے انگریزی میں بھی کمال کی تحریر کی ہے۔ میں اس کی اشاعت کے لیے کوئی پبلشر تلاش کرتا ہوں۔“

احمد علی ریستوران سے اٹھ کر اپنے ہوٹل کے کمرے میں پہنچا تو خوشی سے نہال تھا۔ ایک نوآزموز ہندوستانی ناول نگار کے لیے انگریزی ناول شائع کرانا آسان نہیں تھا لیکن ای ایم فارمر کی عنایت سے یہ کام ممکن نظر آ رہا تھا۔ وہ اس خوشی میں رات بھر کر نہیں بدلتا رہا۔ دوسرے دن اسے ای ایم فارمر کو کوئی خوشخبری سنانے والے تھے۔

ای ایم فارمر بیسویں صدی کے برطانوی ناول نگاروں میں ممتاز حیثیت کے حامل تھے۔ خود ناول نگار تھے اس لیے احمد علی کے ناول پر ان کی گواہی نہایت مستحکم تھی۔

John Lehman نیوراٹنگ گروپ کے بانی تھے۔ شاعر اور ناقد کی حیثیت سے معروف تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہوگا رتھ پریس لندن کے شراکت دار اور جنرل ممبر تھے۔ ای ایم فارمر نے ان سے بات کی اور احمد علی کو لے کر ان کے پاس پہنچ گئے۔ ایک بزرگ کی حیثیت سے وہ احمد علی کی ہمتی تعریف کر سکتے تھے۔ اس ناول کی اہمیت پر اچھا خاصا پتہ چڑھا۔ یہ بھی باور کر دیا کہ اگر یہ ناول شائع ہوگا نہایت منافع بخش ثابت ہوگا۔

یہاں تک کہہ دیا ”میں یہ ناول پڑھ چکا ہوں۔ اب اسے پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ اگر میری گواہی معتبر ہے تو اگر اندر کے اسے شائع کر دو۔“

”معاہدہ طے پا گیا۔ جون ہیمن نے مسودہ لے کر اپنے

پاس رکھ لیا۔ احمد علی ان کا شکریہ ادا کرنے کے بعد اٹھ آیا۔ تین دن کے بعد وہ ہوگا رتھ پریس گیا۔ جارج ہیمن نے مسودہ اس کے سامنے رکھ دیا۔

”مجھے اس کے بعض حصوں پر اعتراض ہے۔ اگر یہ حصے حذف کر دیے جائیں تو میں اشاعت کے لیے تیار ہوں۔“

”اگر میں یہ حصے حذف نہ کروں؟“

”تو پھر شاید میں شائع نہ کر سکوں۔“

”آپ معاہدہ کر چکے ہیں۔“

”اس معاہدے میں ہمیں یہ نہیں لکھا ہے کہ میں اسے لفظ بہ لفظ شائع کروں گا۔ میں اشاعت سے انکار نہیں کر رہا ہوں۔ بس بعض حصوں پر اعتراض ہے۔“

”اس کا فیصلہ ای ایم فارمر کریں گے۔ اگر وہ کہتے ہیں تو میں حذف کر دوں گا ورنہ نہیں۔“

”ٹھیک ہے، میں ان سے بات کر لوں گا۔“

ای ایم فارمر نے مذکورہ حصوں کو ناول کے لیے ناگزیر قرار دیتے ہوئے کسی قسم کی تحریف یا تہذیبی کی مخالفت کی۔ ہیمن قائل تو ہو گئے لیکن اصرار پھر بھی یہ کر رہے تھے کہ ان حصوں کو حذف ہونا چاہیے۔ بات مالکان تک پہنچی۔ یہ ادارہ معروف برطانوی ناول نگار ورجینیا وولف اور ان کے شوہر نے قائم کیا تھا۔

ورجینیا وولف نے یہ مسودہ ہیرلڈ نکلسن کے سامنے رکھ دیا۔ جو *Official Censor* تھے۔

ہیرلڈ نکلسن نے بھی ناول کو اصل متن کے مطابق شائع کرنے کے حق میں فیصلہ دیا۔

ناول کا شائع ہونا تھا کہ ہر طرف سے پذیرائی کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ اہم ترین برطانوی ادیبوں اور نقادوں نے مضامین لکھ کر اس ناول کی تعریف و توصیف کی۔ یہ ناول نہ صرف کئی مرتبہ شائع ہو چکا ہے بلکہ اردو کے علاوہ بعض بین الاقوامی زبانوں میں اس کے تراجم بھی شائع ہو چکے ہیں۔ بعض بڑی جامعات اور تحقیقی اداروں نے بھی اسے اہمیت دی۔

برصغیر میں بھی اس ناول کو پذیرائی حاصل ہوئی اور اسے ادبی تاریخ کا ایک اہم واقعہ قرار دیا گیا۔

ہندوستان آنے کے بعد ایک مرتبہ پھر وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں طلبہ کو انگریزی پڑھانے پر مامور ہو گئے۔

اس نے لندن میں جو وقت گزارا تھا اس میں وہ بہت سے اہم لوگوں کو متاثر کر کے وطن واپس آیا تھا۔ اس کے

حوالے سے تمام تخلیقی امکانات بروئے کار لا چکا تھا اس لیے نئے امکانات اور وسیع کیڑوں کی تلاش اسے انگریزی کی طرف لے گئی۔ حقیقت یہ تھی کہ ناقدری کا احساس اسے انگریزی میں لکھنے پر مجبور کر رہا تھا۔ یہ ایک منفی سوچ تھی لیکن تھی۔

اس رویے کا سب سے زیادہ نقصان اسی کو پہنچ رہا تھا۔ اس نے اردو میں لکھنا چھوڑ دیا اور اسی طرح عام پڑھنے والوں کی نظروں سے اوجھل ہوتا چلا گیا۔ اس شہرت سے محروم ہو گیا جو اسے مل سکتی تھی۔ اردو ادب کا دامن اس کے جواہر پاروں سے خالی رہ گیا جو بھر سکتا تھا۔

ترقی پسند تحریک کے زیر اثر لکھے جانے والے افسانے زیادہ تر موضوعات کے گرد گھومتے تھے۔ وہ ایک تخلیقی فنکار تھا جس کے یہاں رومان کے ساتھ ساتھ فکر و نظر کی کارفرمائی بھی نظر آتی تھی۔

اس کے عالمانہ رزم نے اسے عام پڑھنے والوں سے دور کر دیا۔ نہایت بلند سطح پر تو اس کے واقف کار باقی رہ گئے لیکن عام آدمی یہ پوچھنے میں حق بہ جانب تھا کہ کون احمد علی؟ اب وہ ایک مایوس اور نوئے ہوئے دل کا بزرگ خود ٹھکرایا ہوا فنکار تھا جس کی قدر اس کے ہم وطنوں نے نہیں کی۔ وہ انہی بھول بھلیوں میں گم تھا۔ انگریزی میں تراجم کر رہا تھا۔ دو انگریزی ناول مزید لکھ چکا تھا کہ اسی ایم فارمنر کی کانفرنس میں شرکت کے لیے تشریف لائے۔

اب احمد علی کانفرنس تھا کہ وہ اپنی میزبانی کا شرف حاصل کرے۔ یہ کانفرنس بے پور میں تھی۔ احمد علی نے مذکورہ کانفرنس میں فارمنر کے ہمراہ شرکت کی۔ کانفرنس کے بعد وہ انہیں کلکتہ لے کر گیا اور مختلف تاریخی عمارات دکھائیں۔ اس قیام میں جب فارمنر کو یہ معلوم ہوا کہ احمد علی اردو میں لکھنا ترک کر چکا ہے اور یہاں ایسے پبلشر خال خال ہیں جو اس کی انگریزی نگارشات کو شائع کر سکیں تو انہوں نے لندن جا کر ایسے پبلشرز کا اہتمام کیا جو اس کی تخلیقات کو شائع کرتے رہے۔ اردو افسانوں کے کم و بیش تمام ایڈیشن احمد علی نے خود شائع کیے تھے۔ فارمنر کی کوششوں سے اس کے روابط بعض بین الاقوامی اشاعتی اداروں سے استوار ہوئے جو اسے بھاری رقوم رائلٹی کے طور پر ادا کرتے تھے۔ اس لیے بھی اسے انگریزی میں لکھنے کی تحریک ملتی رہی۔

اب احمد علی تاریخ کے ایسے موڑ پر آ گیا تھا جب ہندوستان میں سیاسی پھل اپنے عروج پر تھی۔ تقسیم ہند کی

درگت یاد آتا ہے جو اس کے مکان کے احاطے میں لگا ہوا تھا۔ اس کی جڑیں دیمک زدہ تھیں۔ اس کے نیچے ایک عورت مری پڑی تھی اور اس کا بچہ اس کی مردہ چھاتیوں سے دودھ لٹالنے کے لیے انہیں چوس رہا تھا۔

اس افسانے میں درخت موت کی علامت ہے کیونکہ جسے دیمک لگ جائے وہ قوتِ نمو سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس افسانے میں بعض کرداروں کی تصویر کشی میں بھی کمال مہارت کا ثبوت دیا۔

”ان کا قد لمبا، ہاتھ پاؤں بڑے بڑے اور ان کے لبوترے چہرے پر ان کی بڑی سی ناک اور پتلی واڑھی، ایک چٹان پر جھربری کی جھاڑی کا گمان پیدا کر دیتی تھی۔ وہ اکثر دھوئی باندھنے تھے اور ان کی بے ہنگم ناکھیں دھوئی میں سے ٹپکی کے دو ٹکڑوں کی طرح نظر آتی تھیں۔“

”موت سے پہلے“ سے بڑی امیدیں تھیں۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ اس نے مغرب کی جدید افسانوی تکنیک کو جس انداز سے برتا ہے وہ اردو افسانے میں اپنی نوعیت کا ایک منفرد تجربہ ہے۔ اس کی اشاعت کے بعد وہ انتظار کرتا رہا کہ کوئی ناقد اس کی پذیرائی کے لیے تیسرہ لکھے گا لیکن وہ دیکھ رہا تھا کہ اردو کی دنیا میں ہر طرف سناٹا ہے۔ اسے یوں لگا جیسے وہ دانشورانہ سطح، رحمت، انفرادیت اور نئے تجربات کے باوجود اپنے قاری کو گرفت میں لینے میں ناکام رہا ہے بلکہ اردو کے قاری میں ابھی اتنی اہلیت ہی نہیں کہ وہ میری باتوں کو سمجھ سکے یا پھر یہ کہ جو وہ کہنا چاہتے ہیں وہ اردو میں ادا ہو ہی نہیں سکتا۔ اس نے ممتاز شیریں کے نام ایک خط میں لکھا۔

”موت سے پہلے“ پر تیسرہ ابھی تک نگاہ سے نہیں گزرا۔ کیا آپ کے تیسرے نوٹس کو کتاب اس قدر ناپسند ہوئی؟ ہر حال کوئی بات نہیں۔ کچھ تصانیف شائع ہونے کے بچھیں اور یہاں سال بعد سمجھی جاتی ہیں۔

”بہر حال کوئی بات نہیں“ میں ایسا درد چھپا ہوا تھا جس کی شدت کا اندازہ اس وقت ہوا جب وہ اردو کی طرف سے موڑ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ مکمل طور پر انگریزی سے وابستہ ہو گیا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ اردو میں کچھ نہیں لکھے گا۔ اس نے اپنی سیر کرے گا، نئے قاری تلاش کرے گا۔ اب اس کی طرف آیا بھی تو اس طرح کہ اردو کے فن پاروں کو انگریزی میں منتقل کر دیا۔

اس لوگوں کا یہ بھی خیال تھا کہ وہ اردو افسانے کے

مخصوص دور کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی صورت حال پر پھیلا دیا تھا جس کی وجہ سے فضا محدود نہیں لاکھود ہو گئی تھی۔ ”میرا کرا، کلکتہ، مسٹر ٹمس الحسن وغیرہ اس مجموعے میں شامل تھے۔

1944ء میں احمد علی نے بی بی سی کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اسی سال اس کا افسانوی مجموعہ ”قید خانہ“ کے عنوان سے شائع ہوا۔

یہ احمد علی کا آخری مجموعہ ثابت ہوا۔ قید خانہ اس مجموعے کا طویل افسانہ ہے۔ اس افسانے میں فلسفہ حیات کے حوالے سے انسان کے تشخص کے بحران کو اجاگر کیا گیا تھا۔ ”پریم کہانی“ میں محبت کو موضوع بنایا گیا تھا۔ ”قلعہ“ میں مسیحا انداز میں سیاست کو فلسفیانہ رنگ دیا گیا تھا۔ چوتھے اور آخری افسانے میں ناطلیجائی شعور کی مدد سے ماضی کے پردوں میں چھپی پراسرار اور حیران کن بازگشت سننے کی کوشش کی گئی تھی۔

اس مجموعے کے ذریعے وہ ایک وسیع افسانہ نگار کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آئے۔

اب اس پر ترقی کے سارے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ وہ بنگال سینئر ایجوکیشنل سروس سے وابستہ ہو کر پریذیڈنسی کالج کلکتہ میں پروفیسر و صدر شعبہ انگریزی کی حیثیت سے خدمات انجام دینے لگا۔

ترقی پسندی اپنے عروج پر تھی لیکن اب اس کا وہ حال نہیں رہا تھا۔ سجاد ظہیر کے ذریعے اس کا جھکاؤ کمیونزم کی طرف ہو گیا تھا اور اسے ایک سیاسی و انقلابی انجمن سمجھا جانے لگا تھا۔ بہت سے محتاط ادیب اس سے الگ ہو گئے تھے۔ احمد علی بھی ان میں سے ایک تھا لیکن اس کے فن پارے ترقی پسندی کی ایک صاف ستھری شکل میں منظر عام پر آ رہے تھے۔

دسمبر 1945ء میں اس کے طویل افسانوی تجربہ ”موت سے پہلے“ شائع ہوئی۔ یہ نہایت معرکے کی چیز تھی، اس میں موت و حیات کے فلسفے کو سمجھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ابتدائی حصے میں بیانیہ تکنیک اپناتے ہوئے بتایا گیا تھا کہ زندگی بھی اس کی محبوبہ تھی اور وہ اس کا دل دل سوز عاشق مگر زندگی ایک سہرا ب تھی۔ ایسا رنگین خواب جو آنکھ کھلنے پر غیر حقیقی اور بے کار ثابت ہوتا ہے۔ زندگی کے حلق حقائق کا شعور اسے ایک ایسے صحرا میں لے جاتا ہے جس کا ہر کوننا بھیا تک اور ہر ذرہ دلخراش ہے۔ وہ شعور کی رو میں بہتا ہے تو اسے ایک

ناول نے بھی اہم ادیبوں کو متاثر کیا تھا۔ اسی کا حاصل تھا کہ ہندوستان آنے کے صرف ایک سال بعد ای ایم فارمنر کا خط آیا کہ اسے بی بی سی لندن میں ریسرچ ڈائریکٹر کے عہدے پر تعین کیا جا رہا ہے۔ وہ لندن آنے کی تیاری کر لے۔ یہ عہدہ یقیناً اسے فارمنر کی حمایت سے ملا تھا۔ اس نے شکریہ کا خط لکھا اور تیاری کرنے لگا۔ اس اثنا میں بی بی سی کی جانب سے بھی ایک خط اسے موصول ہو گیا۔

تیاری مکمل کی اور ایک مرتبہ پھر وہ لندن میں تھا۔ اسے مسٹر جارج آرویل کی ماتحتی میں کام کرنا تھا۔ جارج آرویل بنگال میں پیدا ہوئے تھے۔ انڈین سول پولیس برما میں شامل رہے۔ برطانوی استعمار کے خلاف سخت نکتہ چینی کی۔ اپنی بعض کتابوں کی وجہ سے معروف ہوئے۔ اور اب بی بی سی کی اوور سیرسروس سے وابستہ تھے۔

احمد علی نہ ان کے لیے اجنبی تھا اور نہ برطانیہ والوں کے لیے۔ اس کے ناول نے اسے بھی معروف لوگوں کی صف میں کھڑا کر دیا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس نے اپنے بعض افسانوں کو ترجمہ کر کے بین الاقوامی جرائد میں شائع کرایا تھا۔

جارج آرویل اس سے بڑے تپاک سے ملے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا وہ اس کی صلاحیتوں کے معترف ہوتے چلے گئے اور یہ قربت رفتہ رفتہ دوستی میں داخل گئی۔ دفتری اوقات کے بعد وہ اور جارج آرویل اپنا بیشتر وقت ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ گزارتے۔

وہ بی بی سی لندن میں ملازمت کر رہا تھا کہ اس کا افسانوی مجموعہ ”ہماری گلی“ منظر عام پر آیا۔ انگارے اور شعلے میں شامل افسانے انقلابی شعور اور تکنیک کے تجربات کے حوالے سے اردو افسانے کی تاریخ میں مستند سمجھے جانے لگے تھے۔ ان افسانوں نے اسے افسانہ نگار کی حیثیت سے شہرت دی تھی لیکن ”ہماری گلی“ کے ذریعے وہ ایک سنجیدہ اور پختہ کار افسانہ نگار کی حیثیت سے سامنے آیا۔

اس مجموعے میں کل سات افسانے تھے۔ پہلے افسانے کا نام ہماری گلی تھا جس کے بارے میں سید وقار عظیم نے لکھا۔

”بلاشبہ کچھ ایسے (افسانے) بھی ہیں جن کی حیثیت سنگ میل کی ہے۔ ہماری گلی اسی قبیل کا افسانہ ہے۔“ ہماری گلی کی کہانی ایک گلی سے شروع ہو کر اسی گلی میں ختم ہو جاتی ہے مگر مصنف کا کمال یہ ہے کہ اس گلی کی علامت کو اس

یہاں بھی اس کی مقبولیت نے سرکاری کاموں میں بڑی سہولت پیدا کر دی۔ دراصل وہ اپنی بحر انگیز شخصیت اور فنون لطیفہ سے وابستگی کی بدولت لوگوں میں بہت جلد مقبول ہو جاتا تھا۔ اسی لیے سفارتی کاموں کے لیے وہ بہت مفید ثابت ہو رہا تھا۔ مراکش کے سلطان سے اس کے ذاتی تعلقات ہو گئے تھے۔

وہ ہر لحاظ سے خوش قسمت ثابت ہو رہا تھا۔ بیٹی کی آرزو تھی۔ خدا نے اسے ایک بیٹی بھی دے دی جس کا نام اس نے شاہانہ احمد علی رکھا۔

ملک میں مارشل لا لگ چکا تھا۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان انتظامی امور کو بڑی سختی سے چلا رہے تھے۔ انہوں نے ایسے سرکاری ملازمین کی فہرست تیار کرنے کا حکم دیا جو ملک کو کسی بھی طرح کا نقصان پہنچا رہے تھے یا پہنچا سکتے تھے۔ یہ فہرست مرتب ہوئی تو کسی نے اس کا نام بھی شامل کر دیا۔ اسے ترقی پسند قرار دے کر نقصان کا باعث گردانا۔ بہت سے ناپسندیدہ افراد کے ساتھ اسے بھی سرکاری ملازمت سے آزاد کر دیا گیا۔

ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد بھی اس نے ادبی سرگرمیاں جاری رکھیں بلکہ اب فرصت زیادہ تھی چنانچہ کچھ بعد دیگرے دو کتابیں منظر عام پر آئیں۔

ملازمت سے فرصت ملی تو وہ ایک مرتبہ پھر کسی بڑے کینوس کی تلاش میں نکلا۔ اس مقصد کے لیے ناول ہی ایک بڑا میدان ہو سکتا تھا۔ اس سے پہلے وہ دلی کے پس منظر میں ایک ناول لکھ چکا تھا۔ دلی کے بعد لکھنؤ ہی ایک بڑا ادبی مرکز تھا بلکہ اپنی بعض خصوصیات کے پیش نظر دلی سے بھی آگے نظر آتا تھا۔ اپنی رنگینیوں کے اعتبار سے ناول کے لیے ایک اچھا موضوع تھا۔ احمد علی نے ایک بڑا عرصہ لکھنؤ میں گزارا تھا۔ وہ یہاں کے گلی کوچوں سے واقف تھا۔ طوائفوں اور تماشا بینوں کو دیکھ چکا تھا۔ یہاں کی تہذیب سے بھی واقف تھا اور تاریخ سے بھی۔ ہندوستانی تہذیب کی آخری نشانی لکھنؤ ہی تو تھا۔ احمد علی نے جب لکھنؤ کو دیکھا تھا، اس وقت لکھنؤ تہذیبی شکست و ریخت سے گزر رہا تھا۔ اس نے اپنے ناول کے لیے اسی پس منظر کو پیش نظر رکھا۔

عروج و زوال کی اس داستان کو اس نے انگریزی میں رقم کیا اور "آوشن آف ٹائم" نام دیا۔

اس ناول کے مرکزی کرداروں میں لکھنؤ کے ایک عیاش طبع نواب چکن، اس کی داشتہ ما اور کیرنٹی وکیل شامل

ارٹ متوجہ ہوا اور بہت کم عرصے میں اولین کاوش *The Falcon of the Hunted bird* شائع کی۔

اس کی یہ کوششیں کلاسیکی اردو شاعری کی مبسوط تاریخ ہونے کے علاوہ انگریزی داں طبقے کے لیے اردو شاعری کا کلاسیکی مزاج سمجھنے کا اہم وسیلہ بھی بنیں۔

1950ء میں وہ پاکستان فارن سروس میں سینئر ڈپٹی سیکریٹری، وزارت امور خارجہ مقرر ہوا۔

وقت نے کئی کروٹیں بدل لی تھیں۔ اس نے گردشوں کی کئی الٹ پھیر دیکھ لیے تھے۔ اس کی عمر چالیس سال ہو گئی تھی۔ شادی کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ رشید جہاں کی بے وفائی تھی یا ادبی مصروفیات کہ اب تک اس نے اپنا گھر نہیں بسایا تھا۔ اب والدہ کا بھی انتقال ہو چکا تھا لیکن کچھ عزیز تھے جنہیں اس کی فکر تھی۔ اب وہ بھی اس بارے میں سوچنے لگا تھا۔

کراچی میں سید رؤف علی کا خاندان آباد تھا۔ یہ خاندان چونکہ دہلی سے تعلق رکھتا تھا اس لیے احمد علی کا اس خاندان سے آبائی تعلق تھا۔ سید رؤف علی نہایت مستند قانون داں تھے۔ انگلستان سے قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد 1912ء میں وطن واپس آئے تھے اور بہت جلد 1927ء میں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ ان کی صاحبزادی بقیہ جہاں تھیں۔ اب اور مسوری کا عمدہ ذوق رکھتی تھیں۔ کلاسیکی موسیقی کی تربیت حاصل کر چکی تھی۔ قدرت نے انہیں احمد علی کی قسمت میں لکھا تھا۔

شادی کو ایک سال گزرا تھا کہ 1951ء میں حکومت پاکستان نے اپنے نمائندے کی حیثیت سے اسے چین بھیجا۔ وہ قیام پاکستان سے پہلے بھی چین جا چکا تھا۔ اس کے کئی اہم دوست وہاں موجود تھے۔ وہ چینی زبان سے بھی واقف تھا لہذا نمائندگی کا حق خوب ادا کیا اور دونوں ممالک کے مابین فارتی تعلقات قائم کرنے میں معاون ثابت ہوا۔ اس کی خدمات کے صلے میں حکومت پاکستان نے اسے پیننگ (پننگ) میں قونسلر مقرر کر دیا۔

اس کا پہلا بیٹا ارم احمد علی پیدا ہوا تو وہ چین میں تھا۔ چھ ماہ میں اس کا قیام صرف ایک سال ہی رہ سکا۔ حکومت نے اسے چین سے واپس بلا کر ایک بار پھر اس کی خدمات دارالحکومت کے سپرد کر دیں۔

اس کے دو بیٹے عروج احمد علی اور دید احمد علی پیدا ہو چکے تھے۔ حکومت نے اسے "رباط" بھجوا دیا جہاں اس نے "اس کی" نام سے اپنی ذمے داریاں سنبھال لیں۔

دیا ہے۔ کرنا کرانا کچھ نہیں ہے۔ ہندو بھارتی انتظامیہ متعصب کارروائیاں برابر جاری رکھے ہوئی تھی۔ شاید اسی کوششوں سے احمد علی کی تنخواہ بند کر دی گئی۔ یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ اس کے اہل خانہ کراچی پہنچ چکے ہیں۔ وہ بذریعہ ہوائی جہاز دہلی جانے کے بجائے کراچی پہنچ گیا جہاں اس کے اہل خانہ اس کے منتظر تھے۔

وہ کوئی گم نام آدمی نہیں تھا۔ اتنا مشہور تو تھا ہی کہ مقتدر طبقے اس کے نام سے واقف تھے۔ قابلیت میں بھی کوئی شاہد نہیں تھا۔ بہت سے مہربان دوست بھی ایسے تھے جو اس کی طرح ہجرت کر کے ہندوستان سے پاکستان آ چکے تھے۔ ان دوستوں کی مہربانی سے کراچی ہی میں اس کی ملازمت کا بندوبست ہو گیا۔ وہ فارن پبلسٹی کے شعبے میں ڈائریکٹر کی حیثیت سے کراچی میں اپنے فرائض انجام دینے لگا۔

پاکستان آمد کے بعد اس نے ترجمہ نگاری کو مستقل مشغلہ بنالیا تھا۔ ترجمے کا فن مشکل بھی ہے اور پیچیدہ بھی۔ مترجم کے لیے اپنی زبان کے علاوہ "زبان غیر" کی باریکیوں اور نزاکتوں سے آگاہی کے ساتھ ساتھ اس تخلیقی شعور کی بھی ضرورت ہوتی ہے جس کے نتیجے میں اعلیٰ فن پارے وجود میں آتے ہیں۔ احمد علی میں یہ صفات موجود تھیں۔ اس کی اردو دانی پر کسی کو شک نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان و ادب پر غیر معمولی دسترس رکھتا تھا۔ اس کا ثبوت وہ اپنے انگریزی ناول کے ذریعے دے چکا تھا۔

اس نے ترجمے کرتے ہوئے ایک مشکل صنف کا انتخاب کیا یعنی مختلف زبانوں کی شاعری کو ترجمے کے لیے منتخب کیا۔ شاعری کا شاعری میں ترجمہ مشکل ترین امر ہے۔ آئینے کی مثال ہے کہ ٹھیس لگی اور آئینہ ٹوٹا۔ شاعری کا کاروبار تشبیہات اور استعاروں سے چلتا ہے۔ ایک زبان سے دوسری زبان میں ان استعاروں کی منتقلی دونوں زبانوں پر غیر معمولی قدرت کا تقاضا کرتی ہے۔ احمد علی نے اس چیلنج کو قبول کیا۔ وہ انگریزی میں شاعری بھی کرتا تھا اس لیے یہ مرحلہ اس کے لیے کچھ نہ کچھ آسان ہو گیا۔

سب سے پہلے انڈونیشیا کی منتخب نفلوں کو انگریزی میں ڈھالا جو *The Flaming Earth* کے نام سے شائع ہوئیں۔

چینی شاعری کے انگریزی تراجم پر مشتمل کتاب *The Call of Trumopel* شائع کی۔

اس کے بعد وہ اردو کے کلاسیکی شعرا کے منتخب کلام کی

آوازیں زور شور سے سنائی دے رہی تھیں۔ کئی جگہ فسادات ہو چکے تھے۔ ہندو مسلم اختلافات بڑھتے جا رہے تھے۔ اس فتنہ پروری کے دور میں اسے ایک موقع مل گیا کہ وہ کچھ دنوں کے لیے ہندوستان سے دور ہو جائے اور سکون سے اپنے تخلیقی کام کر سکے۔ وہ جنوری 1947ء میں چین کے لیے روانہ ہو گیا جہاں وہ برٹش کونسل وزینگ پروفیسر کی حیثیت سے نیشنل سینٹرل یونیورسٹی آف چائنا، ناننگ میں انگریزی زبان و ادب کی تدریس میں مصروف ہو گیا۔

وہ جہاں جاتا تھا اپنے لیے تخلیقی مواقع ڈھونڈ لیتا تھا۔ اس نے نہایت مختصر مدت میں چینی زبان سیکھ لی اور ایک چینی شاعر کے ساتھ مل کر جدید چینی شاعری کا انگریزی میں ترجمہ کرنے بیٹھ گیا۔ یہ ترجمے مکمل بھی ہو گئے لیکن اشاعت کی نوبت نہ آ سکی۔

جس شورش کو وہ اپنے پیچھے ہندوستان میں چھوڑ کر آیا تھا اس نے بھیا تک شکل اختیار کر لی۔ دہلی بڑی طرح فسادات کی لپیٹ میں آ گیا۔

14 اگست 1947ء کو برصغیر کی تقسیم عمل میں آ چکی تھی۔ احمد علی کا اپنے خاندان کے لوگوں سے رابطہ منقطع ہو گیا۔ اسی اثنا میں اسے اطلاع ملی کہ حکومت ہند نے اس کی والدہ کا اکاؤنٹ منجمد کر دیا۔ ہندوستان اور پاکستان کے مختلف علاقوں سے فسادات کی خبریں مل رہی تھیں۔ اس نے ای ایم فارسٹر کو اس صورت حال سے آگاہ کیا تو ایک غلط دوست کی طرح فارسٹر نے نہ صرف ان کے اہل خاندان کے بارے میں معلومات حاصل کیں بلکہ احمد علی کی والدہ کو اخراجات کے لیے ایک سو پاؤنڈ بھی بھجوائے۔

1948ء میں جب فسادات کا زور ڈرا تھا تو اسے پابند کر دیا گیا کہ وہ انڈیا نہیں جاسکتا۔ اس نے فوراً ایک چینی دوست کو ساتھ لیا اور چین میں بھارت کے سفیر کے پی مین سے اس سلوک کی شکایت کی۔ وہ بھی بے بس تھے۔ وہ صرف اتنا کہہ سکے کہ یہ ہندو اور مسلمان کا سوال ہے۔

"میں مسلمان ہوں اس لیے اپنے وطن نہیں جاسکتا؟"

"شاید ایسا ہی ہے۔"

"میری شہریت ہندوستان کی ہے۔ میں چین آنے سے پہلے وہیں رہتا تھا۔"

"آپ کا احتجاج سر آکھوں پر۔ میں نئی دہلی کو اس صورت حال سے آگاہ کروں گا۔"

ان کے لہجے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ انہوں نے نال

ہیں۔ یہ سب علامتی کردار ہیں۔ ہمارے ایک طوائف ہے لیکن گناہ آلود زندگی ترک کرنے کی آرزو مند۔ نواب چکن قدیم تہذیب کا نمائندہ ہے۔ زوال کی آخری انتہا پر پہنچ کر بھی عصری حقائق کو قبول کرنے کو تیار نہیں۔ کبیر (وکیل) تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود تصورات کی دنیا میں رہتا ہے۔ عملی زندگی میں حقائق سے فرار کا طالب۔

ان کرداروں ہی سے لکھنؤ کی زوال پذیر معاشرت کی عکاسی ہو جاتی ہے۔

ناول کے آخری حصے میں نواب چکن اپنی عیاشیوں اور فضول خرچیوں کے باعث پائی پائی کو محتاج ہو جاتا ہے، ہمارے پتا چلتا ہے تو وہ کسی شخص کے ذریعے نواب چکن کو مکان کے کاغذات بھجواتی ہے مگر وہ شخص بروقت یہ کاغذات نہیں پہنچا پاتا۔ نواب شدید ذہنی دباؤ میں خودکشی کر لیتا ہے۔

اس ناول کے ذریعے احمد علی نے یہ پیغام دیا کہ جو قومیں نوحہ دیوار نہیں پڑھتیں، فطرت ان کے گناہوں کو بھی معاف نہیں کرتی۔

پہلے ناول کے مقابلے میں اس ناول کو زیادہ پذیرائی حاصل نہیں ہوئی مگر یہ احمد علی کی ناول نگاری اور فنی زندگی کا ایک اہم سنگ میل ضرور ثابت ہوا۔

وہ ادیبوں سے میل جول اور ادبی مجالس میں جانے سے کب کا تائب ہو چکا تھا لیکن ادبی مصروفیات سے تائب نہیں ہوا تھا۔ تخلیقی سرگرمیاں مسلسل جاری تھیں۔ اس کے قدردانوں کو یہ بھی فکر تھی کہ اس کے لیے آمدنی کی کوئی مستقل سبیل بھی ہونی چاہیے۔ اس دوران وہ مختلف پرائیویٹ نوکریاں کرتا رہا تھا۔ کچھ عرصے کے لیے کراچی یونیورسٹی میں انگریزی کے وزٹنگ پروفیسر مقرر ہوا اور پھر 1975ء کے موسم گرما میں مشی گن اسٹیٹ یونیورسٹی امریکا میں وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے مختلف موضوعات پر لیکچر دیتا رہا۔

”امر کی حکومت نے 1975ء میں مجھے بلا لیا۔ وہاں پہنچا تو انہوں نے مجھے مذہب کا ماہر بنا دیا (اس کے لیکچروں کی نوعیت ہی ایسی تھی) اور پھر قرآن مجید کا ترجمہ کرنے کا فریضہ سونپ دیا جسے میں نے چیلنج سمجھ کر قبول کر لیا۔“

وہ انگریزی کا ایک صاحب اسلوب ادیب ضرور تھا مگر عربی زبان سے واقفیت محدود تھی، یوں بھی اس کا کوئی مذہبی پس منظر نہیں تھا لیکن اس کی ثابت قدمی مجبور کر رہی تھی کہ وہ اس کام سے پیچھے نہ ہٹے جو اس کی بخشش کا سامان بھی ہے۔ اسے معلوم تھا کہ اس سے پہلے بھی لوگوں نے قرآن

پاک کے انگریزی تراجم کیے ہیں۔ اس نے اس سلسلے میں کاوش کی تو پورا منظر نامہ اس کے سامنے آ گیا۔

قرآن مجید کا پہلا لاطینی ترجمہ 1143ء میں ہوا اور مطبع کی ایجاد کے بعد 1543ء میں بمقام ہاسل چپ کر شائع ہوا۔ 1647ء میں ایک صاحب آندرے دورائر نے فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا۔ دو سال بعد اس ترجمے کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا۔

جارج سیل نے لاطینی زبان میں کیے ہوئے ایک اور ترجمے کی مدد سے قرآن حکیم کا انگریزی ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ پہلی دفعہ 1734ء میں شائع ہوا۔

جارج سیل کا یہ ترجمہ قرآن تقریباً ڈیڑھ سو سال تک انگریزی خوانوں کے زیر مطالعہ رہا یہاں تک کہ 1861ء میں کیمبرج یونیورسٹی کے ایک استاد جے ایم راڈویل نے قرآن حکیم کا ترجمہ کیا اور زبان میں بہت کچھ اصطلاحیں کیں۔ اس مصنف میں جدت یہ کہ سورتوں کی ترتیب نزول قرآن کے مطابق کر دی۔ یہ پہلا مترجم قرآن تھا جو عربی اسلوب کی ایک حد تک تقلید میں کامیاب رہا۔

1900ء میں کیمبرج یونیورسٹی ہی میں عربی کے استاد پامر نے قرآن حکیم کا دو جلدوں میں انگریزی ترجمہ کیا اور ایک زمانے تک مستند اور عالمانہ سمجھا جاتا رہا۔

قرآن حکیم کے مندرجہ بالا مکمل تراجم کے دوش بدوش جزوی تراجم کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

پہلا انگریزی ترجمہ جو کسی مسلم کے قلم سے نکلا ڈاکٹر عبدالحکیم کا تھا۔ اس کے چند سال بعد ایک انگریزی ترجمہ دو ضخیم جلدوں میں مرزا ابوالفضل الہ آبادی کا شائع ہوا۔ یہ پہلا انگریزی ترجمہ تھا جو عربی متن کے ساتھ شائع ہوا۔

1917ء میں لاہور سے محمد علی لاہوری کا ترجمہ قرآن مع تفسیر شائع ہوا۔ 1930ء کے آس پاس محمد مارڈ پوک پکھال کا ترجمہ قرآن شائع ہوا۔ علامہ عبد اللہ یوسف علی اور عبدالمجید ریا بادی کا ترجمہ قرآن بھی موجود تھا۔

احمد علی نے ان سب نسخوں کو جمع کیا۔ ان کا مطالعہ کیا۔ ان میں جو خامیاں رہ گئی تھیں انہیں اپنے پاس نوٹ کیا۔ علما سے مشورے کیے۔ عربی زبان سے کچھ نہ کچھ واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ وہ انگریزی زبان پر غیر معمولی قدرت رکھتا تھا۔ قرآن کریم کا انگریزی ترجمہ کرتے ہوئے اس نے ممکنہ حد تک عربی زبان کے محاورے، تشبیہات و استعارات اور روایتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے قرآن کریم کے صحیح مفہوم

تک پہنچنے کی کوشش کی۔

”انگارے“ کی بدنامی نے احمد علی کا چچا ابھی تک نہیں چھوڑا تھا۔ اس کی ترقی پسندی کا مفہوم یہ لیا جاتا تھا کہ وہ المذہب بھی ہوگا۔ ادبی اعتبار سے بھی وہ انسانوں اور ناولوں تک محدود تھا لہذا جب لوگوں نے یہ سنا کہ وہ قرآن کا ترجمہ کر رہا ہے تو تعجب بھی ہوئے اور مستحکم بھی اڑایا۔ کچھ نے کہا، دنیا کے مزے اڑانے کے بعد اب عاقبت کی فکر پڑی۔ انگارے اور ترقی پسندی کو چھوڑ کر قرآن کے ترجمے کی طرف چلے ہیں۔ لوگوں کو اس کی فکر میں کچھ عجیب و غریب تضاد نظر آیا۔ کچھ یہ کہہ رہے تھے کہ امریکی اشاعتی ادارے سے بھاری رقم وصول کر لی ہے اس لیے ترجمہ کر رہے ہیں۔ کچھ کا خیال تھا کام شروع تو کر دیا ہے مکمل تک نہیں پہنچا سکیں گے۔ عربی سے اس کی ناواقفیت بھی اعتراض کا باعث بن رہی تھی۔

احمد علی کا یہ دعویٰ تھا کہ اس نے ایک مذہبی گھرانے میں آنکھ کھولی ہے۔ اسکول جانے سے پہلے قرآن پڑھا ہے۔ نجیب الطریفین سید ہوں بالواسطہ طور پر حضرت علیؓ اور بلا واسطہ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ سے منسوب تعلق ہے۔ اس لیے کسی کو حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ میں قرآن کا ترجمہ کر رہا ہوں۔

اعتراضات اٹھتے رہے مگر وہ اپنا کام کرتا رہا۔ احمد علی نے جدید انگریزی کا استعمال کیا۔ اسے ایجاز و اختصار، ابلاغ اور وضاحتی اشاروں سے مزین کیا۔ پچھلے ترجموں کو سامنے رکھ کر اپنے لیے الگ راہ نکالی۔

احمد علی نے دینی عالم یا عربی داں نہ ہونے کے باوجود جس خوبصورتی سے اس ترجمے کو مکمل کیا اس کے باعث مغربی ممالک میں اسے زبردست پذیرائی حاصل ہوئی۔

اس نے یہ ترجمہ 1980ء میں مکمل کر لیا۔ اس کی افتتاحی تقریب کی صدارت کے لیے صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق سے رابطہ کیا گیا۔ انہوں نے اس تقریب کی صدارت کو اپنے لیے باعث برکت قرار دیا لیکن عین وقت پر سرکاری مصروفیات کی وجہ سے وہ شرکت نہ کر سکے اور صدارت مشہور دانشور اور قانون داں جناب اے کے بروہی نے کی۔

حکومت پاکستان نے اسے ستارہ امتیاز سے نوازا۔ 1985ء میں اس کا تیسرا اور آخری انگریزی ناول Rats and Diplomats شائع ہوا۔

یہ ناول مصنف کے سفارتی تجربات و مشاہدات کی عکاسی کرتا ہے۔ ناول کے آغاز میں ہی اس نے واضح کر دیا تھا کہ

اگرچہ مذکورہ ناول میں پیش کیے جانے والے واقعات عصری صورت حال کے تناظر میں حقائق پر مبنی معلوم ہوتے ہیں لیکن یہ فکشن ہے۔ اس کا کوئی کردار حقیقی نہیں۔ اس لیے کسی قسم کی مطابقت محض اتفاقیہ ہوگی کیونکہ جس ملک کے پس منظر میں اس کہانی کا تانا بانا بنایا گیا ہے وہ دنیا کے نقشے پر موجود نہیں۔

اس ناول میں دنیا کے عمومی انحطاط اور سیاسی زوال کو موضوع بنایا گیا تھا۔ بیسویں صدی کے وسط آخر میں عالمی بساط پر دو طاقتوں نے اپنی بالادستی قائم کرنے کے لیے ترقی پذیر اور غریب ملکوں کا جس طرح استحصال کیا اس کو نمایاں کرنے کے لیے احمد علی نے علامتی پیرائے کا اظہار کیا تھا۔ ان بے وقعت انسانوں کا نوحہ لکھا تھا جو ہوس ملک گیری کی بھینٹ چڑھ گئے۔

ناول کا مرکزی کردار ایک برطرف جنرل تھا جسے Ratsan (فرنی) ملک میں تعینات کیا جاتا ہے۔ اس کی سفارتی خدمات بظاہر تو بہت موثر نظر آتی ہیں مگر اس کی کوشش کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ اسے ملک واپس پہنچنے کا حکم ملتا ہے۔ وہ جب رخصت ہوتا ہے تو Ratsan حکومت کی طرف سے طلائی تمغہ دیا جاتا ہے۔ وہ ایک صبح بیدار ہوتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے اس کی دم آگ چکی ہے اور وہ چوہا بن چکا ہے۔ چوہوں کے دیس میں رہتے ہوئے وہ خود بھی چوہا بن جاتا ہے۔

اس ناول میں اس نے بیانیہ تکنیک استعمال کی تھی۔ یہ تکنیک اس اعتبار سے موثر ثابت ہوئی ہے کہ ملکی اور بین الاقوامی صورت حال کے مختلف پہلوؤں پر تبصرہ کرنے کی خاصی گنجائش ہوتی ہے۔ اس ناول کے کردار مختلف ممالک سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والے افراد کی اجتماعی نفسیات پر معنی خیز تبصرے کرتے ہوئے طنز کی نشتریت سے کام لینے کے بھرپور مواقع ملے ہیں۔

زوال کے اس بین الاقوامی ٹل کو افسانوی ادب میں پیش کرنے والوں میں احمد علی کے اور بھی معاصرین شامل تھے لیکن احمد علی کے تجربات و مشاہدات ان سے زیادہ تھے اس لیے اس کے تخلیقی تجربات اسے انفرادیت عطا کرتے ہیں۔

دنیاوی اعتبار سے وہ شہرت و ناموری کے تمام مواقع حاصل کرتا رہا۔ امریکا کی مختلف درس گاہوں میں لیکچر دیتا رہا۔ امریکا کی ساوڈرن الینا کس یونیورسٹی میں انگریزی کے فل برائنٹ پروفیسر کی حیثیت سے بھی وابستہ رہا۔ اس کی علمی خدمات کی بدولت امریکی ریاست نمبر اسکائے اسے اعزاز کی



راکھ کا آسیب

ابن کبیر

حادثات رونما ہوتے ہیں، لوگ بھول جاتے ہیں لیکن کچھ حادثے ایسے ہوتے ہیں جو تا عمر ذہن پر ثبت رہ جاتے ہیں۔ قدرتی آفات تو گہرے نقوش چھوڑ جاتی ہیں۔ یہ حادثہ بھی ایسا ہی ہے جس نے آدھے یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ معیشت بل کر رہ گئی تھی۔ ایک درجن سے زائد ممالک کے ہوائی مستقر بند کر دیے گئے تھے۔ سورج تک نظر نہیں آتا تھا، قدرت سزا دینے پر آئے تو ایسا بھی ہو جاتا ہے۔

اس صدی کی بڑی قدرتی آفات میں سے ایک کا تذکرہ

کھولنے والی موسیقی ترتیب دیا کرتا تھا لیکن اُس وقت دریا کا پانی جو زندگی کی علامت تصور کیا جاتا تھا، پوری طرح تیزابی ہو گیا تھا اور ان ستونوں کو بگھلا رہا تھا، چاٹ رہا تھا، جن پر یہ مِل کھڑا تھا۔

باہر آتش فشاں کی حیثیت سے وہ جانتا تھا کہ اپنی طلسماتی خاموشی کے لیے مشہور یہ حسین ٹاؤن سکواگرا ب کھنڈر بننے کو ہے، تاہم اسے یہ خوف بھی لاحق تھا کہ اگر فوری اقدامات نہیں کیے گئے تو یورپ کا ہوائی آمد و رفت کا نظام ناقابل تلافی نقصان سے دوچار ہو جائے گا اور ہزاروں معصوم انسان موت کی فینڈ سو جائیں گے۔

اس نے گہرا سانس لیا اور فضا میں پیوست سلفر کی تلخ بو کو اپنے نچھون میں محسوس کیا۔ اب وہ بڑی مایوسی سے اس

آسمان جہنمی راکھ سے اٹ گیا تھا۔ قدرت کا قہر ہر شے کو نکلنے پر آمادہ تھا۔ زندگی دم توڑ رہی تھی اور ایسے میں ایک چٹکڑا ستانی دی، خوفناک چٹکڑا جو انسانی تن سے امید کی روح جدا کرنے کی قوت رکھتی تھی۔

”ایچا لاجوکل“ کی چوٹی پر، جو موت کی علامت بن چکی تھی، ایک اور خوفناک دھماکا ہوا تھا۔ اس کے دہانے نے مزید راکھ اچھالی تھی اور یہ سیاہ راکھ نہ صرف آنکس لینڈ بلکہ ہمارے یورپ کو اپنی لپیٹ میں لینے والی تھی۔

اُس وقت یاسیت کا شکار جیمز ڈکنز خوفی چوٹی کے انوکھ میں واقع تباہ حال قصبے ”سکوگر“ کو دنیا سے جوڑنے والے پُل پر کھڑا تھا، جس کے نیچے پھرا ہوا دریائے سکواگرا بہا رہا تھا۔ ابھی اس دریا کا بہاؤ انسانی سماعتوں میں رس

نے ادبوں کے لیے شجر ممنوعہ بن گیا تھا۔ کراچی میں رجبے ہوئے نئی نسل کے ادبوں نے اسے دیکھا تک نہیں تھا۔ وہ مسلمان تھا اس لیے اس سے کہا گیا تھا، تم دہلی مت آؤ، پاکستان جاؤ لیکن پاکستان آ کر کیا دیکھا۔ اپنے انتقال تک دو طویل مارشل لائیو دیکھے۔ دو جنگیں دیکھیں۔ اپنے ملک کو ٹوٹتے ہوئے دیکھا۔ کراچی میں قتل و غارت کا بازار گرم ہوتے ہوئے بھی دیکھا۔ اتحاد کی زنجیر کو ٹوٹتے ہوئے بھی دیکھا۔ نفسا نفسی کو پھٹتے ہوئے بھی دیکھا۔

وہ یہ سوچ کر خوش ہو لیتا کہ دنیا جائے بھار میں، مجھے تو سر آنکھوں پر بٹھایا جا رہا ہے۔ ایسا بھی نہیں ہوا۔ دیارِ غیر میں اس پر بہت کچھ لکھا گیا مگر انہوں کی بے حسی پر وہ ہمیشہ شکوہ کناں رہا۔ اس لیے وہ اپنی ذات کے خول میں بند ہوتا چلا گیا۔ ادبی محفلوں سے رابطہ منقطع کر لیا۔ پُرانے دوست دنیا سے رخصت ہو گئے۔ نئے دوست بنانے کی ہمت نہیں تھی۔ ایک چھوٹی سی پہاڑی کو تراش کر ایک خوبصورت گھر بنالیا تھا جس میں ایک تہ خانہ بھی تھا۔ اس میں کتابیں تھیں۔

ایک چھوٹا سا پُرانہ راکھ تھا۔ ایک بہت بڑا ادیب تھا۔ عمر اپنا کام دکھا گئی تھی۔ بال سفید ہو چکے تھے۔ قوی متحمل ہو رہے تھے۔ خاص طور پر اعصاب۔ بات بات پر پوزک اُٹھتے تھے۔ ماعت کمزور ہو چکی تھی۔ آنکھیں پر دینر شیشوں کا چشمہ آگیا تھا لیکن کالی قریب نہیں آئی تھی۔ ہمیشہ کام کرتے نظر آتے تھے۔

”انگارے“ سے ”ترجمہ قرآن“ تک کا سفر یوں ہی تو طے نہیں کر لیا تھا۔

جنوری 1994ء کے پہلے عشرے میں طبیعت خاصی ابتر ہو گئی۔ اسپتال پہنچا دیے گئے۔ 14 جنوری 1994ء جمعرات اور جمعہ کی درمیانی شب کو وہ زندگی کی قید سے رہائی پا گئے۔

نماز جنازہ میں عزیز واقارب کے علاوہ ادبوں، شاعروں نے شرکت کی۔ پاکستان ٹیلی ویژن نے یہ تک بتانا گوارا نہیں کیا کہ پروفیسر احمد علی مرگئے۔

ماخذات

پروفیسر احمد علی، حیات اور ادبی خدمات

از ڈاکٹر محمد کامران

عبدالماجد دریا بادی، احوال و آثار ڈاکٹر حسین فراقی

سجاد ظہیر مرتبہ ڈاکٹر سید جعفر احمد

شہریت سے نوازا۔ پاکستان میں بھی اسے اکادمی ادبیات پاکستان کی بنیادی رکنیت کے اعزاز سے نوازا گیا۔ گورنر سندھ کی جانب سے اسے کراچی یونیورسٹی کی سینیٹ کا رکن نامزد کیا گیا۔

وہ یہ تمام ادبی کام سرانجام ضرور دے رہا تھا لیکن بعض باتیں ایسی ضرور ہوئی تھیں کہ اس کی تلخی اور تنہائی پسندی کا سبب بن گئی تھیں۔ کراچی جیسے بھرے شہر میں وہ اکیلا تھا۔ تقریبات کے اُجالوں سے دور حیدر علی روڈ پر واقع اپنے مکان کی تہ خانے میں کتابیں کھیرے لکھنے پڑھنے میں مشغول رہتا تھا۔ بیوی کے انتقال کے بعد وہ بالکل ہی تنہا ہو گیا تھا۔

اسے وہ سلوک یاد آتے تھے جو اس کے ساتھ دروار کھے گئے۔ اس کے ناول *Twilight in Delhi* کو بین الاقوامی سطح پر پذیرائی حاصل ہوئی تھی لیکن جب آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے مذکورہ ناول کا ایڈیشن شائع کر کے پاکستان بھجوا یا تو کسٹم کے حکام نے اسے پاکستانی سرحد میں داخل نہیں ہونے دیا۔ کراچی ٹی وی نے جب اس ناول کو اسکرین پر پیش کرنا چاہا تو اسے سرحد پار کے ممنوعہ شہر کی کہانی قرار دے کر مسترد کر دیا گیا حالانکہ اس کا مصنف مسلمان تھا۔ پاکستانی تھا اور وہی جس کے گرد اس ناول کی کہانی گھومتی تھی، مسلمانوں کا مرکز رہ چکی تھی۔ اب بھی کروڑوں مسلمانوں کے دل اس شہر کے لیے دھڑکتے تھے اور پھر ادب کی کوئی سرحدیں تو نہیں ہوتیں۔ کیا اس سلوک نے احمد علی کی روح کو زخمی نہیں کیا ہوگا؟

وہ جب 1947ء میں دہلی سے چین گیا تھا اور برصغیر کی تقسیم عمل میں آگئی تھی تو ہندوستانی حکومت نے یہ کہہ کر اسے دہلی جانے سے روک دیا تھا کہ وہ مسلمان ہے۔ وہ اپنے بچپن کی ساتھ بھلی دہلی کو چھوڑ کر پاکستان آ گیا تھا۔ اس نا انصافی پر اس کا دل ایسا دکھاتا تھا کہ پھر بھی دہلی نہیں گیا۔ ایک مرتبہ آسٹریلیا جاتے ہوئے طیارے کی فنی خرابی کی وجہ سے دہلی ایئر پورٹ پر ہنگامی لینڈنگ کرنی پڑی۔ اس نے طیارے سے اترنے سے انکار کر دیا۔ اب وہ اس سرزمین پر اترنا بھی نہیں چاہتا تھا جس کا جذبہ خودداری ایسا ہو، اس کے دل پر کیا گزری ہوگی جب اس کے ناول کی ڈرامائی تشکیل سے یہ کہہ کر انکار کر دیا گیا ہو کہ یہ سرحد پار کے ممنوعہ شہر کی کہانی ہے۔ اس نے ضرور اپنے آپ سے پوچھا ہوگا تو کیا میں بھی شجر ممنوعہ ہوں؟ ہوں تو کہیں کوئی مجھے چکھ نہ لے۔ وہ واقعی کراچی کے

جیب کی طرف دیکھ رہا تھا جس میں ایسا سوار تھی جس کا حسین چہرہ خدشات نے گہنا دیا تھا۔ اپنا کی گود میں اس کا سات سالہ بیٹا الیگزینڈر تھا جو زخمی تھا اور اسے فوری طبی امداد کی ضرورت تھی۔

کیبارگی مایوسی اور اندیشوں میں گھرے جیمز کو اپنا مقصد یاد آ گیا۔ اس نے ہمت باندھی اور جیب کی جانب بڑھنے لگا۔ اسے ننھے الیگزینڈر کی زندگی بچانی تھی جسے اب وہ بچنے کی طرح چاہنے لگا تھا۔

14 اپریل 2010ء کی وہ غارت گر شام، رات میں تبدیلی ہو رہی تھی۔ تاریکی دبیز ہوتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

آتش فشاں پر تحقیق کرنے والے ادارے ”امریکی ارضیات سروے“ سے منسلک جیمز ڈکنز کو چار برس قبل کولمبیا میں جس ایسے کا سامنا کرنا پڑا تھا، اس نے اُس کی زندگی کو یکسر بدل دیا تھا۔

اس سے قبل وہ توانائی سے بھرپور ایک خوش قسمت انسان تھا۔ جس مزاج کی وجہ سے وہ اپنے ساتھیوں میں بہت مقبول تھا، محافل میں اس کی زندہ دلی کے چرچے ہوتے تھے۔ آتش فشاں پہاڑوں کے رویے پر اس کی گہری نظر تھی، اس کام میں اُسے ماہر مانا جاتا تھا۔ سب اس کی عزت کرتے تھے۔

کام کے سلسلے میں وہ دنیا کے کئی ممالک کا رخ کر چکا تھا جہاں اسے تفصیل پہاڑوں کا سامنا کرنا پڑا۔ چلی، فلپائن، انڈونیشیا، اٹلی، برطانیہ، چین، جاپان، یوگوسلاویہ ہر ملک میں اس کا تجربہ بہت بھروسہ اور یادگار رہا، ماسوائے کولمبیا کے، جہاں وہ، جیسے ہوئے پتھروں کی برسات میں اپنی شریکو حیات جولیا ڈکنسن سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہاتھ دھو بیٹھا۔

کم گو، شرمیلی اور انتہائی حسین جولیا اس کی نیم کا حصہ تھی۔ وہ کمپیوٹر ٹیکنالوجی کی ماہر تھی اور آتش فشاں میں آنے والے تغیرات پر نظر رکھتی تھی۔ جیمز کی توانائی کا بنیادی سبب جولیا ہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے، تاہم جب کولمبیا میں ایک آتش فشاں انتہائی غیر متوقع طور پر پھٹ پڑا، اس سے اٹھتی نیلی پہلی چنگاریوں نے جیمز کی زندگی کو بے رنگ کر دیا۔

اس واقعے نے اسے خاموش کر دیا۔ اس کے ساتھیوں نے جو گزشتہ کئی برس سے اس کے ساتھ تھے، اسے زندگی میں واپس لانے کی کوشش کی، بھرپور کوشش... تاہم وہ ناکام

رہے۔

اور ایک روز بالآخر وہ خود ہی یا سیت سے باہر آیا اور پھر متحرک ہو گیا۔ دراصل اس نے دل میں تپہ کر لیا تھا کہ اب وہ اپنی مہارت کو بروئے کار لاتے ہوئے آتش فشاں کی تباہ کاریوں سے معصوم انسانوں کو محفوظ رکھنے کے لیے خود کو بج دے گا، یہی جذبہ اسے آئس لینڈ لایا جہاں زندگی بدل دینے والا تجربہ اس کا منتظر تھا۔

گوکہ وہ ماضی میں بھی آئس لینڈ میں کام کر چکا تھا لیکن اس بار اسے اپنی چھٹیاں منسوخ کرنی پڑیں۔

☆☆☆

وہ یکم اپریل کی اداس شام تھی! جیمز کا فون مسلسل بج رہا تھا۔ اُس نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف اس کا باس سائمن دانتے تھا۔ اس نے جیمز کو فوری دفتر پہنچنے کی ہدایت کی۔ جب جیمز نے اسے یاد دلایا کہ وہ چھٹیوں پر ہے تو سائمن نے یہ کہہ کر فون رکھ دیا۔ ”یہ ہزاروں انسانوں کی زندگی کا معاملہ ہے، نوجوان!“

اس کا خیال تھا کہ سائمن نے اسے یکم اپریل کی مناسبت سے بیوقوف بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے تاہم جب اسے میٹ کی فون کال موصول ہوئی تو اسے یقین ہو گیا کہ یہ انتہائی سنجیدہ معاملہ ہے۔

دو گھنٹے بعد وہ میٹنگ روم میں تھا۔ 60 سالہ گھر دے

چہرے والا سائمن ایک بڑی ٹی وی اسکرین کے سامنے کھڑا تھا، جس پر آئس لینڈ کا نقشہ نظر آرہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس پر برف سے ڈھکی ایک چوٹی دکھائی دینے لگی، یہ پہاڑ شانت اور پرسکون معلوم ہونے والا ”کلیشیر“ ”ایجا فلا جھول“ تھا۔ سوکھو میٹر کے رقبے پر پھیلے اس پہاڑ کا شمار آئس لینڈ کے چھوٹے ”کلیشیرز“ میں ہوتا تھا۔ اس وقت جیمز یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ چند دن بعد یہی چوٹی پورے یورپ کے لیے خوف کی علامت بن جائے گی۔

اسکرین پر تصویریں بدل رہی تھیں اور میٹنگ ہال میں سائمن کی بھاری آواز گونج رہی تھی۔ ”دوستو، یہ ایک سنجیدہ معاملہ ہے۔ اسکرین پر آپ کے سامنے آئس لینڈ کا ایک برف سے ڈھکا آتش فشاں ہے۔ دسمبر 2009ء میں اس ”کلیشیر“ کے نزدیکی حصوں میں کچھ غیر متوقع گزبود دیکھنے میں آئی جس نے مقامی ماہرین کو چونکا دیا۔ تجربے کے بعد بتا چلا کہ وہاں ہزاروں چھوٹے چھوٹے، انتہائی کم شدت کے زلزلے آئے تھے۔ البتہ چند ایسے جھٹکے بھی تھے جن کی شدت ریکٹر

اسکیل پر 3 کے قریب تھی، تاہم ان کا علاقہ بہت محدود تھا جس کے سبب آبادیوں پر منفی اثرات مرتب نہیں ہوئے پھر بھی اس واقعے نے حکام کو چونکا کر دیا۔“

”آخری بار غالبا 1821ء میں اس نے لاوا اُٹھا تھا۔“ جیمز نے اپنی یادداشت کھنگالتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک کہا جی...“ کیٹ والس نے کمپیوٹر اسکرین سے نظریں اٹھائیں۔ کیٹ نے جولیا کی موت کے بعد یہ کام سنبھال لیا تھا۔ ابتدا میں جیمز کے لیے اسے قبول کرنا مشکل رہا تھا، جولیا کی کرسی پر کسی اور کو دیکھنا ایک اذیت ناک تجربہ تھا، تاہم جلد ہی وہ کیٹ کی مہارت کا قائل ہو گیا۔

کیٹ نے میٹنگ کے شرکاء کو بتایا کہ 26 فروری 2010ء کو بھی اس علاقے میں کچھ پریشان کن علامات نظر آئی تھیں جس کے بعد میٹروپولیٹن انسٹی ٹیوٹ آف آئس لینڈ نے چٹان کے اندرونی حصے میں لاوے کے بڑھنے کے امکانات کا جائزہ لیا اور اپنے خدشات ظاہر کیے، تاہم چند ماہرین خصوصاً اعلیٰ حکام یہ ماننے کو تیار ہی نہیں کہ تباہی آئس لینڈ کے دروازے پر دستک دے رہی ہے۔

”اور اس کا سبب؟“ اڈیٹر عمر ٹیلیفون اور فرنیچر کی جانب مائل میٹ ڈیکن نے سوال کیا۔ وہ مشینوں کو برتنے کا ماہر تھا۔

”نورائزم کو لا حق خطرات!“ سائمن نے کہا۔ ”اگر یہ اعلان کر دیا جائے کہ کوئی آتش فشاں پھٹنے والا ہے تو سیاح اس ملک کا قطعی رخ نہیں کریں گے، جس سے نہ صرف ملک بلکہ پورا خطہ متاثر ہوگا اور کوئی حکومت ایسا نہیں چاہے گی۔ خیر، مارچ کی ابتدائی تاریخوں میں بھی یہاں زلزلے کے جھٹکے محسوس کیے گئے۔“

”اور سیاح تا حال وہاں جا رہے ہیں؟“ جیمز نے سوال کیا۔

”ہاں!“ سائمن بولا۔ ”یہ تمام اطلاعات خفیہ ہیں۔ فقط ہم ان سے واقف ہیں اور ہمیں آئس لینڈ کے ماہرین کی مدد کے لیے جانا ہوگا۔“

اب کیٹ اس آتش فشاں کے بارے میں آخری اطلاعات اُن تک پہنچا رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ ملاقاتی ماہرین نے 20 مارچ 2010ء کو ”ایجا فلا جھول“ اور ”میر دالس جھول“ کے درمیانی حصے میں کھڑے برفانی ”کلیشیر“ ”ٹورو مھیلس“ کے پھٹنے کا خدشہ ظاہر کیا تھا۔ گوکہ حالات زیادہ نہیں بگڑے، تاہم میونسپل رینگر پنک کی

آبادیاں ضرور متاثر ہوں گی۔

”تو کیا یہ علاقہ خالی کر دیا گیا ہے؟“ میٹ نے سوال کیا۔

”نہیں!“ سائمن نے کہا اور پریشانی اُس کے چہرے سے عیاں تھی۔ ”مقامی لوگوں کا خیال ہے کہ ایجا فلا جھول جلد شانت ہو جائے گا۔ وہ اپنی چھتوں سے آتش فشاں سے نکلنے والی راکھ جھاڑ کر معمول کی زندگی کی طرف لوٹ چکے ہیں۔“

”یہ تو پریشان کن ہے۔“ جیمز بہت سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

☆☆☆

6 اپریل کو جیمز ڈکنز اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شمال مغربی یورپ کی جزیرہ نما ریاست، جمہوری آئس لینڈ کے دار الحکومت ”ریکیاویک“ کے ایئر پورٹ پر اترا۔ یہ ریاست اٹلانٹک سمندر میں یورپ اور گرین لینڈ کے درمیان واقع ہے اور ابتدا ہی سے ماہرین ارضیات کی توجہ کا مرکز رہی ہے۔ اس کا بڑا حصہ آتش فشاں اور ”کلیشیرز“ پر مشتمل ہے۔ ان ہی ”کلیشیرز“ سے دریا نکل کر زیریں حصے سے ہوتے ہوئے سمندر میں گرتے ہیں۔

میزبان حکومتی اہل کار اور ماہر ارضیات، ڈیٹیل جان تھا۔

”امریکی دوستو، آئس لینڈ میں خوش آمدید! آپ اس وقت ایک ایسی ریاست میں موجود ہیں جو انسانی ترقی کے لحاظ سے دنیا میں دوسرے، اور جی ڈی پی کے لحاظ سے پانچویں نمبر پر ہے۔“ اُس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

ہوٹل میں سامان رکھنے کے کچھ دیر بعد امریکی ماہرین کی نیم میٹروپولیٹن سروے آف آئس لینڈ کے دفتر میں تھی جہاں تمام امکانات پر بحث ہو رہی تھی۔ جیمز نے واضح طور پر محسوس کیا کہ اس کا باس، سائمن غیر ضروری طور پر معاملے کا روشن پہلو دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے اور خطرے کو کم کر کے پیش کر رہا ہے۔ مقامی اہل کار بھی اس سے متفق نظر آتے تھے۔

جیمز، سائمن کے اس رویے کی وجہ جانتا تھا۔ دراصل کئی برس قبل، چلی میں تحقیق کے دوران سائمن نے بہ طور ماہر یہ دعویٰ کیا تھا کہ آتش فشاں جلد پھٹ جائے گا اور قریبی علاقوں، بلکہ پورے ملک میں ایمر جنسی نافذ کرادی تھی۔ خوش قسمتی سے آتش فشاں نہیں پھٹا لیکن سائمن کے فیصلے سے چلی میں سیاحت کو شدید نقصان پہنچا جس کے بعد چلی کی

حکومت نے امریکی حکومت سے اس کی شکایت بھی کی۔ اسی باعث سائنس بہت محتاط ہو گیا تھا۔

جب بحث طول پکڑ گئی تو جیمز کھڑا ہو گیا۔ ”بھائیو، میں آپ کی توجہ چاہتا ہوں۔“

اس کے لہجے میں غصہ اور تھا۔ سب خاموش ہو گئے، تو اس نے کہا۔ ”دیکھیں، آئس لینڈ ارضیاتی اعتبار سے انتہائی متحرک، ڈائنامک پلیٹ پر واقع ہے جو بالکل اس کے درمیان سے گزرتی ہے۔ یہاں بہت سارے آتش فشاں موجود ہیں جو خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ آپ کو یاد ہو، 1783ء میں لاکہ میں ایک آتش فشاں پھٹا تھا جس سے اٹھنے والا دھواں خوفناک بادلوں کی صورت نہ صرف یورپ، بلکہ ایشیا اور افریقہ پر بھی کئی ماہ چھایا رہا تھا۔“

”یہ تو ہم جانتے ہیں مسٹر جیمز۔“ ڈینیئل جان نے کہا۔

”کھل کر کہیں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔“

جیمز نے ایک نظر سائنس پر ڈالی جس کے چہرے پر خاموشی تھی۔

”دیکھیں، میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ خطرہ بہت زیادہ ہے، تاہم اگر آتش فشاں نے راکھ اٹھی تو اس بار صورت حال 1783ء کے مقابلے میں کئی گنا بدتر ہوگی، کیونکہ اس بار یہ علاقہ فضائی آمدورفت میں ایک اہم زون کی حیثیت رکھتا ہے۔“

وہاں خاموشی چھا گئی۔

”تو آپ کی تجویز کیا ہے مسٹر جیمز؟“ بالآخر ڈینیئل نے خاموشی توڑتے ہوئے سوال کیا۔

”میں فوری طور پر وہاں جانا چاہتا ہوں۔“ اس کے لہجے میں عزم تھا۔

☆☆☆

جیمز ”ریکیاوک“ سے اڑان بھرنے والے جہاز میں سوار تھا جس کی منزل ”ہیٹھینر فجوور“ کا حسین شہر تھا۔ ”ہیٹھینر فجوور“ آبادی کے لحاظ سے آئس لینڈ کا تیسرا بڑا شہر تھا جہاں کا ہنرہ آنکھوں کو حیرت اور دل کو سکون بخشتا تھا۔

جیمز کی میزبانی کے فرائض وہاں کے میئر نے انجام دیے، جس کے ساتھ اس نے شہری انتظامیہ کے تحت ہونے والی ایک یادگار تقریب میں بھی شرکت کی، جس میں ”ہیٹھینر فجوور“ کے کلاکاروں نے بڑی خوبصورت پرفارمنس دی۔ مقامی ڈسٹرکٹ کاؤنٹی بھی طویل عرصے تک جیمز کی زبان پر رہا۔ میئر نے وہاں کے سوشلنگ پول کا بھی دورہ کروایا، جو

شہر کا خاصے تھے۔

اس دوران جیمز کو کسی قسم کی ابلاغی رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ دراصل آئس لینڈ میں جنوبی جرمن زبان بولی جاتی ہے، جو قدیم نورس زبان کے بہت قریب ہے۔ البتہ یہاں انگریزی اور ڈینش زبانیں بھی عام بولی اور بھی جاتی ہیں اور دونوں ہی نصاب کا حصہ ہیں۔

”یہ شہر خوبصورت ہے۔“ جیمز کے لہجے میں ستائش تھی۔

”شکریہ امریکی دوست۔“ میئر کی آنکھوں میں خوشی دیکھی جاسکتی تھی۔ ”ہمیں اپنی ثقافت پر ناز ہے۔ کیا آپ بتانا پسند کریں گے کہ آپ کی یہاں آمد کا مقصد کیا ہے؟“

جیمز تذبذب کا شکار تھا۔ سائنس کی ہدایت کے پیش نظر، چاہتے ہوئے بھی اس نے اپنے مقامی دوست کو اپنے خدشات سے آگاہ نہیں کیا۔ فقط اتنا کہا کہ وہ ایجا فاللا جوکل کا معاہدہ کرنے کا منصوبہ لے کر یہاں آیا ہے۔

”ہاں، وہ گزشتہ چند دنوں سے غصے میں ہے۔“ میئر مسکرایا۔ ”تاہم وہ اتنا فصیح نہیں، اس سے وہاں کے باسیوں کی اچھی دوستی ہے۔ امید ہے، وہ اپنا قہر نازل نہیں کرے گا۔“

جیمز جواب میں مسکرا دیا۔

آتش فشاں اور قریبی آبادیوں میں دوستی ایک قدیم تصور ہے جو دنیا بھر میں پایا جاتا ہے۔ اس تصور کے مطابق قریبی آبادیاں مختلف رسموں کی ادائیگی سے پہاڑ سے دوستی کر لیتی ہیں، پہاڑ شانت اور خاموش ہو جاتا ہے اور لاوا اگلنے سے باز رہتا ہے۔ یہ طور ماہرہ بہ خوبی واقف تھا کہ یہ تصور غامض خیالی پر مبنی ہے، تاہم اس نے میئر کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

”میری خواہش ہے کہ ایسا ہی ہو، تاہم ہمیں بدترین حالات کے لیے تیار رہنا چاہیے۔“ جیمز نے کہا۔

”جی ہاں، آپ درست کہتے ہیں، میں جانتا ہوں کہ 1783ء میں لاکہ میں ایک آتش فشاں پھٹا تھا جس نے ہماری تاریخ کو گہنا دیا تھا، میری دعا ہے کہ دوبارہ ایسا نہ ہو، خیر میری درخواست ہے کہ جب آپ وہاں جائیں تو قریبی ٹاؤن ”سکوگر“ کا ضرور رخ کریں، اسے دنیا کا خوب صورت ترین گاؤں کہا جاتا ہے جہاں اتنا سکون اور ٹھہراؤ ہے کہ انسان خود کو باغ عدن میں محسوس کرتا ہے۔“ میئر نے بڑی محبت سے درخواست کی۔

”میں وہاں ضرور جاؤں گا جناب۔“ وہ خوش دلی سے مسکرایا اور میلوں ڈور کھڑی بلنڈ، برف سے ڈھکی چوٹیوں پر نظر ڈالی۔ وہ جانتا تھا کہ جب بھی برف سے ڈھکے آتش فشاں پھٹتے ہیں تو حالات زیادہ سنگین ہوتے ہیں، کیوں کہ گلیشیر پگھل کر تیزابی پانی کی صورت اختیار کر لیتا ہے جو نہ صرف آبادیوں پر عذاب نازل کرتا ہے بلکہ آتش فشاں کی جاہ کاری کو بھی ہمیز کرتا ہے۔

اب اس کی منزل میونسپلٹی ریگر پنگ ایسٹرا کا ٹاؤن ”ہوولس ولور“ تھا، جو مستقبل قریب میں دنیا کے لیے قہر کی علامت بن جانے والے ”ایجا فاللا جوکل“ نامی گلیشیر کے بے حد نزدیک تھا۔

8 اپریل کی دوپہر وہ اس خوبصورت ٹاؤن کے چھوٹے سے انٹرپورٹ پر اترا۔ اسی دوران اس نے سائنس کو ایک خصوصی ای میل کی جس میں اسے آنے والے خطرات سے آگاہ کرتے ہوئے عملی اقدامات کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔

سائنس نے اسے جواب میں یہ کہہ کر مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ وہ، میٹ اور کیٹ تمام ضروری آلات اکٹھے کر کے جلد اس سے آن ملیں گے۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ اس نے آئس لینڈ کے اعلیٰ حکام کو خطرات سے آگاہ کرتے ہوئے ہجر پور رد، خصوصاً نیلی کا پیرز اور ایداوی گاڑیاں فراہم کرنے کی درخواست کی ہے اور اسے یقین دلایا گیا ہے کہ جلد تمام ضروری آلات اور ایشیا انہیں فراہم کر دی جائیں گی۔ اس نے جیمز کو مطلع کیا کہ آئس لینڈ کی حکومت کی طرف سے ڈینیئل جان ان کے ساتھ ہوگا۔

جیمز نے سائنس سے جلد از جلد وہاں پہنچنے کی درخواست کی تھی، تاہم اس کا پاس خطرے کا اندازہ لگانے میں سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں کر رہا، وہ تا حال چلی کے اس واقعے میں مقید تھا جس نے اس کے اعتماد کو متزلزل کر دیا تھا۔

☆☆☆

اس چھوٹے سے، سرسبز پہاڑوں سے گھرے انٹرپورٹ سے باہر آنے کے بعد اس کی ملاقات وہاں کے میئر ولور ایسے سے ہوئی جو ایک پُر اعتماد اور بااخلاق شخص تھا۔

کچھ دیر بعد جیمز، وکٹر کی جیب میں سوار ایک موٹیل کی جانب بڑھ رہا تھا۔ چہار سو فطرت کا سند زروب ٹھہرا ہوا تھا۔ اہم انتہائی خوش گوار تھا اور فضا میں خوشبو پھیلی تھی۔ درختوں کی لہلہ کی مٹی جن کے سائے میں لیٹنے کے بعد انسان خود کو

جنت میں محسوس کرتا ہے۔

اس مختصر سفر میں اس شہر کے حسن نے جیمز کو مسحور کر دیا، وہ بھول ہی گیا کہ وہ کن اندیشوں کے ساتھ اس علاقے میں آیا ہے۔ اچانک دل میں خیال آیا۔ ”اگر آتش فشاں پھٹا تو یہ حسن گہنا جائے گا۔“ اس خیال نے اسے خوف زدہ کر دیا۔

دوران سفر وکٹر اسے ٹاؤن کے بارے میں معلومات فراہم کرتا رہا۔ اس نے بتایا کہ اس گاؤں کے باسیوں کی تعداد ہزار کے لگ بھگ ہے۔ اس کے ارد گرد بسنے والوں کی تعداد بھی چھ سو سے زائد ہے، اس آبادی کو بھی میونسپلٹی کا حصہ تصور کیا جاتا ہے۔

”یہ انٹرپورٹ چند برس قبل تعمیر ہوا ہے۔“ وکٹر کے لہجے میں مسرت اور احساسِ تقاضا تھا۔

جیمز جانتا تھا کہ اس انٹرپورٹ کے قیام میں وکٹر اور اس کی ٹیم نے کلیدی کردار ادا کیا تھا اور اسی کی کوششوں اور ان تھک محنت کی وجہ سے یہ علاقہ اور قریبی ٹاؤن ”سکوگر“ دنیا کی نظروں میں آئے تھے۔ نوجوان اور باصلاحیت وکٹر کی کوششوں سے علاقے میں صنعت کاری کا بھی آغاز ہو گیا تھا اور چند غیر ملکی سرمایہ کار بھی یہاں آنے کے لیے پرتول رہے تھے۔

اس نے جیمز کو بتایا کہ وہ بطور میئر تنخواہ وصول نہیں کرتا۔ گزرا ہر کے لیے ایک پولٹری فارم چلاتا ہے جو ٹاؤن انتظامیہ کے دفتر کے نزدیک ہی ہے۔ علاقے کے دیگر باسی بھی سختی اور جفاکش ہیں۔ ”ہمیں خوشی ہے کہ ہم دنیا کے خوبصورت ترین علاقے میں رہتے ہیں۔“ وکٹر کے لہجے میں خوشی تھی۔

”یہ واقعی خوب صورت ہے۔“ جیمز نے کہا۔

جیب موٹیل کے سامنے جا کر رکی۔ وہ موٹیل پہاڑوں کے دامن میں تھا۔ اس کے گرد چند اور مکانات بھی تھے۔ وہاں اس کی ملاقات ایسا سے ہوئی، جو وکٹر کی سیکریٹری اور رشتے میں اس کی بہن تھی۔ پیٹھے کے لحاظ سے وہ ایک نرسٹ گائیڈ تھی اور موٹیل کے نزدیک ہی رہتی تھی۔ اس وقت اس کا سات سالہ، نیلی آنکھوں والا حسین بیٹا الیگزینڈر بھی وہاں موجود تھا۔

”اینا بہت قابلِ خاتون ہیں۔“ وکٹر نے اپنی کزن کا تعارف کر دیا جس کے چہرے پر سادگی، آنکھوں میں اعتماد اور شخصیت میں وقار تھا۔

”یہ آپ کا ہر خیال رکھیں گی اور ہر معاملے میں آپ کی راہنمائی کریں گی۔“

پھر اس نے کھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے اجازت طلب کی۔ ”دوست مجھے جانا پڑے گا۔ برطانیہ سے آئے ایک سرمایہ کار مسٹر چارلس سے ملاقات ملے ہے۔ جلد ملتے ہیں۔“

وکنز کے جانے کے بعد اب اپنا اس کے سامنے بھی ہوئی منیجر نے اس کا سامان کمرے میں رکھوا دیا تھا اور چابی اس کے حوالے کر دی تھی۔

”آپ تازہ دم ہو جائیں، پھر ہم ڈاننگ ہال میں ملتے ہیں۔“ اپنا کی منیجر آواز سنائی دی۔

نہا دھو کر جب جیمز اس چھوٹے سے سونیل کے سلیقے سے سجے ہوئے ڈاننگ ہال میں پہنچا تو اپنا اور الیکٹرینڈر وہیں موجود تھے۔ تینوں میں مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا۔ منیجر میزبانی کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ جیمز نے بڑی رغبت سے کھانا کھایا، جو سادہ پر انتہائی لذیذ تھا۔ اس دوران اپنا اسے علاقے کے بارے میں مطلع کرتی رہی۔

”یہ شہر اپنی رزمیہ داستانوں، خصوصاً ایک سورما کے تعلق سے بہت مشہور ہے۔“ اپنا نے شہر گریزی میں کہا۔

”اوہ، کیا واقعی؟“ آپ مجھے یہ کہانی سنانا پسند کریں گی محترمہ؟“

”کیوں نہیں؟“ اپنا کے لہجے میں خوشی تھی۔

اس نے اس علاقے میں جنم لینے والے اُس سورما کی کہانی بیان کی، جسے بیرونی حملہ آوروں نے غلام بنالیا تھا اور اپنے ملک لے جا کر اُسے اکھاڑے میں اتار دیا جہاں وہ اپنے جیسے انسانوں کی جان لینے پر مجبور تھا۔ وہاں کے بے حس اور ظالم حکمران اس خونیں کھیل سے بہت محفوظ ہوا کرتے تھے۔ بالآخر اس سورما نے بغاوت کر دی اور اکھاڑے میں موجود دیگر غلاموں کو اپنے ساتھ ملا کر حاکموں کا قتل عام شروع کر دیا۔ کہانی کے آخری حصے میں گوکہ اُسے قتل اور اس کے ساتھیوں کو مصلوب کر دیا جاتا ہے، مگر اُس کی بغاوت سے عوام کو پہلی بار آزادی کا احساس عطا ہوتا ہے جس کے بعد نئی بغاوت جنم لیتی ہے۔

جیمز کو یہ کہانی اسپارٹکس کی لازوال داستان سے بے حد قریب محسوس ہوئی جس کا تعلق یونان کی سرزمین سے تھا۔

اپنا نے باتوں باتوں میں اُسے یہ بھی بتایا کہ اُس کے شوہر، اہلی واک کا چند برس انتقال ہو چکا ہے۔ اُس کا بیٹا الیکٹرینڈر مقامی اسکول میں پڑھتا ہے۔ آج کل اس کی

چھٹیاں ہیں۔ جب کہ اس کا سابق مسٹر مارکیز واک ”سکوگر“ میں مقیم ہے۔

”گوکہ ہم دونوں میں ہمیشہ اختلاف رہا تاہم اپنے پوتے کے لیے ان کے دل میں بہت محبت ہے، جس کی وجہ سے میں سینے میں دوبارہ سکون محسوس کر رہا ہوں۔“ اس کے چہرے پر ادا ادا تھی۔

”میں بھی سکون جانے کا ارادہ لے کر یہاں آیا ہوں۔“

”کیا آپ مجھے وہاں لے جائیں گی۔“ جیمز نے سوال کیا۔

”بالکل، مجھے یہی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔“ اپنا مسکرائی۔ ”لیکن آپ وہاں کس مقصد کے لیے جانا چاہتے ہیں؟“

”میں اس غصیل آتش فشاں کا تجربہ کرنے کے لیے یہاں آیا ہوں جو اس علاقے سے بے حد قریب ہے اور گزشتہ ماہ اپنے غصے کا تھوڑا بہت اظہار بھی کر چکا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے جیمز کی نظریں کھڑکی پر لگی تھیں جہاں سے برقی چوٹیاں نظر آرہی تھیں۔

”کیا آپ کے خیال میں آتش فشاں قہر نازل کرنے والا ہے؟“ اپنا نے سوال کیا۔ جیمز نے محسوس کیا کہ اُس کے لہجے میں فکر مندی نہیں۔

”آپ کا کیا خیال ہے؟“ جیمز نے جواباً سوال کیا۔

”ہم برسوں سے یہاں رہ رہے ہیں۔ یہ پہاڑ ہمارے دوست ہیں، مجھے امید ہے کہ یہ اپنے غصے کا اظہار نہیں کریں گے لیکن...“ اپنا خاموش ہو گئی۔ ”لیکن مسٹر جیمز، حادثات پوچھ کر نہیں آتے۔ بہترین تیاری ہی خود کو محفوظ رکھنے کا واحد طریقہ ہے۔“ یہ کہہ کر وہ برتن سینے میں میجر کی مدد کرنے لگی۔

الیکٹرینڈر بہت اشیاق سے جیمز کو دیکھ رہا تھا۔ جیمز نے اس بچے کے لیے دل میں اپنا عین محسوس کی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ آئے والے چند دنوں میں اپنا اور الیکٹرینڈر اس کے لیے خصوصی اہمیت اختیار کر جائیں گے۔

☆ ☆ ☆

صبح چھ بجے وہ ”ہولس داور“ سے ”سکوگر“ کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ ٹاؤن ایجا فالا جوکل کے جنوب میں واقع تھا۔

جیمز اپنا چلا رہی تھی اور جیمز علاقے کی خوبصورتی کو اپنی آنکھوں میں محفوظ کرنے میں مگن تھا۔ اسے سامنے کی ای سیل لگتی تھی، جس کے مطابق تمام انتظامات مکمل کر لیے گئے

تھے اور وہ آج شام ”ریکیا وک“ سے روانہ ہونے والے تھے۔

9 اپریل کی دوپہر جب جیمز سکونگر میں داخل ہوا، قدرت کے حسن نے اُس کی آنکھیں خیرہ کر دیں۔ وہ ہر اس منظر کو بھول گیا جو اُس نے آج سے قبل دیکھا تھا۔ وہ گاؤں انتہائی حسین تھا۔ وہاں چند مکانات تھے جو اس خاص ڈھب پر تعمیر کیے گئے تھے کہ قدرتی ماحول کا حصہ معلوم ہوتے تھے۔ ان کی چیمنیوں سے اٹھتا دھواں، طلسماتی خاموشی اور سبزہ، یوں لگتا تھا جیسے وہ وقت میں کہیں بہت پیچھے چلا گیا ہے، جیسے وقت کسی حسین لمحے میں ٹھہر گیا ہے۔

جب جیمز دریائے سکونگر پر تھے اسی پل پر سے گزر رہی تھی جیمز نے اپنا سے چند منٹ ٹھہرنے کی درخواست کی۔ جیمز پل پر رک گئی۔ وہ نیچے اترا اور ریلنگ کے پاس جا کر ”کھڑا ہو گیا۔“ اُس نے دریا کے پانی پر نظر ڈالی جو انتہائی شفاف تھا اور جس کا بہاؤ دلکش موسیقی ترتیب دے رہا تھا۔ وہ اپنے دائیں جانب ایک آبشار بھی دیکھ رہا تھا۔ اپنا بھی جیمز سے آگے آئی اور جیمز کے پہلو میں کھڑی ہو گئی جو اس وقت فطرتی حسن کے جادو کے زیر اثر تھا۔

”سکوگر کے باسی اسے دنیا کا خوب صورت ترین گاؤں کہتے ہیں۔“ اس نے دھیرے سے کہا۔ ”ہاں، یہ ایک طلسماتی بستی ہے۔ چھوٹی سی، سبزے سے بھری، جنت نظیر!“

وہ تاحال سحر کے زیر اثر تھا۔

”یہ آکس لینڈ کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، جہاں تھوڑے بہت گھر ہیں، تھوڑے بہت لوگ بستے ہیں، جو بہت ہی بااخلاق اور زندگی سے بھرپور ہیں۔“ اپنا نے بتایا۔

”یہ آبشار کس قدر حسین ہے۔“ اس کے لہجے میں پرسکون ٹھہراؤ تھا۔

”ہاں!“ اپنا نے کہا۔ ”یہ آبشار سکونگس کہلاتی اور دریائے سکونگر سے نکلتی ہے۔ یہاں کا میوزیم بھی مشہور ہے جو چوبیس کھنڈے، سال کے 365 دن کھلا رہتا ہے۔ اگر آپ قریبی جنگل کو پار کر لیں تو پرانے زرعی نظام کی باقیات بھی مل جائیں گی۔“

”یوں معلوم ہوتا ہے، جیسے وقت کسی حسین پل میں ٹھہر گیا ہے۔“ وہ مسکرایا۔ ”میں نے سنا ہے کہ آکس لینڈ کا لوی ترانہ لکھنے والا شاعر میتھس جوکنسن (Matthias Jochumsson) اسی علاقے میں پیدا ہوا تھا۔“

”جی ہاں، آپ نے ٹھیک سنا ہے!“ اپنا کے چہرے پر

چمک تھی۔

جیمز نے پھر اپنی کہانیاں ریلنگ پر لگا دیں۔ وہ قدرت کے طلسم میں گم تھا۔ اس لمحہ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جلد یہ حسین علاقہ تاریکی میں گم ہو جائے گا!

☆ ☆ ☆

الیکٹرینڈر کا دادا، بوڑھا مارکیز واک کی روایتی خوش اخلاقی سے ملا۔ اس نے ”مینی فیز نظروں سے جیمز کا جائزہ لیا جس پر اپنا نے اسے فوری مطلع کر دیا کہ وہ فقط برقی چوٹی کے معائنے کی غرض سے یہاں آیا ہے۔“

”اوہ، تم امریکیوں کی اس بابت فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ نہیں سمجھتے والا!“ اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا۔

”مجھے امید ہے۔“ جیمز مسکرایا۔

اب وہ ایک چھوٹے سے انتہائی خوب صورت، لکڑی سے تیار کردہ گھر میں بیٹھے تھے جہاں آتش دان سے بھونکتی جدت بہت ہی خوشگوار لگ رہی تھی۔ پلن میں چولہے پر کیتلی رکھی تھی، جس میں مختلف قسم کی پتیوں سے تیار ہونے والی چائے آخری مراحل میں تھی، اس کی خوشبو سے مکان مہک رہا تھا۔

وہ ایک سکونگر گھر تھا لیکن جیمز یہ بھی جانتا تھا کہ حالات کسی بھی وقت بگڑ سکتے ہیں۔

میز پر کھانا مہن دیا گیا جو سادہ اور خوش ذائقہ تھا۔ اب وہ پہاڑ کا قریب سے مشاہدہ کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔

”مسٹر مارکیز، میں الیکٹرینڈر کو آپ کے پاس چھوڑ جاتی ہوں۔“ اس نے اپنے سابق مسٹر سے کہا۔

”ہاں، کیوں نہیں۔“ تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں خاتون!“ وہ مسکرایا۔ جیمز نے صاف محسوس کیا کہ وہ اپنا پر طنز کر رہا ہے۔

”میں گرم چشمے پر نہانا چاہتا ہوں۔“ اچانک الیکٹرینڈر نے کہا۔

”اچھا خیال ہے، تاہم ہم ایک ضروری کام سے جا رہے ہیں بیٹا!“ اپنا نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”کوئی مسئلہ نہیں اپنا، چشمے میں غسل اس بچے کے لیے فائدہ مند ہے۔ تم ہمیں راستے میں اتار دینا۔“ مجھے امید ہے مسٹر جیمز کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“ مارکیز نے کہا۔

”اوہ قطعی نہیں۔“ آپ ہمارے ساتھ چلیں مسٹر مارکیز۔“ جیمز نے بوڑھے کا طنز نظر انداز کرتے ہوئے

خوشدلی سے کہا۔

کچھ دیر بعد وہ چاروں ایجاٹا جھول کے انتہائی نزدیک موجود اس قدر ترقی گرم پانی کے چشمے پر تھے جس کے چاروں طرف دھواں گردش کر رہا تھا۔ وہاں کنارے پر کچھ مٹھلوک سے کپڑے پڑے تھے جنہیں یہ کہہ کر مارکیز نے نظر انداز کر دیا کہ یہاں نوجوان غسل کی غرض سے آتے رہتے ہیں اور شاید اس وقت بھی کوئی ”شریر“ پانی میں ہو۔ جیمز اس قسم کے چشموں پر تھوڑی بہت تحقیق کر چکا تھا۔ یہ عام طور سے آتش فشاں پہاڑوں کے سلسلے میں جا بہ جاپائے جاتے ہیں، لیکن نہ جانے کیوں اسے احساس ہو رہا تھا کہ یہاں کچھ گڑبڑ ہے۔ اس کی نظر چند درختوں پر پڑی جو اپنے ساتھ کھڑے سرسبز درختوں کے مقابلے میں پس مردگی کا شکار معلوم ہوتے تھے۔ وہ چشمے کے قریب ہو گیا، اس نے غور سے دیکھا۔ اسے سطح آب پر چند لمبے نظر آئے جو عام طور سے اس قسم کے چشموں میں نظر نہیں آتے۔ ”پانی توقع سے زیادہ گرم ہے!“ اس نے خود سے کہا اور چونکا ہوا گیا۔

اس اثناء میں ننھا الیگزینڈر چشمے میں چھلانگ لگانے کی تیاری مکمل کر چکا تھا، جیمز فوراً اس کے سامنے آ گیا اور اسے جکڑ لیا۔ اچانک اپنا کی خوف میں ڈوبی چیخ بلند ہوئی۔ چشمے کی سطح پر دوادھ جلی لاشیں تیر رہی تھیں!

☆☆☆

وکنز اور چند دیگر حکومتی اہل کار چشمے کو گھیرے کھڑے تھے۔ لاشیں ایسبیلٹنس میں رکھی جا چکی تھیں جن کی شناخت غیر مقامیوں کے طور پر کی جا رہی تھی۔

مارکیز اور الیگزینڈر کو واپس بھجوا دیا گیا تھا۔ اس چھوٹے سے علاقے میں پہلی بار اس قسم کا خوفناک واقعہ پیش آیا تھا اس لیے سب سکتے میں تھے۔ فوراً انک ٹیم بھی وہاں موجود تھی جو فقط دو افراد پر مشتمل تھی۔ اس علاقے کے محکمہ پولیس میں کل نو افراد تھے جن میں سے پانچ اُس وقت وہاں موجود تھے۔

”آج سے قبل کبھی اس قسم کا واقعہ پیش نہیں آیا۔ یہ چشمہ تو...“ ایسا خاموش ہو گئی، وہ اس خیال سے کانپ رہی تھی کہ اگر ننھا الیگزینڈر پانی میں کود جاتا تو اس کا کیا حال ہوتا۔ ”اس کا درجہ حرارت ارضیاتی تبدیلی کی وجہ سے بڑھ گیا ہے۔“ جیمز نے کہا پھر چشمے کے کنارے کی طرف بڑھا، اس نے پانی کا نمونہ لیا اور اسے اپنے آلات سے چیک کرنے لگا۔ چند ساعت وہ خاموشی سے ریڈنگ کا جائزہ لیتا رہا۔ اُن

محلات میں اس نے پہلی بار خوف محسوس کیا تاہم سب کے سامنے اُس کا اظہار کرنے سے اجتناب برتا۔

”کیا حالات ہیں؟“ متذبذب وکنز نے سوال کیا۔ ”ابھی کچھ کہا نہیں جاسکتا۔“ جیمز نے کہا۔ ”پانی کی تیزابیت بڑھ گئی ہے۔ ہمیں اس کا لیبارٹری میں ٹیسٹ کرنا ہوگا۔“

”امید ہے ہماری فور انک ٹیم آپ کی مدد کر پائے گی۔“ وکنز نے کہا۔ اب وہ سب واپس سکور کی جانب بڑھ رہے تھے۔ وہاں کی اکلوتی اور چھوٹی سے لیبارٹری میں ٹیسٹ کر کے جیمز کو خطرے کا اندازہ ہو گیا۔ پانی میں تیزابیت واقعی بڑھ گئی تھی۔ اس نے سائنس کو فون کر کے تمام حالات سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا، تاہم انٹریٹ سروس جواب دے گئی۔ رابطے کے لیے فوراً ”ہوولس ولور“ پینچینا ضروری تھا۔ ”سکور“ سے نکلے ہوئے جیمز قطعی اس کیفیت میں نہیں تھا جو اس پر اس جنت نظیر علاقے میں داخلے کے وقت طاری ہوئی تھی۔ اُس کی نظریں برفانی چوٹی پر لگی تھیں جس کے اندر بہت کچھ پک رہا تھا!

☆☆☆

10 اپریل کی صبح تھی۔ جیمز وکنز، وکنز کے چھوٹے سے انتہائی سادہ دفتر میں بیٹھا تھا۔

”شاید میری حیثیت سے آپ کو میرا دفتر عجیب لگ رہا ہو؟“ وکنز کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ ”نہیں، بلکہ میرے لیے یہ بہت متاثر کن اور... دلچسپ ہے۔“ جیمز مسکرایا، حالانکہ وہ خدشات میں مبتلا تھا۔

”خیر، اب مدعا پر آتے ہیں۔“ وکنز نے چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے کہا۔ اتنی دیر میں اپنا دونوں کے سامنے کافی کے کپ رکھ چکی تھی۔

”دیکھیں، میں آپ کو اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتا۔“ جیمز نے کافی کا گھونٹ لیا۔ ”حالات بگڑ سکتے ہیں، بہت زیادہ بگڑ سکتے ہیں، میں چاہوں گا کہ احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کے معاملے کو سنجیدگی سے لیا جائے۔“

”کیا آپ خطرے کی وضاحت کر سکتے ہیں۔“ اپنا سوال کیا۔

”نہیں!“ جیمز نے قطعیت کے ساتھ کہا۔ ”چند ساعت خاموشی چھائی رہی، پھر اس کی آواز گونجی۔“ خطرے کی وضاحت کرنا ممکن نہیں، کیونکہ اسے الفاظ میں نہیں سمجھایا جاسکتا۔ سمجھنے کی کوشش کریں، اگر آتش فشاں پھٹا تو اہل

علاقے کے ہزاروں افراد براہ راست متاثر ہوں۔ ہم تیزابی پانی کی لپیٹ میں آجائیں گے، راستے مسدود بھی ہو سکتے ہیں اور سب سے بڑھ کر، مجھے خدشہ ہے کہ یہ پہاڑ رکھ اگلے گا جو آسمان پر پھیل کر بہت بڑے علاقے کو گھیر لے گی اور اگر یہ رکھ پھیلی تو یقین کریں، فضائی آمدورفت کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔“ جیمز نے بہ مشکل کہا۔ اُس کا سانس پھولا ہوا تھا۔

اینا اور وکنز حیرت میں تھے۔ چند ساعت سناٹا چھایا رہا۔

”دیکھیں...“ بالآخر جیمز نے چپ توڑی۔ ”ہمیں ایمر جنسی کے نفاذ کے لیے خود کو کوئی طور پر تیار رکھنا ہوگا۔“ ”کیا میں ٹاؤن کونسل کی میٹنگ بلاؤں؟“ وکنز کے آنکھوں میں اندیشے تھے۔

”ہاں!“ اس نے جواب دیا اور ایک بار پھر میز کے دفتر میں خاموشی چھا گئی۔

☆☆☆

وہ ”ہوولس ولور“ اور ”سکور“ کے معززین کے لیے ایک پریشان کن شام تھی۔ ان کے سامنے ایک امریکی بیٹھا تھا جو انہیں اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ چند ہی روز میں ان کا یہ خوبصورت علاقہ تباہ ہو جائے گا۔

ان کے لیے یہ تصور کرنا محال تھا۔ ان میں سے بیش تر یہیں پیدا ہوئے اور یہیں لپے بڑھے تھے۔ اس زمین سے انہیں محبت تھی، وہ اسے چھوڑنے کے لیے کسی صورت تیار نہیں تھے۔

کونسل کی میٹنگ میں جیمز پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی گئی۔ ہر طرح کا اعتراض اٹھایا گیا جس میں سے چند تو بچکانہ تھے، تاہم جیمز کے جواب دیتا رہا۔ عوام کے اخلا کے لیے کونسل کے معزز ارکان کو قائل کرنا ضروری تھا اور اس کے لیے لازم تھا کہ جیمز محل سے کام لے۔

”آپ کو نہیں لگتا مسٹر جیمز کہ آپ کی سوچ اس خوبصورت علاقے کے صنعتی مستقبل کو تباہ کر دے گی؟“ مسٹر چارلس نے الفاظ چباتے ہوئے سوال کیا۔ اس کے لہجے میں تنکیر تھا۔ یہ شخص برطانیہ سے سرمایہ کاری کا ارادہ لے کر آیا تھا اور اسے امریکی ماہر کی باتیں اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔

”دیکھیں، میرا مقصد یہاں کے باسیوں کی زندگی بچانا ہے۔“ جیمز نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”حالات کنٹین ہیں، تباہی دستک دے رہی ہے۔ گزشتہ چند ماہ میں زلزلے

کے کئی جھٹکے آچکے ہیں جس کا مطلب ہے کہ...“ ”ایسے علاقوں میں تو زلزلے کے جھٹکے آتے ہی ہیں مسٹر جیمز!“ ایک معزز رکن نے کہا۔

”آپ درست کہتے ہیں جناب لیکن چشمے والے واقعے کو نظر انداز مت کریں۔“ جیمز دلائل پیش کرتا رہا، انہیں قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا اور تاریکی گہری ہوتی گئی۔

☆☆☆

اس دوران جب ٹاؤن کونسل کی میٹنگ چل رہی تھی ”ہوولس ولور“ کے اکلوتے موٹیل کے سامنے دو بھاری جیپیں آ کر رکیں جو جدید ساز و سامان سے بھری تھیں۔ ان سے سائنس، میٹ، ڈیٹیل اور کیٹ اترے۔ ان کے لیے پہلے ہی بنگلہ کروادی گئی تھی۔

کاؤنٹر پر چائیاں لیتے ہوئے موٹیل کے میجر سے سائنس نے سوال کیا۔ ”دوست، میں مسٹر جیمز سے اس وقت کہاں مل سکتا ہوں؟“

”جناب، مسٹر جیمز اس وقت کونسل ہال میں ہیں، وہاں فوری میٹنگ بلائی گئی ہے۔“ میجر نے جواب دیا۔ ”کونسل ہال میں...“ سائنس بڑبڑایا۔

تھوڑی دیر بعد وہ کونسل ہال کے مرکزی دروازے پر دستک دے رہا تھا، جہاں زور و شور سے ایمر جنسی کے نفاذ کی بابت بحث ہو رہی تھی۔

”ہیلو دوستو، کیا میں آپ میں شامل ہو سکتا ہوں؟“ سائنس کا انداز دوستانہ تھا۔ سب خاموش ہو گئے۔

جیمز اُسے دیکھ کر اپنی نشست سے اٹھا۔ اس نے سائنس کا وکنز، اپنا اور دیگر معززین سے تعارف کروایا۔

”یہاں کیا چل رہا ہے جیمز؟“ سب سے معافہ کرنے کے بعد سائنس نے دریافت کیا۔

”ابھی ہم اس ٹاؤن اور پڑوسی علاقوں میں ایمر جنسی کے نفاذ کے بارے میں رائے شماری کرنے والے ہیں۔“

”ایمر جنسی کا نفاذ...“ سائنس بڑبڑایا۔ لہجے میں پریشانی تھی۔ وہ جیمز کو ایک کونے میں لے گیا۔ اب دونوں میں بحث جاری تھی۔ جیمز اپنے تجربے کی بنیاد پر یہ دعویٰ کر رہا تھا کہ یہ آتش فشاں لاوا اگلنے کے لیے تیار ہے جس کے پیش نظر علاقے کو خالی کروانا ضروری ہے۔ اُس نے متنبہ کیا کہ اس آتش فشاں کی راکھ، فقط آئس لینڈ تک محدود نہیں رہے گی بلکہ دیگر ملکوں کو بھی لپیٹ میں لے لے گی، تاہم سائنس کسی

بھی انتہائی اقدام سے گریز کرنے کا خیال پیش کر رہا تھا۔
بالآخر سائنس معززین کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس
نے بڑے ہی سنجیدہ اور ڈرامائی انداز میں انہیں سمجھایا کہ
آتش فشاں کے معاملات کو بہت سنجیدگی سے سنبھالنا چاہیے
کہ معمولی سی غلطی بھی جان لیوا ثابت ہوتی ہے۔
”معزز ارکان...“ اب اس کا لہجہ پُر وقار اور دوستانہ
تھا۔ ”اگر حالات سنگین ہوئے تو ہم سائنسی بنیادوں پر تجزیہ
کرنے کے بعد فیصلہ کریں گے۔ ایسا فیصلہ جسے قبول کرنے
ہی میں عوام کی بھلائی ہوگی، تاہم فی الوقت علاقہ خالی
کروانے کی ضرورت نہیں۔“

”مگر آپ کے سامنے تو کہہ رہے تھے کہ آتش فشاں کسی
بھی وقت پھٹ سکتا ہے۔“ مسٹر چارلس کے لہجے میں طنز تھا۔
”مسٹر جیمز میرے بہت ہی قابل ساتھی ہیں۔“
سائنس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ ”لیکن وہ ابھی نوجوان
ہیں۔ دیکھیں، میں اپنے تجربے کی بنیاد پر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ
بہ ظاہر غصیل معلوم ہونے والے آتش فشاں بھی کبھار ہی
پھٹتے ہیں۔ چونکہ آپ کا دوست ایسا بالاجوکل تھوڑے بہت
غصے کا اظہار کر چکا ہے، اس لیے امید ہے کہ اب وہ کئی برس
سوتا رہے گا۔“ اس نے ہلکا سے قہقہہ لگایا، باقی لوگوں کے
چہرے پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔

اب سب ایک ایک کر کے وہاں سے رخصت ہو رہے
تھے۔ ان کے دلوں میں جیمز کے لیے ناپسندیدگی بھی جو ان
کے چہروں سے عیاں تھی۔ وکٹر اور اینا بھی خاموشی سے اٹھ
گئے۔ اب جیمز اور سائنس ہال میں رہ گئے تھے۔
”ماضی سے نکل آؤ سائنس، یہ معاملہ گمبھیر ہے۔“ اس
نے جذباتی لہجے میں کہا۔

”جیمز، ہڈ سکون ہو جاؤ۔ اب میں یہاں ہوں اور تمام
معاملات دیکھ لوں گا۔“
”تم غلط کر رہے ہو۔“

”سنو، میں نے تمہیں پچھنیوں سے واپس بلوایا کہ غلطی
کی۔ تم پچھنیوں پر چلے جاؤ فوراً! دو ہفتے بعد ملتے ہیں۔“ یہ
کہتے ہوئے سائنس ہال سے نکل گیا۔

☆☆☆

غصے میں بھرا وہ موٹیل پہنچا اور سامان پیک کرنے لگا۔
اس کی حرکات سے اضطراب جھلکتا تھا۔ آخر کار اس نے
مدد سے اپنا سر تھام لیا اور آبدیدہ ہو گیا۔ چند لمحات ایسے
ہی گزرے، بالآخر اس نے فیصلہ لیا، جتنی فیصلہ! اور کھڑا

ہو گیا۔

اس کے قدم باہر کی جانب اٹھ رہے تھے۔

☆☆☆

بیزر بار میں بیٹھے سائنس نے جب اپنے ساتھ والی
نشست پر براجمان شخص کو دیکھا تو پہلے اسے حیرت ہوئی، پھر
وہ اپنے حیران ہونے پر مسکرا دیا، کیونکہ اس شخص کی یہاں
موجودگی متوقع تھی وہ جیمز تھا۔

”نوجوان، مجھے نہیں؟“ اس کے لہجے میں بے ساختگی
تھی۔

”نہیں۔“ جیمز نے اعتماد سے جواب دیا۔ ”یہ جگہ
خوبصورت ہے اور میں یہیں چھٹیاں مٹانا چاہتا ہوں۔“

”کیا واقعی؟“ سائنس نے ہنستے ہوئے سوال کیا۔
”ہاں بالکل۔“ وہ بھی مسکرایا۔ ”میں نے سنا ہے، کوئی
امر کی نیم یہاں تحقیق کی غرض سے آئی ہے، جس کا پاس بہت
سلجھا ہوا انسان ہے۔ میں بھی آتش فشاں کے موضوع پر ماہر
تصور کیا جاتا ہوں، امید ہے وہ مجھے اپنے ساتھ کام کرنے
دے گا۔“

سائنس نے قہقہہ لگایا اور جیمز کے لیے وہ سکی کا آرڈر
دینے لگا۔

☆☆☆

اُس خوش گوار صبح اینا اپنے دروازے پر جیمز کو دیکھ کر
حیران رہ گئی، جلد ہی یہ حیرت خوشی میں تبدیل ہو گئی۔ اب وہ
اس کے چھوٹے سے گھر کے کچن میں موجود تھا جہاں اس کے
لیے بہت ہی اپنائیت سے کافی تیار کی جا رہی تھی۔

ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد جیمز اصل مدعا پر آیا۔
”میں تم سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔“

”کیوں، ایسا کیا ہوا؟“ اینا نے سوال کیا۔
”میری وجہ سے وکٹر اور ہمیں کونسل ہال کی مینٹنگ
میں شرمندگی اٹھانی پڑی۔“

”ہمیں ایسا نہیں ہے بلکہ میں تمہاری شکر گزار ہوں۔“
”بھلا کس لیے؟“ جیمز کے لہجے میں حیرت تھی۔
”الیکزینڈر کی جان بچانے کے لیے۔“ اور میری

بابت فکر مند ہونے کے لیے! اس کی آنکھوں میں محبت کی
چمک تھی۔ جیمز مسکرا دیا۔
”کیا آپ کل رات کا کھانا میرے ساتھ کھانا پسند
کریں گے مسٹر جیمز؟“ اس نے جھکی ہوئی چلوں کے ساتھ

سوال کیا۔

”ضرور محترمہ، یہ میری خوش نصیبی ہوگی!“

اُس سہانی صبح اُن کے درمیان ایک نیا رشتہ جنم لے رہا
تھا جو آنے والے دنوں میں گہرا ہونے والا تھا۔

☆☆☆

ایک ہیلی کاپٹر ایجاٹا لاجوکل کے دہانے پر پرواز کر رہا
تھا۔ اس میں ڈیٹیل، کیٹ، جیمز اور میٹ سوار تھے جبکہ میسر
آفس کے ایک کمرے میں بیٹھا سائنس سے رابطے میں تھا۔
دراصل امریکی ماہرین نے وکٹری کے دفتر میں کام
شروع کیا تھا۔ انہوں نے چارلیپ ٹاپس کو مختلف آلات کے
ساتھ تھپی کر لیا تھا جس سے وہ آتش فشاں میں ہونے والی
تبدیلیوں پر نظر رکھ سکتے تھے۔

دوسری طرف کیٹ دہانے کے اوپر پرواز کرتے ہیلی
کاپٹر میں بیٹھی درجہ حرارت لوٹ کر رہی تھی۔ میٹ نے تار
سے نچو ایک آلہ دہانے کے اوپر جیسے ٹھوس لاوے پر اتار دیا
تھا جو یوں لگتا ہے کہ وہاں پر اتار دیا

”کیا صورت حال ہے؟“ بالآخر جیمز کے صبر کا پیمانہ
پریز ہو گیا۔

”یہاں بالکل خاموش ہے جیمز۔“ کیٹ نے کہا۔ ”درجہ
حرارت میں کوئی تبدیلی نہیں۔“

”اور مسٹر ٹیکنیشن، تمہارا آلہ کیا کہتا تھا؟“ اُس نے
میٹ سے سوال کیا۔

”میرا آلہ بھی خاموش ہے دوست، اس پہاڑ کے
مانڈا! میٹ یو۔ا۔“

”کچھ زیادہ ہی خاموشی ہے۔“ جیمز بڑبڑایا۔
اب ہیلی کاپٹر واپس ٹاؤن کی طرف جا رہا تھا۔

☆☆☆

اگلے روز وکٹر نے امریکیوں کو ایک خصوصی تقریب
میں مدعو کیا جہاں اُن کا ہڈ تپاک استقبال کیا گیا۔ اس تقریب
کو 12 اپریل کا جشن کا نام دیا گیا تھا۔

تقریب میں شہر کے معززین نے تقاریر کیں۔ ڈیٹیل
حکومتی نمائندے کی حیثیت سے مائیک پر آیا۔ مسٹر چارلس نے
وہاں کے باسیوں کو اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ سائنس کو بھی
تقریر کی دعوت دی گئی۔ اس نے عوام سے اپنے خوشگوار
گربات شیئر کیے۔ اختتام میں بچوں نے ایک ڈراما پیش کیا
جس میں ننھے الیکزینڈر نے مرکزی کردار نبھایا۔ لوگوں نے
کھل کر بچوں کو داد دی۔

اب وہ گروپس میں بنے مختلف موضوعات پر گفتگو کر
رہے تھے۔ میٹ اپنی جس مزاح کی وجہ سے بچوں کی توجہ کا
مرکز بنا ہوا تھا۔ وہ انہیں لطیفے سنارہا تھا اور سب قہقہے لگا رہے
تھے۔ پھر اس نے بچوں کے کان میں سرگوشی کی، سب جیمز
کے گرد جمع ہو گئے۔ وہ جادوئی کرتب کے مظاہرے کی
درخواست کر رہے تھے۔ دراصل کسی زمانے میں جیمز اپنی
بچک ٹرکس کی وجہ سے بچوں بڑوں میں بہت مقبول تھا، تاہم
جولیا کی موت کے بعد اس نے یہ مشغلہ ترک کر دیا تھا۔

اس نے بڑے ہی مہذب انداز میں ان سے معذرت
کی لیکن الیکزینڈر بغیر ہلکا سا آخر ایسا کی خصوصی سفارش سے
بات بن گئی اور جیمز ٹیبل کی ایک جانب کھڑا ہو کر انہیں جادوئی
کرتب دکھانے لگا۔

بچوں کے شور نے بڑوں کو بھی اُس میز کے گرد اکٹھا کر
دیا۔ اب سب کی توجہ کا مرکز جیمز تھا جو کبھی رومال غائب کر
دیتا، کبھی انگلی اٹھاتا!

لوگ تالیاں بجا کر اس کے کرتب کی داد دے رہے
تھے۔ اس مجمعے میں معززین شہر بھی تھے جو ٹاؤن کونسل کی
مینٹنگ کے بعد اُس سے خاصے ناراض تھے، تاہم دلچسپ
جادوئی کرتب نے انہیں بھی ہنسنے پر مجبور کر دیا۔ البتہ مسٹر
چارلس کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، بلکہ اُس نے
تہذیبی اطوار کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے یہ آواز بلند یہ تک
کہہ دیا کہ جیمز کو آتش فشاں پر تحقیق کرنے کے کام سے کنارہ
کش ہو کر اب یہی کام کرنا چاہیے!

جیمز نے اسے نظر انداز کر دیا۔ اس کے گرد معصوم بچے
تھے جن کی آنکھوں میں اس کے لیے پسندیدگی تھی اور پھر اینا
بھی وہاں موجود تھی۔

اس شام ایک طویل عرصے بعد اس نے خود کو ہشاش
بشاش محسوس کیا۔

☆☆☆

یہ 13 اپریل کی صبح تھی۔ موسم خلاف توقع گرم تھا۔
اس وقت جیمز اور میٹ آتش فشاں کے دہانے پر موجود تھے،
ہیلی کاپٹر انہیں چھوڑ کر ٹاؤن لوٹ چکا تھا۔ وہ اپنے سعی اور
بصری آلات کی مدد سے سائنس اور کیٹ سے مسلسل رابطے
میں تھے۔

میٹ ایک بڑی سی عجیب الخلقیت مشین جسے وہ
”شیطان کی مکڑا“ کہا کرتا تھا، آتش فشاں میں اتارنے کی
تیار کر رہا تھا۔ اس کا مقصد ایک خاص مقام تک رسائی

الیکزینڈر کی بھولی بھالی دلچسپ باتوں نے آج کا خوفناک واقعہ ذہن سے کھرچ دینے میں خاصی مدد کی اور وہ اس تھکا دینے والے دن کے اختتام پر خود کو تازہ محسوس کرنے لگا۔ تھا چہ اس سے جادوئی کر جب کیکنے کا بھی خواہش مند تھا۔ اس نے وعدہ کیا کہ ٹاؤن چھوڑنے سے قبل وہ اسے تمام کرب سکھا دے گا۔

اتنی دیر میں اپنا کھانا لگا چکی تھی۔ کھانے کے دوران بھی الیکزینڈر اور جیمز کا دلچسپ مکالمہ جاری رہا۔ وہ دونوں خوش تھے اور انہیں یوں مسرور دیکھ کر اپنا اپنے دل میں مسرت محسوس کر رہی تھی۔ کھانے کے بعد الیکزینڈر کی فرمائش پر اس نے پھر چند کرب دکھائے۔

جب الیکزینڈر کے سونے کا وقت ہو گیا، اس نے ایک امریکی "بیڈ ٹائم اسٹوری" سننے کی فرمائش کر دی۔ جیمز نے یہ خواہش پوری کی۔

اب اپنا اور جیمز گھر کے باہر بیڑھیوں پر بیٹھے تھے۔ دونوں کے ہاتھ میں کافی کے گگ تھے۔ ہوا میں ٹھکی اور جنگلی پھولوں کی خوشبو تھی۔

جب جیمز نے اپنا کوتاہیا کہ سائنس یہاں سے جانے کے منصوبے ترتیب دے رہا ہے تو وہ افسردہ ہوئی۔

"کاش تم بھی نہ جاؤ" اس نے زور لپ کہا۔

جیمز نے یہ الفاظ سن لیے، تاہم اپنا رستہ نہیں کیا۔

اپنا نے اس کا شکریہ ادا کیا کہ اس کی وجہ سے الیکزینڈر کو خوشی کا انوکھا تجربہ ہوا۔ اس کی آنکھوں میں ممتا کی روشنی تھی جو اچانک بجھ گئی اور اس نے زور، بردہائی چوٹیوں پر نظریں نکا دیں۔ وہ بہت افسردہ تھی۔ جیمز نے محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"تمہارا بیٹا، تمہاری طرح بہت خوب صورت اور باہمت ہے۔" اس نے دھیرے سے کہا۔ اپنا کے چہرے پر مسرت پھیل گئی۔

پھر اپنا اسے اپنے ماضی کے بارے میں بتانے لگی۔ اس نے اپنے شوہر کا بھی ذکر کیا جس سے اس کی ملاقات کوہ پیما کی ایک ٹیم کے دوران زمانہ طالب علمی میں ہوئی تھی۔ "ہماری ملاقات 'تھور سورک' کے پہاڑی سلسلے میں طلباء کے لیے منعقد کیے جانے والے ایک مقابلے میں ہوئی۔" اس کی آنکھوں میں ماضی کے حسین مناظر تھے۔

"یہ علاقہ کوہ پیما کے لیے خاصا مقبول ہے۔" وہ کہتی رہی۔ "وہاں حسین چوٹیاں ہیں، جنہیں سر کرنے کی خوشی

الفاظ میں بیان نہیں کی جاسکتی۔ ہم کئی بار وہاں گئے۔ وہیں ہمارے درمیان محبت پروان چڑھی۔ جس کے بعد ہماری شادی ہوئی، الیکزینڈر پیدا ہوا اور پھر ایک حادثہ..." اس کی آواز بھرا گئی۔ جیمز نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے حوصلہ دیا۔

اب وہ ہچکیاں لے رہی تھی۔ "آج اسپتال میں میٹ سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے اس سے جولیا کے بارے میں سنا۔" اس نے اچانک کہا۔

جیمز خاموش رہا۔ چند ساعت خاموشی چھائی رہی، پھر وہ خود ہی اسے جولیا کے بارے میں بتانے لگا۔

کچھ دیر اداسی سے بھرپور سناٹا چھایا رہا۔ وہ دونوں تنہا تھے اور ایک دوسرے کے کرب کو سمجھ سکتے تھے۔

پھر ایک خیال نے جیمز کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دی۔ "اپنا، کیا تم اور الیکزینڈر میرے ساتھ تھور سورک کے پہاڑی سلسلے کا رخ کرنا پسند کرو گے؟ مجھے بھی کوہ پیما کی دلچسپی ہے۔"

یہ تجویز سننے ہی اپنا کھل اٹھی۔ "ضرور، میں تمہارے ساتھ چلوں گی!" اس کا چہرہ دیک رہا تھا۔

اس خنک رات انہیں قطعی اندازہ نہیں تھا کہ فقط چوبیس گھنٹے بعد "تھور سورک" کا پہاڑی سلسلہ راکھ میں دفن ہو جائے گا!

☆☆☆

اپنا جیمز کے کاندھے پر سر رکھے بیٹھی تھی کہ اچانک کسی نے اسے پکارا۔

"اوہ، الیکزینڈر! شاید وہ پانی مانگ رہا ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ بچن کی طرف چلی گئی۔ جیمز بھی بیڑھیوں سے اٹھ کر گھر کے اندر آ گیا۔

چند سیکنڈ بعد اسے اپنا اپنے سامنے کھڑی نظر آئی۔ وہ خاصی پریشان تھی۔ اس کے ہاتھ میں گلاس تھا جس میں موجود پانی خالی تھا۔

"نہ جانے پانی کو کیا ہوا؟ شاید ٹل میں کوئی خرابی ہو گئی ہے۔" اس نے گلاس جیمز کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اپنا پہلے بھی نہیں ہوا۔"

جیمز نے پانی کو سونگھا، تو اسے جھٹکا لگا۔ اس میں سلفر کی تیز بو تھی۔

"نہیں، ٹل میں کوئی خرابی نہیں۔ مجھے بتاؤ، ٹاؤن کے لیے واٹر اسٹور کرنے والا ٹینک کہاں ہے؟" اس نے سوال

کیا۔

"ٹینکسٹر کے دامن میں!" اپنا کے جواب نے اس کے اندیشوں کو تقویت دی۔ اب وہ گاڑی میں بیٹھے واٹر سپلائی ٹینک کی جانب جا رہے تھے۔

ٹینک کے پانی کی تیزابیت حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ جیمز کو فلپائن میں تجربہ ہو چکا تھا جب آتش فشاں کے پھٹنے سے ٹل پینے کا پانی گدلا ہو گیا تھا۔

واٹر اسٹورج ٹینک کے معائنے کے بعد وہ سائنس کے سامنے کھڑا تھا۔ ٹلوں میں آنے والے غیالے پانی نے اس امر پر تصدیق کی مہر ثبت کر دی تھی کہ آتش فشاں میں لاوا بڑھ رہا ہے جس نے ٹینکسٹر سے نکلنے والے بیٹھے چشموں کے پانی کو تیزابی کر دیا ہے۔

"وکیلز سے کہو، میٹنگ بلوائے، آتش فشاں کسی بھی وقت پھٹ سکتا ہے، پورے ٹاؤن کو مطلع کر دو!" یہ سائنس کے الفاظ تھے۔ اس کے گھر درے چہرے پر فکر مندی کے سائے تھے۔

☆☆☆

14 اپریل صبح سات بجے:

ٹاؤن ہال کچھا کچھا بھرا ہوا تھا۔ امریکیوں کے اس اعلان کے بعد کہ آتش فشاں کسی بھی وقت پھٹ سکتا ہے، لوگوں میں سرایت گئی تھی۔

وہ بوکھلاہٹ کا شکار تھے اور چیخ چیخ کر یہ سوال کر رہے تھے کہ آتش فشاں کے پھٹنے میں کتنا وقت باقی ہے۔

سائنس نے انہیں ہدایت کی کہ وہ ضروری سامان ساتھ لے لیں اور دستیاب سوار یوں میں پہلی فرصت میں محفوظ مقامات پر ٹھک ہو جائیں۔

"بکواس بند کرو، یہ بتاؤ وقت کتنا ہے؟" ایک عورت چلائی۔

"یہ ساٹھ کل رات تک متوقع ہے، ہمارے پاس فقط 48 گھنٹے ہیں۔" سائنس نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

اتنی دیر میں ٹاؤن انتظامیہ کے اہل کار شہریوں میں ایک پمفلٹ تقسیم کر چکے تھے جس میں احتیاطی تدابیر درج تھیں، لیکن لوگ انہیں پڑھنے میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ باہر کی طرف دوڑ رہے تھے۔ اس دوران دھم دھم کی کئی ضعیف افراؤں گزرتی گئیں۔ جیمز اور وکیلز نے آگے بڑھ کر

انہیں سہارا دیا۔ کچھ دیر بعد ہال خالی ہو گیا۔ فقط امریکی ٹیم، اپنا اور

وکیلز رہ گئے تھے۔

"تو سب ختم ہو جائے گا۔" اچانک وکیلز کی آواز بھرا گئی اور وہ صدمے سے زمین پر بیٹھ گیا۔

"ہمت سے کام لو وکیلز۔" جیمز نے آگے بڑھ کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "تمہیں اپنے لوگوں کی راہ نمائی کرنی ہے، اسپتال اور طبی مراکز کے عملے کو الٹ کر دوا۔"

"ہاں مجھے خود کو سنبھالنا ہو گا۔" اس نے آنسو پونچھے۔ "تم سب تیاری کرو، ہم شام تک ٹاؤن چھوڑ دیں گے۔" سائنس نے انہیں ہدایت کی اور ہال سے نکل گیا۔

☆☆☆

جیمز، اپنا کی مدد کرنے کے ارادے سے اس کے ساتھ ہوا۔ دوران سفر وہ اس کی حوصلہ افزائی کرتا تھا، تاہم جب انہوں نے گھر میں قدم رکھا، دونوں کو دھچکا لگا۔

سامنے، ڈائٹنگ ٹیبل پر مارکیٹرز کا چھوڑ ہوا ایک جابہ گن پیغام دھرا تھا۔

"خانا تم بہت مصروف ہو محترمہ، اسی لیے اپنے شوہر کی برسی بھول گئیں۔ خیر میں اپنے پوتے کو ایک دن کے لیے سکوکھ لے جا رہا ہوں، جب تم فارغ ہو تو اسے لینے آ جانا۔ تمہارے سابق شوہر کا باپ، مارکیٹرز!"

نوٹ پڑھتے ہی اپنا پر گھبراہٹ طاری ہو گئی اور اسی وقت، اچانک زمین پوری قوت سے لرز اٹھی۔

"یہ... یہ کیا تھا؟" اپنا صدمے کی حالت میں تھی۔

"ابتدائی جھٹکا!" جیمز گھبرایا ہوا تھا۔ "یہ پھٹنے والا ہے۔"

"لیکن اتنی جلدی... اوہ الیکزینڈر..." اس کے منہ سے نکلا، اچانک ایک اور جھٹکا لگا اور اسے اپنا توازن قائم رکھنے کے لیے سہارا لینا پڑا۔ اب ایک اور دھماکا سنائی دیا۔

جیمز باہر کی جانب دوڑا۔ ایجا فالو بوجھل کی چوٹی کی طرف دیکھتے ہی اس کے بدترین خدشات سچ ثابت ہوئے۔

آتش فشاں کے دہانے نے دھواں اٹھنا شروع کر دیا تھا۔ وہ والپس اندر گیا۔ اپنا کو سنبھالا اور اسے مارکیٹرز کو فون کرنے کے لیے کہا۔

اچانک جیسے اپنا کو ہوش آ گیا ہو، وہ تیزی سے فون کی جانب بڑھی، لیکن بد قسمتی اُن کا اتنی جلدی بیچھا چھوڑنے والی نہیں تھی۔ کئی کوششوں کے باوجود رابطہ نہیں ہو سکا۔ اپنا کی آنکھوں میں مایوسی اُٹھ آئی۔

”وکر کا نمبر ڈائل کرو۔“ وہ چلایا۔

وہ اپنے دفتر ہی میں تھا۔ ”ہیلو، میں وکر بول رہا ہوں۔“ وہ ہائست شخص اپنی گھبراہٹ مچھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”کیا آتش فشاں کے بارے میں سکوگر میں اطلاع پہنچادی گئی ہے؟“ جیمز نے سوال کیا۔

”ہاں!“ اس نے جواب دیا۔ ”لیکن حالات وقت سے پہلے ہی بگڑ گئے۔ میں نے آدھے گھنٹے پہلے تین امدادی گاڑیاں روانہ کی تھیں۔ وہ سکوگر پہنچنے والی ہوں گی۔“

”ہمیں خود وہاں جانا ہوگا۔“ یہ کہتے ہوئے جیمز نے اپنا کا ہاتھ تھا اور باہر کی جانب دوڑ پڑا۔

اب اس کے مضبوط ہاتھ اسٹیرنگ پر تھے۔ جیمز تیزی سے سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ وہ ٹاؤن کے مرکزی علاقے سے گزر رہے تھے جہاں خاصی پھل پھل تھی۔ سڑک پر چند اور گاڑیاں بھی تھیں، جن کے سوار انجانے خوف میں مبتلا تھے۔

اسی اثنا میں اس کا واک ٹاک کی بجائے دوسری طرف سائن تھا۔

”تم درست تھے دوست، مجھے معاف کرنا!“ اس کی آواز میں دکھ تھا۔

”یہ باتیں بعد میں ہوں گی۔ تم لوگ نکلنے کی تیاری کرو، ہمارے پاس فقط چند گھنٹے ہیں۔ یہ عمارت گر پہاڑ 48 گھنٹے دینے کے لیے تیار نہیں۔“ اس نے تیزی سے کہا۔

اس دوران جیمز نے چند مزید جھٹکے محسوس کیے۔ پھر ایک چٹکھٹائی سنائی دی۔ اس نے چوٹی کی طرف دیکھا جہاں راکھ کا خوفناک بادل تھا۔ اچانک تیز ہوا میں چلتے گئیں، آسمان پر بجلی چمک رہی تھی۔

”خدا یا!“ اپنا کے منہ سے نکلا۔

اگلا جھٹکا شدید اور تباہ کن تھا۔ جیمز اٹھتے اٹھتے بجی، تاہم ہر کوئی اتنا خوش قسمت نہیں رہا۔ سڑک پر موجود چند گاڑیاں اپنا توازن کھو بیٹھیں۔ ”ہوولس واور“ اٹھل چھل کا شکار ہو گیا۔ کئی عمارتوں میں دراڑیں پڑ گئیں، سائن بورڈز گرنے لگے، تارنٹ گمے، بجلی کا نظام منقطع ہو گیا۔

ایک اور جھٹکا۔ سڑک کی سطح گئی، کئی گاڑیاں پھسل گئیں، عمارتوں میں آگ لگ گئی۔

اس بار بھی جیمز جیمپ کو بچانے میں کامیاب رہا۔ اس نے اپنے دائیں جانب درختوں کو جڑوں سمیت زمین چھوڑتے دیکھا، تاہم وہ رک نہیں سکتا تھا اسے

الیکٹریسیٹی کی جان بچانی تھی۔

”سکوگر“ میں داخل ہونے کے لیے جب وہ اپنی ٹیل سے گزر رہے تھے، اس نے وہاں کے چند کینوں کو امدادی گاڑیوں میں سوار وہاں سے نکلنے دیکھا، ان کے چہروں پر موت کا خوف تھا۔ پھر اچانک کان بھاڑ دینے والا دھماکا ہوا۔ آتش فشاں نے لاوا اگلنا شروع کر دیا تھا۔ آسمان پر سرخ چنگاریاں ناچ رہی تھیں۔

اس ہیبت ناک منظر نے اپنا کو، ایک دھکی ماں کو مزید حواس باختہ کر دیا۔ یہ پہلا موقع تھا، جب جیمز آگ اگلنے آتش فشاں کے اتنے نزدیک تھا لیکن اس نے خود کو سنبھالے رکھا۔ اور تب اس نے چوٹی کی طرف سے تیز، چمکتی، نشیب کی طرف بڑھتی لکیریں دیکھیں۔ وہ گلیشیر کی برف تھی جو تیش سے پھل کر پانی کی صورت نیچے کی طرف بہ رہی تھی۔ یہ پانی موت کی علامت تھا، کیونکہ یہ تیزابی ہو چکا تھا، نہر بلا ہو گیا تھا اور تھوڑی دیر بعد دریاؤں کو نہر بلا کرنے والا تھا۔ اپنی ٹیل پار کرنے کے بعد جیمز نے مرکز دیکھا، چوٹی سے بہتا یہ پانی دریا کے سکوگ میں گر رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

منظر پر جیمز اور ڈری ہوتی اپنا جس گھر کے دروازے پر دستک دے رہے تھے، اس کے بالکل جیسے ایجا نکلا جوکل کی چوٹی تھی جس سے اس وقت چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ وہ وحشت سے رنگا ایک خوفناک منظر تھا۔

دروازہ مارکیز نے کھولا۔ وہ بوکھلایا ہوا تھا۔

اپنا اس پر برس پڑی، وہ اسے برا بھلا کہہ رہی تھی۔ مارکیز کے چہرے پر شرمندگی کے اثرات تھے۔

وقت کم تھا اس لیے جیمز نے مداخلت کی اور اپنا کو خاموش کروادیا۔ اتنی دیر میں الیکٹریسیٹی دوڑتا ہوا آیا اور اپنی ماں سے لپٹ گیا۔

اپنا نے اپنے جگر کے گوشے کو ہاتھوں میں گھیر لیا۔ غریب جذبات سے اس کی آنکھوں میں آنسو امد آئے۔ مارکیز بھی جذباتی ہو گیا۔ ”مجھے معاف کر دو اپنا، میں تمہیں ایک بے پروا مان سمجھتا تھا، لیکن میں غلط تھا۔“ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

”یہ باتیں بعد میں ہوں گی۔ پہلے یہاں سے نکلنے کی تیاری کریں۔“ جیمز نے کہا۔

مارکیز اندر کی طرف دوڑا، وہ جلدی جلدی ضروری سامان سمیٹ رہا تھا۔

اچانک زمین لرز اٹھی اور اس بار کئی ساعتوں تک اس پر لرزہ طاری رہا۔

”جلدی!“ جیمز چلایا۔ وہ بڑھتی تیش اور آتش محسوس کر سکتا تھا۔

مارکیز ایک بیگ لیے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اب وہ تیزی سے باہر کی جانب دوڑ رہا تھا، تاہم دلہیز پر ایک صدمہ ان کا منتظر تھا۔ آخری جھٹکے سے سڑک بری طرح بچ چکی تھی اور چوٹی سے آنے والا تیزابی پانی اس کی دراڑوں میں بھر گیا تھا، اب اس پر سفر کرنا موت کے کنوئیں میں چھلانگ لگانے کے مترادف تھا۔

جیمز تیزی سے جیمپ کی جانب بڑھا۔ ابھی جیمپ اشارت ہی ہوئی تھی کہ ایک اور جھٹکا لگا اور سڑک پر مزید گہرا شکاف پڑ گیا، اب وہ کھلی طور پر ناقابل استعمال تھی۔

”کیا کوئی اور راستہ ہے؟“ جیمز نے چلاتے ہوئے مارکیز سے پوچھا۔

”ہاں اس طرف!“ مارکیز نے جنگل کی طرف اشارہ کیا۔ جیمز وہاں جاتے ہوئے تیز بکڑ کا شکار تھا، درختوں میں کسی بھی وقت آگ لگ سکتی تھی لیکن اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اس نے جیمپ اشارت کی اور جنگل کی طرف جانے والے کچے راستے پر ڈال دی۔

☆ ☆ ☆

اچانک بریک چرچائے۔ راستہ لاوے سے بھر چکا تھا۔ مزید آگے جانا ممکن نہیں تھا۔

”اب؟“ اسٹیرنگ تھا جیمز نے سوال کیا۔

”دائیں جانب۔“ مارکیز چلایا۔ ”ہمیں اگلے حصے سے دریا پار کرنا ہوگا۔“

”کیا ہم جیمپ دریا میں اتار دیں گے؟“ اپنا نے گھبرا کر پوچھا۔

”لوہ کوئی راستہ نہیں۔“ جیمز نے کہا۔ چند لمحوں بعد وہ دریا کے کنارے پر تھے۔ یہ کم گہرا حصہ تھا، جوڑائی بھی زیادہ نہیں تھی۔ جیمز نے اندازہ لگایا کہ اسے پار کیا جاسکتا ہے، تاہم اسی وقت سلفر کی تیز، حواس معطل کر دینے والی بو اس کے نتھوں سے گرائی۔

”پانی تیزابی ہو گیا ہے۔ شیشے جڑے حوالہ!“ اس نے کہا، چند ساعت توقف کیا، پھر ایکس لریٹر بادیلا۔

جیمپ پانی میں اتر گئی اور بچکولے کھاتی آگے بڑھنے لگی۔ گھومتے ٹائرڈوں کی حرکت سے تیزابی پانی اچھل رہا تھا۔

وہ دریا کے درمیانی حصے تک پہنچ گئے تھے کہ دفعتاً جیمپ کو ایک خوفناک جھٹکا لگا۔ الیکٹریسیٹی کا سر بری طرح ڈیش بورڈ سے ٹکرایا۔ اس سے خون بہنے لگا۔

”الیکٹریسیٹی!“ جیمپ میں اپنا کی چیخ گونجی۔

”زخم کو اپنے ہاتھ سے دبا کر رکھو، پوری قوت سے!“ جیمز چلایا۔ وہاں سے نکلنا ضروری تھا۔ اس نے پھر ایکس لریٹر دہرایا۔ گاڑی آگے نہیں بڑھی۔ اس نے گاڑی ریورس کر کے پھر کوشش کی، کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

”کوئی بھاری پتھر یا تار راستے میں آگیا ہے۔“ جیمز کے لہجے سے گھبراہٹ عیاں تھی۔

وہ واقعی ایک خوفناک لمحہ تھا۔ کسی بڑی رکاوٹ کی وجہ سے جیمپ آگے نہیں بڑھ رہی تھی، تیزابی پانی جیمپ میں داخل ہونے لگا تھا اور الیکٹریسیٹی رز گئی تھی۔

اس نے بوڑھے مارکیز کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں میں یاسیت اور ناامیدی تھی۔

وہ پہلا لمحہ تھا، جب مایوسی نے جیمز کو گھیر لیا۔ اس نے خود کو بے بس محسوس کیا۔

یکبارگی جیمپ میں مارکیز کی بے سکون، مچھتاہ آواز گونجی۔ ”اپنا، مجھے معاف کر دینا!“ یہ کہہ کر اس نے تیزی سے جھپٹ لیا۔

”یہ پاگل ہیں، وہ اپس آ جاؤ، پانی تیزابی ہے۔“ جیمز چلایا لیکن باہر کھڑے مارکیز کی نظریں تو اپنے پوتے پر لگی تھیں، جو بے ہوش ہو چکا تھا۔

”اسے بتانا، بوڑھا دادا اس سے بہت محبت کرتا تھا۔“ اس نے یہ کہا اور پانی میں غائب ہو گیا۔

چند سیکنڈ ہیٹ تاک سنا طاری رہا۔ اچانک پانی کی سطح پر مارکیز کا سر ابھرا، پھر ڈوب گیا۔

پھر وہ جیمز کو اپنی کھڑکی کی جانب کھڑا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ بکھے ہوئے جسم سے خون رس رہا تھا، چہرے اور ہاتھوں پر زخم پڑ گئے تھے، جن سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ تیزابی پانی نے اس کا جسم گلا دیا تھا، تاہم اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ تھی۔

مارکیز نے پھنسا ہوا اتنا گاڑی کے نیچے سے ہٹا دیا تھا۔

”چلو!“ وہ چلایا۔

اس نے ایکس لریٹر دہرایا، جیمپ تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔

مارکیز کے نزدیک پہنچ کر جیمز نے اسے جیمپ میں بیٹھنے کی ہدایت کی، لیکن وہ زخموں سے سننے چہرے پر مشتاقانہ

سکر اہٹ لیے کھڑکی سے اپنے پوتے کو تکتا رہا پھر وہ اچانک ہی پانی میں گر اور غائب ہو گیا۔ اینا کی چیخ بلند ہوئی اور فضا میں بجند ہو گئی۔

سورج مغرب میں گم ہو رہا تھا!

☆☆☆

سر پر راکھ کا آسب تھا، زمین پر لرزہ طاری تھا، لاوے نے سبزے کو جھلسا دیا تھا، سڑک جگہ جگہ سے اوجھ گئی تھی، زندگی دم توڑ رہی تھی، تاہم جیمز کو سفر جاری رکھنا تھا۔

مارکیز کی قربانی کے فطیل اب وہ سڑک پر آگئے تھے لیکن یہاں بھی صورت حال گھبرائی تھی، کئی درخت گر گئے تھے، چند میں آگ لگی ہوئی تھی اور ان کی جیب ان درختوں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔

منزل آہنی پل تھا اور تب... جیمز نے اپنی جیب کے آگے دوڑتی ایک گاڑی دیکھی۔ اُس میں ایک خاندان سوار

تھا جو آتش فشاں سے دور جانے کی کوششوں میں جٹا تھا۔ انہیں دیکھ کر جیمز کو کچھ سکون ملا کہ وہ تنہا نہیں، لیکن عین اسی لمحے آسمان سے جلتے ہوئے انگاروں کی بارش شروع ہو گئی۔

یہ آتش فشاں سے نکلنے والے، جھلے ہوئے پتھر تھے۔ ماضی عود کر آیا اور جیمز بوکھلا گیا۔ کولمبیا میں اسی قسم کے

بھاری، آسمان سے برستے انگاروں نے جولیا کی جان لی تھی۔ وہ ہمت چھوڑ بیٹھا، اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔

ایسے میں اینا نے اسے پکارا۔ یہ آواز اُسے واپس دنیا میں لے آئی۔ اُسے یاد آیا، اس نے زندہ رہنے، انسانوں کی مدد کرنے کی قسم کھائی ہے۔

جیمز نے خود کو سنبھالا اور برستے انگاروں سے اپنی جیب کو محفوظ رکھنے کی حتی الامکان کوشش کرنے لگا۔ یہ موت کے جبروں سے زندگی چھین لینے کی جنگ تھی۔

اور اسی دوران، مٹی ہوئی سڑک پر سفر کرتے ہوئے اس نے سکورگر کے چرچ پر ایک بھاری جھلے ہوئے پتھر کو گرتے دیکھا، جس نے چرچ کی چھت کو نقصان پہنچایا اور اس میں آگ لگ گئی۔ یہی حال دیگر مکانات کا تھا۔ راکھ کی وجہ سے چار سو تار کی چھارہی گئی جو جاہی کے لیے سازگار تھی۔

اُس نے واکی ٹاک پر سائمن سے رابطہ کیا۔ ”کہاں ہو جیمز؟“ اُس کے لہجے سے گھبراہٹ عیاں

تھی۔ جیمز نے اسے اپنے حالات سے آگاہ کیا، پھر ”ہوولس ولور“ کی صورت حال کے بارے میں دریافت کیا۔ اطلاعات افسوسناک تھیں۔ سائمن نے بتایا کہ انگاروں کی بارش کی وجہ سے جہاں کئی عمارتوں کو نقصان پہنچا ہے، وہیں ٹاؤن کے ٹیس اسٹیشن میں بھی آگ بھڑک اٹھی ہے جس کی وجہ سے صورت حال گھبرائی ہوئی ہے۔ سائمن نے یہ بھی بتایا کہ کئی افراد تاحال شہر میں پھنسے ہوئے ہیں، وکٹر اور اس کی میم کوشش کر رہی ہے، تاہم انہیں شدید مسائل کا سامنا ہے، کیونکہ انگاروں کی بارش سے باہر جانے والی سڑک شدید متاثر ہوئی ہے۔

”سائمن، حکومت کو مطلع کر دو، ہوائی سفر پر پابندی عائد کرنی ہوگی فوری، ورنہ ہزاروں افراد جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔“ جیمز چلا آیا۔

اب وہ پل کے بے حد نزدیک پہنچ چکے تھے۔ زندہ رہنے کا امکان بڑھ رہا تھا، امید لوٹ رہی تھی لیکن آخری منوڑ پر اُس نے ایک ایسا خوفناک منظر دیکھا جسے بھولنے کی ہر کوشش، آنے والے کئی برسوں تک ناکام رہی۔

حقای خاندان کی جو کار اُن کی جیب کے آگے دوڑ رہی تھی، اُس کے پونٹ پر بھاری پتھر آکر گر کر ڈرائیور تو اڑن کھو بیٹھا اور کار سیدھی دریا میں جا گری۔

اینا نے سسکی لی، جیمز کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ کار کے مسافروں کی چیخیں سن سکتا تھا۔

ناپوسی اور عمدے کے زیر اثر اُس نے پل پر جیب روک دی۔ انتہائی کرب کے ساتھ نیچے اترا اور دریا کے تیزابی پانی پر نظریں نکا دیں، جس میں ایک کار گم ہو رہی تھی، جس کے سوار موت کے گھٹنے میں تھے۔ وہ ان معصوموں کو بچانے کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا اور اس لمحے گہری یاسیت نے اسے گھیر لیا۔

مارکیز کی موت اور اس حادثے نے اسے توڑ دیا تھا۔ آسمان راکھ سے اٹا تھا، موت زندگی کو نکلنے کو چھی اور ناامیدی کا شکار جیمز اپنی پل کی ریلنگ سے لگا کھڑا تھا۔ دریا کا تیزابی پانی دھیرے دھیرے پل کے ستونوں کو کھوکھلا کر رہا تھا۔

اُس نے ایک نظر تباہ حال، کھنڈر بن چکے سکورگر پر ڈالی جس کے حسن نے بھی اسے مسحور کر دیا تھا۔

اور ایسے میں اسے جیب میں بیٹھے الیگزینڈر اور اس کی ماں اینا کا خیال آیا جن کی زندگی کا دارومدار اُس کے فیصلے پر

تھا اور اُس نے انہیں بچانے کا فیصلہ کیا۔ اب وہ جیب کی جانب بڑھ رہا تھا۔

☆☆☆

گوکہ راستہ تباہی کی علامات سے اٹا پڑا تھا۔ جلتے ہوئے درخت، جھلے ہوئے پتھر، لاوے کے نشانات، سڑک میں پڑے شگاف، تباہ حال گاڑیاں، مویشیوں کے ادھ جلتے جسم، لاشیں... لیکن وہ آگے بڑھتا رہا۔ جیب تیزی سے ”ہوولس ولور“ کی جانب بڑھ رہی تھی۔ الیگزینڈر کو فوری طبی امداد کی ضرورت تھی، اُس کی دھڑکن گھٹتی جا رہی تھی۔

جیب وہ شہر میں داخل ہوا، دیرانی اس کی منتظر تھی۔ ہر طرف آگ تھی، تباہی تھی، سناٹا تھا۔ انسان غائب تھے۔

اُس نے گاڑی ٹاؤن آفس جانے والی سڑک پر ڈال دی۔ چونکہ ٹاؤن آفس پہاڑوں کے دامن میں واقع تھا، اس لیے وہ کم متاثر ہوا تھا۔ پناہ گزینوں کے لیے وہیں کمپ لگایا گیا تھا۔ اُس وقت بھی کمپ میں درجنوں شہری موجود تھے۔

وکٹر آفس کے باہر ہی کھڑا کارکنوں کو ہدایات جاری کر رہا تھا۔ وہ ادا اس ضرورت تھا لیکن مایوس نہیں۔ ایک کونے میں زخمیوں کو طبی امداد فراہم کی جا رہی تھی۔ جیمز الیگزینڈر کو گود میں لیے اُس جانب بڑھا۔ چند لمحوں بعد ایک ماہر ڈاکٹر الیگزینڈر کی مرہم پٹی کر رہا تھا، گوکہ زخم زیادہ گہرا نہیں تھا لیکن خون بہنے کی وجہ سے وہ خاصا کمزور ہو گیا تھا۔

اینا تاحال صدمے میں تھی۔ ڈاکٹر نے اُسے یقین دلایا کہ ننھا جلد ٹھیک ہو جائے گا، مگر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔

”امدادی ٹیمیں پہنچنے والی ہیں۔“ الیگزینڈر کی خیریت دریافت کرنے کے بعد وکٹر نے جیمز کو بتایا۔ ”دو گھنٹے بعد ہم یہ علاقہ چھوڑ دیں گے۔“ اب وہ آنکھوں میں اداسی لیے راکھ اگتی چوٹی کو دیکھ رہا تھا۔ ”اس نے ہمیں بالکل وقت نہیں دیا۔“

جوں ہی جیمز کی میم کو اُس کے پہنچنے کی اطلاع ملی، سب ارکان دوڑتے ہوئے اپنے دفتر سے باہر آگئے۔ کیٹ اور میٹ اُس کے لپٹ گئے۔ سائمن کی آنکھوں میں بھی خوشی کے آنسو تھے۔

”تمہارا اندازہ، تمہارا تجربہ درست تھا جیمز!“

”یہ کام میں نے تم ہی سے تو سیکھا ہے سائمن۔“ جیمز مسکرایا۔

کھر دے چہرے اور مضبوط اعصاب والا سائمن

آبدیدہ ہو گیا۔ ”اوہ جیمز... میں نے کبھی کہا نہیں پر... میں نے تمہیں... ہمیشہ اپنے بیٹے کی طرح سمجھا ہے۔“

جیمز بھی جذباتی ہو گیا۔ وہاں سب کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔

”خیر دوستو...“ اس نے آنسو پونچھے۔ ”ایسا بظاہر جوکل پھٹ گیا۔ ہم اُسے روک نہیں سکتے تھے، تاہم ہم ان ہزاروں انسانوں کو بچا سکتے ہیں، جنہیں یہ راکھ کا عفریت نکلنے کو ہے۔“

”ہاں، ہمیں دنیا کو تانا ہوگا۔ انہیں خبردار کرنا ہوگا۔“

سائمن نے کہا۔ پھر وہ ڈیٹیل کی جانب مڑا۔ ”مسٹر ڈیٹیل، حکام کو مطلع کر دیں، یہ غصیل، ناراض، پہاڑ بہت تباہی پھیلانے کا قریبی ریاستوں کو بھی متنبہ کر دیا جائے، نقصانی آمدورفت روک لی ہوگی۔“

”کیا راکھ اتنی پھیل جائے گی؟“ ڈیٹیل کی آنکھوں میں خوف تھا۔

”ہاں!“ جیمز نے جواب دیا۔ ”جلد راکھ کے بادلوں میں ریت، شیشے اور پتھر کے ذرات شامل ہو جائیں گے جو جہازوں کے انجن جام کر سکتے ہیں۔ تیزابی بارش کا بھی خدشہ ہے۔ ہمیں فوری اقدامات کرنے ہوں گے۔“

”ہاں چوٹی پر مسلسل دھماکے ہو رہے ہیں۔ زلزلوں کا سلسلہ رکنے والا نہیں ہے۔ اور...“ کیٹ کی نظریں کمپیوٹر اسکرین پر لگی تھیں۔ ”جلد ایک بڑا دھماکا ہوگا!“

☆☆☆

امدادی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس قریب آ رہی تھیں جس سے مایوس شہریوں کے دل میں امید لوٹ رہی تھی۔

الیگزینڈر ہوش میں آ گیا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں جیمز کی لیے محبت تھی۔ اینا نے رندھی ہوئی آواز میں اُس کا شکریہ ادا کیا۔ جیمز نے اینا اور الیگزینڈر کو گلے سے لگالیا۔ تینوں کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ محبت نے تینوں کو ایک دوجے سے باندھ دیا تھا۔

”خوب صورت خاندان ہے۔“ اس جملے نے جیمز کو چونکا دیا۔ یہ برطانوی سرمایہ کار چارلس تھا۔ اُس کی آنکھوں میں شرمندگی تھی۔ ”معاف کرنا دوست، میں تمہیں غلط سمجھا۔“

”کوئی بات نہیں، حالات ہی کچھ ایسے تھے۔“ جیمز دوستانہ انداز میں مسکرایا۔

وکٹر بھی نزدیک آ گیا۔ اس نے جیمز کا شکریہ ادا کیا۔

”تم ایک بہادر انسان ہو دوست، میں تمہارے لیے دعا گو



سملی ڈیم رنفی شاہ

ڈیم ہماری بقا کے لیے بہت ضروری ہے۔ آج تمام ممالک زیادہ سے زیادہ ڈیم بناکر اپنے ملک کو ترقی کی دوڑ میں آگے لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہمارے پاس یہ رجحان کم ہے نہ سیلاب سے بچاؤ کو مدنظر رکھ رہے ہیں اور نہ پانی کا اٹھ وقتوں کے لیے ذخیرہ کرنے پر غور کر رہے ہیں پھر بھی ہم نے کئی اہم ڈیم بنالیے ہیں انہی میں سے ایک سملی ڈیم ہے۔ آئیے اس کا جائزہ لیتے ہیں۔

اپنے وطن کا ہر ذرہ ہے پیارا، وطن پرستوں کا تحفہ، وطن دوستوں کے لیے

پاکستان کے وفاقی دارالحکومت اسلام آباد کو موجودہ جگہ پر بسانے کے دفاعی یا سیاسی مقاصد جو بھی رہے ہوں لیکن اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس میں علاقے کی خوبصورتی، آب و ہوا اور گردش و پیش کے ماحول کا بھی بے حد ہاتھ تھا۔ خطہ پوشوہار کا یہ علاقہ قدرتی جنگلات اور نہایت کم اونچے پہاڑوں کی وجہ سے ایک جانب توبہ آسانی قابل رسائی تھا جبکہ دوسری جانب انہی جنگلات اور پہاڑیوں نے

متاثر ہوئے۔ کئی ہوائی اڈے بند ہو گئے۔ ہزاروں افراد، ہزاروں معصوم افراد بے روزگار ہوئے۔ اس فضائی بحران کے نتیجے میں اندازاً تریسٹھ ہزار پروازیں متاثر ہوئیں۔ کیا آپ یقین کریں گے، تریسٹھ ہزار پروازیں!

اس نے مضطرب چہروں پر نظر ڈالی اور بات جاری رکھی۔ ”فضائی صنعت کو یومیہ بنیادوں پر دو سو ملین ڈالر کا نقصان اٹھانا پڑا۔ ٹائن ایون کے واقعے کے بعد یہ دوسرا موقع تھا، جب اتنے دنوں تک فضائی سروس معطل رہی۔ اور نقصان کئی گنا زیادہ ہوا۔ یورپ اور ایشیا کے کتنے ہی مسافر مختلف براعظموں میں پھنس گئے۔ انہیں ذہنی اور جسمانی عذاب برداشت کرنا پڑا۔“

وہ پھر ٹھہرا، سامعین پر نظر ڈالی جو سکتے میں تھے۔ ”دوستو، مختلف ممالک میں پھنسے والے برطانوی باشندوں، یعنی آپ کے ہم وطنوں کی تعداد ڈیڑھ لاکھ کے قریب تھی۔ کیا یہ سنے میں خوفناک نہیں لگتا؟ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ اس حادثے سے ایسٹر کی تقریبات بری طرح متاثر ہوئیں اور کئی ممالک میں اس تہوار کو سادگی سے منانے کا اعلان کیا گیا۔ امدادی کارکنان کی پیشیاں منسوخ کر دی گئیں۔ اب، چند دن بعد حالات میں بہتری آرہی ہے اور ہم 14 اپریل کے سانحے کا تجربہ سائنسی بنیادوں پر کر سکتے ہیں۔ گوکہ اس دوران اربوں ڈالر کا نقصان ہوا، لیکن مجھے خوشی ہے کہ انسانی جانیں محفوظ رہیں۔“

ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ ”ہم اس کے لیے آپ کے شکر گزار ہیں مسٹر سائنس!“ کئی آوازیں بلند ہوئیں۔ ”یہ آپ کی محبت ہے۔“ سائنس نے کہا۔ ”لیکن اس سٹائش کا اصل حق دار میں نہیں!“ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ ”اس کا اصل حق دار میرا دوست اور انتہائی باصلاحیت ماہر آتش فشاں جیمز ڈکنز ہے۔ اسی کی کوششوں کے نتیجے میں آج دنیا رہنے کے لیے، ہم سب کے لیے بہترین جگہ ہے۔“

”وہ کہاں ہے؟ ہم اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتے ہیں!“ کئی آوازیں بلند ہوئیں۔

”وہ اس وقت...“ سائنس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ ”وہ اس وقت چھٹیوں پر ہے، اپنی فیملی کے ساتھ، اپنی نئی فیملی کے ساتھ!“ یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر مشفقانہ مسکراہٹ تھی۔

”ہوں۔“ ”شکریہ!“ اس نے جواب دیا۔ ”مجھے یقین ہے وکٹر تم اس شہر کو پھر آباد کرو گے، نئے جذبے کے ساتھ!“ ”ہاں، مجھے یقین ہے۔“ اس کے لہجے میں عزم تھا۔

☆☆☆

زخمیوں کو، مصیبت کے شکار شہریوں کو امدادی کارکنان کی جانب سے گاڑیوں میں سوار کیا جا رہا تھا۔ وہ یہ شہر چھوڑ رہے تھے جس پر قہر نازل ہوا تھا، جس کے خون کو راکھ کے آسیب نے نکل لیا تھا۔ وہ سب رنجیدہ تھے، لیکن ان کی آنکھوں میں امید تھی، عزم تھا، ایک نیا شہر آباد کرنے کا عزم، زندگی جاری رکھنے کا عزم!

اور تین اُس وقت، کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہوا۔ زمین لرز گئی، لیکن یہ دھماکا متوقع تھا، امدادی کارکنان نے اپنا کام جاری رکھا، کیونکہ ان کا کام زندگیاں بچانا تھا۔ وہ زندگی کی رخ کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔

الیکٹریٹر، جیمز کی گود میں تھا۔ اس نے اپنا کام تمام رکھا تھا اور اس کی نظریں ایسا فالو بکول کی چوٹی پر جمی تھیں۔ دوسری جانب سے مشرق کا نیا سورج طلوع ہو رہا تھا، جو حقیقتاً، امید کا سورج تھا!

☆☆☆

29 اپریل، دوپہر ایک بجے۔ ”آئس لینڈ کے اس آتش فشاں نے اپنی معلوم تاریخ میں چوتھی بار لاوا اگل دیا۔“ اسٹو اور کیا آپ یقین کریں گے، ابتدائی 72 گھنٹوں میں وہ 750 ٹن فی سیکنڈ کے حساب سے راکھ اگل رہا۔ اور یہ خوفناک سلسلہ ایک ہفتے جاری رہا۔“ یہاں پہنچ کر امریکی ماہر ارضیات، سائنس دانے نے چند گھنٹوں کے لیے توقف کیا اور پھر ہال میں موجود آکسفورڈ یونیورسٹی، برطانیہ کے طلباء و طالبات پر نظر ڈالی، جو ہمدن گوش تھے اور اس پر تجسس مہم اور خطرناک تجربے کے بارے میں مزید جاننا چاہتے تھے، کیونکہ مستقبل میں انہیں خود بھی اس قسم کے حالات کا سامنا کرنا پڑ سکتا تھا۔

سائنس نے گھبرا سانس لیا اور قہصے کا سراپا بکڑا۔ ”نوجوانوں! آپ جانتے ہیں، ایسا فالو بکول کی آگنی راکھ سے براعظم یورپ کی فضا بری طرح متاثر ہوئی۔ میں سے زائد ممالک کی، میرا یقین کریں میں سے زائد ممالک کی فضائی سروس معطل ہو گئی۔ آپ کے ملک، یعنی برطانیہ کے علاوہ فرانس، جرمنی، ناروے، ڈنمارک، سلوینیا، صومالیہ اور

اس کی دل کشی کو چار چاند لگا دیے تھے۔ اسلام آباد کو مارگلہ ہلز کے دامن میں آباد کیا گیا جن کا سلسلہ ایک جانب کوہستان نمک سے جاملتا ہے تو دوسری جانب مری ہلز میں ختم ہو جاتا ہے۔ اس لیے یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اسلام آباد اور اس کے قرب وجوار کا علاقہ تین پہاڑی سلسلوں کے سنگم پر واقع ہے۔

مارگلہ ہلز کو اللہ تعالیٰ نے قدرتی حسن عطا کیا ہے جبکہ کوہستان نمک میں موجود نمک کی کانوں کا شمار دنیا کی سب سے بڑی کانوں میں ہوتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ کوہستان نمک کے ملحقہ علاقوں میں تیل اور گیس کے بے پناہ ذخائر بھی موجود ہیں۔ موٹروے کے راستے لاہور سے اسلام آباد آئیں تو ٹکڑا ہار (جہاں موٹروے کوہستان نمک کو چیر کر خطہ پوٹھوہار میں داخل ہوتی ہے) سے لگ بھگ پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر ہلکسر اور تلہ گنگ کا علاقہ ہے جس کے لیے کہا جاتا ہے کہ اس کے نیچے پانی کا ایک سمندر موجزن ہے۔ بس اسے تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔

مارگلہ ہلز اور کوہستان نمک کی طرح مری ہلز بھی قدرتی عطیات سے مالا مال ہے۔ یہ قدرتی عطیہ پانی ہے کیونکہ مری ہلز اور اس کے گرد و نواح پر ہونے والی برف باری اور بارش صرف ان علاقوں کے حسن کو ہی نہیں نکھارتی بلکہ لاکھوں افراد کو پینے اور وسیع رقبے کو آب پاشی کے لیے پانی جیسی اموں نعمت بھی فراہم کرتی ہے۔

مری اور اس کے بالمقابل گھڑاگلی (پتھر یا نہ کا علاقہ) کی پہاڑیوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان پر ہونے والی برف باری اور بارش دھلوان کے ایک جانب دریائے جہلم اور اس کی وادیوں کو پانی فراہم کرتی ہے تو دوسری جانب راولپنڈی اور اسلام آباد کے علاوہ ان سے ملحقہ علاقے اس سے فیض یاب ہوتے ہیں۔

مری سے دریائے سواں اور گھڑاگلی سے کھاد نالہ ان پانیوں کو لے کر نشیب کی جانب اپنے سفر کا آغاز کرتے ہیں۔ راستے میں ٹیکڑوں چھوٹے بڑے برساتی نالوں اور چشموں کا پانی ان میں شامل ہو جاتا ہے۔ لگ بھگ پچاس کلومیٹر کا پُر پیچ راستہ طے کرنے کے بعد اراری کے مقام پر کھاد نالہ، دریائے سواں سے مل جاتا ہے جو کچھ فاصلے کے بعد ایک چھوٹی سی پیالہ نما وادی میں آ نکلتا ہے جہاں 1980ء سے پہلے سو ڈیڑھ سو مکانات پر مستقل سسلی نام کا ایک گاؤں آباد تھا۔

وفاقی دارالحکومت کی تعمیر کے وقت سے پانی کی فراہمی کے لیے جو منصوبے بنائے گئے تھے وہ بڑھتی ہوئی آبادی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے رفتہ رفتہ کم پڑنے لگے۔ اب پانی کی کمی بڑی ذخیرہ گاہ کی تلاش شروع ہوئی اور آس پاس کے علاقوں کو کھنگالا جانے لگا۔ متعدد ارضیاتی اور جغرافیائی سروریز کے بعد قریب فال اس علاقے کے نام نکلا جس کا نام سسلی تھا۔

اس کی خصوصیت یہ تھی کہ تین اطراف بلند و بالا پہاڑ تھے جن کے عین نشیب میں آبادی تھی۔ اگر اس گاؤں کو خالی کر لیا جاتا تو یہ پیالہ نما وادی قدرتی جمیل بن سکتی تھی لیکن مسئلہ سسلی گاؤں کے مکینوں کو متبادل جگہ فراہم کرنا تھا۔

اسلام آباد سے مری جاتے ہوئے کوئی دس کلومیٹر کے فاصلے پر بارہ کوتاہی ایک بڑا قصبہ آباد ہے۔ اسلام آباد مری شاہراہ اس قصبے سے ملحق کورنگ نالے کو عبور کر کے اس پہاڑی سلسلے میں داخل ہوتی ہے جس میں سسلی آباد تھا۔ یہ سڑک ایک مقام پر پہاڑی کے نیچے ایک تنگ سڑک سے بھی گزرتی ہے۔ اس سے آگے سڑک دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ ایک نیلور اور دوسری سسلی کی جانب چلی جاتی ہے۔ اس گاؤں کو جانے کا یہی واحد راستہ تھا۔

سسلی گاؤں سے ذرا پہلے یہ سڑک پہاڑیوں کا دامن تمام لیتی ہے اور انہی سے لپٹی لپٹائی بلند ہوتی اور پُر پیچ راستوں سے گزرتی گھبراہلی یعنی پتھر یا نہ جاتکتی ہے۔ مری ایکسپریس وے کی تکمیل سے پہلے یہی خستہ حال اور خطرناک سڑک، راولپنڈی، اسلام آباد سے مری کا متبادل راستہ ہوا کرتی تھی۔

سسلی کے مقام پر یہ سڑک گاؤں سے خاصی بلند ہے تاہم اہالیان سسلی کو اسی سڑک کے کنارے متبادل جگہ فراہم کی گئی۔ گاؤں خالی ہو گیا تو اس پیالہ نما وادی میں پانی کی اس ذخیرہ گاہ کی بنیاد رکھی گئی جسے اب سسلی ڈیم کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

سسلی، اسلام آباد کے شمال مشرق میں لگ بھگ تیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ دریائے سواں پر واقع یہ مکمل طور پر ایک قدرتی ڈیم ہے کیونکہ اس میں پانی کی آمد صرف اور صرف بارشوں اور برف باری سے مشروط ہے۔

کھاد نالہ اور دریائے سواں کے علاوہ منگل، چندر پلا، چنیوٹ، کلائی، کلاں، بساند، بھانہ اور ملحقہ چھوٹے چھوٹے علاقوں سے بھی درجنوں نالوں اور چشموں کا پانی براہ راست

اس جمیل میں گرتا ہے جس سے اس کی سطح میں بتدریج اضافہ ہوتا رہتا ہے لیکن چونکہ ڈیم میں پانی آنے کا اور کوئی ذریعہ نہیں اس لیے ہر دو چار سال میں ایک مرتبہ اسے پانی کی کمی کا سامنا پڑتا ہے جس کا اثر براہ راست اسلام آباد پر پڑتا ہے کیونکہ اس صورت میں پانی کی فراہمی نصف سے بھی کم رہ جاتی ہے۔

سسلی ڈیم کی جمیل 28 ہزار 1750 ایکڑ پر پھیلی ہوئی ہے جبکہ اس کا مجموعی رقبہ دس مربع کلومیٹر سے زائد ہے۔ ستمبر 1982ء میں مکمل ہونے والے اس ڈیم کی عمر کا اندازہ تقریباً 63 برس ہے یعنی یہ الفاظ دیگر اسلام آباد کے شہری 2045ء تک سسلی ڈیم کے پانی سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

سسلی ڈیم کی جمیل 265 فٹ گہری ہے اور اس میں 25 لاکھ 80 ہزار کیوبک گز پانی ذخیرہ کرنے کی گنجائش ہے۔ جمیل میں گنجائش سے زیادہ پانی آ جانے کی صورت میں اس کے اخراج کے لیے 1010 فٹ طویل اسل وے بنایا گیا ہے جو سطح زمین سے 250 فٹ بلند ہے۔ اس کے تین دروازے ہیں جبکہ بلندی پر اس کی موٹائی 30 فٹ ہے۔ اس اسل وے سے بیک وقت 4500 کیوبک پانی خارج ہو سکتا ہے۔

1998ء میں اسل وے کو مزید بیس فٹ بلند کیا گیا جس کی وجہ سے ڈیم میں پانی کی گنجائش 28 ہزار 1750 ایکڑ فٹ سے بڑھ کر 38 ہزار ایکڑ فٹ ہو گئی۔ پہلے یہاں سے اسلام آباد کو روزانہ 2 کروڑ 40 لاکھ گیلن پانی کی فراہم کیا جاتا تھا لیکن توسیع کے بعد یہ تقریباً دو گنی ہو گئی۔

اسلام آباد کی 5 لاکھ 25 ہزار آبادی کو اوسطاً 150 گیلن فی شخص کے حساب سے 8 کروڑ 25 لاکھ گیلن پانی درکار ہے۔ کیپٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی (سی ڈی اے) کیارہ مختلف ذرائع سے یہ پانی فراہم کرتا ہے جن میں کورنگ واٹر ورکس، سسلی واٹر ورکس، سید پور واٹر ورکس، نور پور واٹر ورکس، راول ڈیم واٹر ورکس، خان پور ڈیم واٹر ورکس، نیشنل پارک پرائے گولف کورس، نئے گولف کورس اور مختلف سیکٹرز میں نصب ڈیڑھ سو سے زائد نیوب ویل شامل ہیں جن میں سے کسی ایک خشک یا خراب ہو چکے ہیں۔

سسلی ڈیم کی ایک انفرادیت یہ ہے کہ یہ کوئی کمرشل منصوبہ نہیں اور نہ ہی یہ قول سی ڈی اے کے اس کے اضافی مراعات برداشت کرنے پڑتے ہیں کیونکہ یہ اپنا خرچہ اسلام آباد کو پانی کی فراہمی کے عوض پورا کر لیتا ہے۔

سسلی ڈیم چونکہ مکمل طور پر بارانی ہے اس لیے عام طور پر اس کی سطح سوائے موسمِ برسات کے، اسل وے کی بلندی سے قدرے کم ہی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اضافی پانی کے اخراج کے لیے کوئی ٹریبان بھی نہیں لگایا گیا تاہم بعض ماہرین کا کہنا ہے کہ ڈیم کی تعمیر کے وقت اگر اس کے ڈیزائن میں تبدیلی کر لی جاتی تو پوری فیکیشن اور فلٹریشن پلانٹ کو فراہم کی جانے والی سڑک کے پانی سے بھی بجلی پیدا کی جاسکتی تھی جس کا بہاؤ 445 کیوبک ہے۔

سسلی ڈیم کی تعمیر کا سہرا ایم سی پی (سابق میکناٹز ڈکنسن کمپنی آف پاکستان) اور مصطفیٰ کمپنی کے سر جاتا ہے۔ علاقے کے مکینوں کا کہنا ہے کہ تکمیل کے آخری مراحل میں خاصے ”گھیلے“ ہوئے اور ان میں سے ایک کمپنی کام ادھورا چھوڑ کر بھاگ گئی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ اس وقت یوں محسوس ہوتا تھا کہ بنانے والے صرف اس ڈیم کو مکمل کرنا چاہتے تھے اور انہیں اس امر سے قطعی طور پر کوئی دلچسپی نہ تھی کہ اس کا تعمیراتی معیار کیسا ہوگا؟

سسلی ڈیم کی بد قسمتی یہ ہے کہ ملک کے دیگر منصوبوں کی طرح اس کی دیکھ بھال کا بھی کوئی مناسب اور خاطر خواہ انتظام موجود نہیں۔ ڈیم بننے کے بعد سے اب تک جمیل سے گار نہیں نکالی گئی جس کی وجہ سے جمیل میں پانی کی بلندی رفتہ رفتہ کم ہو رہی ہے اور جس رفتار سے مٹی جمیل میں آ کر گر رہی ہے، اس سے خدشہ ہے کہ یہ 63 سال سے پہلے ہی مٹی سے اٹ جائے گی۔

سی ڈی اے کا موقف ہے کہ یہ ڈیم آئوٹینک واشنگ سسٹم کے تحت کام کرتا ہے لیکن جمیل، ڈیم کی حالت زار، تنصیبات اور فلٹریشن پلانٹ کی زیوں حالی دیکھ کر یہ دعوے کھوکھلے محسوس ہوتے ہیں جس کی وجہ سے اسلام آباد کے شہری گند پانی پینے پر مجبور ہیں۔ جمیل میں گر کر آئے دن کئی جنگلی جانور ہلاک ہوتے رہتے ہیں جن کی لاشوں سے لحظہ پہلینا شروع ہو جاتا ہے لیکن انہیں پانی سے نکالنے کا کوئی انتظام نہیں جبکہ فلٹریشن پلانٹ پر کالی اور گندگی کی موٹی تہ جم چکی ہے اور ڈیم شدید خستہ حالی کا شکار ہے۔

ڈیم چونکہ شہر سے دور پہاڑی علاقے میں واقع ہے اور اس کا راستہ بھی بے حد خراب، خستہ حال اور قدرے دشوار گزار ہے اس لیے چند سال پہلے تک یہ سیاحوں اور ٹینک منانے والوں کی دسترس سے دور تھا۔ گئے دنوں میں غیر ملکیوں کے بھی اس علاقے میں جانے پر پابندی تھی۔

خونفک بھینسا

انجم فاروق ساحلی

اڑیل پن، غیر معمولی قوت اور بھاری بھرکم جسمانت کی وجہ سے اڑنا بھینسے شیر اور چیتے سے زیادہ خطرناک سمجھے جاتے ہیں۔ ان کا شکار سنسنی خیزی میں سب سے زیادہ ہے۔ اس پر غضب یہ کہ ایسے بھینسے کا شکار جسے مقامی لوگ آسیب سمجھ رہے ہوں بڑے چوکھم سے کم نہیں۔

سنسنی خیزی سے بھری شکاریات کے قصے پڑھنے والوں کی مدارات



بھی۔ سڑک کے پانچویں میل پر ایک لمبی چوڑی جھیل دکھائی دے رہی تھی جس میں بڑی چھوٹی مچھلیوں کے علاوہ مکرچھ بھی پائے جاتے ہیں۔ اس جھیل کے نزدیک اس قدر گھٹا جنگل ہے کہ دن کے وقت بھی وہاں راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ جنوب کی سمت یوگی مت پہاڑی ہے جس کے اوپر ایک صدیوں پرانا قلعہ ہے۔ کچی سڑک کے اختتام پر مجھے گاڑی سے اتار کر ڈرائیور واپس روانہ ہو گیا۔ میں ٹارچ تھامے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ میں اس بار جنگلی بھینسوں سے نبرد آزما ہونے جا رہا تھا۔ ایک ایسے بھینسے سے جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ بھینس کی شکل میں عفریت ہے۔

میں اُن دنوں ریاست میسور میں تھا۔ میرا ایک پُرانا دوست، ننگور کے ایک جنگل میں عرصہ دراز سے رہائش پذیر تھا، اسی کا میں مہمان تھا۔ وہ خود بھی معروف شکاری تھا لیکن اب عمر بزرگی کے عوارض کے ہاتھوں کنارہ کش ہو چکا تھا۔ رات کے وقت ہم دونوں اپنے اپنے شکار کے دلچسپ واقعات ایک دوسرے کو سناتے رہتے۔ وہ رات بھی ایک دوسرے کی سنتے کہتے گزری تھی اور صبح کو ایک ایک کلف ناشتا کیا پھر شکار کے لیے روانہ ہو گیا، اس کے ساتھ کہ واپسی میں بھی یہیں ٹھہروں گا۔ میرا رخ بالکل ونگ کی طرف تھا جو ضلع بھی ہے اور ضلع کا صدر مقام

تھا۔ ان کشتیوں کے بارے میں بھی سی ڈی اے حکام اور چشم دید گواہوں کے بیانات میں واضح تضاد تھا۔ سی ڈی اے کا کہنا ہے کہ موثر بوٹ جھیل کے سروے کے لیے رکھی گئی ہے لیکن عینی شاہدین کچھ اور کہتے ہیں۔ سی ڈی اے کے افسران اور دیگر افراد اپنے اہل خانہ اور سہیلیوں کو اس جھیل کی سیر کرایا کرتے تھے۔ یہ دیگر افراد بھی صرف وہی ہوتے تھے جو کسی نہ کسی طور سی ڈی اے کے اعلیٰ حکام کے چہیتے کہلاتے تھے۔

لیکن اب یہ صورت حال قدرے تبدیل ہو گئی ہے کیونکہ ٹورزم ڈیولپمنٹ کارپوریشن آف پاکستان کی جانب سے جھیل پر وائٹ اسپورٹس کا انتظام کر دیا گیا ہے اور یوں ہر خاص و عام مقررہ فیس یا ٹکٹ کی رقم ادا کر کے جھیل سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ اسی طرح پہلے سسلی ڈیم جانے کے لیے ذاتی سواری کا اڈا بنے حد ضروری تھا یا لوگ وہ خستہ حال ٹرانسپورٹ استعمال کرتے تھے جو پارہ کھو سے خطرناک سڑک کے راستے گھبرائی گئی کے لیے چلا کر تھی تھی۔ مقامی آبادیوں کے رہنے والے اب بھی یہی بسیں اور جھپیں استعمال کرتے ہیں لیکن سسلی ڈیم پر جانے والے شوقین افراد اور سیاحوں کے لیے پی ٹی ڈی سی کے علاوہ راولپنڈی اور اسلام آباد کے بعض ٹور آپریٹرز بھی ”ڈے ٹرپ“ کا انتظام کرتے ہیں جس کے اخراجات قابل برداشت ہیں۔

اپنے محل وقوع اور تین طرف پہاڑ ہونے کی وجہ سے سسلی جھیل کسی حد تک جھیل سیف الملوک سے مشابہ ہے لیکن اس سے خوبصورت نہیں کیونکہ جو ظلم آپ کو جھیل سیف الملوک پر محسوس ہوتا ہے وہ یہاں نہیں اور نہ ہی یہاں ویسا سہولتیں دستیاب ہیں۔

سسلی ڈیم کو جانے والی سڑک گواہ سڑک نہیں رہی بلکہ کئی جگہوں پر تو یہ کچے راستے میں تبدیل ہو چکی ہے لیکن یہ جن علاقوں سے گزرتی ہے وہ بہت دلکش ہیں۔ بارہ کھوکے ساتھ ہی نالہ کورنگ ہے جسے پار کرتے ہی یہ سڑک اونچی نیچی پہاڑیوں میں داخل ہو جاتی ہے جو بتدریج بلند ہوتی ہے۔ حکومت اگر ذرا سی توجہ دے تو سسلی ڈیم، اسلام آباد کے اطراف میں ایک بہترین ”تفریحی ریزورٹ“ میں شامل ہو سکتا ہے۔



لیکن اب صورت حال خاصی مختلف ہے اور راولپنڈی، اسلام آباد کے جزواں شہروں کے علاوہ ملک کے دیگر حصوں سے آنے والے شوقین حضرات اکثر سسلی کا رخ کرتے ہیں البتہ انہیں شام کو لوٹنا پڑتا ہے کیونکہ سسلی ڈیم پر تقریبی سہولتیں نہ ہونے کے برابر ہیں اور رہائش کا بھی کوئی انتظام نہیں۔

سسلی ڈیم پر موجود واحد رہائشی عمارت یہاں کا عالی شان ریست ہاؤس ہے جہاں دستیاب سہولتیں کسی بھی طرح فور یا فائیو اسٹار ہوٹل سے کم نہیں لیکن اس کا انتظام وانصرام اور کنٹرول سی ڈی اے کے پاس ہے۔ اور پرمٹ کے بغیر یہاں نہیں رکا جاسکتا۔

عام لوگوں کی اس ریست ہاؤس تک رسائی تو برائے نام ہے لیکن سسلی ڈیم پر واقع شہر کے ہنگاموں سے کوسوں دور یہ ریست ہاؤس بعض سیاست دانوں کا میزبان ضرور رہا ہے۔ اس ریست ہاؤس میں کئی سیاست دانوں اور حکومت کے معتبوں لیکن اعلیٰ عیشیتوں کے مالک افراد نے اپنے ایام اسیری بسر کیے ہیں۔

ایسے افراد میں سابق وزیراعظم بے نظیر بھٹو کے شوہر اور موجودہ صدر پاکستان آصف علی زرداری کے علاوہ آزاد کشمیر کے سابق وزیراعظم ممتاز راٹھور بھی شامل ہیں۔

بے نظیر بھٹو خود بھی دو بار اس ریست ہاؤس کی مہمان رہ چکی ہیں۔ ایک بار وہ اپنے اسیر شوہر کے ساتھ چند روز گزارنے کے لیے یہاں آئی تھیں جبکہ دوسری بار اپنے دور اقتدار میں یہ حیثیت وزیراعظم اپنے بچوں کے ہمراہ پکنک منانے یہاں آئیں۔

اس ریست ہاؤس کے بارے میں کئی کہانیاں زبان زد عام ہیں۔ اطلاعات کے مطابق کئی شوقین افراد اکثر شہر کے ہنگاموں سے دور یہاں عیاشی کے لیے آتے ہیں۔ سی ڈی اے کی انتظامیہ اس کی تردید کرتی ہے۔ ان کے بقول ریست ہاؤس صرف سی ڈی اے افسروں کے زیر استعمال رہتا ہے اور یہ عام لوگوں کو کرائے پر نہیں دیا جاتا۔ اس لیے اس طرح کے معاملے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

لیکن ریست ہاؤس پر نصب بورڈ اور ریست ہاؤس کا عملہ بتاتا ہے کہ سی ڈی اے سے پرمٹ حاصل کر کے اور طے شدہ کرایہ ادا کر کے کوئی بھی شخص یہاں رات بسر کر سکتا ہے۔ چند سال پہلے تک سسلی ڈیم کی جھیل میں صرف دو کشتیاں ہوا کرتی تھیں۔ ان میں سے ایک چھوٹی سی کشتی جو بے نام تھی جبکہ دوسری موٹر بوٹ تھی اور اس کا نام ”مارگھ“

اور تھا۔

☆☆☆

اس بار جب بھینسوں کے شکار پر نکلا تو وہ مناظر دو بارہ نظر آئے۔ انھوں نے اپنے آگے بھینسوں کی بہادری، سینگوں کا استعمال یاد آگیا۔

سینگوں کے علاوہ یہ اپنی زبان سے بھی ہتھیار کا کام لیتے ہیں۔ منہ میں چھپا گوشت کا یہ ٹکڑا اس قدر سخت اور کھردرا ہوتا ہے کہ نرم درختوں کو تیز دھار آ رہے کی طرح کاٹ دیتا ہے۔ اس جانور کی سرشت کا ایک خطرناک اور مضر ررساں پہلو دوسری اور ہٹ دھرمی ہے۔ آپ شیر، چیتے یا گینڈے جیسے خطرناک جانوروں پر گولیاں چلا کر ان کا رخ پھرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں لیکن بھینسے کے متعلق یہ سوچنا خوش فہمی اور پرخطر غلطی ہے۔

میں بھینسوں کے بارے میں سوچتا ہوا تیزی سے آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ ایک جانب شاداب جنگل پھیلا ہوا تھا اور دوسری جانب چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں۔ ان خوبصورت پہاڑیوں کے دامن میں ان گنت اودے، پیلے، نارنجی سرخ، قرمزی رنگوں کے پھول عجب بہار دکھا رہے تھے۔ خوشنما پرندوں کی جادو اثر چہچکاراؤں میں امرت ٹپکا رہی تھی۔ اس خطہ جنت نشاں میں جنگلی بھینسوں کے بڑے غول آوارہ گردی کرتے تھے۔ وہیں گاؤں کے کچھ لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بھی وہی بات کہی ”یہاں ایک سیاہ عفریت

رہتا ہے جسے کوئی شخص شکار کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔“ وہ سیاہ عفریت ہے کیا چیز؟“ میں نے انجان بن کر دریافت کیا۔

”وہ جنگلی بھینسے کے روپ میں کوئی عفریت یا آسیب ہے جو چاہے کسی جگہ نمودار ہو جاتا ہے، اس کی طاقت اور قوت بے انتہا ہے۔“

”آپ گھبراہے مت، میں اسے ٹھکانے لگا کر اس کا سر اپنے کمرے میں لٹکاؤں گا۔“ میں نے رائفل پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”میری مانو تو واپس لوٹ جاؤ، وہ بہت خطرناک آسیب ہے۔“ ایک نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

میں چونکہ بھوت پریت اور بدروحوں وغیرہ کا قائل نہیں تھا لہذا میں نے تمبیہ کر لیا تھا کہ اس کالی بلا کوفتا کے گھاٹ اگلی طویل الاعتقادی کا تار و پود سمجھ دوں گا۔

اگلے روز نور کے تڑکے میں راتقل، پستول اور خنجر سے

مگے کہ اچانک دائیں جانب کے گھنے درختوں میں سے ایک جوان سال شیر ہلکی آواز میں غراتے ہوئے سامنے آیا۔ اس نے تیزی سے جست لگائی اور ایک جنگلی بھینسے کی پشت پر سوار ہو گیا۔ اس نے اپنے اگلے پیچھے بھینسے کی موتی گردن میں گاڑ دیے تھے۔

شیر کے کھیلے بیٹوں سے بھینسے کی جلد زخمی ہو گئی اور اس میں سے خون بہنے لگا۔ بخروج جانور تکلیف کی شدت سے ڈراؤنی آواز میں ڈکرایا اور شیر کو اتار چھیننے کی دیوانہ وار کوشش کرنے لگا اور اپنا وزنی جسم زور زور سے جھٹکنے لگا۔ شیر جو غالتا بھوکا تھا، وہ کسی طور اسے چھوڑنے پر آمادہ نہ تھا اور اس کی گردن میں اپنے خونیں دانت پیوست کرنے میں کوشاں تھا۔ دوسرے دونوں بھینسے اپنے ساتھی کو گرفتار بلا دیکھ کر بجلی کی طرح لپکے۔ انہوں نے پھرتی کے ساتھ دائیں اور بائیں پہلوؤں سے شیر پر حملہ کر دیا۔ انہوں نے اپنے تیز کھیلے سینگوں سے بے درپے ضربات لگا کر شیر کو لبو لبھان کر دیا۔ شیر جو شدت اشتہا سے بے تاب تھا، بخروج ہونے کے باوجود اپنے شکار سے دستبردار ہونے پر تیار نہ تھا۔ وحشی درندہ تو مند بھینسے کو مار کر اس کی جھوٹا کوشش کر رہا تھا۔

آخر کار زخمی بھینسا اپنی جان بچانے کے لیے دوڑنے لگا۔ ساتھی بھینسے بھی لپکتے ہوئے آئے اور حسب سابق انہوں نے شیر پر پہلوؤں سے یلغار کر دی۔ گرافٹل بھینسے غیظ و غضب میں بھرے ہوئے تھے، وہ شیر کو اپنے سینگوں میں پرونے کی کوشش کیے جا رہے تھے۔

شیر گزیدہ بھینسا اندھا دھند ان درختوں کی طرف لپکا جن کی ڈالیں زمین سے چند فٹ اوپر جھکی ہوئی تھیں۔ جو کئی زخم خوردہ جانور اس طرف دوڑا، ایک مضبوط ڈال کی زد میں آ کر شیر جھٹکنے سے زمین پر آ رہا۔ اب شیر چھ مہلک کھیلے سینگوں کی زد پر تھا۔ ایک پربول دھاڑ کے ساتھ شیر نے پھر حملہ آور ہونا چاہا لیکن وہ بُری طرح زرخے میں آچکا تھا۔ وہ سیاہ عفریتوں کے سینگوں میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ اس کے لیے فرار کی راہ مسدود ہو چکی تھی۔

اب وہ جارحانہ انداز بھول کر مدافعتی پوزیشن اختیار کرنے پر مجبور تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے چھ کھیلے سینگ شیر کے جسم میں ترازو ہو گئے۔ شیر کے گاڑھے خون سے بھینسوں کے سر رنگین ہو رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان تینوں نے شیر کے ٹکڑے آزاد دیے۔

اس واقعے کو عرصہ گزر چکا تھا مگر ذہن کے کیوبس پر ہنوز

شیر، چیتا، ہاتھی، گینڈا اور جنگلی بھینسا، اقلیم دہشت کے پانچ بڑے جانور ہیں، بیشتر تجربہ کار شکار یوں نے ان پانچوں میں سے بھینسے کو خطرناک ترین قرار دیا ہے۔ یہ انتہائی سخت جان، ختم مزاج، مکار اور خونی جانور ہے۔ اپنے تن و توش، بھاری سر اور مہلک سینگوں کے باعث یہ نہایت ہیبت ناک مخلوق سمجھتا ہے۔

دشمن کے ہاتھوں زخمی ہو کر اس کی تند خوئی اور وحشت خیزی انتہا پر پہنچ جاتی ہے۔ یہ جسم قہر و غضب بنا اپنے دشمن کا پیچھا کرتا ہے اور جب تک اسے حوالہ آجل نہ کر دے یا خود ہلاکت کے گڑھے میں نہ گر جائے، پیچھا نہیں چھوڑتا۔ قدرت نے اس قوی ہیکل، جسم اور سیاہ قام حیوان کے بدن میں قوت اور طاقت کا بے پناہ خزانہ سمودیا ہے۔

اپنی انہی خوبیوں کے باعث یہ جانور سبزی خور ہونے کے باوجود گوشت خور درندوں پر بھاری پڑتا ہے۔ اسے دوڑتے دیکھ کر معلوم ہوتا ہے گویا اس کے رگ و پے میں بجلیاں بھری ہوں۔ جنگلی بھینسے کثیر التعداد غول کی صورت میں رہتے ہیں اور عموماً کوئی غیر معمولی تن و توش کا مالک گرافٹل جانور غول کا سردار ہوتا ہے۔ اگرچہ بعض شوریہ سر بھینسے اپنے گروہ سے الگ ہو کر آزاد روی کی روش اپناتے ہیں مگر مجموعی طور پر یہ جانور اپنے ہم جنسوں میں رہنا پسند کرتا ہے۔ اس کی ایک نمایاں وجہ غالباً احساس تحفظ ہے۔ بھینسے اپنے ازلی دشمنوں شیروں اور چیتوں کے خلاف اجتماعی دفاع کرتے ہیں۔

خون آشام درندوں کے جارحانہ حملوں کا مقابلہ کرتے وقت بھینسوں کی صف آرائی، نظم و ضبط، جرأت، بے جگری قابل دید ہوتی ہے۔ اس پر غضب کہ کسی ایسے بھینسے کو شکار کرنا جو تو ہم پرستی کی وجہ سے آسیب مشہور ہو گیا ہو، ایک سنسنی سے بھرپور مرحلہ تھا۔ یوں بھی اپنی طویل مہمانی زندگی کے دوران مجھے بہت سے خیر خیز واقعات دیکھنے کا موقع ملا جس میں برنگا کے جنگل کا واقعہ بھی شامل ہے۔ وہاں میں تین دوڑے سے دو دو ہاتھ کرنے گیا تھا اور جمیل کے کنارے بچان لگا رکھی تھی۔ سورج دن بھر کا سفر کرنے کے بعد غروب ہو رہا تھا اور آسمان پر دل فریب رنگوں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ میں اس نظرنواز نظارے میں منہمک تھا کہ بھاری قدموں کی دھمک سے توجہ دائیں طرف مبذول ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد تین عظیم الجثہ بھینسے اپنی جنگلی بھانجے دریا پر وارد ہوئے۔ انہیں ٹھنڈے پانی سے سیراب ہوئے چند ہی منٹ گزرے ہوں

قطر کے امیر شیخ حماد بن خلیفہ الثانی

خلیج کی عرب شاہی ریاست قطر کے حکمران کا سرکاری لقب ”امیر“ ہے۔ قطر کے موجودہ امیر شیخ حماد بن خلیفہ الثانی کی عمر 57 سال ہے اور ان کی دولت 2 ارب امریکی ڈالر ہے۔ قطر کے تیل اور قدرتی گیس کے ذخائر کو ترقی دینے میں شیخ حماد کی بصیرت اور ذاتی کوششوں کا بڑا عمل دخل ہے۔ اس کے علاوہ ان کی ایک اور وجہ شہرت قطر کی مسلح افواج کو جدید اسلوب میں ڈھالتا ہے۔ امیر قطر کا شاہی محل دار الحکومت دوحہ میں واقع ہے تاہم وہ اس میں نہیں رہتے۔ یہ محل عموماً پارلیمانی سرگرمیوں اور مہمانوں کے خیر مقدم اور ان کے قیام کی ضرورتوں سمیت دیگر سرکاری کاموں میں استعمال ہوتا ہے۔

مرسلہ: فرید عطاری، حیدر آباد

لیس ہو کر نیلے کی طرف چل دیا جسے مقامی لوگوں نے آسیب زدہ ہونے کے باعث ”پریت گڑھ“ کا نام دے رکھا تھا۔

مجھے بتایا گیا تھا کہ اس علاقے میں سیاہ عفریت کو بار بار دیکھا گیا ہے۔ جنگلی بھینسوں کی اس جولان گاہ میں بھییم دیو نامی شکاری ایک بدست سائڈ کے قوی سینگوں کی زد میں آ کر قہر آجل ہوا تھا۔ تب سے وہ علاقہ آسیب زدہ کہلانے لگا ہے۔

صبح سے دوپہر ہو گئی لیکن کالے بھوت کی شکل دکھائی نہ دی۔ جنگل گہنا اور دشوار گزار تھا۔ میں بھید مشکل اس میں راستہ بناتا کھڑوں میں گرتا سمجھتا آگے بڑھتا چلا گیا۔ یہ خوفناک علاقہ جنگلی جانوروں اور حشرات الارض سے چا پڑا تھا۔ یہاں جا بجا دلہلی قہقہے تھے جن میں پھنس کر کوئی ذی الحیات زندہ نہیں بچتا۔ سیاہ کچھڑ میں کئی جگہ بھینسے کے پاؤں کے نشانات نظر آئے۔ نقوش پا کئی روز پرانے معلوم ہوتے تھے۔ میں اپنے خیالات میں گم آگے بڑھتا چلا گیا۔

دن ڈھل رہا تھا اور فضا میں کیف آور فحش کور آئی تھی۔ میں صبح سے آوارہ گردی کرنے کے باعث جسمانی اور ذہنی تحکم محسوس کرنے لگا تھا۔ بھوک اور پیاس کا احساس اس پر مستزاد تھا۔ چنانچہ واپسی کے ارادے سے مختصر راستہ اختیار کیا۔ ابھی تھوڑا سا راستہ طے کیا تھا کہ ایک بُرائے اور گھنیرے درخت کے نیچے سبزی مائل خاکستری رنگ کا ایک موٹا تانہ نظر آیا۔ اس کے نزدیک ہی بارش کا پانی تالاب کی

کیا آپ

لبوب مقوی اعصاب

کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے اعصابی کمزوری دور کرنے تھکاوٹ سے نجات اور مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے کستوری عنبر زعفران جیسے قیمتی اجزاء والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب ایک بار آزما کر دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت والی لبوب مقوی اعصاب ٹیلیفون کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی منگوائیں فون منج 10 بجے تا رات 9 بجے تک

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)

(دبئی یونانی دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061

0301-6690383

آپ صرف فون کریں۔ آپ تک

لبوب مقوی اعصاب ہم پہنچائیں گے

ہلے لگیں اور ان میں سے ایک اور بھینسا اچھلتے کودتے برآمد ہوا۔ اس کا ایک سینک ٹوٹا ہوا تھا۔ وہ لرزہ خیز انداز میں ہاتھ اڑاتے ہوئے کالے بھوت کی طرف بڑھا گیا اسے دعوت مبارزت دے رہا تھا۔ عام طور سے ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی بھینسا خواہ مخواہ کسی سے اُچھے۔ لگتا تھا دونوں کا پہلے بھی ٹکراؤ ہو چکا تھا۔ بھینسے دشمن کو بھولتے نہیں ہیں۔ شاید اسی وجہ سے نئے آنے والے بھینسے نے اسے لٹکا رکھا۔

زخمی حریف کی آواز سن کر فوراً پلٹا اور اس نے پھرتی سے اس کے پہلو میں زوردار ٹکرماری۔ اس قدر تیز اور کاری دار تھا کہ سینگوں کی نوکیں بھینسے کی پسلیوں میں گڑ گئیں اور وہ ان کی تاب نہ لاتے ہوئے گر پڑا۔ کالے بھوت نے دوسرا وار کرنے کے لیے سر جھکایا تو حریف ساندے نے پوری قوت سے اپنا اگلوتا سینک اس کی آنکھوں میں گھونپ دیا۔

پہلا بھینسا کرب و اذیت سے چیخے بنا تو سینک کے ساتھ اس کا لال انگارہ ڈھیلا اُبل پڑا۔ وہ بڑی بھینک آواز میں چیخا۔ اب دونوں بھینسے چند قدم پسپا ہو کر انتہائی خوفناک انداز میں ٹکرائے اور ایک دوسرے کو دھکیلنے لگے۔ کبھی ایک کی ٹانگیں دھری ہوئے لگیں اور کبھی دوسرے کے قدم اکھڑتے معلوم ہوتے لیکن ہار ماننے پر کوئی بھی آمادہ نہ تھا۔ دونوں ساندوں نے غراتے ہوئے ایک دوسرے کو سینگوں سے مہلک زخم لگائے۔ سرخ گاڑھاخون زخموں سے اُبل اُبل کر ان کے سیاہ جسموں کو رنگین بنا رہا تھا۔ جنونی جانوروں کی وحشتانہ ٹکروں سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دو سیاہ چٹانیں ایک دوسرے سے متصادم ہو گئی ہیں۔ میدان کارزار میں ایک حشر سا برا ہوا تھا۔ گھاس پھوس پکلی گئی تھی اور زمین ان کے بھاری قدموں تلے بڑی طرح پامال ہو رہی تھی۔

اتنی دھول اُڑی کہ وحشی بھینسے گرد کے بادل میں بھوت نظر آنے لگے۔ میں حیرت اور خوف کے ملے جلے جذبات سے یہ خوریز منظر دیکھ رہا تھا پھر اچانک میری یاد پرل پھر ایک سپرٹس رائفل نے لگا تار شعلے اُگلے اور بھینسوں کی اس وحشت ناک جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔ دم بھر میں ان کے لاشے زمین پر پڑے تڑپ رہے تھے۔ میں نے ایک دن میں دو قوی بھینسے شکار کیے تھے۔ دونوں ہی کے سر عام بھینسوں سے لائے تھے جو آج بھی میری نشست گاہ کی دیوار پر سجے ہوئے ہیں۔ ان سروں کو دیکھتا ہوں تو دونوں بھینسوں کی جنگ کا منظر اُلوں میں تیرنے لگتا ہے۔



سینگ چھوٹی بڑی ہڈیاں اور کھر وغیرہ برآمد ہوئے۔

رات کی تاریکی پھیل رہی تھی جب میں اپنے کیمپ میں واپس پہنچا، چھکن اتنی زیادہ تھی کہ دن چڑھے تک سوتا رہا، آنکھ اُس وقت کھلی جب دھاڑنے کی آواز سنی۔ ہلکا سا ناشتا کرنے کے بعد میں تازہ ولولے اور عزم کے ساتھ اس سیاہ عفریت کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ موسم بڑا سہانا تھا۔ میں جنگل کے روح پرور منظر سے شاد کام ہوا جا رہا تھا۔ ایک ٹیلے کے نزدیک پہنچا تو اچانک ایک غصیلی پھونکار سنا دی۔ بھاری قدموں کی دھمک محسوس ہوئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو کیلچا اچھل کر منہ کو آ گیا۔ ایک قوی بیکل بھینسا میری طرف دوڑتے ہوئے آ رہا تھا۔ اس کی موٹی گردن کے سیاہ بال جوش غضب سے کھڑے نظر آتے تھے اور دم حالت اضطراب میں اوپر اُٹھی ہوئی تھی اور چمکیلے سینک ہلاکت خیز چخروں کی طرح فضا میں لہرا رہے تھے، بھینسا کیا تھا، طاقت اور قوت کا ایک طوفان تھا جو بڑھتا چلا آ رہا تھا۔

جان بچانے کے لیے میں پھرتی سے ایک جھمٹا درخت پر چڑھ گیا اور بھینسا جب دوڑتے ہوئے قریب آیا تو اس کے سر کا نشانہ لیتے ہوئے فائر داغ دیا لیکن گھبراہٹ میں ہاتھ لرز گیا اور گولی بھینسے کے سینگ میں جا گئی۔ رائفل کی آواز سے وحشی ساند اور بھڑک اُٹھا۔ اس کی خشکیں آنکھوں میں غصے اور انتقام کی آگ دہکی نظر آئی۔ میں نے غور سے دیکھا تو اس کا لے دیو کی گردن اور بائیں پہلو پر زخموں کے بہت سے نشان نظر آئے۔ یہ کسی اور جانور سے لڑائی بھڑائی کے نشانات تھے۔ سیاہ عفریت نما بھینسا غصے سے پھونکارتے، ڈکراتے، پیڑ کے گرد چکر کاٹنے لگا۔ پیڑ کا تباہت چوڑا تھا۔ یقیناً اس کی عمر سو سال سے اوپر تھی۔ ڈالیں بھی عام پیڑ کے ستنے جتنی موٹی تھیں۔ میں نے کئی گولیاں دائیں لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ہر بار وہ اپنا وزنی سر جھٹک کر رہ جاتا۔ میرے دل میں یہ وہم پیدا ہونے لگا کہ واقعی یہ بھوت پریت نہ ہو لیکن جب حقیقت حال پر غور کیا تو مجھے اپنے وہم و تردید پر خود ہنسی آئی۔ بھینسے کے سر پر سخت ہڈی کے مضبوط چوکنے میں سے گولی پار نہیں ہوئی تھی۔ میں نے جلدی سے رائفل کے میگزین میں دوبارہ گولیاں بھریں اور بھینسے کی گردن کا نشانہ لے کر فائر جھونک دیا۔ وحشی حیوان کی موٹی گردن سے خون کا فوارہ اُبل پڑا۔ وہ ایک ہولناک ڈکراہٹ کے ساتھ دوڑ اُٹھا۔

اچانک پیڑ کے دائیں جانب کی جھاڑیاں زور زور سے

صورت میں جمع تھا۔ دل میں ایک تجسس اور اضطراب کی کیفیت رونما ہوئی اور میں تحقیقی احوال کے لیے ایک درخت کے قریب جا پہنچا۔ غور سے جائزہ لینے پر پتا چلا کہ وہ ایک جسم اڑدھا تھا جو کندلی مارے گہری نیند سو رہا ہوا تھا۔

اس کی کھال بہت نرم، چمکیلی اور دلکش تھی۔ اگر لوازمات میسر ہوتے تو میں اسے پھندے میں جکڑنے کا جتن کرتا لیکن ایک تو میں تنہا اس دشت بلاخیز میں بھٹک رہا تھا پھر یہ خیال بھی دامن گیر ہوا کہ اگر ناپاب اڑدھے کا شکار نہ کیا تو خدا جانے پھر بھی اس کی جھٹک نظر آئے کہ نہ آئے۔ یہ سوچ کر میں نے اس کے سر کا نشانہ لے کر ایک سپرٹس رائفل سے دو فائر کیے جن میں ایک نشانے پر لگا جبکہ دوسری گولی ہاتھ میں ذرا سی لرزش آ جانے سے درخت کے تنے میں جا کر پیوست ہو گئی۔

اڑدھا تڑپتے، پھڑکتے ہوئے غضب ناک انداز میں میری طرف لپکا۔ میں نے تیزی سے پسپا ہوتے ہوئے ایک اور گولی اس کی طرف داغ دی جو اس کی گردن سے ذرا نیچے جا گئی۔ شدید زخمی ہونے کی وجہ سے اڑدھے کی رفتار سست پڑ گئی اور پھر وہ اپنا رخ موڑ کر سرکتے ہوئے تالاب میں داخل ہو گیا۔

میں نے شکار کو یوں ہاتھ سے نکلنے دیکھا تو اس کے پیچھے دوڑا پھر ایک اور گولی اس کے جسم میں داخل کر دی جو دم سے ذرا اوپر پیوست ہو گئی۔ تالاب کے گدے پانی کی سطح پر گاڑھے سیاہی مائل سرخ لبو کے لوتھڑے سے تیرنے لگے۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ کاری زخموں سے اڑدھا جانبر نہیں ہو سکے گا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی کوم پکڑ کر آہستہ آہستہ اسے تالاب سے باہر کھینچنا شروع کیا۔ مجھے اس کے ساتھ خاصی زور آزمائی کرنی پڑی۔ میں اسے باہر کھینچنے کے لیے قوت صرف کرتا اور وہ مجھے تالاب کے گہرے پانی میں کھینچنے کی کوشش، اس جان توڑ مشقت سے میں لپٹنے میں شراپور ہو گیا حالانکہ فضا میں خاصی خشکی اور نمی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اڑدھے کی قوت مدافعت دم توڑ گئی اور میں چند جھٹکوں کے بعد اسے تالاب سے باہر کھینچ لانے میں کامیاب ہو گیا۔

اتنا بڑا اڑدھا میں نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ لمبائی کا اندازہ چوبیس فٹ تھا اور گولائی نصف فٹ سے کم کیا ہوگی۔ میں دم لینے کے لیے ہری ہری گھاس پر لیٹ گیا۔ جب طبیعت بحال ہوئی تو اپنے تیز دھار شکاری تجربے سے اڑدھے کی کھال اُتار کر پیٹ چاک کیا اندر سے ہرن کے



وقت کہا کہ یہ نام بچے پر بہت بھاری ہے، اگر بدل نہیں گیا تو یہ زندگی بھر الم و الم میں مبتلا رہے گا کیونکہ اس بچے کی کنڈلی کے ساتویں گھر میں ”شٹی“ (زحل) ہے۔ شٹی کا پرکوب (خوست) نام پچھا کرے گا۔

امرنگھ نے اپنے گرو (مذہبی پیشوا) سے رابطہ کیا۔ انہوں نے ستاروں کا حساب لگایا۔ ہر طرح سے دیکھا، دہی کچھ ان کے حساب میں بھی آ رہا تھا۔ کنڈلی میں ”سڑھے سٹی“ صاف نظر آ رہا تھا۔ بالآخر انہوں نے کہا ”اس کا ایک ہی حل ہے۔“

”وہ کیا؟“ امرنگھ کے لہجے میں تجسس تھا۔
”اس کا نام بدل دو“ راشی“ خود بدل جائے گی۔“
نام بدلتے ہی ستاروں کی چال بدل جائے گی، یہ سنتے ہی وہ خوش ہو گیا۔ اس نے کہا ”گرو جی! اس شہ کار یہ کار پرارمھ آپ سینگ کریں۔“ (نیک کام کا آغاز آپ خود کریں)

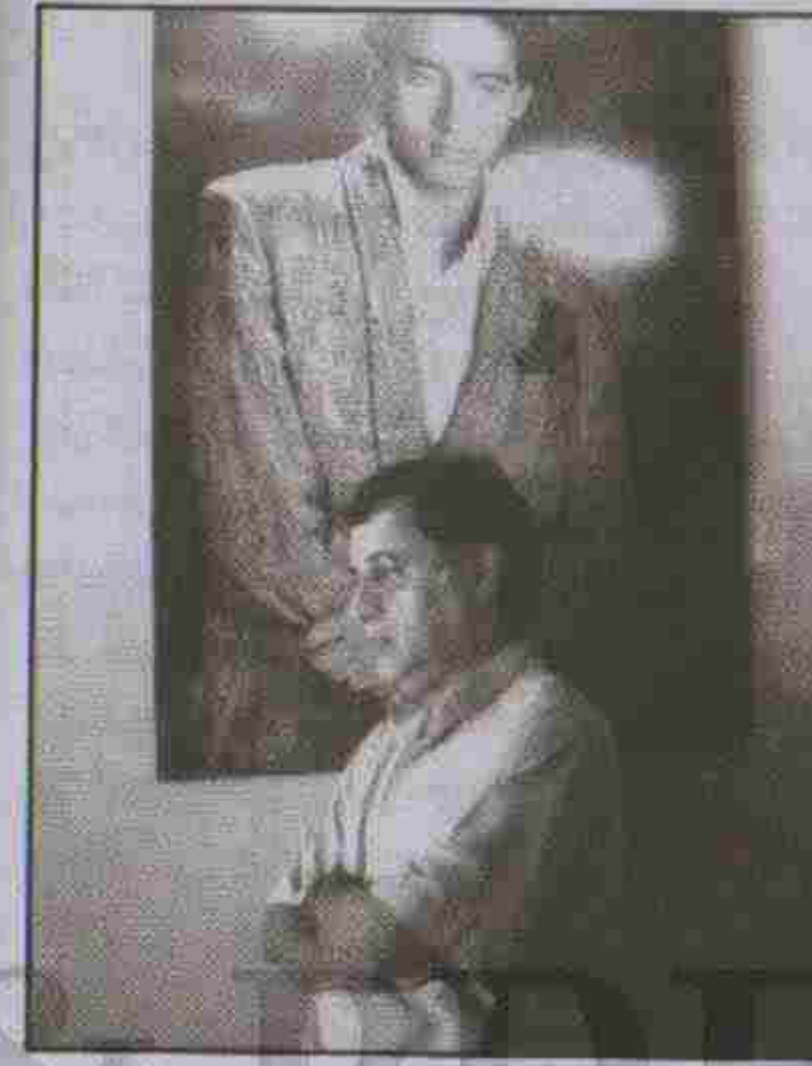
گرو جی نے کچھ دیر غور کیا پھر بولے ”اس کی کنڈلی کے تیسرے گھر میں ”شکر“ ہے۔ یہ بہت نام کمائے گا اس لیے اس کا نام جگ جیت (فاتح عالم) رکھ دو۔“

نام باحتی اور خوبصورت تھا۔ سب کو پسند آیا۔ اس دن

ہے۔ ادا سی کارنگ رو مانویت میں ڈھل جاتا ہے۔ اس کی غزلیں سننے کے بعد یوں لگتا ہے جیسے کوئی پچھلے پہر خالی گھر کی میز چیاں اتر رہا ہو۔ وہ زندگی کی راہ میں خوابوں کے ستلاشی افراد کا پسندیدہ گلوکار ہے۔

یہ مقام جگجیت سنگھ نے انتھک محنت کے بعد حاصل کیا ہے۔ اس کی ستر سالہ زندگی جہد مسلسل کی تصویر ہے۔ صوبے راجستھان جہاں شجر اور ریشمی زمین دور دور تک پھیلی ہوئی ہے، جہاں ریگستان پھیلتے پھیلتے پاکستان تک پہنچ رہے ہیں۔ جہاں آبادیاں دور دور کی ہوئی ہیں۔ اسی صوبے میں ایک شہر ہے، گنگا نگر..... گوکہ یہ ایک چھوٹا سا شہر ہے مگر کئی معنوں میں اہم ہے۔ یہاں کے راجا کی بہادری کے بہت سے قصے مشہور ہیں مگر عدل و انصاف میں یہ راجا وہ اچھی شہرت کا حامل ہے۔ اس علاقے میں ہندو، سکھ اور مسلمان امن و آشتی سے رہتے تھے۔ دیوالی ہو کہ دسمہ، عید ہو کہ عرم، ہر تہوار مل کر مناتے تھے۔ اس وجہ سے بھی یہ شہر معروف تھا۔

اسی شہر میں 8 فروری 1941ء کو امرنگھ کے گھر بچن کور کی گود میں وہ بچہ آیا۔ پیدائش کے تیسرے دن اس کے گھر والے اس کے ”نام کرن“ کی تقریب ہوئی۔ گھر والوں نے اس کا نام جگ موہن رکھا تھا مگر جو بھائیوں نے جنم پتری بناتے



سر کا بادشاہ زین مہدی

جہد مسلسل کی ایک لازوال داستان، وہ بھوکے پیٹ رہا، ہزار ہا مصائب جھیلے مگر اپنی دھن میں مگن رہا۔ منزل کی جستجو میں کوشاں رہا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ ایک بہت بڑا گلوکار بنے گا اور اس نے نام پیدا کر کے دکھادیا۔

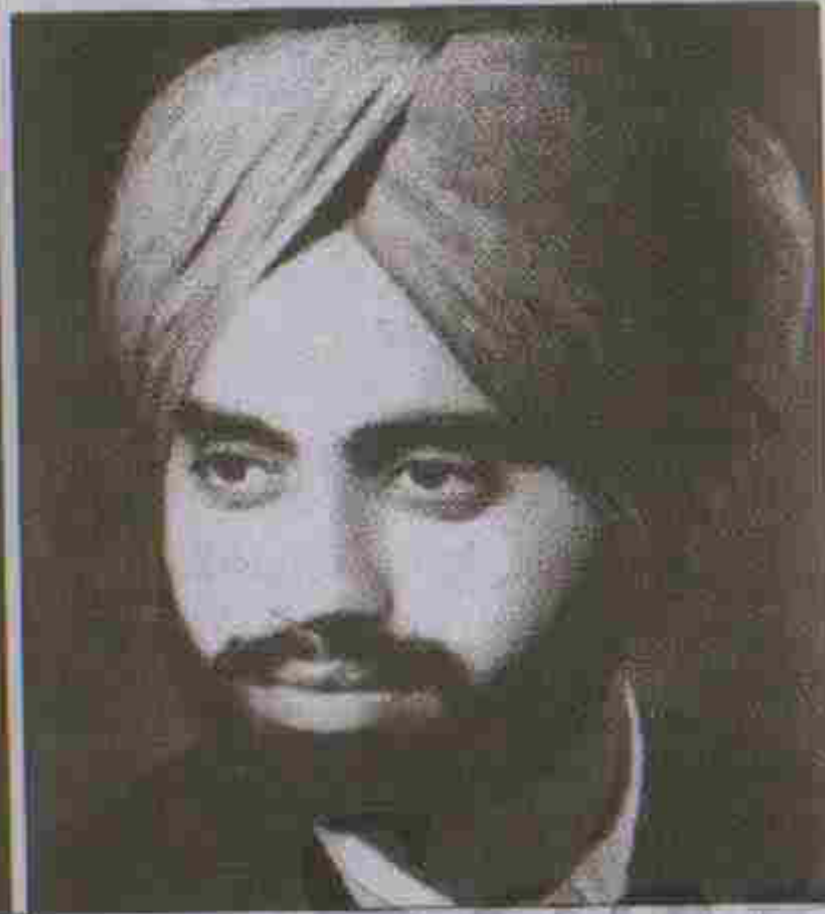
بچن گائیں سے غزل گائیں تک کے سفر کی مختصر داستان

کھتے پہلے جنگل میں لگی آگ کی طرح ایک خبر پھیلی، چیتلو کے نمائندے، اخبارات کے رپورٹرز اور سنگیت پر مبنی خبر کی حقیقت جاننے کے لیے لیلا دانی اسپتال کی طرف دوڑ پڑے۔ ”دیواروں سے باتیں کرنا، اچھا لگتا ہے“ جیسی مشہور غزل کا گائیک آج دیوار کی طرف منہ کرنے سے بھی قاصر تھا۔ وہ سفید بستر پر چٹ لیٹا تھا۔ منہ پر آکسیجن ماسک لگا ہوا تھا۔ بلڈ پریشر اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ اسپتال لاتے لاتے دماغ کی شریان پھٹ گئی تھی۔ اسے بے ہوشی کی حالت میں اسپتال لانا پڑا تھا۔ سب اس کے لیے دعا گو تھے۔ ڈاکٹر زبھی سرتوڑ کوشش میں لگے ہوئے تھے۔

بالآخر ان کی محنت رنگ لائی۔ 24 ستمبر کو دماغ کی سرجری کی گئی اور وہ پھر سے دنیائے رنگ و بو کی رنگینیوں کا حصہ بن گئے۔ اخبارات نے بڑی بڑی سرخیاں لگائیں ”غزلوں کی دنیا کا بے تاج بادشاہ روپہ صحت“

روزنامہ آفتاب کی یہ سرخی غلط نہ تھی۔ مہدی حسن شہنشاہ غزل ہیں مگر یہ معنی بھی اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے کہ غزل سرا ہوتے ہی سامعین کو مسحور کر دیتا ہے، کہنے والے کہتے ہیں، جگجیت سنگھ کے لہجے سے سماعت کو ایک سکون ملتا ہے اور اس کی گائی ہوئی غزلوں کا تاثر ایک طویل عرصے تک قائم رہتا

بالآخر وہ وقت آ ہی گیا، تاریخ مقرر ہو گئی۔ 23 ستمبر 2011ء کی وہ شام بمبئی کی ثقافتی تاریخ میں امر ہونے والی تھی۔ اس شام کا لطف لینے کے لیے بھارت کے کونے کونے سے لوگ آنے والے تھے کیونکہ اس پروگرام کے ٹکٹ کلکتہ، دہلی، امرتسر، حیدرآباد، وجے واڑہ، چنائے اور پٹنہ میں بھی خوب خوب بکے تھے۔ بیرون ملک سے بھی شائقین آنے والے تھے کیونکہ دو ملکوں کے دو عظیم گلوکار آمنے سامنے ہو رہے تھے۔ دونوں ہی اردو بکھنے بولنے والوں میں یکساں مقبول تھے۔ غزل گائیکی میں ید طولی رکھتے تھے۔ اسی لیے موسیقی سے دلچسپی رکھنے والے خصوصی طور پر دلچسپی لے رہے تھے۔ ان میں ایک غلام علی تھے، گوکہ وہ پاکستانی ہیں مگر بھارت میں بھی یکساں مقبول ہیں۔ ان کی پیشکش اور سی ڈیز بھارت میں پاکستان سے زیادہ فروخت ہوتی ہیں۔ ان کے ساتھ جگجیت سنگھ بھی پر فارم کرنے والے تھے۔ یہ دونوں نام غزل گائیکی میں بہت معتبر ہیں اسی وجہ سے لوگ اس محفل کے انعقاد کا انتظار کر رہے تھے کہ پاکستان اور بھارت کے دو گوہر آبدار کو ایک ساتھ سننے کا موقع ملے گا۔ منتظرین کو بھی بھاری منافع کی امید تھی کہ دو مہار تھی آمنے سامنے ہوں گے۔ مگر قسمت کی دیوی کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ پروگرام کے کچھ



جگجیت سنگھ - کیش کی قربانی سے پہلے اور بعد

کاساں پیش کرنے لگتیں۔ اس کی آواز کا جادو پورے جالندھر میں گونجنے لگا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی تعلیمی معاف کردی گئی تھی۔ اس دور میں ریڈیو کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ لوگ ریڈیو تک پہنچنے کے لیے سڑکوں کو شش کرتے۔ ریڈیو منکر کو فوراً عوامی مقبولیت مل جاتی تھی مگر اس نے ابھی تک ریڈیو



چترا سنگھ، جگجیت سنگھ کی ار تھی سے لپٹی ہوئی

انٹیشن تک جانے کی ہمت نہیں کی تھی کہ 1940ء کی ایک شام میں ریڈیو جالندھر کا ایک نمائندہ اس کے کمرے میں پہنچ گیا۔ قسمت خود اس کے دروازے پر دستک دینے پہنچ گئی تھی۔ اس نمائندے نے کمرے میں پہنچ کر اسے ”پاس“ دیا اور کہا۔

”کل آپ کو ریڈیو انٹیشن آنا ہے۔“

”مگر کیوں؟“ جگجیت نے پر تجسس انداز میں پوچھا۔

”صاحب نے بلایا ہے۔ وہ آپ کی آواز کا آڈیشن لینا

پہنچا۔ جالندھر میں بھی اس نے اپنی پرسوز آواز کا جادو جگایا۔ یہاں کے گوردواروں میں بھی اسے فوقیت دی گئی۔ اب تو اس کی آواز میں مزید سوز پیدا ہو چکا تھا اور وہ باقاعدہ موسیقی کی تعلیم بھی حاصل کر رہا تھا لیکن چنگن لال شرما گنگا گھر میں رہ گئے تھے۔ اس لیے وہ انہی جیسے استاد کی تلاش میں تھا۔ کافی تلاش بسیار کے بعد اس کی نظر استاد جمال خان پر جا پڑی۔ استاد جمال خان کا بھی بڑا نام تھا۔ وہ اُن کے پاس جا کر ریاض کرنے لگا۔ استاد جو سبق دیتے، جالندھر واپس آ کر وہ اسی انداز میں ریاض کرتا۔ اس کی آواز اور اساتذہ کے اسباق، اس میں نکھار آتا چلا گیا۔ اب یہ عالم ہو چکا تھا کہ جب وہ ”گرووانی“ کا پانٹھ کرتا تو سننے والوں پر رقت طاری ہو جاتی۔ سامعین کی آنکھیں ساون بھادوں



غلم سے نڈھال غلام علی، شمشان میں



جگجیت سنگھ معروف شاعر گلزار کے ساتھ

خصوصی طور پر بلایا جاتا۔ اس کی حوصلہ افزائی کے لیے اسے نقد رقم بھی دی جاتی۔ حوصلہ افزائی نے اس کے اندر موسیقی کی چاہ بڑھادی تھی۔ اس نے والد سے فرمائش کی کہ اسے کسی موسیقار کی شاگردی میں دے دیا جائے۔ امر سنگھ نے کئی دوستوں سے مشورہ کیا اور اسے لے کر چنگن لال شرما کے پاس پہنچ گئے۔ اس دور میں چنگن لال کا ایک مقام تھا۔ وہ تاجینا تھے مگر موسیقی میں وہ درسگاہ کا مقام رکھتے تھے۔ چنگن لال شرما نے اس کی آواز سننے ہی اسے اپنا شاگرد بنالیا۔

دھیرے دھیرے وہ تعلیمی مدارج طے کرتا رہا۔ میٹرک کے بعد اسے جالندھر کے ڈی اے وی کالج میں داخلہ دلوایا گیا۔ اسکول کے محکم بھرے ماحول سے نکل کر وہ کالج



دیوک کو سینے سے لپٹائے جگجیت سنگھ

سے جگ موہن جگ جیت ہو گیا مگر لوگ اسے صرف جیت کہہ کر پکارتے۔

جگ جیت کچھ بڑا ہوا تو اس کی تعلیم کے بارے میں غور کیا جانے لگا۔ گوکہ امر سنگھ ولایت پلٹ نہ تھا، واجبی کی تعلیم حاصل کی تھی مگر وہ بیٹے کو بابو بنانے کا خواب دیکھنے لگا۔ اس



جگجیت سنگھ کی ار تھی شمشان لاتے ہوئے

نے جگ جیت کو گنگا نگر کے خالصہ ہائی اسکول میں داخل کرادیا۔ جگ جیت پڑھنے میں کوئی خاص نہ تھا مگر اس کی آواز میں بلا کا سوز تھا۔ سکھ مذہب میں عبادت کے وقت ”گرووانی“ کا ”پانٹھ“ کیا جاتا ہے۔ وہ گوردواروں میں جا کر ”گرووانی“ کا پانٹھ کرتا۔ اس کی پرسوز آواز پر ”بھگت جن“ جھوم جھوم جاتے۔ اتنا چھوٹا بچہ اور ایسی اچھی آواز، ہر کوئی اس کی پیاری آواز میں گرووانی سنتا چاہتا۔ لوگ منت کے طور پر گھروں میں ”گرہنت صاحب“ کا پانٹھ کراتے تو اسے

لگا تھا۔

ابھی پہلے الہم کی شہرت ماند نہ پڑی تھی کہ دوسرے الہم ”کم الائیہ“ نے پھر پچھل مجادی۔ گویا اب شہرت ان کے تعاقب میں تھی۔ ان کے ہر کنسرٹ کامیابی کے آسمان پر نظر آتے۔ یورپ، امریکا اور متحدہ عرب امارات سے پروگراموں کی برسات شروع ہو گئی۔ گھر جیسے پرایا ہو گیا تھا۔ ہر وقت سفر میں رہنے لگے تھے۔ اکلوتے بیٹے دیو یک اور بیٹی موزیکا کو اسکول میں داخل کر دیا گیا تھا۔

موزیکا، جگجیت سنگھ کی بیٹی نہیں تھی۔ چترانے اس سے دوسری شادی کی تھی۔ موزیکا پہلے شوہر سے بھی مگر جگجیت اسے بھرپور شفقت دیتا تھا۔ دیو یک سے بڑھ کر اسے چاہتا تھا۔ جس قسم کے کھلونے دیکڑے وہ دیو یک کے لیے لاتا تھا، اسی قسم کی چیزیں موزیکا کے لیے بھی لاتا۔ لوگ اسے بھی جگجیت ہی کی بیٹی سمجھتے تھے۔



پہلی الہم کی ریلیز کے وقت

جگجیت فلموں میں پلے بیک دینے کا خواب سجا کر بھی آیا تھا مگر ابھی تک وہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوا تھا۔ کیسٹوں کی کامیابی نے فلم والوں کو بھی متوجہ کر دیا اور 1980ء میں جاوید اختر کی غزلوں کو اس نے ”ساتھ ساتھ“ میں پیش کیا۔ اسی سال ہمیش بھٹ کی فلم ”ارتھ“ کے لیے بھی اس نے چترانے کے ساتھ مل کر کئی غزلیں پیش کیں۔ اس کی فلمی غزلوں میں ”ہونٹوں سے چھو لو تم، میرا گیت امر کر دو یہ زندگی کسی اور کی، تم کو دیکھا تو یہ خیال آیا، ہزار بار دہرائے، ہم ہزار بار چلے“ بہت مقبول ہوئیں۔ فلم ”پریم گیت“ کے تمام گیتوں نے خوب شہرت پائی تھی۔

شہرت کی بلندیوں پر پہنچ کر وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ اب خوشیاں ان کی زندگی کا جزو لاینک بن گئی ہیں، پُرانے دن ہوا ہو چکے ہیں مگر تمام دن یکساں کب ہوتے ہیں۔ ہر دن



جگجیت سنگھ

گئی۔ اس کی آواز میں ریکارڈ کیے ہوئے کئی اشتہار بہت مقبول ہوئے جن میں ایک گلائیکوڈین کا اشتہار بھی تھا۔ بے بی منگرا رام بکٹ اور گورنر جی کی مصنوعات کے اشتہار بھی مقبول ہوئے۔ جدوجہد کے اسی دور میں اس کی ملاقات ایک گلوکارہ سے ہوئی۔ نام تھا اس کا چترانہ، وہ بھی فلمی دنیا میں جگہ بنانے کی کوشش میں تھی۔ دونوں ایک منزل کے راہی تھے اس لیے آہستہ آہستہ ایک دوسرے کے قریب آنے لگے۔ یہ قربت 1970ء میں رنگ لے آئی۔ دونوں نے شادی کر لی۔ اس شادی نے ان کی زندگی میں ایک نیا موڑ لا کر رکھا کامیابیاں بائیں پھیلائے ان کی طرف بڑھتی چلی آئی۔ غزل سرائی کا دور گزر چکا تھا۔ بیگم اختر وغیرہ کو لوگ بھول چکے تھے۔ ایسے وقت میں اس نے غزل سرائی کی طرف بھرپور توجہ دے دی۔ اپنی بیگم چترانہ کے ساتھ مل کر اس نے غزلوں کی محفل سجانا شروع کر دی۔ دیو یک پیدا ہو چکا تھا، چترانہ اسے گود میں لے کر جاتی تھی۔ ان دونوں کی آوازیں بڑی تیزی سے مقبول ہو رہی تھیں۔ غزل سرائی کا یہ نیا انداز خاصا پسند کیا جانے لگا تھا۔ 1975ء میں مشہور زمانہ گراموفون کمپنی، ایچ ایم وی نے ان دونوں میاں بیوی کی آواز میں غزلوں کا ایک الہم ”دی ان فور گیت ایبلز“ ریلیز کیا۔ اس الہم کا مارکیٹ میں آنا تھا کہ ان کی شہرت کو پر لگ گئے۔ ریکارڈ تو ڈسٹریبل ہوئی۔ ہر گھر میں ان کی غزلیں سنائی دینے لگیں۔ کیسٹ کا دور آچکا تھا۔

یہ ریکارڈ سے سستے ہوتے تھے اس لیے بھی زیادہ تعداد میں فروخت ہو رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے جگجیت سنگھ کا نام بھارت کے کونے کونے میں گونجنے لگا۔ انہوں نے غزل گائیکی میں خاصی جدت پیدا کر دی تھی۔ سازوں کے استعمال میں بھی جدت لے آئے تھے۔ روایتی ساز سارنگی اور طبلے کے ساتھ جدید آلات موسیقی کو بھی استعمال کیا گیا تھا، اس وجہ سے انہیں جدید غزل سرائی کا موجد کہا جانے

یقین تھا کہ اگر اسے صحیح موقع ملا تو وہ بہت کچھ کر دکھائے گا مگر موقع مل نہیں رہا تھا اور وقت گزرتا جا رہا تھا۔

گزرتے وقت کے ساتھ اس کی خواہش جوان ہوتی رہی۔ وہ تو اتر سے بمبئی کے دوستوں کو خط لکھتا رہا مگر کہیں سے بھی حوصلہ افزا جواب نہیں آ رہا تھا۔ اب اس نے سوچا کہ اتنی دور سے کامیابی عبث ہے، اس لیے 1965ء میں اس نے پھر ایک بار بمبئی کا رخ کر لیا۔ اس بار وہ اپنے ساتھ اچھی خاصی رقم بھی لے کر گیا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اب وہ تبھی لوٹے گا جب اسے فلمی دنیا میں مقام مل جائے گا۔

بمبئی پہنچ کر اس نے مذہبی اعتبار سے بہت بڑی قربانی پیش کی۔ سکھ مذہب کے پیروکار ہمہ وقت اپنے ساتھ پانچ ”دک“ رکھتے ہیں۔ یہ ان کے ایمان کا حصہ ہے۔ وہ پانچ ”دک“ ہیں، کھمبہ، کڑوا، کرپان اور کیش۔ اس نے کیش کی قربانی دے دی۔ بال ترشوا لینے کے بعد پگڑی اور کھمبہ



رہیں اور گھوڑوں کا شوق جنوں کی حد تک تھا

سے بھی نجات مل گئی۔ اب وہ ایک ہینڈسم جوان نظر آنے لگا تھا۔ وہ اس طبع میں اسٹوڈیو کے چکر لگانے لگا۔ اُس دور میں مناڈے، کشور کمار اور محمد رفیع کا جادو سرچڑھ کر بول رہا تھا بلکہ محمد رفیع کی تو شہنشاہیت قائم تھی۔ ان کے درمیان یہ کیسے اپنی جگہ بنانا مگر کوشش کرنے میں کیا حرج ہے، اسی کے مصداق وہ کوشش کیے جا رہا تھا۔ اب تک اسے صرف اتنی کامیابی ملی تھی کہ ”ہر ماسٹر وائس“ نامی گراموفون کمپنی نے اس کی دو غزلیں ریکارڈ کر لیں۔ یہ ریکارڈ مارکیٹ میں بھی آئے مگر اسے اتنی کامیابی نہیں ملی جو اس نے سوچا تھا۔ اس ریکارڈ کی بدولت اسے کچھ شہرت ضرور مل گئی، خواص میں اس کی آواز پہچانی جانے لگی۔ اُن دنوں ریڈیو پر ایسے اشتہار بہت زیادہ نشر ہوتے تھے جو کسی گلوکار کے گائے ہوئے ہوتے۔ فلمی دنیا میں نہ سچ مگر ریڈیو کی اشتہاری دنیا میں اسے جگہ مل



والد امر سنگھ اور ماں بچن کور کے ساتھ

چاہتے ہیں۔ ”لیکن میں نے تو اب تک ایسی کوئی کوشش نہیں کی ہے۔“

”صاحب جی نے بتایا ہے کہ وہ آپ کو کوئی بڑا کنٹریکٹ دیں گے۔“ نہایت دے نے ایک اور خوش خبری سنائی۔

اس رات وہ بہت خوش تھا۔ ساری رات بے چینی میں گئی۔ اسے امید ہو چلی تھی کہ قسمت اسے اونچا مقام دینا چاہتی ہے اسی لیے اسٹیشن ڈائریکٹر نے اسے بلایا ہے۔ وہ صبح ہی صبح ریڈیو اسٹیشن پہنچ گیا۔ اس کی آواز کو پرکھا گیا اور یہ آفر دی گئی کہ وہ سال میں چھ براہ راست پروگرام پیش کر سکتا ہے۔

یہ ایک بہت بڑی آفر تھی۔ اس نے ایک ایک ماہ میں کئی کئی پروگرام کیے اور ہر پروگرام کو خاصی پذیرائی ملی۔ اس کا نام ابھرتے ہوئے گلوکار میں لیا جانے لگا مگر وہ مطمئن نہ تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ ابھی اسے اور آگے جانا ہے۔ اسی خیال نے اسے ہمیشہ کیا کہ وہ بمبئی کی فلمی دنیا تک پہنچے۔ وہاں ترقی کی راہیں زیادہ کھلیں گی۔ بس اسی بات نے اسے آگے بڑھنے پر اکسایا اور وہ 1961ء میں بمبئی آ گیا۔

بمبئی بڑی بے وفا مگر یہ ہے۔ یہاں پر کسی کو کامیابی نہیں ملتی ہے، صرف وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جن کی پیٹھ پر کوئی مضبوط ہاتھ ہو، کسی اہم شخصیت کا سہارا ہو۔ بمبئی پہنچ کر اس نے دوڑ دوڑ شروع کر دی۔ دن رات کوششیں کرتا رہا مگر یہاں اسے وہ کامیابی نہیں ملی رہی تھی جو اسے جالندھر اور گوجرانگر میں ملی تھی۔

جب خاطر خواہ کامیابی نہ ملی تو وہ جالندھر لوٹ آیا۔ تعلیمی سلسلہ پھر سے شروع کر دیا۔ ماسٹر کی ڈگری کے لیے کرک ماسٹر یونیورسٹی سے منسلک ہو گیا۔ تعلیم کے دوران بھی وہ بمبئی کا خواب دیکھتا رہا۔ اسے اپنے فن پر اعتبار تھا،



فلمی افق

علی سفیان آفاق کی یادداشتیں

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

ایسے نادر روزگار حال حال ہی نظر آتے ہیں جو نصف صدی سے علم و ادب، صحافت و فلم کے میدان میں سرگرم عمل ہوں اور اپنے روزاؤل کی طرح تازہ دم بھی۔ ان کے ذہن رسا کی پروازیں کوئی کمی واقع ہو، نہ ان کا قلم کبھی تھکن کا شکار نظر آئے۔ آفاق صاحب ہمارے ایسے ہی جوان فکر و بلند حوصلہ بزرگ ہیں۔ وہ جس شعبے سے بھی وابستہ رہیں، اپنی نمایاں جھنک کی نشان اس کی پیشانی پر ثبت کر دیتے۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستگی کے دوران میں انہیں اپنے عہد کی ہر قابل ذکر شخصیت سے ملنے اور اس کے بارے میں آگاہی کا موقع بھی ملا۔ دہد و شنید اور میل ملاقات کا یہ سلسلہ خاصا طولانی اور بہت زیادہ قابل رشک ہے۔ آئیے ہم بھی ان کے وسیلے سے اپنے زمانے کی نامور شخصیات سے ملاقات کریں اور اس عہد کا نظارہ کریں جو آج خواب معلوم ہوتا ہے۔

ادب و صحافت سے فلمی دنیا تک و راز ایک داستان در داستان سرگزشت

2021

یہ 1956ء کا زکر ہے۔ ہم نے آفاق کے فلمی صفحے کے لیے مواد حاصل کرنے کے لیے لاہور کے فلمی نگار خانوں کے پھیرے لگانے شروع کر دیے تھے اور اسٹوڈیو کے چوکیدار سے لے کر مالک تک

ساتھ نہ دیا۔“

چتر کے اندر مچی ٹوٹ پھوٹ اوپر سے بھی نظر آ رہی تھی مگر جھنجھٹ سکھ اس غم کو سینے سے لگائے اندر ہی اندر کھل رہا تھا۔ وہ رہ کر بلڈ پریش ہوتا تھا۔ 2007ء میں بلڈ پریش اتنا بڑھا کہ اسے بے ہوشی کی حالت میں اسپتال لایا گیا تھا۔ 1998ء میں اس پر دل کا زبردست دورہ پڑا، یہ دو دورے حد سے زیادہ خطرناک قرار دیے گئے تھے۔ ان دونوں دوروں سے وہ بچ گیا، سب کی کوشش تھی کہ اسے کوئی ایسی خبر نہ سنائی جائے جس کا اثر دل و دماغ پر منفی پڑے مگر قسمت کا کیا کہیے۔ اس کے ترکش میں کون کون سے تیر ہیں کسے خبر۔ 2009ء میں جب وہ چتر کے ہمراہ امریکا کے دورے پر تھا کہ وہاں ایک بہت بڑی خبر پھیلی۔ یہ خبر مونیکا سے متعلق تھی۔ مونیکا جو چتر کی بیٹی تھی مگر اس نے یہ خبر دل پر پھر رکھ کر سنی اور شوہر سے پھپھالی۔ اس نے دوسرے لوگوں کو بھی منع کر دیا تھا کہ وہ یہ خبر جھنجھٹ کو نہ سنائے۔ اس نے شوہر کو صرف اتنا بتایا کہ مونیکا کی طبیعت خراب ہے، ہمیں فوراً اسپتال پہنچنا ہے۔ وہ لوگ اسی وقت بھارت لوٹ آئے۔ یہاں آ کر جھنجھٹ کو پتا چلا کہ مونیکا نے خودکشی کر لی ہے۔ مونیکا نے بھی دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی شادی کی طرح دوسری شادی بھی ناکام ہوئی نظر آئی تو وہ ڈپریشن کا شکار ہو گئی۔ بمبئی کے کسٹرن آف پولیس این کو شک نے بھی اخباری نمائندوں کو یہی بتایا کہ مونیکا ازواجی انجمنوں کی وجہ سے تناؤ کا شکار تھی۔

پے در پے حادثات نے جھنجھٹ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ بیٹا اور بیٹی دونوں موت کی آغوش میں جاسوئے۔ اب اسے اپنی زندگی از حد سونی لگنے لگی تھی۔ وہ اکیلا ہوتے ہی سوچ میں غرق ہو جاتا۔ اسی سوچ و فکر کی وجہ سے 23 ستمبر 2011ء کو جس دن غلام علی کے ساتھ اسے پر فارم کرنا تھا، اس کا بلڈ پریش اتنا بڑھ گیا کہ دماغ کی شریان پھٹ گئی۔ اسے بے ہوشی کی حالت میں لیلا وٹی اسپتال پہنچایا گیا۔ ڈاکٹروں نے 24 ستمبر کو دماغ کی سرجری کی اور دماغ میں جمع ہو جانے والے خون کو صاف کر دیا۔ گویا موت کے منہ سے اسے بچھ لائے۔

سب مطمئن ہو گئے تھے۔ اب وہ گھر میں ہی مقید ہو کر رہ گیا تھا۔ کہیں آنا جانا ممکن جو نہ تھا۔ بستر پر پڑا رہتا پھر اندر سرگرمیوں میں وقت گزار لیتا۔ اسی دوران 10 اکتوبر 2011ء کا منحوس دن آ گیا۔ اس دن صبح آٹھ بجے لیلا وٹی اسپتال کے وٹنی لیٹر میں غزلوں کو نئی زندگی دینے والا زندگی کی قید سے آزاد ہو گیا۔ اپنی آواز سے سحر پیدا کرنے والا ساحر موت کے مایا جال میں کھو گیا۔

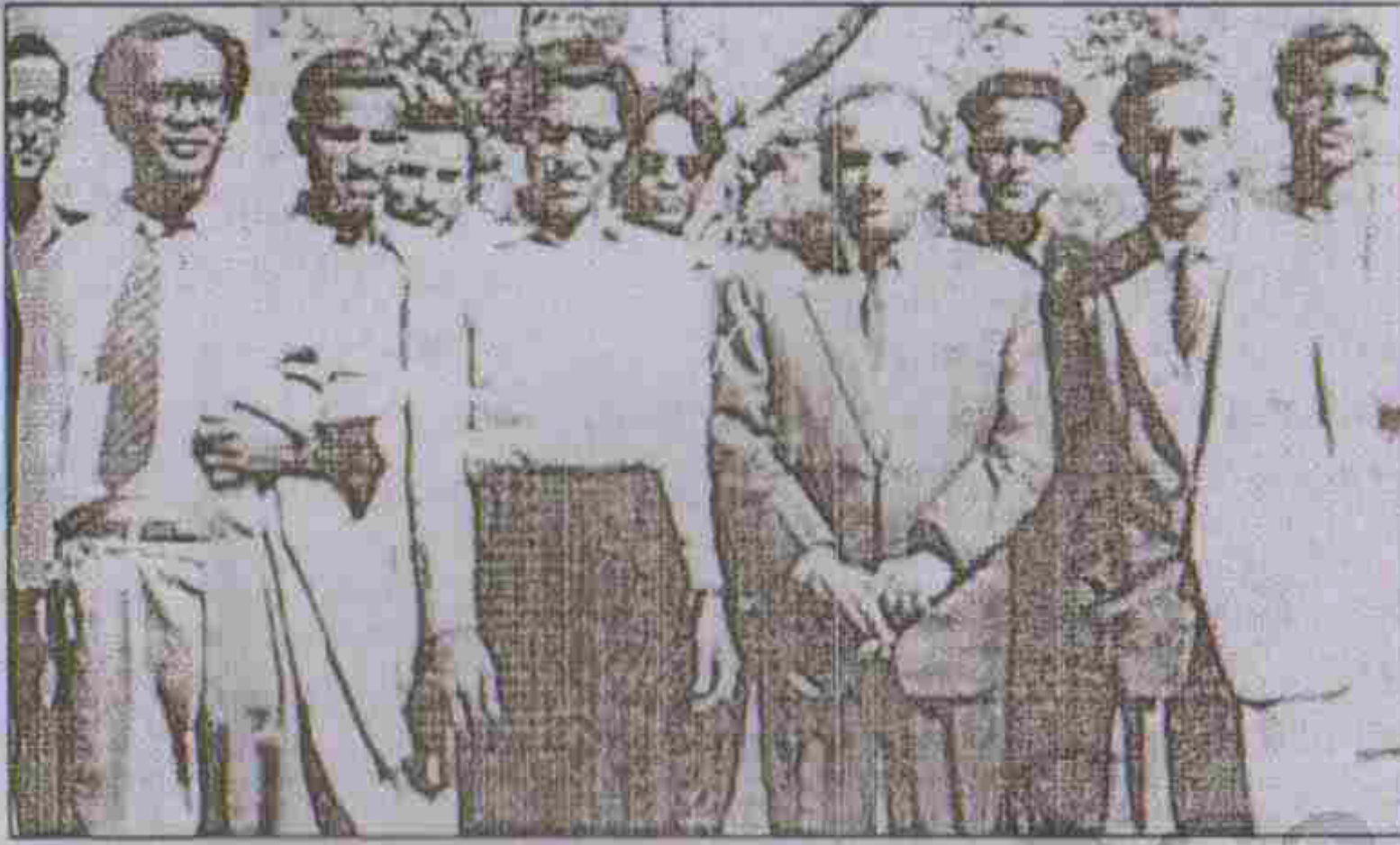
کے بعد رات کا اندھیرا ضرور پھیلتا ہے۔ ان کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا آپنیوں کی کی نہ تھی۔ قہش کی اشیا سے گھر بھر گیا تھا۔ بچوں کے لیے بھی الگ سے گاڑیاں لے لی گئی تھیں۔ ویو یک کولانگ ڈرائیو کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ وہ اکثر طوفانی رفتار سے کار چلاتا تھا۔ اسے اسی میں مزہ آتا تھا۔ دوستوں کا کہنا تھا کہ وہ دوسروں کو طعنہ دیتا تھا، تم سب کار کو سائیکل کی رفتار سے چلاتے ہو۔

اس کی یہی تیزی 1990ء میں بھارت سے دور لندن میں ایک بھیا تک حادثے کا سبب بن گئی۔ صرف 17 سال کی عمر میں اسے موت نے اپنے جڑے میں دیوچ لیا۔ ڈاکٹروں کی تمام کوششیں رائگاں میں۔

مرنے والے کے ساتھ لوگ مرا نہیں کرتے مگر غم سے زندہ درگور ضرور ہو جاتے ہیں۔ چتر ابھی زندہ درگور ہو گئی۔ اس نے بیٹے کے غم میں ہر خوشی سے منہ موڑ لیا۔ اس نے بیٹے کی موت کا ذمے دار شوہر کو قرار دے دیا اور الگ رہنے لگی۔ اس نے گانا تک چھوڑ دیا تھا۔ بلاوے پر بلاوا آتا مگر وہ ہر ایک کے التماس کو ٹھکرا دیتی۔

پھر آہستہ آہستہ اسے احساس ہونے لگا کہ وہ غلطی پر ہے۔ حادثے کو ہوتا تھا ہو گیا، اس میں جھنجھٹ کا کیا قصور؟ ایک باپ اپنے بیٹے کی موت کا ذمے دار کیسے ہو سکتا ہے؟ اس بات نے اسے مجبور کر دیا اور وہ لوٹ کر جھنجھٹ کے پاس آ گئی مگر گانے سے اجتناب جاری رہا۔ وہ کسی ساز کو بھی ہاتھ نہیں لگاتی تھی۔

جھنجھٹ بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا تھا مگر مرد ہونے کی وجہ سے اس نے غم کو اپنے اوپر طاری نہیں کیا تھا۔ پیٹ کی خاطر ہی سہی، وہ گاتا رہا۔ کنسرٹ کرتا رہا۔ 2005ء میں وہ چتر کے ساتھ پروگرام کرنے آئیں یلیا گیا۔ چتر کو دیکھ کر جھنجھٹیں خوش ہو گئے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ بھی کچھ پیش کرے گی مگر چتر اول تا آخر حاضرین کے درمیان پہلی رو میں بیٹھی شوہر کی حوصلہ افزائی کرتی رہی۔ سامعین کے اصرار پر بھی وہ اسٹیج پر نہیں گئی۔ اپنی اس خاموشی کے بارے میں اس نے ”اسٹار ڈسٹ“ نامی رسالے کو دیے گئے انٹرویو میں کہا ”چودہ برس تک میں مون برت (خاموشی کا روزہ) کی کیفیت میں رہی، پھر ایک صبح میں اپنے بیٹے کی تصویر کو دیکھ رہی تھی کہ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں خدا کے دیے ہوئے تحفے (آواز) سے نا انصافی برت رہی ہوں۔ ہمارا بیٹا ویو یک بھی تو ہماری آوازوں کا مداح تھا پھر میں نے تہیہ کیا کہ میں اپنے بیٹے کے لیے گاؤں گی لیکن گانا چھوڑے مدتیں بیت چکی تھی اور اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے بعد میری آواز نے میرا



فیض احمد فیض فلم جاگو ہوا سویرے کے سیٹ پر ڈھاکہ میں

بیٹھ جاتا ہے اور یہ کتاب اٹھا کر پڑھتی ہے۔ ”یا اسی قسم کی کوئی ہدایت تھی۔“

بے بی نے پوچھا ”انگل، کیا میں کتاب اٹھا کر پڑھتی شروع کر دوں؟“

”ارے نہیں، بس اتنا ہی شائے ہے۔ اس کے بعد کیا کرنا ہے، وہ اگلے شائے میں تمہیں بتائیں گے۔“

لقمان صاحب بھی سیٹ پر آ گئے تھے۔ بے بی نے شائے اوکے کرادیا۔ لقمان صاحب نے ہمیں بتایا کہ یہ بچی فلم میں بہت اہم کردار کر رہی ہے۔ اس کا نام حسہ ہے لیکن سب اس کو ”بے بی“ کہتے ہیں۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ بے بی حسہ اپنے والدین کے ساتھ شاہ نور اسٹوڈیو میں ہی رہتی تھی۔ اس کے والد آفتاب علی خان بہت وجہ اور معقول آدمی تھے۔ والدہ بھی باوقار اور دلکش شخصیت کی مالک تھیں۔ آفتاب صاحب نے کئی سال بعد ”ہاؤ“ کے نام سے ایک فلم بھی بنائی تھی جو فلاب ہو گئی۔ اس کے بعد وہ ”ہاؤ خان“ کے نام سے مشہور ہو گئے۔

بے بی حسہ تو شوٹنگ میں مصروف تھیں۔ لقمان صاحب نے ہمیں ان کے والدین سے ملوایا۔ بہت ہی اچھے، بااخلاق اور مہذب لوگ تھے۔ شوکت صاحب کے اصرار پر انہوں نے اپنی اکلوتی بیٹی کو فلم میں کام کرنے کے لیے اُن کے حوالے کی تھی۔ شوکت صاحب بھی بے بی سے اپنی اولاد جیسا سلوک کرتے تھے۔ بعد میں بے بی سے بھی ملاقات

کیا اور ان کو کیا بھی توبہ دلی کے ساتھ۔ انڈیا سے آنے والے نامور فلم سازوں اور ہدایت کاروں میں صرف نذیر صاحب ایسے مجاہد تھے جنہوں نے نئے ملک کے نئے حالات سے سمجھوتا کر لیا اور فلم سازی شروع کر دی۔ پاکستان کی پہلی سلور جوبلی اور کامیاب فلمیں نذیر صاحب ہی نے بنائی تھیں۔

کئی سال بعد ایس ایم یوسف پاکستان آئے تو یہاں فلم انڈسٹری کا پھیلا ہوا تھا اور حالات کافی بہتر ہو گئے تھے اس لیے انہیں پاکستان میں فلمیں بنانے میں زیادہ مشکل اور الجھنوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

شوکت حسین رضوی کی فلم ”جان بہار“ ان کے بداحوں اور دوستوں کے مجرور اصرار پر شروع کی گئی تھی۔ وہ فلمی صنعت کا بچپن تھا۔ تجربہ کار مصنف تھے، ندادا کار۔ نہ ہنر مند، نہ موسیقار۔ بہر حال انہوں نے فلم کا آغاز کر دیا جو کئی وقفوں کے بعد کافی دیر بعد مکمل ہوئی۔

ایک دن ہم شاہ نور اسٹوڈیو گئے تو معلوم ہوا کہ شوکت صاحب کی فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہے۔ ہم لقمان صاحب کو مطلع کر کے فوراً سیٹ پر پہنچ گئے۔ سیٹ پر کوئی معروف اداکار موجود نہ تھا۔ البتہ ایک دس بارہ سال کی نو عمر پیاری سی بچی کیمرے کے سامنے کھڑی تھی۔ شوکت صاحب اس کو ”بے بی“ کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔

”دیکھو بے بی! تمہیں اس طرف سے آکر صوفے پر

خوبصورت مناظر، فوارے، لان اور عمارتیں بنوا کر اسے پاکستان کا سب سے خوبصورت فلمی اسٹوڈیو بنادیا تھا۔ شوکت صاحب نے ہنرمند بھی اچھے تلاش کیے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت زیادہ تر فلم سازی شاہ نور اسٹوڈیو ہی میں ہوتی تھی۔ اسٹوڈیو کے ایک بڑے لان کے کنارے پر ساؤنڈ ریکارڈنگ ہال تعمیر کیا گیا تھا جس کے اوپر ایک چھوٹا سافلیٹ اور سامنے ایک وسیع میز یا مین تھا۔ اس جگہ بیٹھ کر سارا اسٹوڈیو نظروں کے سامنے آ جاتا تھا۔ عموماً شام کے وقت شوکت صاحب اسی جگہ بیٹھتے تھے۔

اسٹوڈیو کے ایک گوشے میں رہائشی بنگلا تھا۔ میڈم نور جہاں اور شوکت صاحب کے تعلقات اس وقت تک بہت اچھے تھے۔ یہ دونوں اپنے بچوں کے ساتھ اس کوٹھی میں بہت خوش و خرم زندگی بسر کر رہے تھے۔ دونوں عمر بے پڑھنے کے لیے صادق پبلک اسکول بہاولپور بھیج دیے گئے تھے جو چھٹیوں میں آ جاتے تھے۔ چھوٹی بیٹی غل ہما ایک خوبصورت گڑیا کی طرح تھی۔ وہ نور جہاں اور شوکت صاحب کی زندگی کا ایسا دور تھا جب کسی قسم کی غلط فہمیاں، شکوک و شبہات اور اختلافات نے جنم نہیں لیا تھا۔ ہندوستان سے معروف کیریئرٹراکٹر شاہ نواز پاکستان آئے تو وہ اسی چھوٹے سے فلیٹ میں رہا کرتے تھے۔ دیکھنے میں وہ بہت باوقار اور بارعب لگتے تھے مگر بہت خوش مزاج تھے۔ اکثر مکمل مذاق بھی کر دیا کرتے تھے۔ مثلاً کسی سیٹ پر کوئی جھگڑا ہو رہا ہے تو شاہ نواز صاحب نے اپنے فلیٹ کے میز پر لاؤڈ اسپیکر لگا کر اس کو براہ راست نشر کرنا شروع کر دیا اور جھگڑے والوں کو خبر تک نہ ہوئی کہ ان کی لڑائی لفظ بہ لفظ سارے اسٹوڈیو میں براڈ کاسٹ ہو رہی ہے۔

شوکت صاحب نے بہت سوچ بچار کے بعد ایک فلم ”جان بہار“ شروع کی تھی۔ شوکت صاحب ہمیشہ میں کام کرنے کے عادی تھے۔ پاکستان کی ابتدائی اور بدقسمت فلم انڈسٹری کے حالات میں ان کے لیے کام کرنا بہت مشکل تھا۔ یہی مسئلہ ڈبلیوزید احمد اور سید بسطنی فضل صاحب کے ساتھ بھی تھا۔ وہ نئے نئے ہمیشہ کی انڈسٹری چھوڑ کر پاکستان کی نئی اور ابتدائی فلم انڈسٹری میں آئے تھے جہاں کوئی کام بھی ان کے مزاج اور طریقہ کار کے مطابق نہیں ہو سکتا تھا اسی لیے ان عظیم ہدایت کاروں نے پاکستان آ کر فلمیں نہیں بنائیں ورنہ ایک نئی نسل ان کے تجربات سے سیکھ کر پاکستان کی فلمی صنعت کو چار چاند لگا دیتی۔ انہوں نے بد دل ہو کر یا تو کام ہی نہیں

کے ہمارے ایک جیسے تعلقات تھے۔

ہدایت کار لقمان سے ہماری گہری دوستی ہو گئی تھی جس کی وجہ سے ہمیں فلم سازی کے مختلف مراحل کو بہت نزدیک سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ ہر وقت ان کے ساتھ رہنے کی وجہ سے نہ صرف فلم کے ہر شعبے کے افراد سے ملاقات اور بے تکلفی ہو گئی بلکہ ان کے بارے میں لقمان صاحب نے ہمیں بہت سی اہم معلومات بھی فراہم کیں۔ ہم اخبار کے دفتر سے فارغ ہو کر سیدھے شاہ نور اسٹوڈیو پہنچ جاتے یا لقمان صاحب ہمیں اپنے ساتھ ہی لے جاتے۔ انہی کی وجہ سے ہم نے پنجابی فلم ”چن“ کے شروع سے لے کر آخر تک تمام معاملات کو دیکھا۔ موسیقاروں، گلوکاروں، اداکاروں، ہنرمندوں اور اہم لوگوں سے ملنا جلنا ہو گیا۔ ہمارے شوق کو دیکھ کر لقمان صاحب نے اپنی فلموں کی کہانیوں پر بحث مباحثے میں بھی ہمیں شامل کر لیا یہاں تک کہ ہم نہ صرف ان کے اسکرپٹ ڈیپارٹمنٹ کا ایک حصہ بن گئے بلکہ ان کی چند فلموں کے مکالمے اور منظر نامہ لکھنے کا بھی ہمیں قسمت سے موقع مل گیا۔ اس طرح ہم صحافت کے ساتھ ساتھ فلمی دنیا کا بھی ایک حصہ بن گئے۔

نیا پور نیو اسٹوڈیوز اس وقت تک تعمیر نہیں ہوا تھا۔ آغا جی اے گل نے مسلم ٹاؤن میں واقع پنجولی اسٹوڈیوز کو کرائے پر حاصل کر کے وہاں فلم بندی کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ پور نیو اسٹوڈیوز کی خوبصورت اور جدید ترین عمارت بعد میں بنی تھی جس کو اس وقت نیو پور نیو اسٹوڈیو کہا جاتا تھا۔ جب نیا اسٹوڈیو مکمل ہو گیا تو آغا صاحب نے پُرانے اسٹوڈیو کو چھوڑ دیا اور یہ اسٹوڈیو مختلف لوگوں کی ملکیت میں رہا۔ یہاں تک کہ تقسیم کار اور فلم ساز باری ملک نے اس کو ٹھیکے پر لے لیا اور یہ باری اسٹوڈیو کہلانے لگا۔

تقسیم کے بعد جو نئے نئے چلے ہوئے اسٹوڈیو کسی کام کے رہ گئے تھے، ان میں تھوڑا بہت کام شروع ہو گیا تھا۔ اس وقت صرف ایک اسٹوڈیو ایسا تھا جسے از سر نو تعمیر کر کے بہت اچھے شوٹنگ فلور بنائے گئے تھے۔ ساز و سامان بھی ادھر ادھر سے حاصل کر لیا گیا تھا۔ کچھ آلات خود اسٹوڈیوز کے مالک نے بنائے تھے۔ سبزہ زار اور خوبصورت درختیں کے درمیان گھرا ہوا اسٹوڈیو ایک پکنک کی تفریح گاہ کا منظر پیش کرتا تھا۔

یہ شاہ نور اسٹوڈیو تھا۔ سید شوکت حسین رضوی نے ایک ایک اینٹ اپنی نگرانی میں لگوائی تھی اور ہر طرف



نیلا پرست کا پوسٹر

اغذے فرائی کرتے ہوئے انہیں اچانک خیال آیا، وہ ہنسنے لگیں۔

”کیا بات ہے بے بی، ہنس کیوں رہی ہو؟“
 ”اس لیے کہ آپ نے مجھے بے وقوف بنا دیا ہے۔“
 ”میں نے؟ وہ تو تم پہلے ہی ہو۔“
 وہ زیادہ ہنسنے لگیں ”باتوں باتوں میں مجھ سے ناشتا بنوا لیا، مگر یہ ناشتا میں ان سب کو نہیں دوں گی۔“
 ”پھر کیا کرو گی اس کا؟“
 ”خود کھا لوں گی۔“

”رہنے دو بے بی، خواہ مخواہ موٹی ہو جاؤ گی۔ موٹی بیروئن کو لوگ پسند نہیں کرتے۔“
 اتنی دیر میں وہ صاحب کچن میں جھانکتے ”کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟“

ہم کہتے ”آ جائے۔“
 بے بی غصے سے کہتی ”تو پھر میں جا رہی ہوں۔“ وہ فوراً روٹھی ہوئی چلی جاتی تھیں مگر اس وقت تک ناشتا تیار ہو جاتا اس لیے بے بی کی ناراضی کے باوجود سب ناشتا کر لیتے۔

یہ تو سب جانتے ہیں کہ آؤٹ ڈور شوٹنگ میں تمام آرٹسٹ اکٹھے ہی جاتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ ہر روز اور ہر وقت تمام آرٹسٹ مصروف رہیں۔ مگر بے بی کو یہ منظور نہ تھا۔ انہوں نے فلم ساز اعجاز سید کا شریف سیر صاحب کی جان کھالی کہ پہلے میرا کام ختم کریں۔ انہوں نے بہتیرا سمجھایا کہ کام تو شیڈول کے مطابق ہی کیا جاتا ہے مگر وہ بغض رہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ میں فلیٹ میں خالی اور بے کاریٹھ بیٹھے تنگ آ جاتی ہوں، کیا کروں؟“

”تم باہر سیر کے لیے چلی جایا کرو۔“
 ”میں اکیلی، پردیس میں اکیلے پھرتے اچھی لگوں

پھلائے کیوں بیٹھی ہو۔“

”آفاقی صاحب، میں کسی کی نوکر تو نہیں ہوں۔ بیروئن ہوں۔ ان لوگوں نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے؟“
 ”بے بی۔ سب تمہیں بیروئن ہی سمجھتے ہیں۔“
 ”اب خود دیکھیے۔ فلاں صاحب نے مجھے کیا کہا، میں نے بھی خوب سنائیں اور کہا کہ اب اپنا ناشتا بھی خود ہی بنانا۔“

”بے بی، آج تو طالش صاحب بھی نہیں ہیں کہ ناشتا بنادیں۔ تم اس بے چارے کو بھوکا تو نہ مارو۔“
 ”جو کیا ہے اب سمجھتے۔“

”اچھا تم کم از کم چائے کی ایک پیالی بنا کر دے دو، پلیز۔ میری خاطر!“

”ٹھیک ہے، آپ کہتے ہیں تو بنادیتی ہوں۔“ وہ کچن میں جا کر چائے بنانے کے لیے پانی کیتلی میں ڈالتیں۔
 ”سنو بے بی، اب کچن میں آئی ہو تو ایک دو ٹوسٹ ہی سینک دو۔ مکھن وہ خود لگا لیں گے۔“
 ”ٹوسٹ وہ خود سینک لیں، کوئی مشکل کام نہیں ہے۔“

”لاؤ، ٹوسٹ ہم سینک دیتے ہیں۔“
 ”بس آپ رہنے دیجئے، میں ٹوسٹر میں ڈالتی ہوں۔“ وہ ڈبل روٹی تلاش کرنے لگیں۔
 ”اوہو بے بی! دیکھو سانسے ہی اغذے بھی پڑے ہیں۔“

بے بی کا موڈ اب تک کچھ سنبھل چکا ہوتا۔ وہ ہنس پڑتی ”یہ اغذے مرغی کے ہیں، کچھ اور نہ سمجھ لیں۔“
 ”ہمارا مطلب ہے کہ مرغی نے کتنا ٹیک کام کیا ہے کہ اپنے بچوں کو قربان کر کے ہم انسانوں کے لیے یہ اغذے دے دیے ہیں۔“

”مرغیاں اغذے دینے کے سوا اور کرتی کیا ہیں اور یہ اغذے تو مصنوعی ہیں۔ مشینوں سے بنائے جاتے ہیں۔“

”اچھا بے بی، ذرا فرائی چن اٹھا کر دینا۔“
 ”کیوں، آپ کیا کریں گے اس کا؟“

”سوچتے ہیں یہ دو اغذے تو ڈکراس میں ڈال دیں۔ گھی یا نیل تو تم ڈال ہی دو گی۔ فرائیڈ ایک تیار ہو جائے گا۔“

”آپ تو رہنے دیجئے، جلتا ہوا نیل اچھل کر زخمی بھی کر دیتا ہے۔“

”اچھا تو پھر تیل بھی تم ہی ڈال دو۔“

بی بی کہہ کر ہی پکارتے رہے۔ بے بی ایک خوش مزاج اور ہنس کھ لڑکی تھی۔ مہذب اور تعلیم یافتہ بھی تھی مگر اس کے موڈ بدلتے رہتے تھے۔ وہ کسی بھی معمولی بات پر ناراض ہو جاتی تھی اور کبھی بعض بڑی بڑی باتوں کو بھی نظر انداز کر دیتی تھی۔ اس کے بدلتے ہوئے مزاج کی وجہ سے حسد کو فلیٹ چلتے ”کرپک“ کہتے تھے۔ اس زمانے میں ایسے مزاج کی دوا دارا میں بیک وقت فلمی دنیا میں کام کر رہی تھیں۔ ایک نگہت سلطانہ اور دوسری حسد۔ ان دونوں سے ہمارے تعلقات بہت اچھے اور بے تکلفانہ تھے۔ ہم انہیں چاہے جو بھی کہیں، وہ کبھی سنجیدگی سے برا نہیں مانتی تھیں بلکہ اکثر ہمارا مشورہ مان لیا کرتی تھیں۔ ان کی کسی بھی وقت، کسی بھی بات پر ہدایت کار، فلم ساز، کیرئیرسٹن، ساسھی اداکار اور اداکارہ کے ساتھ جھڑپ ہو سکتی تھی مگر ہم چونکہ ان کے غصے کو بھی مذاق میں اڑا دیتے تھے اور انتہائی عقیم اور نازک موقع پر بھی نعرہ بازی کر کے انہیں بتا دیا کرتے تھے اس لیے ہمارے سوا شاید ان کی ہر ایک سے لڑائی اور جھڑپ ضرور ہوئی۔

کئی فلم ساز خصوصاً ہمارے قریبی دوست کسی مسئلے کو حل کرانے کے لیے ہماری مدد حاصل کرتے تھے اور مسئلہ حل ہو جاتا تھا۔

جب فلم دوستی کی شوٹنگ کے لیے ہم فلم یونٹ کے ساتھ لندن گئے تو فلم ساز اعجاز سید سبھی لوگ ایک ہی فلیٹ میں رہتے تھے۔ ہدایت کار شریف سیر صاحب کی صاحب زادی شاہدہ بھی والد کے ساتھ گئی ہوئی تھیں۔ حسد اور وہ دو ہی خواتین تھیں جو صبح سب کے لیے ناشتا بنایا کرتی تھیں۔ شاہدہ غالباً ایم اے انگلش کا امتحان دے چکی تھیں یا اس کی تیاری کر رہی تھیں۔ وہ بے حد سنجیدہ، سمجھ دار اور خوش مزاج تھیں۔ ہر ایک سے حفظ مراتب کا خیال رکھتی تھیں۔

اس کے برعکس حسد ناراض ہو کر کھری کھری سنا دیتی تھیں چاہے کوئی بھی ہو۔ وہ جس سے ناراض ہوتی تھیں اس کو ناشتا بھی بنا کر نہیں دیتی تھیں۔ ناراض ہونے کے بعد وہ کسی کی بات سننے کو تیار نہیں ہوتی تھیں۔ ایسے موقعوں پر ”متاثرہ“ فریق ہماری خدمات حاصل کرتا تھا۔

”یار آفاقی، ناشتا تو بنوادو، بہت بھوک لگ رہی ہے۔“

نیر صاحب کی صاحب زادی سے تو سب کو تکلف اور لحاظ تھا۔ حسد کے ساتھ ہی کام پڑتا تھا۔ ہم حسد کے پاس جاتے۔ ”بے بی، کیا بات ہے؟ منہ



ناصر خان اور آشا پوسٹر فلم تیری یاد میں

ہوئی۔ وہ اتنی کم عمر تھی کہ اس سے کوئی سنجیدہ بات کی ہی نہیں جاسکتی تھی۔ بے بی شوخ اور کھلندری تھی۔ اسٹوڈیو میں فرصت کے اوقات میں وہ ہر سیٹ پر پہنچ جاتی اور شوٹنگ دیکھا کرتی۔ سینما ہال میں اگر کسی فلم کے رش پرنٹ چل رہے ہوتے تو بے بی حسد وہاں بھی موجود۔ شوکت صاحب کی فلم رک رک کر بن رہی تھی اور ظاہر ہے کہ بے بی کا فلم میں بہت زیادہ کام بھی نہیں تھا اس لیے وہ فرصت کے اوقات اسٹوڈیو کے کاموں کو دیکھ کر گزرتی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کی کوئی ہم عمر بچی اس کو نہیں ملی تھی جس کے ساتھ وہ کھیلتی۔ اس طرح ہمارا بے بی حسد سے تعارف ہوا۔

مختلف وجوہ کی بنا پر یہ فلم مکمل ہونے میں اتنی دیر ہو گئی کہ بے بی اس عرصے میں بچی سے نو عمر لڑکی میں بدل چکی تھی۔ شوکت صاحب کے لیے یہ مسئلہ تھا کہ فلم کا ایک حصہ اس کے بچپن میں فلما یا جا چکا تھا، اب وہ بڑی ہو چکی تھی مگر شوکت صاحب نے بڑی ہنرمندی سے بے بی کا کام مکمل کر لیا۔

بے بی حسد کو اس فلم کے بعد دوسرے فلم سازوں نے بھی کاسٹ کرنا چاہا لیکن اس کی عمر ایسی تھی کہ اس کے لیے خاص طور پر کردار لکھا جاتا تو وہ کام کر سکتی تھی۔

چند سال اور گزر گئے۔ بے بی بچپن سے نو جوانی کی عمر میں داخل ہو گئی اور اس نے فلموں میں کام بھی کرنا شروع کر دیا۔

اس جگہ بے بی حسد کی زندگی کے تفصیلی حالات بیان کرنا مقصود نہیں ہے۔ ان کے بارے میں کچھ تاثرات پیش خدمت ہیں۔

بے بی اور اس کے گھرانے سے ہمارے بہت گہرے مراسم ہو گئے تھے۔ بے بی باقاعدہ کامیاب بیروئن بن کر حسد کہلائی مگر ہمیں ایسی عادت پڑی تھی کہ ہم انہیں ہمیشہ بے

کی؟

”بہت اچھی لگوگی۔“ اعجاز نے کہا ”مگر میک اپ وغیرہ کر کے باہر جانا۔“

بے بی اپنے مطالبے پر قائم رہیں۔ آخر ایک دن اعجاز نے ہم سے کہا کہ آفاقی، تم میری مشکل آسان کرو۔

”وہ کیسے؟“

”تم دو چار دن بے بی حنہ کو اپنے ساتھ گھمانے پھرانے، کھانا کھلانے اور فلم دکھانے لے جاؤ۔ تمہارے ساتھ وہ خوش رہے گی۔“

ہم نے کہا ”خوش تو ہم بھی رہیں گے لیکن اگر بے بی کسی بات پر اڑ گئی تو مشکل ہو جائے گی۔“

”ارے یار، تم سب ٹھیک کر لو گے، مجھے معلوم ہے۔“

اچھا، اب کل صبح سے بے بی تمہارے سپرد۔“

صبح ناشتے پر بے بی کو یہ خبر سنائی گئی تو وہ بہت خوش ہوئیں۔ انہوں نے فوراً پروگرام بنانا شروع کر دیا کہ کہاں کہاں سیر کے لیے جائیں گے۔ سچ کہاں کھائیں گے۔ شام کو کون سی فلم دیکھیں گے۔ شاپنگ کے لیے کہاں جائیں گے۔ ڈنر کہاں کریں گے، وغیرہ وغیرہ۔

ہم نے پوچھا ”بے بی، ان سب کاموں کے لیے تمہارے پاس پاؤنڈز ہیں؟“

”شاپنگ کے لیے تو ہیں مگر دوسرے سارے اخراجات پروڈیوسر کے ذمے۔“

”بھئی ہم اعجاز سے پیسے مانگتے اچھے لگیں گے؟“

”بس تو ٹھیک ہے۔ باقی خرچے آپ کے ذمے۔“

سب لوگ شوٹنگ پر چلے گئے تو ہم اور بے بی ارل کورٹ کے فلیٹ سے نکل کر آکسفورڈ اسٹریٹ پہنچ گئے۔ یہاں بے بی نے درجن بھر اسٹورز میں جھانکا۔ کئی دکانوں پر کافی دیر لگائی۔ آخر ایک اسٹور میں انہیں اپنی پسند کے ڈریس پسند آ گئے۔ سیلز گرل نے انہیں تمام ڈریسز دکھا کر کہا کہ آپ اس کمرے میں ٹرائی کر لیں۔ بے بی ہر لباس پہن کر باہر آئیں اور ہم سے پوچھتیں ”آفاقی صاحب، کیسا ہے؟“

ہم اپنی پسند اور ناپسند بتاتے تو وہ اس کو مان لیتیں۔ سیلز گرل نے یہ اندازہ لگا لیا کہ خریداری کے لیے ہمارا رضا مند ہونا بہت ضروری ہے اس لیے وہ اب ہر ڈریس کی تعریف ہم سے کرنے لگی۔ اس طرح دو ڈھائی گھنٹے میں بے بی نے ہمارے مشورے سے تین چار ڈریس خرید لیے۔ ایک بار وہ نیا لباس پہن کر باہر آئیں تو بہت ہنس رہی تھیں۔

ہمارے پوچھنے پر بتایا ”آفاقی صاحب، پتا ہے یہ لڑکی کیا سمجھ رہی ہے؟“

”کیا سمجھ رہی ہے؟“ ہم نے پوچھا۔

”سمجھ رہی ہے کہ ہم دونوں میاں بیوی ہیں۔ کہہ رہی تھی کہ تمہارے شوہر کی پسند بہت اچھی ہے۔“

”پھر تم نے اس کو بتایا کہ ہم میاں بیوی نہیں ہیں۔“

”میں نے تو نہیں بتایا۔ دراصل آپ مجھے بے بی، بے بی کہہ رہے ہیں۔ یہاں گرل فرینڈ یا بیوی کو پیار سے شوہر بے بی کہتا ہے۔ اس لیے اس کو یقین آ گیا۔“

کپڑوں کی شاپنگ کے بعد بے بی نے میک اپ کے حصے کا رخ کیا اور وہاں بہت دیر تک مختلف لب اسٹیکس، نیل پالش اور خوشبوئیں لگا کر ہم سے رائے لیتی رہیں۔ آخر ہم نے کہا کہ ”بے بی، اب کچھ خرید بھی لو۔ وہ لڑکی بھی ہوگی کہ تم فری میں میک اپ اور خوشبو لگانے آئی ہو۔“

بے بی نے وہاں سے بھی خریداری کر لی۔ اس کے بعد جوتوں کی باری آئی۔ اب ہم بیزار ہو گئے تھے۔ ویسے بھی خواتین کے ساتھ شاپنگ پر جانا ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔

ہم نے کہا ”بے بی! اب جوتے دو تے کل، بہت بھوک لگی ہے۔ شیزان میں چل کر کچھ کرتے ہیں۔“

شیزان میں کچھ کے لیے گئے تو اسٹاف کے لوگ انہیں پہچان گئے اور بہت خاطر مدارات کی۔ بے بی بہت خوش ہوئیں، کہنے لگیں ”دیکھا آپ نے، یہ میرے فین ہیں۔“

”ہم تو تب مائیں جب تم مل میں رعایت کراؤ یا فری کھانا کھاؤ۔“

”کیسی باتیں کرتے ہیں۔ یہ تو بہت شرمندگی کی بات ہوگی۔ بلکہ آپ انہیں زیادہ شپ دیجئے گا۔“

کھانا کھا کر نکلے تو سہ پہر ہو رہی تھی۔ بے بی نے پارکس جانے کا پروگرام کینسل کر دیا اور کچھ دیر سڑکوں پر گھومنے کے بعد واپس فلیٹ پر آ گئیں۔ وہ ہمیں اپنی ساری شاپنگ دکھانا چاہتی تھیں مگر ہم نے کہا کہ ہمیں کام کرنا ہے، جب یونٹ کے لوگ آئیں تو انہیں یہ سب سامان دکھانا، وہ سب جل جائیں گے۔“

”ہاں، یہ ٹھیک کہا آپ نے۔“

رات کو انہوں نے سب کو شاپنگ دکھائی۔ ہم اپنے کمرے میں مصروف رہے۔

اگلے دن پارکس سے سیر کا آغاز ہوا۔ کشتی میں بیٹھے۔ آئس کریم کھائی۔ بلیٹوں کو دانہ کھلایا۔ ظاہر ہے کہ اس

روز صرف ہائیڈرک ہی دیکھ سکے۔ بے بی بہت خوش تھیں۔ ہم نے انہیں اسپیکر زکار زور دکھایا جہاں کئی لوگ ٹکڑی کے ڈبوں پر کھڑے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔

”ارے آفاقی صاحب، یہ تو ملکہ کو برا بھلا کہہ رہے ہیں اور وہ سامنے پولیس والا آرام سے ٹہل رہا ہے۔“

ہم نے بتایا کہ یہاں سب کچھ کہنے کی اجازت ہے۔ کوئی نہیں پوچھتا۔

پولیس ”تو پھر مجھے بھی ٹکڑی کا ایک ڈیالا دیں۔“

”وہ ہم کہاں سے لائیں؟“

”یہ سب بھی تو لے کر آئے ہیں۔“

”بھئی، ان کے ذاتی ڈبے ہیں۔ یہ ہر روز یہاں آ کر تقریریں کرتے ہیں۔“

”تو پھر کسی سے ادھار مانگ لیجئے۔“

ہم نے انہیں سمجھایا کہ فی الحال تقریر کرنے کا ارادہ چھوڑو۔ پہلے سوچ لو کہ کیا تقریر کرنی ہے پھر کل ڈیالے کر آئیں گے۔ وہ آسانی سے مان لیں۔ ہم نے بتایا ہے کہ وہ بچوں کی طرح گھڑی میں تولہ اور گھڑی میں ماشہ ہوتی تھیں۔ ان کا دل ہمیشہ صاف رہتا تھا۔ غصے میں جو منہ میں آتا سنا دیتی تھیں۔ جو لوگ ان کی باتوں پر سیریس ہو جاتے تھے ان سے باقاعدہ لڑائی ہو جاتی تھی مگر ہم ان کے غصے پر مذاق کرتے تو وہ ہنس کر کوئی اور بات شروع کر دیتیں۔

لندن میں تین دن ہم بے بی کے ساتھ گھومے۔ یہ واقعات ہم تفصیل سے اپنے سفر نامے میں لکھ چکے ہیں۔ انہوں نے بیٹھے کی رات کو ایک فلم بھی دیکھی جس کے ہم مخالف تھے۔

”بے بی، یہ فلم صرف بالغوں کے لیے ہے۔“

”تو کیا ہوا۔ ہم بھی تو بالغ ہیں، اپنا شناختی کارڈ دکھاؤ؟“

”مطلب یہ ہے کہ یہ گندی فلم ہے، بے ہودہ قسم کی۔“

”آفاقی صاحب، آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ دیکھیں گے تو پتا چلے گا۔ دیکھیے سنیما پر کتنا رنج ہے۔“

”ہم۔۔۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس فلم کے ٹکٹ خرید کر اندر چلے گئے۔ کچھ دیر بعد بے ہودگی کا آغاز ہو گیا۔ ہمیں بہت بُرا لگا اور شرم بھی آئی۔ بے بی کی طرف دیکھا تو وہ سر جھکائے آنکھیں بند کیے بیٹھی تھیں۔“

ہم نے کہا ”بے بی، آؤ چلتے ہیں۔“

”کیا وہ ٹکٹوں کے پیسے واپس دے دیں گے؟“

سعادت حسن منٹو کی دیونید ستیا رگی سے اکثر ٹوک جھونک رہتی تھی۔ ایک روز انہوں نے منٹو کو چڑانے کی غرض سے کہا ”منٹو افسانہ نگاری میں تم حرف آخر نہیں ہو۔“

چینوف، ہوپا ساں اور کئی دیگر افسانہ نگار بیٹھے ہیں۔

منٹو نے کمال بے پردائی سے کہا ”ہوا کریں، تمہارے لیے تو میں حرف آخر ہوں۔“

مرسلہ: جاوید سیال، چینیوٹ

”نہیں۔“

”تو پھر یہ تو نقصان ہو جائے گا۔“

”ہم تو پہلے ہی سمجھا رہے تھے۔“

اس سنیما سے نکل کر ہم دوسرے سنیما میں چلے گئے جہاں ایک کامیڈی فلم چل رہی تھی۔ بے بی بچوں کی طرح ہنستے ہنستے بے حال ہو گئیں۔ لندن کے سنیماؤں میں فلمیں ہر وقت چلتی رہتی ہیں۔ جب چاہو ٹکٹ لے کر فلم دیکھو اور جب وہی حصہ شروع ہو جائے تو اٹھ کر چلے جاؤ۔ جب وہ حصہ آجہاں سے ہم نے فلم دیکھنی شروع کی تھی تو بے بی نے دوبارہ فلم دیکھنے کی فرمائش کر دی۔ اضافی پیسے تو دیئے نہیں تھے۔

دوسری بار فلم دیکھ کر باہر نکلے تو ڈیڑھ بج رہا تھا۔ یہ سٹریڈے ٹائٹ تھی۔ ہر طرف ہنگامہ اور چہل پہل تھی۔ ٹیکسی دستیاب نہیں تھی۔ بے بی کا ایک ٹیکسی والے سے جھگڑا بھی ہو گیا جس کو انہوں نے اردو اور انگریزی میں بہت بُرا بھلا کہا۔ بڑی مشکل سے ہم انہیں سمجھ کر دیاں سے لائے۔ بڑی مشکل سے ایک ہوٹل میں جا کر ریڈیو ٹیکسی منگائی اور رات بلکہ صبح تین بجے فلیٹ پر پہنچے۔ راستے میں بے بی لندن کے ٹیکسی والوں کو بُرا بھلا کہتی رہیں۔ ٹیکسی ڈرائیور نے اردو میں کہا ”معاف کرنا، یہاں سارے ٹیکسی ڈرائیور مجرے نہیں ہوتے۔“

ہم تو بہت شرمندہ ہوئے مگر بے بی نے اس سے انٹرویو لینا شروع کر دیا کہ اس نے اردو کہاں اور کیسے سیکھی؟ اس نے بتایا کہ وہ کلکتہ میں پیدا ہوا تھا۔ پھر دہلی میں رہا اس لیے اردو، پنجابی جانتا ہے۔

فلیٹ پر سب پریشان اور غصہ تھے۔

”یار، کہاں غائب ہو گئے تھے؟ ہم تو پریشان ہو گئے۔“

بات نہیں، تم پریشانی نہیں ہوگی۔“

بے بی نے بے ساختہ ہنسا شروع کر دیا۔ اس طرح معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

بے بی حنہ کے بے شمار واقعات ہیں۔ وہ بہت دلچسپ ہستی تھیں بلکہ اب بھی ہیں۔ (ستمبر 2011ء) آج کل وہ اپنے بیٹے کے پاس امریکا میں رہتی ہیں۔ چند سال پہلے لاہور آئی تھیں۔ سید شوکت حسین رضوی اس وقت بقیہ حیات تھے۔ انہوں نے ہمیں تندوری پرانے کھانے کی دعوت دی تو ان کی بیگم نے موقع پا کر گھٹیت سلطانہ اور حنہ کو بھی بلالیا جو اس زمانے میں لاہور آئی ہوئی تھیں۔ ہم لوگوں کی ملاقات بہت عرصے بعد ہوئی تھی۔ بہت دیر تک پُراے قصبے اور واقعات دہرائے اور ہنستے رہے۔ شوکت صاحب بھی اس گفتگو سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ہم حنہ کو مسلسل بے بی کہہ رہے تھے۔

شوکت صاحب نے کہا ”ارے وہ ثانی ہیں مٹی ہے اور تم بے بی، بے بی کہہ رہے ہو۔“

ہم نے کہا ”شوکت صاحب ہمارے لیے تو یہ ہمیشہ بے بی ہی رہیں گی۔“

حنہ واپس امریکا چلی گئیں۔ کچھ عرصے بعد گھٹیت سلطانہ کا انتقال ہو گیا اور اس کے چند سال بعد شوکت صاحب بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

زمانہ بدل گیا۔ نہ وہ لوگ رہے، نہ وہ باتیں اور ملاقاتیں۔ بے بی نے ایک شادی نوجوان زمیندار رشید بھی سے کی تھی۔ یہ لومیرج تھی اور بھیٹی صاحب کے اصرار پر ہوئی تھی۔ بھیٹی صاحب کو ہمیشہ شک رہتا تھا کہ محمد علی اور کمال بے بی سے فلرٹ کر رہے ہیں۔ اس کی وجہ سے ایک بار وہ اپنے دوستوں کے ساتھ محمد علی پر بھی حملہ آور ہوئے اور ایک بار کمال کی کار کے پیچھے اپنی کار سے پیچھا کرنا شروع کر دیا یہاں تک کہ کمال نے بڑی مشکل سے ایک پولیس اسٹیشن میں کار داخل کر کے جان بچائی۔ یہ واقعات بیان کیے جا چکے ہیں۔

رشید بھیٹی سے زیادہ عرصے تک نہ بن سکی۔ کچھ عرصہ بعد حنہ نے ایک اور شادی کر لی جو کامیاب رہی کیونکہ شوہر کا تعلق فلمی صنعت سے نہ تھا۔

ہزاروں ہی قصے ہیں، کیا کیا بتاؤں۔ کہاں تک سونگے کہاں تک سناؤں؟

☆☆☆

پرتھوی راج کپور جب پشاور سے گلگت اور پھر بمبئی

بے بی بننے لگیں ”کیا آپ سمجھ رہے تھے کہ آفاقی صاحب مجھے لے کر بھاگ گئے؟“

”ارے نہیں، مگر پریشانی تو ہوتی ہے۔“

اب آخری منظر بھی دیکھیے۔ لندن سے شوٹنگ مکمل کر کے ہم لوگ لاہور آئے اور باری اسٹوڈیوز میں ”ڈبنگ“ شروع کی گئی۔ ایک دن ہم باری اسٹوڈیوز گئے تو ملک باری باہر برآمدے میں پریشان کھڑے تھے۔

ہم نے پوچھا ”باری صاحب، خیریت تو ہے؟“

”ارے یار، اندر حنہ اور اعجاز کا سخت جھگڑا ہو رہا ہے۔ بے بی بہت رو رہی ہے، تم کچھ کرو۔“

ہم اندر گئے۔ بے بی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی اور اعجاز کچھ شرمندہ سے بیٹھے تھے۔

ہم نے پوچھا ”بے بی، کیا بات ہے؟“

بے بی پھٹ پڑیں۔ ”دیکھیے آفاقی صاحب، جب میں نے کہا کہ پہلے میری فل پے منٹ کرو تو اعجاز صاحب ناراض ہو گئے۔ میں بھی بکڑ گئی۔ بہت جھگڑا ہوا۔ اعجاز نے بہت بُرے الفاظ کہے۔ میں نے غصے میں آ کر چپل اُتار کر ماری مگر وہ ان کو لگی نہیں۔“

”تو پھر رو کیوں رہی ہو؟“

”کیوں نہ روؤں۔ انہوں نے میری بے عزتی کی ہے۔ ایک لڑکی سے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے ان کو۔“ وہ پھر رونے لگیں۔

اعجاز نے کہا ”آفاقی، تم انہیں سمجھاؤ۔ بلاوجہ ڈبنگ رکی ہوئی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ باہر چلے گئے۔

ہم نے کہا ”بے بی، چپ ہو جاؤ۔ تمہیں رونے کی کیا ضرورت ہے۔ رونا تو اعجاز کو چاہیے۔“

ایک دم انہوں نے رونا چھوڑ دیا ”کیوں؟“

”دیکھو بے بی، اعجاز نے تمہاری بے عزتی کی۔ تم نے انہیں چپل ماری۔ حساب برابر ہو گیا بلکہ تم نے زیادتی کی ہے۔“

”کیوں؟“

”ارے بھی وہ سینئر فنکار ہے۔ تمہارا پروڈیوسر ہے۔“

”مگر انہیں میری بے عزتی کرنے کا حق تو نہیں ہے؟“

”تمہیں بھی انہیں چپل مارنے کا حق نہیں ہے۔ اب تم رو کیوں رہی ہو؟ کیا اس لیے کہ چپل کا نشانہ خطا ہو گیا؟ کوئی

”سناؤ۔“

”دیکھیے، جب کسی کو وکیل بننا ہوتا ہے تو وہ لا کالج میں داخلہ لیتا ہے۔ جو ڈاکٹر بننا چاہتا ہے وہ میڈیکل کالج میں داخل ہوتا ہے۔ میں فلم ایکٹر اور ڈائریکٹر بننا چاہتا ہوں اس لیے آپ مجھے اسکول کے بجائے فلم اسٹوڈیوز میں داخل کرو دیجئے۔“

پرتھوی راج نے ٹھنڈے دل سے بیٹے کی بات پر غور کیا۔ اس کی شکل و صورت اور ذہانت کا اس کو علم تھا۔ وہ بذاتِ خود بھی ڈگریوں سے زیادہ صلاحیتوں کا قائل تھا۔ لہذا اس نے راج کپور کو اس وقت کے معروف اور ذہین ہدایت کار کیدار شرما کے سپرد کر دیا۔ کیدار شرما کی جو ہر شناس نظروں نے اس کا جائزہ لیا اور اپنا چوتھا اسٹنٹ ڈائریکٹر بنالیا۔ راج کپور نے کیدار شرما سے بہت کچھ سیکھا۔ اداکاری کا فن بھی اور ہدایت کاری کی تکنیک بھی۔ کیدار شرما نے اسے اپنی فلم ”نیل مکمل“ میں ہیرو کے طور پر پیش کیا۔ یہ فلم تو زیادہ کامیاب نہ ہو سکی مگر راج کپور سب کی نظروں میں آ گیا۔ اس کے بعد راج کپور نے فلمی دنیا میں جو کامیابیاں حاصل کیں وہ سب جانتے ہیں۔

پرتھوی راج کے دوسرے بیٹوں نے بھی فلمی ماحول کا اثر قبول کیا اور اداکاری کا پیشہ اپنایا اور کبھی نے اپنی اپنی جگہ کامیابی اور شہرت حاصل کی۔ ان لوگوں کی پرورش اسٹوڈیوز کے ماحول میں ہوئی تھی۔ ان کے اندر اداکاری کا شوق اور صلاحیتیں قدرتی طور پر موجود تھیں۔

راج کپور کے بعد پرتھوی راج کے دوسرے بیٹے ششی کپور نے بھی اداکاری کا پیشہ اختیار کیا اور کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد ششی کپور نے اداکاری کے میدان میں قدم رکھا۔ جس خاندان سے اس کا تعلق تھا اس کے لیے فلموں میں داخلہ مشکل نہ تھا لیکن کامیابی حاصل کرنا بہت مشکل تھا۔ اپنے نامور باپ اور دو کامیاب بھائیوں کے سائے میں اس نے اداکاری تو شروع کر دی مگر کامیابی حاصل کرنے کے لیے اسے کافی عرصے انتظار کرنا پڑا۔

ششی کپور بھی اپنے باپ اور بھائیوں کی طرح خوبصورت، سرخ و سفید رنگ اور شرقی بالوں اور آنکھوں کی وجہ سے نمایاں تھا۔

ششی کپور کی پہلی فلم ”جیوتی“ تھی۔ (پورا نام ذہن میں نہیں آ رہا) یہ کوئی خاص کامیابی حاصل نہ کر سکی لیکن اس کے بعد ایسی فلموں کا سلسلہ شروع ہو گیا جو اس کے مزاج اور

رواندہ ہوا تھا اور اس نے فلمی صنعت کے دروازے کھٹکھٹانے کا اہلہ کیا تھا تو اس لیے ترنگے، گورے چٹے پنھان جیسے نوجوان کو تین روز ٹھوکریں کھانے کے باوجود کسی اسٹوڈیوز میں چوکیدار نے اسٹوڈیوز کے اندر داخل نہیں ہونے دیا۔ چوتھے روز وہ ایک ایسے اسٹوڈیوز کے دروازے پر پہنچا جہاں ایک پنھان چوکیدار ڈنڈا لیے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر خشونت اور کڑھکی تھی۔ لیکن پرتھوی راج نے اس چوکیدار سے پشتوں میں بات کی تو اس کا دل موم ہو گیا اور اس نے پرتھوی راج کپور کو فلم اسٹوڈیوز میں داخل ہونے کی اجازت دے دی۔

فلم اسٹوڈیوز میں داخلہ ہی مشکل کام تھا۔ اس کے بعد ہر پیش آنے والی مشکل کا اس نے بڑی ہمت اور حوصلہ مندی سے مقابلہ کیا یہاں تک کہ ہیرو کے درجے پر پہنچ گیا۔ اس وقت پرتھوی راج کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا اور نہ ہی اسٹوڈیوز کے پنھان چوکیدار نے یہ سوچا تھا کہ اس نے ایک ایسے شخص کو فلمی دنیا میں داخلے کی اجازت دی ہے جو نہ صرف بھارتی فلموں کا نامور اداکار اور اسٹیج کا معروف ہدایت کار اور اداکار بن کر درجنوں نوجوانوں کو اپنے ٹھیسر کے ذریعے فلموں میں کام کرنے کا موقع فراہم کرے گا بلکہ انڈیا میں ایک ایسے فلمی خاندان کی بنیاد رکھے گا جس کا ڈنکا عرصہ دراز تک ہندوستان کی فلمی دنیا میں بجتا رہے گا اور اس کی تیسری بیڑھی بھی ہندوستان کی فلمی صنعت بالی وڈ میں نام ووری اور کامیابی حاصل کرے گی۔ اس اعتبار سے پرتھوی راج کپور کے خاندان کو ہمیشہ اہمیت رہی ہے کہ ان سے متعلقہ افراد نے فلمی دنیا پر راج کیا ہے۔

پرتھوی راج کے بعد ان کا سب سے بڑا بیٹا راج کپور بھی فلموں کے شوق میں مبتلا ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ ایک خاندانی بیماری ہے جس میں فنکارانہ صلاحیتوں کے جراثیم پرورش پاتے رہتے ہیں اور نمایاں ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

راج کپور کوشش کے باوجود میٹرک پاس نہ کر سکا۔ وہ تین بار میٹرک کے امتحان میں ٹل ہوا تو اس کے باپ نے فکر مند ہو کر سوچا کہ یہ لڑکا آخر کیا کرے گا؟ انہوں نے بیٹے کو بلا کر پوچھا کہ تم میٹرک کیوں پاس نہیں کر سکتے؟ میں تمہیں آخری موقع دے رہا ہوں کہ اسکول میں داخل ہو کر میٹرک تو پاس کر لو۔

بیٹے نے کہا ”پاپا، آپ میری بات ٹھنڈے دل سے سنئے۔“

فطرت کے عین مطابق تھیں۔ کشمیر کی کلی، پردیس، ایونک، ان بھیرس، برہمچاری، جنگلی، جانور، تیسری منزل، انداز اس کی کامیاب فلمیں تھیں۔

نئی کپور اس دور میں فلموں سے وابستہ ہوا تھا جب اداکاروں میں دلپ کمار، دیو آنند اور راج کپور کے ناموں کا ذکر نہ کیا جاتا تھا اور ان کی ہمسری کرنا آسان نہیں تھا۔

نئی کپور جس زمانے میں فلموں میں آیا اس وقت کئی نئی ہیروئنیں بھی فلمی دنیا میں آئی تھیں۔ نرگس، مدھوبالا، نئی، مینا کمار، نوتن جیسی ہیروئنیں نئی کپور کے ساتھ نہیں چلتی تھیں۔ ان کی جگہ لینے کے لیے سائرہ بانو، وحشی مالا، آشا پارکھی، شرمیلا ٹیگور جیسی مختلف اور تروتازہ چہرے فلموں میں آنے لگے تھے۔ نئی کپور نے ان ہیروئنوں کے ساتھ کام کیا اور اپنے منفرد کرداروں اور نئے انداز کی اداکاری سے فلم بینوں پر سحر طاری کر دیا۔ یہ حقیقت ہے کہ نوجوان نسل میں نئی کپور کی آمد نے ایک نئی لہر پیدا کر دی تھی۔ جنگلی میں اس کی ہیروئن سائرہ بانو تھی۔ یہ فلم برف پوش وادیوں میں فلمائی گئی تھی۔ نئی کپور نے اس فلم میں بے ہنگام اور انتہائی بے تکلف اداکاری کا نمونہ پیش کیا۔

فلم ”جنگلی“ کا نعرہ چاہے کوئی مجھے جنگلی کہے پہلے جو بھی کہتا رہے ہم پیار کے طوفانوں میں گھرے ہیں، ہم کیا کریں یا ہو۔۔۔!

اس گانے کی فلم بندی میں برف پوش وادیوں میں نئی کپور کے بچھلنے، بھاگنے دوڑنے اور رقص کے انداز نے فلم دیکھنے والوں کے دل جیت لیے۔ ”یا ہو“ ہر نوجوان لڑکے اور لڑکی کی زبان پر تھا۔ یہ ہندوستان میں فلمی گانوں اور انہیں فلماں کا ایک انوکھا انداز تھا جو اس سے پہلے کسی ہیروئن نے پیش نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد یہی انداز نئی کپور کا ”فریڈ مارک“ بن گیا۔ فلم ”کشمیر کی کلی“ میں اس کے گانے ”دیوانہ ہوا بال“ نے کشمیر کے حسین مناظر کو نئی کپور کی اچھل کود اور رقص کے ساتھ دیکھا تو انہیں کشمیر کے حسن کا اندازہ ہوا۔

نئی کپور نے اپنے لیے اداکاری کا ایک نیا حلقہ پیدا کر لیا تھا جس میں وہ اپنے انداز میں اداکاری کرتا رہا اور دیکھنے والے جھومتے رہے۔ کامیڈی کا انداز اس کو قدرت سے ملا تھا۔ وہ بے ساختہ کامیڈی کرتا تھا۔ کشمیر کے لوگ نئی

کپور کے اور فلم دیکھنے والے کشمیر کے شیدائی ہوئے تو نئی کپور کے گانوں کی وجہ سے۔ اس فلم میں جیل ڈل، اس میں تیرتے ہوئے شکارے، پہاڑیوں پر تیرتے ہوئے بادلوں نے ایک نئی دنیا لوگوں کو دکھائی۔ نئی کپور میں یہ خوبی تھی کہ وہ جہاں بھی شوٹنگ کرتا تھا وہاں کے عام لوگوں میں گھل مل جاتا تھا۔ کشمیر کے باگروں اور شکارے والوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتا اور چائے پیتا تھا۔ اس عادت کی وجہ سے مقامی لوگ اس کے پرستار بن گئے۔

فلم ”بلف ماسٹر“ کا گانا گووند آلا رے آلا

بہمنی کی سڑکوں پر فلما یا گیا تھا چونکہ بہمنی کے مزدوروں کا ماحول دکھانا مقصود تھا۔ جب وہ سڑکوں پر رقص کرتا تو عمارتوں کی کھڑکیوں اور بالکونیوں سے لوگ اس پر پانی کی بالٹیاں پھینک کر ماحول کے حسن میں مزید اضافہ کر دیتے۔ یہ ایک ایسا گانا ہے جو پچاس ساٹھ سال گزر جانے کے بعد بھی ہندوؤں کے تہوار جنم اشٹمی کے موقع پر گھر گھر میں آج بھی گایا جاتا ہے۔

نئی کپور نے ہیرو کے رقص کا آغاز کیا۔ اس سے پہلے ہندوستانی فلموں کے ہیرو اس والہانہ انداز میں رقص نہیں کرتے تھے۔ اس نے رقص کی تربیت کسی سے حاصل نہیں کی تھی۔ موسیقی اور ردھم اس کے جسم میں رچا ہوا تھا۔ اس کے رقص کے لیے کسی ڈانس ڈائریکٹر کی ضرورت نہیں تھی۔ جوں ہی گانا شروع ہوتا، موسیقی اور ردھم کے مطابق نئی کپور رقصاں ہو جاتا۔ اس کے لیے وہ کسی ڈانس ڈائریکٹر کا محتاج نہ تھا۔

نئی کپور نے اپنے گانوں کی فلم بندی میں چھتری سے بھی بہت کام لیا۔ یہ چھتری گانے کے دوران۔۔۔ اس کے ہاتھ میں ایک میوزیکل انسٹرومنٹ یا بانسری کی حیثیت اختیار کر لیتی تھی۔ یہ بھی اس کا اپنا ایجاد کیا ہوا انداز تھا۔

نئی کپور کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ انڈیا کی فلمی دنیا کا پہلا ہیرو تھا جو باقاعدہ گہرا میک اپ کرتا تھا۔ ہونٹوں پر سرخ رنگ کی لپ اسٹک لگاتا تھا۔ حالانکہ وہ خوبصورت شکل اور رنگت کی وجہ سے میک اپ کا محتاج نہ تھا مگر ہر فلم میں وہ میک اپ زدہ چہرے کے ساتھ نظر آتا ہے جسے فلم بینوں کا ایک طبقہ پسند نہیں کرتا تھا مگر نوجوانوں کی اکثریت اس کی ان اداؤں کی دلدادہ تھی۔ نئی کپور اور ایکٹنگ بھی کرتا تھا مگر دیکھنے والوں کو اس کا یہ انداز بھی پسند تھا۔

نئی کپور کی پہلی شادی معروف اداکارہ گیتا بالی سے

ہوئی تھی۔ وہ خوش و خرم زندگی گزار رہے تھے مگر چنچک کے مرض میں مبتلا ہو کر گیتا بالی وفات پا گئی۔ اس کے بعد کافی عرصے تک نئی کپور نے دوسری شادی نہیں کی۔

پرتھوی راج خاندان میں حفظ مراتب اور بزرگوں کے احترام کا رواج ہے۔ پرتھوی راج کے سارے بیٹے اس کے سامنے نظریں جھکا کر کھڑے ہوتے تھے۔ راج کپور کے سبھی بھائی باپ کی طرح اس کی عزت کرتے اور اس کا حکم مانتے تھے۔ ششی کپور، ششی کپور سے چھوٹا ہے جس کو ششی کپور اپنے بیٹوں کی طرح سمجھتا تھا۔ شاشی اور اردولب ولجہ اس خاندان کی نمایاں خصوصیت رہی ہے۔

نئی کپور کے کئی گانے انتہائی مقبول ہوئے ہیں۔

مثلاً

لال چھتری..... (فلم جانور)

اور تم اور یہ سناں (دل دے کے دیکھو)

تم نے مجھے دیکھا (فلم تیسری منزل)

اشاروں اشاروں میں دل لینے والے (فلم کشمیر کی کلی)

احسان ترا ہو گا مجھ پر..... (فلم جنگلی) سائرہ بانو کے

ساتھ)

کلی پلک میں جھونکا غصہ (فلم پرنس) وحشی مالا کے

ساتھ)

یوں تو ہم نے لاکھ حسین دیکھے ہیں

تم سائیں دیکھا..... (فلم تم سائیں دیکھا)

حقیقت یہ ہے کہ فلم رائٹرز، ہدایت کاروں اور

موسیقاروں نے اس کے انداز اور شخصیت کو دیکھ کر کہا نیوں

اور گانوں کا انتخاب کیا اور یہ تجربہ بے حد کامیاب رہا۔ یہ بھی

سچ ہے کہ نئے نوجوان اور جوان اس کے ہر انداز کے دیوانے

تھے۔

فلم ”جنگلی“ میں اس کا ایک اور نعرہ بے حد مقبول ہوا

تھا۔

ایا ایا سکوسکو

یہ بے معنی الفاظ تھے مگر نئی کپور کے رقص اور گانے کی

نفسی نے اس کو سپر ہٹ بنا دیا تھا۔

نئی کپور نے وقت گزرنے کے بعد درمیانہ عمر اور

بوڑھے کردار بھی کیے۔ مثلاً اس کو راجت میں ملا تھا۔ درمیانی

عمر میں ہی وہ موٹا ہونے لگا تھا مگر اپنی فلموں میں اس نے

مٹاپے کا بھی فائدہ اٹھایا۔ آخری دنوں میں وہ بے حد موٹا

ہو چکا تھا اور مختلف بیماریوں میں مبتلا تھا۔ ایک ایوارڈ کی تقریب میں وہ وہیل چیئر پر بیٹھ کر آیا تو اس کی جوانی دیکھنے والوں کی آنکھیں پریم ہو گئیں۔ کچھ عرصے بعد ہی اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کی آخری فلم ”راک اسٹار“ تھی۔ اس کے بعد صحت نے ساتھ نہ دیا اور اس نے اداکاری ترک کر دی تھی۔

وہ ایک نیا مخصوص انداز لے کر فلموں میں آیا تھا۔ بعد میں آنے والے ہیروؤں کے لیے رقص ضروری ہو گیا تھا لیکن نئی کپور جیسا والہانہ انداز کوئی نہ اپنا سکا۔ نئی کپور پہلا انڈین ہیرو تھا جس نے رقص کو اپنی اداکاری کا ایک لازمی حصہ بنالیا تھا۔

راج کپور اب دنیا میں نہیں رہے۔ نئی کپور بھی رخصت ہو گئے۔ ششی کپور بھی آج کل (ستمبر 2011ء) میں شدید بیمار ہیں۔ لیکن ان کی آنے والی نسلوں نے ہالی ووڈ کو جھکا رکھا ہے۔ ششی کپور، کرشمہ کپور، کرینہ کپور اور اس کے بعد اب رنبیر کپور اس چراغ کو روشن رکھے ہوئے ہیں جسے پرتھوی راج کپور نے جلایا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر یہ خاندان نہ ہوتا تو بھارتی فلمی صنعت بہت بڑے خزانے سے محروم رہ جاتی۔

☆☆☆

وقت بھی کس تیزی سے گزرتا ہے۔ کل کی بات معلوم ہوتی ہے۔ جب ایک نوجوان اور نوجوان شاعر کراچی سے لاہور آیا اور فلمی موسیقی میں بہت جلد نعرہ نگار کی حیثیت سے نامور نعرہ نگاروں کی موجودگی کے باوجود نمایاں ہو گیا۔

یہ تسلیم فاضلی تھے۔ 17 اگست 2011ء کو ان کی وفات کو 29 برس گزر گئے۔ اسی تاریخ کو 1982ء میں وہ جوانی ہی میں ہارت ٹیل ہو جانے کی وجہ سے اچانک انتقال کر گئے تھے۔

جب تسلیم فاضلی نعرہ نگار کی حیثیت سے پاکستان کی فلمی دنیا میں داخل ہوئے اس وقت تنویر نقوی، سیف الدین سیف، قتیل شفائی، منیر نیازی، حبیب جالب، مسرور انور، خواجہ پرویز، حمایت علی شاعر جیسے نعرہ نگاروں کی حکومت تھی لیکن تسلیم فاضلی آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے فلمی دنیا میں اپنی جگہ بنالی۔ آغاز میں نا شاد نے انہیں موقع دیا پھر وہ اپنی ملاصورتوں کی بنا پر مسلسل آگے بڑھتے رہے۔ انہوں نے بہت سی گولڈن جوبلی اور سلور جوبلی فلموں کے یادگار گانے لکھے ہیں۔

نغمہ نگاری کا آغاز انہوں نے ہدایت کار سید شوکت حسین رضوی کی فلم ”عاشق“ سے کیا تھا۔ اس کے بعد ان کی مقبولیت میں روز بہ روز اضافہ ہوتا رہا۔ انہوں نے متعدد فلموں میں یادگار اور ناقابل فراموش گیت لکھے ہیں۔ فلم ساز و ہدایت کار اقبال یوسف کی فلم ”تم ملے پیار ملا“ اپنے نغمات اور موسیقی کے اعتبار سے ایک نہ بھولنے والی فلم ہے جس کے موسیقار ناشاد تھے۔ یہ دو گانے شاید آپ کو آج بھی یاد ہوں گے۔

آپ کو بھول جائیں ہم اتنے تو بے وفائیں..... (گلوکار مہدی حسن، ملکہ ترنم نور جہاں)

اپنے پہلو میں مرے دل کو چل جانے دو (گلوکار نور جہاں، منیر حسین) تسلیم فاضلی نے بہت جلد نغمہ نگاری کی حیثیت سے اپنی جگہ بنائی تھی حالانکہ وہ غالباً اس وقت سب سے نو عمر نغمہ نگار تھے۔

تسلیم فاضلی کا تعلق ایک شاعرانہ خاندان سے تھا۔ ان کے والد دعا دبا نیوی ایک معروف شاعر تھے۔ ان کے دو اور بھائی بھی مشہور شاعر تھے۔ ان کے نغمات سے آراستہ پہلی فلم ”عاشق“ میں ان کے دو گانے بہت مشہور ہوئے تھے۔

مہدی حسن کا گایا ہوا یہ گانا اے گل نو بہار جھوم، اے دل بے قرار رو اور رونا لیلیٰ کا گایا ہوا گانا لگا ہوں میں سما جانے کے دن ہیں بہت مقبول گانے تھے۔

انہوں نے آغاز ہی بہت اچھا کیا تھا اس لیے فلم ساز اور ہدایت کار ان کی طرف متوجہ ہو گئے اور انہوں نے بہت سی فلموں کے لیے گانے تحریر کیے جو بے حد مقبول بھی ہوئے۔ انہوں نے قریب قریب سبھی موسیقاروں کے لیے گانے لکھے۔ وہ غزل، گیت اور نغمات بہت ہنرمندی سے لکھتے تھے۔ موسیقار کی بنائی ہوئی دھن ہو تو بھی انہیں کوئی مشکل پیش نہیں آتی تھی۔ وہ بہت ذہین اور زود نویس تھے فلم ”آئینہ“ میں ان کے نغمات بہت مقبول ہوئے، خصوصاً یہ گانا مجھے دل سے نہ بھلاتا

چاہے رو کے یہ زمانہ اس فلم کے موسیقار روبن گھوش تھے۔ اس کے بعد روبن گھوش کی دھنوں میں انہوں نے فلم ”بندش“ کے لیے بھی

نغمات لکھے تھے۔

تجھے دل سے لگا ہوں
پلکوں میں چھپا ہوں
اور فلم ”آئینہ“ کا لکھا ہوا گیت
تیرا سودنیا میں کچھ بھی نہیں
میرے صنم، میرے صنم

ان تینوں نغمات پر انہیں بہترین نغمہ نگار کی حیثیت سے نگار ایوارڈ دیے گئے تھے۔

اقبال یوسف کی فلم ”تم ملے پیار ملا“ کی موسیقی بے حد مقبول ہوئی تھی جس کے موسیقار ناشاد تھے۔ اس فلم میں ان کے دو گانے آج بھی بھلائے نہیں گئے۔

آپ کو بھول جائیں ہم اتنے تو بے وفائیں

یہ گانا مہدی حسن اور میڈم نور جہاں کی آوازوں میں الگ الگ ریکارڈ کیا گیا تھا۔ دوسرا گانا اپنے پہلو میں مرے دل کو چل جانے دو میڈم نور جہاں اور منیر حسین کی آوازوں میں صدابند کیا گیا تھا۔

ان کے چند معروف اور مقبول گانے یہ ہیں۔
سنا ہے چاند پر انسان رہیں گے
وہیں ہم تم اوجان جاں رہیں گے
اس فلم کے موسیقار ناشاد تھے۔ یہ مالا اور احمد رشدی کی آوازوں میں ریکارڈ کیا گیا تھا۔

مٹی ہے آج زمانے کی ہر خوشی مجھ کو
یہ کس مقام پہ لے آئی زندگی مجھ کو
موسیقار ناشاد، فلم ”افشاں“ گلوکار احمد رشدی اور نگہت سہا۔

فلم ”یادیں“ کا یہ نغمہ آج بھی روز اول کی طرح مقبول ہے۔

مجھ سا تجھ کو چاہنے والا
اس دنیا میں کوئی اور ہو
اللہ نہ کرے، جی اللہ نہ کرے

یہ گانا میڈم نور جہاں اور رجب علی کی آوازوں میں موسیقار ناشاد نے صدابند کیا تھا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ گانا رجب علی کا پہلا گانا ہے جو انہوں نے فلموں کے لیے گایا تھا۔

فلم تیری صورت میری آنکھیں، تسلیم فاضلی کا لکھا ہوا

یہ گانا مالا اور احمد رشدی نے گایا تھا، ناشاد اس کے موسیقار تھے۔

میرے سینے پر سر رکھ دو
مرے دل میں سما جاؤ
یہ گانا اقبال یوسف کی فلم ”مل اسٹیشن“ میں مالا اور شرقی پاکستان کے گلوکار بشیر احمد نے گایا تھا۔ موسیقار ناشاد تھے۔

فلم ”آریار“ میں میڈم نور جہاں اور رجب علی کی آوازوں میں تسلیم فاضلی کا یہ نغمہ بہت مقبول ہوا تھا۔

کیوں نہ تجھے پیار کروں
کیوں نہ کروں پیار
تسلیم فاضلی کے لکھے ہوئے کچھ مقبول گانے ذیل میں پیش کیے جا رہے ہیں۔

1۔ جانے سے پہلے اتنا بتا دو
کہ پھر کب ملو گے کہاں پر ملو گے
فلم ”پودے میں رہنے دو“ موسیقار ایم اشرف، گلوکارہ نیرہ نور، مسعود رانا۔

2۔ شباب کیرانوی کی فلم ”دامن اور چنگاری“ بہت کامیاب فلم تھی۔ اس فلم کا یہ گانا آج بھی مقبول ہے۔
یہ وعدہ کرو کہ محبت کریں گے
سدا ایک دو بچے کے دل میں رہیں گے
اس فلم کے موسیقار ایم اشرف تھے۔

3۔ فلم ”پیار ہی پیار“ موسیقار ثار بزی، گلوکارہ، نیرہ نور اور شازیہ۔

یہ دن بچپن کے ساتھ جیون بھر یاد آئیں گے
4۔ بن تیرے رات تو کیا ہم سے کئے دن بھی نہیں
فلم ”آبرو“ موسیقار ناشاد، گلوکارہ میڈم نور جہاں اور زاہدہ پروین۔

5۔ تیری قسم تیرے سر کی قسم
کچھ بھی ہو پیار دل سے ہو گانہ کم
فلم ”زینت“ موسیقار ناشاد، گلوکار رجب علی اور مہناز۔

6۔ ایسا نہ ہو لوگ تیرے میرے پیار سے جل جائیں
فلم ”معاشرہ“ موسیقار اے حمید، گلوکار عمران علی ناشاد اور ناہید اختر۔

7۔ شباب کیرانوی کی سپر ہٹ فلم ”میرا نام ہے محبت“ کے تمام نغمات تسلیم فاضلی نے لکھے تھے۔

اس فلم کا یہ یادگار نغمہ آج بھی دلوں کو گرماتا ہے۔

یہ دنیا ہے نہ رہے میرے ہدم
کہانی محبت کی زندہ رہے گی
8۔ فلم ”اسک“ کے لیے تسلیم فاضلی نے تمام گانے لکھے تھے جو بہت مقبول ہوئے تھے۔ اس کے موسیقار ایم اشرف تھے۔

تیرے ہونٹوں کی لالی چڑالوں تو
تجھے اپنی دلہنیا بنالوں تو
نیرہ نور اور احمد رشدی کی آوازوں میں یہ گانا صدابند کیا گیا تھا۔

9۔ زندگی بھریوں ہی اقرار کیے جائیں گے
فلم ”پالکی“ موسیقار ناشاد، گلوکار مہناز، رجب علی
1976ء اس لحاظ سے تسلیم فاضلی کے لیے مبارک سال تھا کہ اس سال بیشتر فلموں کے نغمات محبت اور مہنگائی، دیکھا جائے گا، انسانیت، مجھے گلے لگاؤ، جیو اور جینے دو، شائد، گونج، دھڑکن، پھول اور شعلے، شہنائی وغیرہ شامل ہیں۔ چند مقبول گانے پیش ہیں۔

نیل گنگن کو گواہ بنا کے آج یہ فیصلہ کرنا ہوگا
فلم ”دیوار“ موسیقار ایم اشرف، گلوکار غلام عباس، ناہید اختر۔

ہوا کہتی تھی دل نہیں دوں گی
کبھی وفا کا نام نہ لوں گی
کہ چوری تیری پکڑی گئی
فلم راجا رانی، موسیقار امجد بولی، گلوکار ناہید اختر، احمد رشدی۔

پیار کا وعدہ ایسے نبھائیں
کوئی جدا کرنے نہ پائے
فلم ”آج اور کل“ موسیقار خلیل احمد، گلوکار، مہدی حسن، مہناز۔

من لے قریب آ کے تو مرا فیصلہ
تم میری زندگی ہو
فلم ”موم کی گڑیا“ موسیقار ثار بزی، گلوکار عالمگیر، مہناز۔

منے تم اک کام کرو
اپنی امی جی کو رام کرو
فلم ”آگ اور آنسو“ موسیقی ثار بزی، گلوکار غلام عباس، مہناز۔

لٹ گیا دل کا چین ہمارا
راتوں کا آرام

دھت تیرے کی پیاساڑی کر گیا نیند حرام
قلم ”دیکھا جائے گا“ موسیقار ایم اشرف،
گلوکار احمد رشدی، رجب علی،
چلو اک فیصلہ کر لیں
شریک زندگی بن جائیں
دامن پیار سے بھر لیں
قلم ”محبت اور مہنگائی“ موسیقار کمال احمد، گلوکار
ناہید اختر، اخلاق احمد۔

یوں تو ہر شخص نے دنیا میں محبت کی ہے
قلم ”سازش“ موسیقار کمال احمد، گلوکار نور جہاں،
غلام عباس۔
پیار کریں گے ہر ٹپل
کل سے زیادہ آج کریں گے
آج سے زیادہ کل
قلم ”جیو اور جینے دو“ موسیقار روبن گھوش، گلوکار
مہدی حسن، مہناز۔

لو آئیں بہاریں آیا سماں سہانا
قلم ”دو آنسو“ موسیقار نذیر علی، گلوکار مہدی حسن،
مہناز۔
ایسے ملیں کہ پھر نہ جدا ہوں
دنیا ہے نہ رہے
قلم ”گوج اٹھی شہنائی“ موسیقار ایم اشرف، گلوکار
ناہید اختر، رجب علی۔

1977ء میں بھی انہوں نے درجنوں فلموں کے گیت
لکھے۔ ان میں قابل ذکر یہ ہیں۔
پرستش، بی بی، آ منا سامنا، آف یہ بیویاں، گوراکالا،
عشق عشق، عاشی، سنگم، میرے حضور، سلاخیں، پیار کا وعدہ،
قتل کے بعد، آئینہ، بلیک کیٹ، انسان، جوانی دیوانی،
سار جنت۔
قلم ”آئینہ“ جس کے ہدایت کار نذر الاسلام تھے۔
اس کا یہ نقد بہت مقبول ہوا تھا۔
مجھے دل سے نہ بھلانا

چاہے رو کے یہ زمانہ
تیرے بنے انجیون
کچھ نہیں

اس فلم کے موسیقار روبن گھوش تھے۔ گلوکار مہناز،
مہدی حسن، بی بی گانا، گلوکار اور مہناز کی آوازوں میں بھی پیش
کیا گیا تھا۔

نیلے آسمان پر کیا ہے بوجھ تو حائیں
قلم سنگم، موسیقار کمال احمد، گلوکار نیرہ نور، اخلاق
احمد۔
یوں ہی ہم سفر بن کے چلتے رہیں ہم
نہ بدلیں بھی دن بدلتے رہیں
قلم ”سلاخیں“ موسیقار کمال احمد، گلوکار اسے نیرہ،
مہناز۔

تسلیم فاضلی نے بے شمار بہت اچھے نعماں لکھے۔ وہ
جس زمانے میں کراچی سے لاہور آئے تھے اس وقت بڑے
بڑے نقد نگاروں کا سکہ چلتا تھا۔ یہ سیف الدین سیف، فہیل
شفا کی، ریاض الرحمن، ساغر، مسرور انور، خواجہ پرویز
تنویر نقوی، حجاز قادری، سرور بارہ بنگوی، وغیرہ کا دور تھا۔
ان کے ہوتے ہوئے اپنے لیے جگہ بنانا اور نام پیدا کرنا ایک
مشکل کام تھا مگر خدا داد صلاحیتوں اور لگن کے باعث انہوں
نے بہت کامیابی حاصل کی۔

تسلیم فاضلی نے فلمی دنیا میں صرف چودہ سال
گزارے۔ ان کے لکھے ہوئے نعماں کی تعداد بہت زیادہ
ہے۔ وہ بہت تیزی سے جلدی جلدی بولتے تھے۔ گانے بھی
بہت کم وقت میں لکھ دیتے تھے۔
تسلیم فاضلی نے اداکارہ نشو سے شادی کی تھی۔ اس
شادی کے نتیجے میں ایک بیٹی پیدا ہوئی تھی۔ صاحبہ اس سے
پہلے موجود تھیں۔ نشو سے شادی تسلیم فاضلی کو اس نہیں آئی۔
شادی کے بعد چند سال ہی میں وہ اچانک ہارٹ حمل ہونے
کی وجہ سے انتقال کر گئے۔ 17 اگست 1982ء کو کراچی میں
اچانک ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی وفات کے بعد 1983ء
میں فلم ”دلہیز“ ریلیز ہوئی تھی جس کے گانے بہت پسند کیے
گئے اور مرنے کے بعد ان کی یادیں تازہ ہو گئیں۔

تسلیم فاضلی بے حد بااخلاق اور وضع دار انسان تھے۔
حفظ مراتب کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔ انتہائی حلیم اور صلہ پسند
تھے۔ کبھی کسی اسے ان کا جھگڑا نہیں ہوا۔ ہمیشہ نرم اور پختہ
آواز میں بولتے تھے۔ ہر ایک سے ان کے بہت اچھے
تعلقات تھے۔ انہوں نے بھی کسی سے نفی نہ کھوانے کی
خواہش ظاہر نہیں کی۔ اس قدر شریف النفس آدمی تھے کہ
معاوضہ ملے کرتے وقت ان کی آنکھیں جھک جاتی تھیں اور

کہتے تھے۔ جو آپ کا بھٹ ہو اس کے مطابق دے دیں۔ فلم
ساز پیسے یا چیک دیتا، اس کو دیکھے بغیر جیب میں ڈال لیتے
تھے اور ایسے شرمسار نظر آتے تھے جیسے کوئی غلطی سرزد ہوئی
ہو۔

فلمی دنیا میں سب سے پہلے ہمیں ”انگل“ انہوں نے
ہی کہا تھا اور پھر ہمیشہ نام سے مخاطب کرنے کے بجائے انگل
ہی کہا کرتے تھے۔ انہیں فلمی صنعت سے روشناس کرانے کا
سہرا موسیقار ناشاد کے سر ہے مگر ناشاد نے ابتدائی دنوں کے
علاوہ کبھی کسی فلم ساز سے فرمائش نہیں کی کہ تسلیم فاضلی سے
گیت لکھواؤ۔

کرتا اور چوڑے پانچوں کا علی گڑھ کٹ پا جامہ عموماً
ان کا لباس ہوتا تھا۔ جائزوں میں گرم چادر یا شال اوڑھ لیا
کرتے تھے۔ انہیں پتلون، ٹیئس یا سوٹ میں ملہوس ہم نے
شاید کبھی نہیں دیکھا۔ وہ تیز بات کرنے کے عادی تھے جس
کی وجہ سے کئی بار ان کی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی اور ”مکرر
فرمائیے“ کہنا پڑتا تھا۔

وفات کے وقت ان کی عمر صرف 35 سال تھی۔ اگست
2011ء کو ان کی 29 ویں برسی تھی۔ بعض لوگوں کو ہر کام کی
جلدی ہوتی ہے۔ جھٹ پٹ جو کچھ کرنا ہو کر کے کم عمری میں
ہی دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ تسلیم فاضلی بھی انہی
لوگوں میں شامل ہیں۔

ہماری کئی فلموں کے نعماں انہوں نے لکھے تھے۔ گانا
لکھنا ان کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ دھن سن کر یا گانے کی
پچویشن سن کر اتنی جلدی گانا لکھ دیا کرتے تھے کہ یقین نہیں آتا
تھا۔

ایک لحاظ سے وہ خاندانی شاعر تھے۔ انڈیا میں ان
کے والد ایک معروف شاعر تھے۔ ان کے بڑے بھائی ندا
فاضلی بھی ہندوستان کے ممتاز شعرا میں شمار کیے جاتے تھے۔
شاعری کے رموز سے پوری طرح آشنا تھے مگر انہوں نے فلمی
شاعری کے علاوہ انہوں نے بھی ادبی شاعری کی طرف توجہ
نہیں دی۔

ہماری فلم ”آبرو“ کے نعماں انہوں نے ہی لکھے
تھے۔ اس فلم میں شبنم نے ڈیہر اکروار ادا کیا ہے۔ ایک لڑکی
کسی غریب گھر میں لڑکا بن کر پکی ہے اور دوسری نے اپنے چچا
کے گھر میں ناز و نعم سے پرورش پائی ہے۔ ایک پچویشن پر فلم
کے ہیرو کی فرمائش پر وہ ایک گانا گاتی ہے۔ ہیرو (محمد علی)
اس بات سے لاعلم ہے کہ وہ ان سے چپکے چپکے محبت بھی کرتی

ہے حالانکہ ان کی ملاقات بہت کم ہوتی ہے۔
اس پچویشن کے لیے انہوں نے ایک کھڑا لکھا۔
بن ترے رات تو کیا ہم سے کئے دن بھی نہیں

پچویشن کے مطابق یہ ایک موزوں کھڑا تھا۔ اس گانے
کو وہ غزل کے انداز میں لکھنا چاہتے تھے۔ ناشاد صاحب کو
کھڑا ایسا پسند آیا کہ انہوں نے اس کی دھن ہی بنائی حالانکہ
پورا مصرع بھی نہیں لکھا گیا تھا۔

ہمیں سنایا تو ہم کو بھی پسند آیا مگر ہم نے کہا کہ فاضلی
مصرع تو بہت برکت ہے مگر اس کے قافیے، ردیف تلاش کرنا
مشکل ہو گا اس لیے بہتر ہے کہ کوئی اور کھڑا سوچو۔
کہنے لگے ”انگل“ آپ اس کی فکر نہ کیجئے۔ کل آپ کو
پورا گانا لکھ کر سنا دوں گا۔“

اور ایسا ہی ہوا۔ دوسرے دن ناشاد صاحب کو پورا گانا
سنایا۔ یہ ایک مشکل بحر ہے اور ”دن بھی نہیں“ کے ہم قافیہ
الفاظ منتخب کرنا آسان نہ تھا مگر تسلیم فاضلی نے یہ مشکل کام
چند گھنٹوں میں مکمل کر لیا۔

کسی موت کو بے وقت کہنا درست نہیں ہے کیونکہ اللہ
تعالیٰ نے جو وقت مقرر کیا ہے موت کا فرشتہ اسی وقت روح
قبض کرتا ہے لیکن ”بے وقت“ ان معنوں میں استعمال کرنا
درست ہے کہ ابھی مرنے کی عمر نہ تھی مگر وفات پا گئے۔
تسلیم فاضلی کے بارے میں بھی یہ کہنا درست ہے۔
بد قسمتی سے آج انہیں بھلا دیا گیا ہے۔ مگر کیا خوب آدمی تھا،
اللہ مغفرت کرے۔

☆☆☆

ہومیو ڈاکٹر عبدالسلام شیخ کا تذکرہ مختلف حوالوں سے
پہلے بھی کئی بار ہو چکا ہے۔ کئی سال سے ان کی تمام تردیجی
اور مصروفیت صرف ”علاج“ تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ یوں
محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کسی ”مشق“ پر ہیں۔ غیر ملکی مشنری
اپنے ملکوں کو چھوڑ کر ملکوں ملکوں گھومتے پھرتے ہیں لیکن ڈاکٹر
عبدالسلام شیخ نے خود اپنے ملک میں رہ کر سب سے قطع تعلق
کر کے خود کو صرف مریضوں کی خدمت کے لیے وقف کر لیا
تھا۔ گزشتہ کئی سال سے ان کے روزانہ کام کرنے کے اوقات
یہ تھے۔

”صبح سات بجے سے دن کو دس یا گیارہ بجے تک۔“
اس کے بعد وہ ایک ہومیو پیتھک ادارے میں
پڑھانے کے لیے جاتے تھے۔
واپس آ کر زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹا آرام کرنے کے

بعد تین بجے پھر اپنے مطب میں آ کر بیٹھتے تو رات کو نو دس بجے تک آخری مریض کو دیکھ کر اور دوائی دے کر ہی اُٹھتے تھے۔

یہ نہ سمجھتے کہ اتنا زیادہ کام کر کے وہ لاکھوں کماتے تھے۔ انہوں نے اس مہنگائی کے زمانے میں بھی ایک اصول وضع کر رکھا تھا۔ ایک دن کی دوائی کے لیے (مع مشورہ) صرف پانچ روپے جس کے بارے میں معلوم ہوتا کہ سادات سے تعلق رکھتا ہے اس سے ایک پیسا بھی وصول کرنا گناہ سمجھتے تھے۔ ضرورت مند اور غریبوں کو مفت دوائیں دیتے۔ کم حیثیت لوگوں سے نصف رقم وصول کرتے یعنی ایک دن کی دوائی ڈھائی روپے میں۔ اتنا سستا اور بہترین علاج اور کس جگہ میسر ہے؟

ڈاکٹر صاحب مسلم ٹاؤن میں پرانی خاندانی کوٹھی میں رہتے تھے۔ یہیں پلے بڑھے اور تعلیم حاصل کی۔ اسی کوٹھی کے برآمدے کو انہوں نے اپنا کلینک بنالیا تھا۔ سامنے ایک کشادہ جگہ خواتین مریضوں کے لیے مخصوص تھی۔ مرد حضرات کے لیے باہر لان میں کرسیاں موجود تھیں۔ گرمی کے موسم میں سبز کپڑے کی عارضی چھت اور ایک بڑا پیدل مشین بھی فراہم کر دیا جاتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب پر مریض پروانوں کی طرح ٹوٹے پڑتے تھے۔ دور اور نزدیک کے بے شمار مریض ہر روز اس شفا خانے میں نظر آتے تھے۔ مریضوں کو ترتیب کے ساتھ دیکھا جاتا تھا۔ اس مقصد کے لیے ایک خاتون بڑا سار جٹر لیے کلینک کے باہر ایک میز پر بیٹھی ہوتی تھیں۔ مریض سے وہ اس کا احوال سن کر رجسٹر میں درج بھی کر لیتی تھیں۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب کے پاس جب مریض پہنچے تو انہیں طویل سوال جواب نہ کرنا پڑے۔ شکایات پڑھ کر اگر مناسب سمجھتے تو وہ مزید کچھ سوالات کرتے اور پھر وہ دوائی لکھ کر اپنی میز پر کاغذ رکھ لیتے۔ اس کے بعد دوسرا مریض اس جگہ اپنے نمبر کے مطابق آ کر بیٹھ جاتا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ایک خاتون اندر آ کر ترتیب سے رکھے ہوئے نسخے اُٹھا کر لے جاتیں۔ اندر کلینک میں تین خواتین مسلسل دوائیاں بنانے میں مصروف رہتی تھیں۔ جیسے ہی کسی مریض کی دوائی تیار ہوتی ایک خاتون باہر نمودار ہو کر ان کا نام پکارتیں۔ دوائی اس کے حوالے کر تیں اور پیسے وصول کر کے واپس چلی جاتیں۔ یہ سلسلہ ایک خود کار مشین کی طرح صبح سے رات گئے تک جاری رہتا تھا۔

بیرونی دروازے پر ایک چوکیدار متعین تھا جو مریضوں کے لیے بند دروازہ کھولتا تھا۔ ایک مقررہ وقت کے بعد یہ دروازہ کھلتا تھا کیونکہ اگر مقررہ وقت کے بعد بھی مریض آتے رہیں تو ڈاکٹر صاحب کو تمام رات کلینک میں بیٹھنا پڑتا۔

ایسا نہیں ہے کہ ڈاکٹر صاحب تعلقات کے پیش نظر باری کے بغیر کسی کو بھی نہیں دیکھتے تھے۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ مثلاً ہمیں دیکھتے ہی ان کا اسٹاف ڈاکٹر صاحب کو ہماری آمد کی خبر دیتا یا خود ان کی ہم پر نظر پڑ جاتی تو وہ اسٹاف سے کسی رکن کو اشارہ کرتے جو ہمیں لے جا کر ڈرائنگ روم میں بٹھا دیتا۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر صاحب بھی کسی بہانے سے اُٹھ کر ڈرائنگ روم میں آ جاتے۔ ٹلیک سلیک کے بعد باری کا احوال سننے۔ ایک دو لطیفے سننے اور سناتے اور پھر اُٹھ کر چلے جاتے۔ دوائی کچھ دیر بعد ہمیں ڈرائنگ روم ہی میں مل جاتی تھی لیکن رخصت ہوتے وقت یہ ممکن ہی نہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب کرسی سے اُٹھ کر ہمیں بیرونی دروازے تک چھوڑنے نہ آئیں۔ ہم بہتیرا کہتے کہ کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔ جواب میں وہ کہتے کہ شرمندہ تو وہ ہوں گے اگر باہر تک ہمیں رخصت کرنے نہ آئیں۔

ہمارا خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحب مسلسل کام کی تحکیم اُتارنے کے لیے بھی ایسا کرتے تھے۔ کلینک سے بیرونی دروازے تک پہنچتے تک وہ کسی جگہ رک کر ایک دو لطیفے ضرور سناتے اور سننے اور تازہ دم ہو کر دوبارہ مریضوں کی بھیڑ میں گم ہو جاتے۔

ڈاکٹر صاحب کا بیشتر خیرچہ ادویات اور عملے پر ہوتا تھا۔ خود ان کی زندگی بہت سادہ تھی۔ اپنے کلینک کے چھوٹے سے کونے میں وہ بارہ مہینے سردی گرمی اور برسات میں بیٹھے رہتے تھے۔ سخت گرمی اور جس کے باوجود اے سی کا کوئی بندوبست نہ تھا صرف ایک چھت کا پنکھا ہوا دینے کے لیے حاضر رہتا تھا۔ کتنی ہی شدید گرمی اور جس کیوں نہ ہو، مریضوں کا دم گھٹ رہا ہو۔ وہ پسینے میں نہا رہے ہوں، ڈاکٹر صاحب بھی ان کے ساتھ اسی حال میں موجود رہتے۔ مریض تو آتے جاتے رہتے یا تازہ ہوا کھانے کے لیے باہر لان میں چلے جاتے مگر ڈاکٹر صاحب بدستور اپنے مورچے پر جے رہتے۔ وہ موسموں سے بے نیاز تھے۔ نہ گرمیوں میں اے سی اور نہ سردیوں میں ہیٹر۔ وہ جس حال میں خود رہتے، اسی میں مریضوں کو بھی رہنا پڑتا تھا۔ شدید گرمی میں تو اس کلینک میں

ہارمٹ بیٹھنے سے بھی سرچکرا نے لگتا تھا مگر ڈاکٹر صاحب "موسم پروف" تھے۔ ان کی زبان سے کبھی نہیں سنا کہ آج گرمی اور جس زیادہ ہے یا سردی بہت زیادہ ہے۔

اس قدر طویل نشست کے باوجود ڈاکٹر صاحب بروقت تروتازہ، شگفتہ اور ہنستے ہنساتے ہی نظر آتے تھے۔ موقع بہ موقع وہ مریضوں کو حسب حال لطیفہ بھی سنا دیا کرتے تھے جس کی وجہ سے مریضوں میں ایک نیا حوصلہ اور جذبہ پیدا ہو جاتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اتنی ادنیٰ آواز میں لطیفے سناتے تھے کہ دوسرے تمام مختصر مریض بھی ان سے لطف اندوز ہوتے رہتے تھے۔ اسی طرح ان کی آدمی بیماری تو لطیفہ بازی سے ختم ہو جاتی تھی۔ باقی آدمی بیماری کے لیے وہ دوائیاں دے دیا کرتے تھے۔

ایک بار شدید گرمی کے موسم میں لہجی نے کہا "ڈاکٹر صاحب! اتنی تجویزی کیوں کرتے ہیں۔ اپنے اور مریضوں کے لیے ایک اے سی تو لگوا لیں۔"

وہ ہنستے اور کہتے "نہیں، اگر اے سی کے لیے پاؤں پھیلاؤں تو اور کا جسم نہیں ڈھانپ سکوں گا۔ جسم ڈھانکوں تو ہارنگے رہیں گے۔ بجلی، دوائیوں اور اسٹاف کے اخراجات دن اور پھر میری اور میرے گھر والوں کی بہت سی ضرورتیں ہیں۔"

ایک بار ہم نے انہیں مشورہ دیا "ڈاکٹر صاحب، دنیا بدل گئی یہاں تک کہ بانا کے جوتوں کے ریٹ بھی بدل گئے مگر آپ کی دوائی کی قیمت نہیں بڑھی۔ اگر آپ فیس دو گنی کر دیں پھر بھی مریضوں کے لیے تو علاج سستا ہی رہے گا۔ مگر کچھ سہولت ہو جائے گی۔"

ڈاکٹر صاحب عینک کے پیچھے شرارت سے مسکراتے اور لہجی سے کہتے "دیکھیے ہمیشہ، آپ کے سرتاج مجھے اُٹنی پٹی کا حار ہے ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب ہماری بیگم کو "ہمیشہ" کہا کرتے تھے۔ ہم نے کئی بار کہا کہ ڈاکٹر صاحب، یہ ٹیکنیکل طور پر غلط ہے۔ "ہمیشہ" تو وہ ہوتی ہے جس نے ایک ہی ماں کا دودھ پیا ہو۔ وہ کہتے "یہ دودھ کے رشتے دل کے رشتوں سے زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ جب انہیں ہمیشہ مان لیا تو بس یہ میری بات ہو گئیں۔"

ڈاکٹر صاحب کے پاس کار نہیں تھی۔ وہ موٹر سائیکل استعمال کرتے تھے۔ جب پڑھانے جاتے تب بھی اس سائیکل پر سردی گرمی، برسات سے انہیں کوئی فرق نہیں

پڑتا تھا۔

ایک بار ہمارا نواسہ سیف الدین ان کے پاس گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے بیماری کے بارے میں دریافت کرنے سے پہلے دو تین لطیفے سنا دیے۔ سیف کو بھی اپنی لطیفہ گوئی پر بہت تازہ ہے۔ اس نے بھی جواب میں ایک دو لطیفے انک انک کر سنا دیے۔

ڈاکٹر صاحب بہت خوش ہوئے، بولے "بیٹا، تم بہت اچھے مریض ہو۔ آ جایا کرو کبھی بھی۔"

اس نے کہا "ڈاکٹر صاحب، ٹھیک ہو گیا تو پھر کیوں آؤں گا؟"

بولے "بیٹے، لطیفے سننے کے لیے آ جانا۔ اس طرح تم بیمار نہیں پڑو گے۔"

ڈاکٹر عبدالسلام شیخ رات کو سونے سے پہلے کچھ وقت مطالعے کے لیے ضرور نکالتے تھے اور فلمی الف لیلہ خاص طور پر پڑھتے تھے۔ شاید اس لیے کہ فلموں سے تو نہیں مگر فلم والوں سے ان کا دیرینہ رشتہ تھا۔ وہ مسلم ٹاؤن کے اسی گھر میں پیدا ہوئے، یہیں بچپن گزرا۔ یہیں تعلیم حاصل کی۔ آس پاس سب فلم والے رہتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب فلمی صنعت کی "دانی" تھے۔ بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے ہر شخص کے خاندان تک سے واقف تھے۔ پہلے کون کہاں رہتا تھا، اس کے خاندانی اور گھریلو حالات کیسے تھے؟ کس جگہ کس چیز کی چھوٹی سی دکان تھی۔ دکان کا مالک کون تھا۔ مزاج کیسا تھا؟ کتنے پیچھے تھے، ان کی کیا عادتیں تھیں۔ ڈاکٹر صاحب سب جانتے تھے اسی لیے پرانے واقعات پڑھ کر لطف اندوز ہوتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کھلتے رنگ کے خوش شکل آدمی تھے۔ آنکھیں براؤن اور کسی اور رنگ کا آئینہ تھی۔ مسکراتے یا ہنستے تھے تو سارا ماحول جگمگا اُٹھتا۔ ڈاکٹر صاحب کی صحت بہت اچھی تھی۔ زندگی بھر انہوں نے کوئی دوائی نہیں کھائی مگر رنگ سیب کی طرح سرخ اور گلابی۔

ہم اکثر کہتے "ڈاکٹر صاحب، ہمیں بھی سدا بہار رہنے کی وہ دوا دیجئے جو آپ خود کھاتے ہیں۔"

کہتے "میں تو صرف ہوا کھاتا ہوں، دوائی نہیں کھاتا۔"

مگر ہمارا وزن بڑھانے کے لیے وہ اکثر دوائیں تجویز کرتے رہتے تھے۔

ان کے ڈاکٹر بننے کا واقعہ بھی عجیب ہے۔ انہوں نے

یکمشری میں ڈگری حاصل کی تھی۔ آسٹریلیا کی لیبارٹری میں کام کرتے تھے۔ بہت اچھی اور خوش و خرم زندگی تھی مگر بیگم گھیا کے مرض میں گرفتار ہوئیں تو ہر طرح کا علاج کرنے کے باوجود تندرست نہ ہو سکیں۔ ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہوا کہ ہومیو پیتھی میں اس کا علاج موجود ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ہومیو پیتھک کتابوں کا مطالعہ شروع کیا تو انہیں معلوم ہوا کہ اس میں تو ایک نئی دنیا آباد ہے جو ہر قسم کے مریضوں کو جینے کی امید اور شفا فراہم کرتی ہے۔

عبدالسلام شیخ نے فوراً ملازمت چھوڑ دی اور آسٹریلیا کی پرفضا سرزمین چھوڑ کر پاکستان کی راہ لی۔ یہاں آ کر انہوں نے اپنی بیگم کا ہومیو پیتھک علاج خود ہی شروع کر دیا اور اس کے ساتھ ہی ہومیو پیتھی کی تعلیم بھی حاصل کرنی شروع کر دی۔ اس طرح ان کی بیگم کے طفیل پاکستانیوں کو ایک بہت اچھا ہومیو پیتھک ڈاکٹر مل گیا جس نے اپنی طویل زندگی میں لاکھوں بیماروں کو صحت جیسی نعمت برائے نام قیمت پر فراہم کی اور آخری دم تک کرتے رہے۔

ڈاکٹر صاحب، قلمی الف لیلہ مستقل طور پر پڑھتے تھے اور یہی ہماری ان کی ملاقات کا بہانا بنی۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کے دنوں کو یاد کرتے اور بہت سی پرانی یادوں کو تازہ کرتے رہے اور ایسی ایسی داستانیں سناتے کہ ہم سن کر حیران رہ جاتے۔ ہم نے ان کی فرمائش کی تھی کہ وہ وقت نکال کر ہمیں ایک انٹرویو میں اپنے تاثرات اور معلومات سے بھی آگاہ کریں۔

ڈاکٹر مسکرا کر کہتے ”مریضوں سے فرصت ملے گی تو یہ ہو سکتا ہے۔“ مگر ہمیں معلوم تھا کہ انہیں مریضوں سے کبھی فرصت نہیں ملے گی۔ دراصل اب وہ اس درجے پر پہنچ چکے تھے جہاں انہیں مریضوں سے ”عشق“ ہو گیا تھا۔ ان کی خاطر انہوں نے سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ ان کے پاس نہ اپنے لیے وقت تھا، نہ گھر والوں کے لیے اور نہ ہی کسی تفریح کے لیے۔ ان کی واحد تفریح رات سونے سے پہلے مطالعہ اور مریضوں کو لپیٹے سنانا رہ گیا تھا۔

ڈاکٹر عبدالسلام شیخ کبھی چھٹی نہیں کرتے تھے۔ صرف اتوار کے دن وہ صبح سے دوپہر تک مریضوں کو دیکھنے کے بعد شام کو چھٹی کر لیا کرتے تھے۔ اس کے سوا ان کی زندگی میں چھٹی یا تفریح کا کوئی اور ذریعہ یا تصور نہ تھا۔

ڈاکٹر صاحب کہا کرتے تھے کہ ڈاکٹر ہائمن جس نے

ہومیو پیتھی طریقہ علاج دریافت کیا تھا، یقیناً جنتی تھا۔ اس کو دنیا میں کوئی اور کام کرنے کی فرصت ہی نہیں تھی تو پھر گناہ کیسے اور کس وقت کرتا؟ وہ چوبیس گھنٹے اپنے چند ساتھیوں کی مدد سے جڑی بوٹیاں تلاش کر کے ان کے خواص تلاش کرتا اور پھر انہیں ادویات میں تبدیل کر کے خود اپنے آپ پر اور اپنے چند سر پھرے ساتھیوں پر ابتدائی تجربات کر کے تصویق کرتا تھا کہ یہ دوا کی کن کن امراض کے لیے مفید ہے۔ ہومیو پیتھک طریقہ علاج سے ناواقف لوگ یہ جانتے ہی نہیں کہ ایک ہومیو پیتھک دوائی کتنے امراض کے لیے فائدہ مند ہے۔ صرف ایک ہی دوائی کے مختلف فوائد معلوم کرنا ہی ایک مشکل کام ہے مگر ہائمن نے تو سیکڑوں ادویات ایجاد کی تھیں۔ پھر یہ تجربے کیے کہ کون سی دوائی کس طاقت میں استعمال کرنا مفید ہوگا۔ یہ بھی ایک بہت مشکل کام ہے بلکہ ناممکن ہی سمجھتے۔ مثلاً ایک دوائی اگر 30 کی طاقت میں فائدہ نہیں دیتی اور وہی مریض کی دوائی ہے تو پھر اس کو 200 اور ایک ہزار یا CM کی طاقت میں استعمال کرانے کے بعد فائدہ ہو جائے گا۔

ہومیو پیتھی دوا نقل با یو یکمشری طریقہ علاج کی ترقی یافتہ شکل ہے اور ڈاکٹر ہائمن نے یہ تجربات بھی کیے کہ با یو یکمشری ادویات کی طاقت تبدیل کر کے انہیں ہومیو پیتھی طریقہ علاج میں استعمال کر کے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ با یو یکمشری کی ادویات (IX) سے شروع ہو کر (12x) کی طاقت پر ختم ہو جاتی ہیں۔ ڈاکٹر ہائمن نے ان ادویات کو بھی تجربات کے بعد ہومیو پیتھک طریقہ علاج میں شامل کر لیا تھا۔

با یو یکمشری طریقہ علاج کے بارے میں بتایا جا چکا ہے کہ اس کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ انسان کے جسم میں بارہ نمک ہوتے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک نمک بھی اگر کم یا زیادہ ہو جائے تو وہ بیمار ہو جاتا ہے۔ اگر اس نمک کی کمی پوری کر دی جائے تو مریض صحت یاب ہو جائے گا۔ اس طریقہ علاج سے کروڑوں انسان فیض یاب ہو چکے ہیں۔

ہومیو پیتھک طریقہ علاج کا احوال یہ ہی کہ اسے علاج بالمثل کہا جاتا ہے۔ جسم میں دو قسم کے جراثیم ہوتے ہیں۔ ایک صحت مند دوسرے بیمار۔ جب تک ان کا توازن برقرار رہتا ہے، انسان صحت مند رہتا ہے۔ کسی ایک جراثیم کی بیشی انسان کو بیمار کر دیتی ہے۔ اگر وہی جراثیم جسم میں پہنچا دیے جائیں جن کی کمی ہے تو پھر توازن برقرار ہو جائے گا۔

انسان تندرست ہو جائے گا۔ اس اصول پر ایلو پیتھک طریقہ علاج میں بھی استعمال کیا جاتا ہے مثلاً پیچک کے علاج کے لیے جو ویکسین استعمال کی جاتی ہے وہ اسی بیماری کے جراثیم سے بنائی جاتی ہے جو انسان کے جسم میں داخل کر دیے جاتے ہیں اور وہ تندرست ہو جاتا ہے۔ اس مختصر سے بیان سے آپ کو یہ معلوم ہو گیا ہوگا کہ ہومیو پیتھی کس قدر مشکل طریقہ علاج ہے۔ یہ ایلو پیتھک دواؤں کی طرح نہیں ہے کہ ہر مرض کی مخصوص دوائیاں مقرر ہیں۔ ہر ڈاکٹر وہی دوائیں تجویز کرتا ہے اور کیسٹ ڈیپارٹمنٹ یا آٹھا کر مریض کو دے دیتا ہے۔ اس آسان طریقہ علاج کی بدولت ہی کیسٹ بھی ڈاکٹر بن جاتے ہیں اور وہ بھی مریض کو وہی دوا دیتے ہیں جو آئیٹلٹس ڈاکٹر دیتے ہیں۔ اس کے برعکس ہومیو پیتھی میں ڈاکٹر کا وسیع مطالعہ، حافظہ، تجربہ اور سب سے بڑھ کر مریض کا اپنے مرض کے بارے میں بالکل درست بتانا بہت ضروری ہوتا ہے۔ اس کے بعد علاج میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ ایلو پیتھک طریقہ علاج میں جن امراض کا علاج ہی نہیں ہے، ہومیو پیتھی سے اس کا علاج کیا جاسکتا ہے۔ بے شمار ایسے واقعات خود ہمارے ساتھ، ہمارے اہل خانہ کے ساتھ اور ہمارے والدین کے ساتھ پیش آئے جن میں بڑے خطرناک امراض سے بھی نجات پائی گئی۔

یہ تذکرہ محض معلومات فراہم کرنے کی غرض سے کیا گیا ہے لیکن ڈاکٹر عبدالسلام شیخ کے ساتھ اس کا تذکرہ بہت ضروری تھا۔

ڈاکٹر عبدالسلام کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر مرض کا علاج پیدا کیا ہے۔ وہ بے شمار خطرناک امراض کا علاج کر چکے تھے۔ جس پر انہیں فخر تھا کہ ہومیو پیتھی طریقہ علاج کے ذریعے وہ بے شمار مریضوں کو صحت مند زندگی کی طرف لانا چکے تھے۔

ڈاکٹر عبدالسلام کبھی بیمار نہیں پڑے حالانکہ چوبیس گھنٹوں میں سے اٹھارہ انہیں گھنٹے اُن تھک مصروف رہتے تھے اور کرسی پر ہی بیٹھے رہتے تھے۔ سادہ خوراک کھاتے تھے۔ کوئی اور مشغلہ نہیں تھے۔

دو تین دن کی چھٹیوں میں وہ اپنی فیملی کے ساتھ مری یا باہر سے باہر کسی جگہ چلے جاتے تھے۔ یہی ان کا چھٹی اور علاج کا تصور تھا۔

اس عید کے موقع پر بھی وہ اپنے بیٹے اور پوتا پوتی کے ساتھ مری گئے۔ سفر حسب معمول خوشگوار گزرا۔ جائے

قیام پر پہنچے تو شام ہو چکی تھی۔ رہائش گاہ میں داخل ہونے کے بعد وہ ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔

بیٹان سے چائے کے بارے میں پوچھنے کے لیے ان کے پاس گیا تو وہ صوفے سے سرٹکائے بیٹھے تھے۔ بیٹے کے دریافت کرنے پر انہوں نے کہا ”بس بھی، ہم تو چلے۔“ یہ کہا اور گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ بیٹے نے دیکھا تو ان کی روح پرواز کر چکی تھی۔ سارا خاندان اسی وقت لاہور واپس روانہ ہو گیا۔ دن کو ان کی تدفین کر دی گئی۔

ان کا ایک بیٹا جو ڈاکٹر ہے اور لندن میں رہتا ہے۔ پہلی فلائٹ سے لاہور پہنچ گیا تھا۔ ان کی بیگم کی ماہ سے لندن میں اپنے بیٹے کے پاس رہائش پذیر تھیں۔ وہ صحت کی خرابی کے باعث لاہور نہ آ سکیں۔ چھٹیوں کی وجہ سے یہ خبر عام نہ ہو سکی۔ نہ ہی ان کے بیٹوں نے پریشانی کے عالم میں عید کے دن جانے والوں کو زحمت دینا مناسب سمجھا۔ چھٹی ختم ہوئی تو ہم نے اخبار میں ان کی وفات کی خبر پڑھی اور تصویر دیکھی۔ تصویر میں بھی ان کے چہرے پر وہی مسکراہٹ تھی جو ہمیشہ نظر آتی تھی۔

اسی وقت فون کر کے ہم ڈاکٹر صاحب کے گھر گئے۔ گھر والوں کے سوا کوئی اور موجود نہ تھا۔ کافی دیر بیٹھے ڈاکٹر صاحب کی باتیں کرتے رہے۔ انسان نہیں رہتا مگر اس کی باتیں باقی رہ جاتی ہیں۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ہمارے تین معزز اور نہایت قریبی اور عزیز ڈاکٹر بالکل اسی طرح دنیا سے رخصت ہوئے جن کی کمی ہمیشہ محسوس ہوتی رہے گی۔

ڈاکٹر میجر (ر) نوید ظفر سے ہم بہت قریب ہو گئے تھے۔ انہوں نے ہماری کئی مشکل بیماریوں کے علاج کیے۔ وہ بھی ایک نیک دل اور ہمدرد انسان تھے۔ بہت اچھا ٹیکنک تھا۔ اسٹاف تھا جو لڑکیوں پر مشتمل تھا۔ ڈسٹن بہت اچھا تھا۔ ڈاکٹر نوید ظفر کمپیوٹر سے بھی کام لیتے تھے اور ان کے مطب میں تمام مریضوں کی فائلیں نہایت سلیقے سے محفوظ رہتی تھیں۔ وہ ایک پچھلے کے بھی ماہر تھے۔

ہم ایک بار ان کے پاس گئے تو پھر زیادہ تر وہیں جایا کرتے تھے۔ مطلب ان کے ڈسٹنڈ اور بہت سجا ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس بھی ایک خاتون کارکن مریضوں کو وقت دیا کرتی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب کے دو بے در پے بائی پاس ہو چکے تھے مگر وہ صحت مند ہونے کے بعد صبح شام مریضوں کو دیکھنے لگے تھے۔ نہایت با اخلاق، شریف انفس اور نیک دل

انسان تھے۔ ان کا مطلب بھی گلیبرگ میں ان کی کوٹھی میں ہی تھا لیکن بہت سلیقہ کا بندوبست تھا۔ خواتین اور مرد مریضوں کے بیٹنے کی جگہیں الگ الگ تھیں۔ فرنیچر بہت اچھا تھا۔ اسے سی کی سہولت تھی۔ عملے میں پانچ کے قریب لڑکیاں تھیں جو نہایت خاموشی سے اپنے کام میں مصروف رہتی تھیں۔ ہم نے ڈاکٹر نوید سے بھی پوچھا کہ آپ نے اپنے کلینک کے اسٹاف میں مردوں کے داخلے پر پابندی کیوں لگا دی ہے؟

انہوں نے مسکرا کر کہا ”لڑکیاں بہت محنت اور یکسوئی سے کام کرتی ہیں۔ ہر چیز کو قرینے سے رکھتی ہیں۔ اپنے فرائض کا بہت خیال رکھتی ہیں۔ کافی تجربات کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔“

ڈاکٹر صاحب کا دستور یہ تھا کہ وہ مریض کو ایک ہفتے یا دس دن کی دوائی دیا کرتے تھے۔ بعض اوقات دو تین دوائیاں بھی ہوتی تھیں مگر معاوضہ صرف 50 روپے لیتے تھے۔

جب ذرا بے تکلفی ہوگئی تو ہم نے ایک دن ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کہ ڈاکٹر صاحب، آپ اتنی کم فیس اور اتنی زیادہ دوائیاں دے کر گزارہ کیسے کرتے ہیں؟

ڈاکٹر صاحب بولے ”اللہ کا شکر ہے، کچھ زمین ہے جس سے گھر کے اخراجات پورے ہو جاتے ہیں۔ علاج تو میں منافع کے لیے نہیں، خدمت کی غرض سے کرتا ہوں۔“

ڈاکٹر نوید ظفر سے ہم صبح مل کر آئے تھے۔ شام کو فون آ گیا کہ وہ انتقال کر گئے ہیں۔ بطور خاص ان کے گھر گئے۔ تدفین میں شرکت کی۔ قبر پر مٹی ڈالی۔ ان کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ صرف دو لڑکیاں تھیں۔ ایک بیٹی کی شادی امریکا میں ہوئی تھی۔ ان دنوں وہ بھی لاہور آئی ہوئی تھی۔

شام کو نماز پڑھنے کے بعد کلینک جانے سے پہلے ڈاکٹر صاحب چائے پیا کرتے تھے۔ وہ نماز پڑھ کر اپنے مخصوص صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بیٹی نے پوچھا ”ابو، چائے لاؤں یا ٹھہر کر بیٹیں گے؟“

”لے آؤ۔“ انہوں نے جواب دیا۔ بیٹی چائے بنا کر لائی تو ڈاکٹر صاحب بدستور صوفے پر بیٹھے تھے۔

بیٹی نے کہا ”ابو..... چائے!“

مگر ابو بیٹھے بیٹھے ہی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر اسد الرحمن ایلو پیتھک ڈاکٹر تھے۔ جب بھی ہم ایلو پیتھک علاج کراتے تو ڈاکٹر اسد الرحمن ہی کو زحمت دیا

کرتے تھے۔ وہ مشرقی پاکستان سے طبی تعلیم حاصل کرنے کے لیے لاہور آئے تھے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد لاہور میں شادی کر لی اور پھر بیٹن کے ہو گئے۔ وہ سرکاری ملازم تھے لیکن گھر پر بھی مریضوں کو دیکھا کرتے تھے۔ چند سال میں ان سے گھریلو تعلقات ہو گئے تھے۔ ان کی بیگم کا تعلق لاہور سے تھا۔ ایک بیٹا تھا جو ڈاکٹر تھا اور امریکا میں تھا۔

ڈاکٹر صاحب نہایت تجربہ کار اور بہت ہی اچھے ڈاکٹر تھے۔ شاید ہی انہوں نے بھی ٹیسٹ کرایا ہو۔ معائنہ کر کے بتادیا کرتے تھے کہ آپ کو یہ مرض ہے۔ تین دن بعد بخار آجائے گا اور ایسا ہی ہوتا تھا۔

وہ کم سے کم اور سستی سے سستی دوائیاں دینے کے قائل تھے۔ ہم کو انہوں نے بھی اپنی بانیوٹک دوائی نہیں استعمال کرائی۔ نہایت خوش اخلاق، خوش گفتار اور نرم لہجے میں گفتگو کرنے والے انسان تھے۔ انہیں بھی اونچی آواز میں بولنے نہیں سنا۔ ملکی حالات کے بارے میں بعض اوقات بہت غصہ ناک ہو جاتے تھے مگر غصے کا اظہار ایسے کرتے تھے جیسے محبت بھرا شکوہ کر رہے ہیں۔ بہت خوبیوں والے، دیانت دار اور ایماندار ڈاکٹر تھے۔ اپنے گھر پر آنے والے مریضوں سے وہ ایک سو روپے فیس لیا کرتے تھے اور نسخے کے ساتھ چند دوائیاں جو دوا فروشوں کے نمائندے نمونے کے لیے دے جاتے تھے، وہ بھی مریض کو دے دیا کرتے تھے۔

ڈاکٹر اسد الرحمن کھانے کے بہت شوقین تھے۔ یہ نہیں کہ مرغن غذا میں پسند کرتے تھے۔ دراصل وہ لذت کے قائل تھے۔ خود بھی بہت مزیدار کھانے پکایا کرتے تھے۔ اگر کسی کھانے کی ترکیب بتاتے تو خود ان کے منہ میں پانی آ جاتا تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مزیدار کھانے کے کس قدر شوقین ہیں۔ کئی قسم کے کھانوں کے نام انہوں نے خود ہی تجویز کیے تھے۔ جب ہم ٹائیفائیڈ سے صحت یاب ہوئے تو وہ ہمیں قوت بخش غذا کھانے کا مشورہ دیتے تھے۔ ایک ایسی ڈش کا نام ہمیں زبانی یاد ہو گیا۔ چاول کو مرنے کے گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کے ساتھ ملا کر پکایا جائے تو مرنے کی ساری غذائیت ان نرم چاولوں میں جذب ہو جاتی ہے۔ مزہ ذائقے کے لیے ریاضت یا کوئی بھی چیز ملا کر کھائیں۔ غذا کی غذا علاج کا علاج۔ اس کا نام انہوں نے ”فش فاش“ رکھا تھا۔ ہم یہ ”فش فاش“ آج بھی اکثر کھاتے رہتے ہیں اور ڈاکٹر صاحب کے لیے دعا کرتے ہیں۔

ایک بار ہم نے پوچھا ”ڈاکٹر صاحب! اس میں فش“

ایک بار ہم نے پوچھا ”ڈاکٹر صاحب! اس میں فش“

ایک بار ہم نے پوچھا ”ڈاکٹر صاحب! اس میں فش“

ایک بار ہم نے پوچھا ”ڈاکٹر صاحب! اس میں فش“

ایک بار ہم نے پوچھا ”ڈاکٹر صاحب! اس میں فش“

ایک بار ہم نے پوچھا ”ڈاکٹر صاحب! اس میں فش“

ایک بار ہم نے پوچھا ”ڈاکٹر صاحب! اس میں فش“

ایک بار ہم نے پوچھا ”ڈاکٹر صاحب! اس میں فش“

کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ پھر آپ نے اس کا نام ”فش فاش“

بولے ”ایک بار میں نے سوچا تھا مگر ”چک چاک“

ایک اچھا نہیں لگا۔ اس کے مقابلے میں ”فش فاش“ سننے میں

ایک اچھا ہے اور ذائقہ دار بھی ہے۔ کھانے والے کو پتا بھی

نہیں چلتا کہ دراصل وہ کیا کھا رہا ہے۔“

ڈاکٹر اسد الرحمن بھی دو سے زائد دوائیاں تجویز نہیں کرتے تھے۔ اکثر تو ان کا مشورہ ہوتا تھا کہ دوا میں استعمال

ہی نہ کریں۔ خوراک میں احتیاط کر لیں تو تندرست ہو جائیں گے۔

ڈاکٹر صاحب ریٹائر ہونے کے بعد چھٹیوں میں بیگم کے ساتھ اپنے بیٹے کے پاس امریکا جاتے رہتے تھے مگر کیا حال ہو جائے اور آنے کے بارے میں اطلاع دیں۔ ہم گھر

پر فون کرتے تو پورا سے ملازم سے اطلاع ملتی تھی کہ ڈاکٹر صاحب امریکا گئے ہوئے ہیں۔ لاہور آ جاتے تو فون وہ خود

ہی اٹھاتے تھے۔ گویا وہ لاہور پہنچ گئے ہیں۔ ہم نے کئی بار شکوہ کیا کہ آپ کو جانے کی اطلاع ضرور دینی چاہیے تاکہ آپ

کے مستقل مریضوں کو علم تو ہو جائے۔

وہ کہتے ”اگر بتا کر جاؤں گا تو وہ خواہ مخواہ پریشان ہوں گے، اس لیے نہیں بتاتا۔“

ایک بار ہم ڈاکٹر صاحب کے پاس گئے۔ ان کا کلینک بہت بھارتیہ تھا۔ ہمیں انہیں فیس دیتے ہوئے جھک سی محسوس ہوتی تھی۔ بس کسی کاغذ کے نیچے نوٹ رکھ کر چلے آتے تھے۔ ہم نے کئی بار کہا کہ آپ گزشتہ تیس برسوں سے سو

روپے فیس لے رہے ہیں۔ اس میں اب اضافہ کریں۔

وہ کہتے ”آفاقی صاحب! فیس تو میں اس لیے لیتا

ہوں کہ مریض کو احساس رہے کہ وہ اپنا علاج کر رہا ہے۔ اگر

معاوضہ نسخہ دیا جائے تو کئی مریض اس کو اہمیت نہیں

دیتے۔“

ڈاکٹر صاحب سے مل کر آئے تو دوسرے دن فون

آ گیا کہ ڈاکٹر صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ اچانک یہ خبر سنی تو

ماکت رہ گئے۔ تعزیت کے لیے فوراً ان کے گھر گئے۔ بیگم

صاحبہ سے ملاقات ہوئی۔ ظاہر ہے کہ بہت رنجیدہ تھیں۔

اب وہ لاہور میں بالکل تنہا رہ گئی تھیں۔

”یہ سب ہوا کیسے؟ کل ہی تو ہم ان سے مل کر گئے

“

بولیں ”بالکل ٹھیک تھے۔ ہم لوگ کسی سے ملنے کے

لیے گئے، واپس آئے تو ڈاکٹر صاحب ڈرائنگ روم میں

صوفے پر بیٹھے گئے، بولے ”آج ہم لوگ ڈرائنگ روم میں

بیٹھ کر چائے پیئیں گے۔“

ورنہ عموماً کسی مہمان کی آمد پر ہم ڈرائنگ روم میں

چائے پیا کرتے تھے۔ میں خود چائے بنانے کے لیے پکین میں

چلی گئی۔ واپس آئی تو ڈاکٹر صاحب صوفے پر میگزین لیے

بیٹھے تھے۔ میں نے چائے بنا کر پیالی ان کی طرف بڑھائی مگر

وہ اسی طرح بیٹھے رہے۔ میں نے مخاطب کیا ”ڈاکٹر

صاحب، چائے پیئیں۔“

مگر ڈاکٹر صاحب نے کوئی حرکت نہیں کی۔ پاس جا کر

دیکھا تو بیٹھے بیٹھے ہی قلم ہو گئے تھے۔“

ان تین ڈاکٹروں کی ایسی موت پر کبھی کبھی ہم حیران

بھی ہوتے ہیں اور رٹک بھی کرتے ہیں کہ کس قدر پرسکون

اور آرام کی موت ہے۔ اللہ اپنے نیک بندوں کو اسی طرح

اپنے پاس بلا لیتا ہے۔

مگر ڈاکٹر عبدالسلام نے تو صوفیوں والا کام کیا تھا کہ

چند لمحے پہلے اپنی بہو سے کہا ”لو، ہم تو چلے ہیں۔“ اور چلے

گئے۔ اللہ مغفرت کرے، کیا خوب آدمی تھے اور لا جواب

ڈاکٹر۔ وہ تو چپکے سے چلے گئے۔ ان کے سیکڑوں ہزاروں

مریض اب کیا کریں گے؟

☆☆☆

جن لوگوں کو پاکستان ٹیلی وژن کے آغاز کے

پروگرام یاد ہیں انہیں ایک اناؤنسر اور نیوز کاسٹر ضرور

یاد ہوگا۔ ایک خوش شکل بلکہ خوبصورت نوجوان، گھنے بال،

مناسب ناک، نقشہ، مہکتی ہوئی رنگت۔ سب سے زیادہ موثر

آواز تھی۔ وہ اپنی آواز کو مختلف پروگراموں کے مطابق

ڈھال لینے کے فن میں ماہر تھا۔ یہ سہیل ظفر تھے۔ گہری اور

دل پر اثر کرنے والی آواز اور دلکش شخصیت کے باعث وہ پی

ٹی وی کی ایک مقبول اور پسندیدہ شخصیت تھے۔

اس زمانے میں لاہور اتنا پھیلا ہوا نہیں تھا۔ چند

درجن چائے خانوں اور کافی ہاؤس کے اندر ہی ادیبوں،

شاعروں اور ادب نواز لوگوں کی آمد و رفت محدود تھی۔ فارغ

وقت بھی تھا اور زندگی پرسکون تھی۔ آج کی طرح بھاگ دوڑ

اور مصروفیات نہیں تھیں۔ نہ ہی زیادہ فاصلے تھے۔ شہر کے

لوگ تو پیدل یا سائیکل پر ہی چند منٹوں میں ایک جگہ سے

دوسری جگہ پہنچ جاتے تھے۔ ملنے ملانے کا دستور عام تھا۔ لوگ

مخلص، بے ریا اور بامروت ہوتے تھے۔ اس وقت کی

107

ماہنامہ سرگزشت

نومبر 2011ء

106

ماہنامہ سرگزشت

نومبر 2011ء

106

ماہنامہ سرگزشت

نومبر 2011ء

106

ماہنامہ سرگزشت

نومبر 2011ء

106

ماہنامہ سرگزشت

نومبر 2011ء

ملاقاتیں اور دوستیاں آنے والے سالوں میں بھی اسی طرح قائم رہیں حالانکہ ملاقاتیں یہاں تک کہ ٹیلی فون پر رابطے بھی نہ رہے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے وقت نے کروٹ لی اور لاہور کی شکل و صورت، مزاج اور ماحول ہی بدل کر رہ گیا۔ کہاں تو روز کی ملاقاتیں تھیں، کہاں یہ کہ کسی کو کسی کا علم نہ تھا کہ کہاں ہے؟ پاکستان ہی میں ہے یا ملک سے باہر چلا گیا یا پھر دنیا سے ہی گزر گیا؟ جب انسانوں میں میل ملاپ اور رابطے ختم ہو جاتے ہیں تو زندگی کی چھوٹی چھوٹی دلچسپیاں اور مشغلے بھی باقی نہیں رہتے۔

سمیل ظفر کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ جب تک صحافت سے وابستہ تھے کافی ملاقاتیں رہا کرتی تھیں۔ فلم سے وابستہ ہوئے تو زندگی ایک نئے دائرے کے اندر محدود ہو کر رہ گئی۔ پھر بھی جب وقت ملتا تو پُرانے دوستوں سے ملنے اخباروں کے دفاتر، ریڈیو اور ٹی وی اسٹیشن چلے جاتے تھے۔ عرصہ گزر گیا۔ سمیل ظفر سے نہ بات ہوئی، نہ ملاقات۔

چند سال پہلے موبائل پر ایک ایس ایم ایس موصول ہوا۔ ہمیں نہ ایس ایم ایس پڑھنا آتا ہے نہ بھیجنا۔ سوچتے ہیں جس کی کو بات کرنی ہے وہ چند سیکنڈ خود بات کیوں نہیں کرتا؟ کئی کئی دن بعد دفتر کا کوئی ساتھی، بیٹی یا نواسہ، نواسی ہمارا موبائل لے کر کھیلنے بیٹھے تو کہہ سارے پاپا، آپ کے لیے تو 25 پیغامات آئے ہوئے ہیں۔

”پڑھ کر سناؤ، کس نے بھیجے ہیں، کیا لکھا ہے؟“ وہ پڑھتے جاتے تو معلوم ہوتا کہ لطفی ہیں جو دوستوں نے بھیجے ہیں۔ کچھ گڈ مارٹنگ کے پیغامات ہیں، کچھ شخص نمبر ہیں۔

ہماری نواسی نے پوچھا ”پاپا، یہ سمیل ظفر کون ہیں؟“ ہمیں فوراً سمیل ظفر یاد آ گئے بلکہ ان کا سراپا اور آواز بھی دکھائی اور سنائی دینے لگی۔

”ہمارے ایک پُرانے دوست ہیں، ان کا کیا پیغام ہے؟“

”انہوں نے ہر روز صرف ”گڈ مارٹنگ“ کے پیغام بھیجے ہیں۔ آپ نے انہیں جواب دیا؟“

”نہیں، جب وہ فون کریں گے تو بات کر لیں گے۔“ اسی طرح کچھ دن اور گزر گئے۔ ہمارے دفتر کے ایک ساتھی نعیم مرتضیٰ اور سمیل ظفر کے ”گڈ مارٹنگ“ موصول

ہوتے رہے۔ نعیم مرتضیٰ تو ہمارے دفتر ہی میں ہیں۔ انہیں ہم نے بتا دیا کہ آپ کے پیغامات کا شکریہ ہمیں ایس ایم ایس کرنا نہیں آتا اس لیے جواب کا انتظار نہ کیجئے گا۔

مزید دو ماہ گزر گئے۔ سمیل ظفر کے گڈ مارٹنگ کے پیغام روزانہ وصول ہوتے رہے۔ آخر ایک دن ہم نے بارمان لی۔ معلوم کیا کہ ان کا موبائل نمبر کیا ہے اور موبائل پر فون کیا۔ دوسری طرف سے چند لمحے بعد کسی نے فون اٹھایا اور ایک گہری خوبصورت آواز سنائی دی۔

”ہیلو، آفاقی صاحب! کیا حال ہیں؟“ ”ٹھیک ہیں۔ شکر ہے، ابھی آپ کے ”گڈ مارٹنگ“ ہر روز ملتے ہیں مگر مجھے جواب دینا نہیں آتا اس لیے فون کیا ہے۔“

”بڑی عنایت!“ ”بھی آپ آج کل کہاں ہیں۔ اتنے عرصے کہاں رہے؟ کیسے رہے؟ حال چال کیا ہیں؟“

انہوں نے بتایا کہ وہ کسی ایڈورٹائزنگ کمپنی اور ٹی وی چینل کے لیے کام کرتے ہیں۔ ”سب خیریت ہے۔“

”سمیل! کیا کبھی ملنے کودل نہیں چاہتا؟ موبائل کے میسج پر گزرا کر دیتے ہو۔“ وہ ہنسنے ”نہیں نہیں، کسی دن وقت نکال کر ضرور آؤں گا۔ دراصل مصروفیات اور بھاگ دوڑ اتنی ہے۔“ ”پھر بھی، کچھ وقت تو نکال سکتے ہو۔“

”ہاں ہاں، ضرور نکالوں گا۔ عنقریب ملاقات ہوگی۔ بہت خوشی ہوئی اتنے عرصے بعد آپ کی آواز سن کر۔“ دن گزرتے گئے اور سمیل ظفر کے پیغام بلا ناغہ موصول ہوتے رہے۔ یہ اب معمول میں شامل ہو گیا تھا۔

پریس کلب کے اسٹیشن ہوئے تو ہم بھی گئے۔ بہت چہل پہل تھی۔ ایسے موقعوں پر بہت سے پُرانے دوستوں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔

ہم کو قطار کے باوجود فوراً اندر پہنچایا گیا۔ ہم نے پوچھا ”یہ سلوک کس لیے؟“

”اس لیے کہ آپ سینئر لوگوں میں سے ہیں جو چند ہی باقی رہ گئے ہیں۔ دوسرے یہ کہ کلب کے لائف ممبر بھی ہیں۔“

ووٹ ڈالنے خیمہ نما گوشے میں گئے۔ باہر ہال میں آ کر ووٹ ڈالا اور باکس کو خوب زور سے ٹھونکا تاکہ ووٹ کا

کاغذ اندر پہنچ جائے۔ پکا ایک پیچھے سے کسی نے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہی جانی بچائی آواز سنائی دی۔

”فکر نہ کریں۔ آپ کا سیٹ خیریت سے اندر پہنچ گیا ہے۔“

پلٹ کر دیکھا تو سامنے سمیل ظفر کھڑے تھے۔ وقت نے انہیں زیادہ تبدیل نہیں کیا تھا سوائے اس کے کہ چہرے پر کچھ سنجیدگی آ گئی تھی۔

ہم دونوں گلے ملے ”بھئی، آپ آتے کیوں نہیں؟ پیغام پر کیوں ٹر خدادیتے ہیں؟“

بولے ”اتنے سویرے میں خود تو آپ کے پاس آ نہیں سکتا مگر چاہتا ہوں کہ آکھ کھلتے ہی سب سے پہلے میری طرف سے آپ کو صبح بخیر کا پیغام ملے۔“

”اتنے عرصے کہاں رہے، کیسے رہے؟ اب کیا ہو رہا ہے؟“

مسکرا کر بولے ”آؤں گا تو سب بتاؤں گا۔ المینان سے باتیں ہوں گی۔ آپ کو نہیں گے، اپنی سناؤں گے۔“ انکسٹن کے ہنگاموں کی وجہ سے کوئی انہیں پہنچ کر لے گیا۔ جاتے جاتے کہا ”اچھا خدا حافظ! جلد ملاقات ہوگی۔“

ہم ان کے پیغامات پر دھوا کر سنتے رہے اور ان کی آمد کا انتظار کرتے رہے۔

جس روز اخبار میں ڈاکٹر عبدالسلام کے انتقال کی خبر پڑی اسی کے اوپر سمیل ظفر کے انتقال کی خبر بھی شائع ہوئی تھی۔

”مشہور براڈ کاسٹر، نیوز کاسٹر، صحافی اور ادیب سمیل ظفر عید کے روز اچانک ہارٹ ٹیل ہونے سے انتقال کر گئے۔“

ہم چپ چاپ یہ دونوں خبریں سامنے رکے بیٹھے۔ بہت دیر تک تو یقین ہی نہیں آیا کہ ایک ساتھ اچانک اور بڑے ترین ہستیاں اس طرح چھوڑ کر چلی جائیں گی۔

دونوں کے لیے فاتحہ پڑھی اور مرنے والے عزیزوں کو اللہ تعالیٰ کے لیے دعاؤں میں انہیں بھی شامل کر لیا۔

مجب زمانہ آ گیا ہے۔ انسان ہر روز اتنے ہولناک حادثوں اور ہلاکتوں کے بارے میں سنتا اور پڑھتا ہے کہ ان لوگوں کی حیات، حرمت اور غم و الم کا بھی عادی ہو گیا ہے۔ آج سے چالیس سال پہلے اگر یہ دونوں خبریں ایک ماہ پہنچتے تو نہ جانے کیا غضب ہو جاتا۔

اگلے روز ہم دفتر گئے۔ موبائل پر ایس ایم ایس کی مختصر

گھنٹی بجی۔ ہمارے ایک ساتھی نے ہمارا موبائل اٹھا کر پیغام پڑھا اور سن رہا تھا۔

ہم نے پوچھا ”کس کا پیغام ہے؟“ ”سمیل ظفر کی طرف سے گڈ مارٹنگ۔“

ہم حیران رہ گئے۔ کیا موت کے بعد بھی انسان عالم ارواح سے ایس ایم ایس بھیج سکتا ہے؟

دوسرے دن پھر سمیل ظفر کا پیغام ملا تو ہم نے ان کے نمبر پر فون کیا۔ ایک اجنبی آواز سنائی دی ”ہیلو، کیا یہ سمیل ظفر صاحب کا فون نمبر ہے؟“

”جی ہاں۔“ ”کیا ان سے بات ہو سکتی ہے؟“

ایک لمحے کے لیے خاموشی، پھر غم میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔ ”آپ کو معلوم نہیں کہ عید کے دن ان کا انتقال ہو چکا ہے۔“

ہم نے چپکے سے فون بند کر دیا۔ ”یا الہی! یہ کیا ماجرا ہے۔ سمیل ظفر ہمیں کہاں سے گڈ مارٹنگ کے پیغام بھیج رہا ہے۔ مرنے کے بعد بھی وہ ہمیں نہیں بھولا؟“

اگلے دن پھر یہ پیغام موصول ہوا تو ہم نے ایک دوست سے بات کی۔

”سمیل ظفر تو اس دنیا میں نہیں ہے پھر اس کے ایس ایم ایس کس طرح مل رہے ہیں؟“

انہوں نے بتایا کہ اگر موبائل میں کوئی ایس ایم ایس پیغام اور اس کا وقت فیڈ کر دے تو وہ پیغام از خود ہر روز اسی وقت ایس ایم ایس ہو جاتا ہے۔

دیکھیے، سائنس اور ٹیکنالوجی نے بھی کتنی ترقی کر لی ہے۔

سمیل ظفر کے ایس ایم ایس کئی دن موصول ہوتے رہے۔ پھر ایک دن خود بخود بند ہو گئے۔ دو دن گزر گئے مگر ”گڈ مارٹنگ“ کا پیغام نہیں ملا۔ ہم نے اس نمبر پر فون کیا۔

ایک اجنبی آواز نے ”ہیلو“ کہا۔

ہم نے رکتے رکتے پوچھا ”کیا یہ سمیل ظفر صاحب کا نمبر ہے؟“

جواب ملا ”پہلے تھا مگر اب نہیں ہے۔“ اور فون بند ہو گیا۔

کسی اور کے ہاتھ یہ موبائل لگا تو اس نے پُرانے تمام نمبر وغیرہ صاف کر دیے ہوں گے۔

اب ہم صبح سمیل ظفر کے ایس ایم ایس کا انتظار

کرتے ہیں۔ وہ جہاں بھی ہیں، اللہ انہیں اپنی رحمت کے سائے میں رکھے، آمین۔

☆☆☆

ہماری بد قسمتی یہ ہے کہ ہم اپنی تاریخ اور دوسرے شعبوں میں پاکستانوں کی پیش قدمیوں سے ناواقف ہیں۔ اس کے برعکس جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے یہ پادیں دھندلی پڑتی جا رہی ہیں۔ اسے آرکاردار کو بیشتر پاکستانی اور خصوصاً نئی نسل ایک بھارتی فلم ساز اور ہدایت کار تصور کرتی ہے۔ انہیں یہ نہیں معلوم کہ لاہور کے اس فرزند نے خاموش فلموں کے زمانے سے فلمی صنعت کے فروغ کے لیے کام کیا۔ راوی کے کنارے ٹین کی دیواریں کھڑی کر کے ایک فلم اسٹوڈیو بنایا۔ پہلی پنجابی فلم بنائی۔ لاہور کے بعد کلکتہ اور بلاخرہ بمبئی پہنچ کر اپنا سفر شروع کیا۔ اس شخص کی برصغیر کی فلمی صنعت میں ناقابل فراموش خدمات ہیں مگر بھارت میں کوئی اس کا تذکرہ تک نہیں کرتا چونکہ وہ مسلمان تھا اور پاکستانیوں کو علم ہی نہیں ہے اس لیے کہ پاکستان بننے کے فوراً بعد محبوب خاں کے ساتھ پاکستان آیا تھا مگر اس وقت یہاں حالات فلمی صنعت کے لیے انتہائی ناگفتہ بہ تھے جس کے بعد ان دونوں ہم زلفوں نے انڈیا جا کر بڑے بڑے کاموں سے سرانجام دیے۔

محبوب خاں ہی کے کاموں کو اگر دیکھیں تو وہ کسی بھی ملک کے لیے باعث افتخار ہو سکتے ہیں مگر اب انڈیا کے فلمی حلقے محبوب خاں اور ان کے کارناموں کو بھول چکے ہیں۔ انڈیا والوں کی تو بات ہی چھوڑیے۔ وہ تو چڑھتے سورج کے پجاری ہیں جب دلیپ کمار کا دور عروج تھا تو ان کے گن گاتے رہتے تھے۔ وہ فلموں سے دلکشی ہوئے تو اب ان کا نام مشکل ہی سے سننے میں آتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کا عظیم ترین اداکار ایما بھ بچن ہے۔ عامر خان، سلمان خان، شاہ رخ خان، سیف علی خان وغیرہ کی دھوم اس لیے مچی ہوئی ہے کہ یہ اربوں روپے کما کر بھارتی فلم انڈسٹری کو دیتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں نئی نئے اداکار آئے مگر کوشش کے باوجود وہ ان کے گھنٹوں تک بھی نہ پہنچ سکے اور یہ تینوں خان پندرہ سال سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے بعد بھی بالی ووڈ کی فلمی صنعت پر چھائے ہوئے ہیں۔

اس وقت موضوع کچھ اور ہے اور وہ ہے خود ہماری قوم کا مختلف شعبوں میں اپنے قابل ذکر ممتاز لوگوں کو فراموش کر دینے کا جرم۔ اداکار، فلم ساز و ہدایت کار نذیر کے بارے

میں پہلے بھی لکھا جا چکا ہے لیکن باقاعدہ طور پر نہیں۔ اگست کا وہ مہینا ہے جس میں نذیر صاحب نے وفات پائی تھی۔ وہ 1910ء کو لاہور میں پیدا ہوئے تھے۔ اور اگست 1983ء میں دنیا سے رخصت ہو گئے لیکن 73 سال کا یہ عرصہ انہوں نے مستقل جدوجہد میں گزارا اور ہندوستان کے بڑے بڑے نامور اور ممتاز اداکاروں، ہدایت کاروں اور فلم سازوں کے ہوتے ہوئے بہت نام پیدا کیا۔ بمبئی کی فلمی دنیا میں ان کا لب و لہجہ اور دب دب تھا۔ دوسرے فلم ساز اور ہدایت کار ان سے خائف رہتے تھے۔ یہی حال ان کے بھانجے کے آصف کا تھا جنہیں بمبئی کی فلمی صنعت میں ”دھانسو“ کہا جاتا تھا۔ وہ بھی کسی سے نہیں ڈرتے تھے بلکہ انڈسٹری کے لوگ ان سے ڈرتے تھے۔

ان کا پورا نام نذیر احمد خان تھا لیکن وہ عموماً نذیر صاحب کے نام سے جانے جاتے تھے۔ وہ کئی پٹھان تھے۔ شروع سے ہی انہیں فلموں سے دلچسپی تھی۔ قدرت نے انہیں مختلف صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ اداکاری، ہدایت کاری اور فلم سازی کے شعبوں میں انہوں نے بہت نام پیدا کیا تھا۔ وہ تقسیم سے پہلے ہی بمبئی چلے گئے تھے۔ وہ ہندوستان کے نامور اور کامیاب ترین ہیرو تھے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ سب کچھ چھوڑ کر پاکستان چلے آئے۔ پاکستان کی فلمی صنعت ان کی ممنون احسان ہے کیونکہ یہاں پہلی کامیاب فلم انہوں نے ہی بنائی تھی۔ انہوں نے بے سروسامانی کے باوجود فلم سازی شروع کر دی۔ ابتدا میں وہ خود ہیرو اور ان کی ٹیمنگ سورن لٹا ہیروئن ہوتی تھیں۔ بعد میں نذیر صاحب نے ہیرو کے بجائے کیریکٹر ایکٹر کے کردار انجام دیے اور دھوم مچا دی۔

اے آرکاردار اور نذیر صاحب دونوں فلمی صنعت کے شیدائی تھے اور اچھی فلمیں بنانا چاہتے تھے۔ نوجوانی ہی میں وہ کاردار صاحب کے ساتھ کلکتہ چلے گئے جو اس وقت ایک اہم فلمی مرکز تھا۔ کاردار صاحب نے وہاں جب فلم سرفروش عرف بریو ہارٹ بنائی (ان دنوں فلموں کی عرفیت ضرور ہوتی تھی) تو اس فلم میں انہوں نے ایک کیریکٹر ایکٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ یہ فلم 1929ء میں بنائی گئی تھی۔

کاردار صاحب نے جب کلکتہ میں پہلی بار فلم ”ہیر“ بنائی تو اس فلم میں نذیر صاحب نے ایک اہم کیریکٹر رول ادا کیا۔ یہ دونوں فلمیں خاموش فلموں کے دور میں بنائی گئی تھیں۔ انہوں نے کاردار صاحب کی ایک اور فلم ”پراسرار

ڈاکو“ میں بھی معاون کردار ادا کیا تھا۔

نذیر صاحب کی فنکارانہ صلاحیتیں خاموش فلموں کے دور میں ہی ظاہر ہو چکی تھیں اس لیے انہیں بمبئی جانے کا مشورہ دیا گیا جو بہت بڑا فلمی مرکز تھا۔

بمبئی میں نذیر صاحب نے چندال چوکڑی، راجپوتانہ کا شیر، بد معاش کا بیٹا اور پہاڑی سوار نامی فلموں میں اہم کردار کیے اور شہرت پائی۔ اس دور میں عام لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے اس قسم کی فلمیں بنائی جاتی تھیں کیونکہ گھرانوں اور تعلیم یافتہ لوگوں کا سینما کی طرف رجحان نہ تھا۔

چند سال بعد وہ کاردار صاحب کے اصرار پر دوبارہ کلکتہ چلے گئے جہاں انہوں نے بدروچی، زربند، ملاپ اور چندر گپت وغیرہ فلموں میں کام کیا۔ فلم چندر گپت میں انہوں نے رہا بیتی کردار چاکلیہ اتنی خوبی سے ادا کیا کہ ہندو تو ان کے پجاری بن گئے۔ چاکلیہ ایک چالاک، ذہین اور ہوشیار وزیر اعظم تھا جس کے بنائے ہوئے امور مملکت پر آج بھی ہندو سیاست دان اور حکمران عمل کرتے ہیں۔

1939ء میں کاردار صاحب اور نذیر صاحب دوبارہ بمبئی چلے گئے۔ یہاں اے آرکاردار فلمز کے بیئر تھے انہوں نے کامیاب ترین فلم ”باغیان“ میں مرکزی کردار ادا کر کے بہت شہرت حاصل کی۔ یہ فلم باکس آفس پر بے حد کامیاب ہوئی تھی اور اس فلم کے بعد ان کا شمار ممتاز اور اہم اداکاروں میں کیا جانے لگا۔ وہ حساس کردار کرنے کے اعتبار سے بہت مشہور ہوئے۔

نذیر صاحب اس کے بعد فلموں میں ہیرو کا کردار کرنے لگے اور انہوں نے اپنے زمانے کی نامور ترین ہیروئنوں کے ساتھ کام کر کے بہت شہرت حاصل کی۔ انہوں نے ہندو پچرز کے نام سے بمبئی میں ایک فلم ساز ادارہ اور اسٹوڈیو قائم کیا۔ وہ اپنی فلموں کے علاوہ دوسرے فلم سازوں کی فلموں میں بھی کام کرتے تھے۔

قیام پاکستان کے وقت بمبئی میں مسلمانوں کے خلاف بدترین فسادات پھوٹ پڑے، ان کا اسٹوڈیو اور دفتر بھی ہلا دیا گیا۔ نذیر صاحب کی جرأت مندی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اپنے اسٹوڈیو پر مسلم لیگ کا ہینڈ لگا رکھا تھا اسی لیے فسادات میں ان کا اسٹوڈیو ہندو دہشت گردوں کا نشانہ بنا۔ ان کے بیٹے کا کہنا ہے کہ جب ان کا اسٹوڈیو جل رہا تھا، وہ اس کے سامنے اطمینان سے کھڑے گرہٹ پی رہے تھے۔ ان کی زندگی کا تمام سرمایہ نذر آتش

ہو چکا تھا مگر نذیر صاحب کی ہمت جواں تھی۔ اس واقعے کے بعد انہوں نے پاکستان آنے کا فیصلہ کر لیا اور وہ 1947ء میں پاکستان آئے اور دوبارہ کبھی ہندوستان نہیں گئے۔

بمبئی میں انہوں نے بے حد کامیاب اور قابل تعریف فلمیں بنائی تھیں۔ فلم ”وامق عذرا“ میں سورن لٹا کے ساتھ کام کرنے کے دوران میں ہیروئن کے بہت نزدیک آ گئے۔ سورن لٹا جن کا تعلق ایک سکھ گھرانے سے تھا، مسلمان ہو کر نذیر صاحب کی ٹیم بن گئیں۔ نذیر صاحب کی ایک گھریلو خاندانی ٹیم لاہور میں بھی تھیں۔ پاکستان بننے کے بعد نذیر صاحب سورن لٹا کے ساتھ سب کچھ چھوڑ کر لاہور آ گئے۔

اس زمانے میں لاہور میں فلم بنانے کا تصور دہانے کا خواب تھا مگر نذیر صاحب نے یہ بیڑا اٹھایا اور فلم سازی شروع کر دی۔ اس اعتبار سے انہیں پاکستان میں فلم سازی کا باوا آدم کہا جاسکتا ہے۔ ان کی پہلی اردو فلم ”چاکی“ زیادہ کامیاب نہ ہوئی لیکن پنجابی فلم ”پھیرے“ نے بھارتی فلموں کے مقابلے میں کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے اور ایک ہی سینما میں سطور جو بی منائی تھی۔ نذیر صاحب نے پاکستان میں بہت سی کامیاب فلمیں بنائیں اور دوسرے فلم سازوں کی فلموں میں اداکاری بھی کی۔ آخر عمر میں وہ بیمار پڑ گئے تھے۔ فلمی صنعت کے حالات اور ماحول بھی بدل چکا تھا اس لیے وہ فلمی صنعت سے بے تعلق ہو گئے۔ 1983ء میں لاہور میں ان کا انتقال ہو گیا۔

پہلی بیوی سے ان کے ایک بیٹے تقسیم کا رہے۔ لندن میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے دوسرے بیٹے اختر نذیر خاں کو بھی فلمی صنعت سے دلچسپی ہے اور وہ پاکستان میں فلمی صنعت کی بحالی کے لیے کوشاں ہیں۔

نذیر صاحب جوانی میں بہت غصیلے تھے۔ لاہور آنے کے بعد بھی لوگ ان کے غصے سے ڈرتے تھے مگر غصہ اُترنے کے بعد وہ اس کی تلانی کر دیتے تھے۔ وہ ایک خوش مزاج، خوش اخلاق اور گوشہ نشین قسم کے انسان تھے۔ فلمی تقاریب میں بہت کم شرکت کرتے تھے۔ اسٹوڈیو اور گھر ہی ان کی دلچسپی کا مرکز تھے۔

پاکستان میں فلم سازی کے اس ستون کو آج بہت کم لوگ یاد کرتے ہیں مگر جب فلمی صنعت کی تاریخ لکھی جائے گی تو ان کا نام سرفہرست ہوگا۔ افسوس کہ کسی حکومت نے انہیں انوار بھی نہیں دیا۔

جاری ہے



ایک دل دہلا دینے والے سفر کی داستان

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

عزم محکم

وہ سب سبیل کے شکار کی خاطر نکلے تھے اور موت ان کے تعاقب میں چل رہی تھی، ہر ہر قدم پر ایک نئے انداز میں موت کا جیڑا ایک ایک کو چباتا جا رہا تھا۔

کبھی اسے ادھر اور نہ چھوڑتا اور اس کام کو مکمل کرنے میں اپنی جان لڑا دیتا۔ تاکہ اس کے لیے ہمیشہ کام دیتی تھی۔ اس نے اپنی زندگی کی بیشتر مہمات کو نہایت کامیابی سے سرانجام دیا تھا۔ اس کے سامنے طالع جو اسے اچھی طرح جانتے تھے، اس کے بارے میں یہ بات نہایت وثوق سے کہتے تھے کہ فرینک بددل ہونا نہیں جانتا۔ ان کی دانست میں اس شخص نے حوصلہ ہارنا کبھی سیکھا ہی نہیں تھا۔

ان کے نزدیک فرینک بہ ظاہر گوشت پوست سے بنا ہوا ایسا شخص تھا، جس کے اعصاب فولاد سے بنے ہوئے تھے۔ وہ بہت دیر تک جہاز کی آہنی ریٹنگ کے سہارے کھڑا رہا اور پائپ کے ہلکے ہلکے ٹکڑے لگاتا رہا۔ کڑے تمباکو کا ذائقہ اس کے آنگ آنگ میں سرور پھیلا رہا تھا۔ پائپ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اس کی نگاہ حد نظر تک پھیلے سیاہی مائل نیلگوں پانی کی سطح پر اضطرابی انداز میں بھٹک رہی تھی۔ سفر کا آغاز کیے ڈیڑھ مہینہ گزر چکا تھا لیکن منزل مقصود کے آثار ابھی تک ظاہر نہیں ہوئے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ شاید اس کا جہاز راستہ بھٹک کر کسی اور سمت نکل آیا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ سمندروں کے سینے میں دروازے اور راستے نہیں ہوتے، یہاں اپنی اہمت کے سہارے راستے بنانے ہوتے ہیں۔

ایک ایک وہ چونک پڑا۔ جہاز سے خاصے فاصلے پر پانی کی سطح پر ایک جگہ زبردست لہلہل مچی ہوئی تھی، یوں جیسے پانی کی

سمندری جہاز کے عرشے پر وہ آہنی ریٹنگ کے سہارے کھڑا تھا اور اپنا پائپ سلگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ لائٹر جلا دیا اور پائپ سلگانا چاہا لیکن کئی بار کوشش کے باوجود وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ یہ مارچ کا ابتدائی ہفتہ تھا۔ پنج بستہ ہوا کے تیز جھکڑ چل رہے تھے۔ وہ جب بھی لائٹر کو جلاتا، ہوا کے تیز چھیرے اس کے لائٹر سے نکلنے والے نارنجی شعلے کو پلک جھپکتے میں بجھا دیتے۔

متعدد بار کی تاکہ اس نے فرینک پر جھنجھلاہٹ طاری کر دی۔ اس کی کشادہ و فراخ پیشانی شکن آلود ہو گئی تھی، وہ عرشے کی آہنی ریٹنگ پر جھک گیا اور ہوا کے مقابل اپنی پشت کر کے دوبارہ پائپ سلگانے لگا۔ اس نے بہت دیر سے پائپ نہیں پیا تھا۔ ٹکڑوں کی طلب ایک ہی شدید ہو گئی تھی، اس مرتبہ دوسرے ہی کوشش میں اس کے پائپ میں رکھا ہوا تمباکو سلگ اٹھا۔

پائپ کو سلگتا دیکھ کر اس کے لبوں پر بے اختیار فاقا نہ مسکراہٹ دوڑ گئی اور اس کے چہرے پر چھائے جھنجھلاہٹ کے آثار یکسر معدوم ہو گئے۔ اس نے اپنے رگ و پے میں طمانیت اور آسودگی کی لہر دوڑتی محسوس کی، اس نے پائپ کو اپنے ہونٹوں سے لگایا، ایک گہرا کش لیا اور دھوئیں کے مرغولے ہوا میں چھوڑ دیے۔

فرینک طبعاً بے حد ترش مزاج واقع ہوا تھا، ضد کا مادہ اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ جس کام میں ہاتھ ڈالتا،

کے دادا نے دریافت کیا تھا۔ اس کی شادی انجیلا نامی ایک لڑکی سے ہوئی تھی۔ وہ اسے میول ہیڈ کی بندرگاہ پر ایک ہوٹل میں ویٹریس کے روپ میں نکرائی تھی اور پھر ہمیشہ کے لیے اس کی ہو گئی تھی۔ انجیلا بے حد خوبصورت، وفا شعار اور سیدھی سادی گھریلو عورت تھی۔ انجیلا سے شادی کرنے سے پہلے اس کی زندگی بے حد سیاہ اور بے رنگ تھی، آوارہ اڑتے ہادل کی طرح..... لیکن انجیلا نے اسے زندگی کے نئے معانی اور رنگوں سے آشنا کیا تھا۔

دو سال کے وقفے کے بعد انجیلا کے لبوں سے اس کی بیٹی پیدا ہوئی۔ فرینک نے اس کا نام میولی رکھا تھا۔ وہ ہمیشہ یہ نام یاد رکھنا چاہتا تھا کیونکہ انجیلا اس سے میول ہیڈ کی بندرگاہ پر ہی نکرائی تھی۔ فرینک کو اپنی بیٹی میولی سے بے حد پیار تھا اور اس کی ہر خواہش کی تکمیل وہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔ رنگ روپ، ناک نقشبے اور خد و خال کے لحاظ سے میولی اپنی ماں پر ہی تھی۔ انجیلا کے پاس اپنے بچپن کی کوئی تصویر نہ تھی، صرف یادیں تھیں، وہ بھی بے حد اذیت ناک۔ اس کا بچپن نہایت عسرت میں گزرا تھا۔ ویسے اسے یقین تھا کہ وہ بچپن میں میولی جیسی ہی ہوگی۔

سمندری موسم بے حد سرد اور تکلیف دہ ہو چکا تھا۔ فرینک سر سے لے کر پیر تک بھاری اور گرم کپڑوں میں ملبوس تھا لیکن اس کے باوجود پنج ہوا اس کی ہڈیوں میں اتر کر اسے کپکپانے پر مجبور کر رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ

سبح کے نیچے کوئی آتش فشاں اُبل رہا ہو۔ غصے سے بچھوٹا ہوا کھارہا ہوا اور باہر نکلنے کی جدوجہد کر رہا ہو۔ تھوڑی دیر بعد ہی ایک سیل کے غراٹے کی ہلکی آواز اس کی حساس سماعت کے بند درجوں سے نکرائی، اسے سیل کی آواز پہچان لینے میں چنداں دشواری نہیں ہوئی تھی۔ مختلف قسم کی مچھلیوں کی آواز سے ان کی شناخت و تیز کی جس اس کی سمیٹ میں شامل تھی۔ غرضیکہ وہ پائپ کا کش لگانا بھول گیا۔ وہ اٹھل پھٹل ہوتے پانی کی طرف بہ غور دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک ہی خوشی کی جھلک ابھر آئی اور دل مسرت سے دھڑک اٹھا۔

سیل کے نظر آ جانے کا مطلب تھا، ڈھیر ساری دولت..... اس کو شکار کر لیا جاتا تو یہ ڈھیر ساری دولت بے مصرف انداز میں پانی میں چنبے کے بجائے اس کی جیبوں میں آ کر اٹھیں بھاری کر سکتی تھی۔ اس کی ساری عمر سمندری پانی کا سینہ چرتے اور ہر موسم میں مچھلیوں کا شکار کرتے گزری تھی۔ سمندری مچھلیوں کا شکار کرنا اس کا پیشہ تھا۔ مچھلیوں کے مارنے اسے نہ صرف بربداری، خلل اور قوت برداشت کھائی تھی بلکہ بروقت فیصلہ کرنے اور مشکل وقت میں حوصلہ برقرار رکھنے کی صلاحیت سے بھی آشنا کیا تھا۔

وہ ایک غیر معروف چھوٹے سے قصبے میں پیدا ہوا تھا، انگریزانی اصطلاح میں نیوفاؤنڈ لینڈ کے شمال مشرقی اٹارے میں واقع تھا۔ یہ چھوٹا سا جزیرہ پچاس سال پہلے اس

ممتاز مزاج نگار جناب شوکت تھانوی علالت کے سبب اسپتال میں داخل تھے، ان کو وہاں کی ایک نرس بہت اچھی لگی۔ انہوں نے اس سے اس کی تصویر مانگی تو اس نے اپنے بچپن کی تصویر دکھائی اور کہا آپ اسے لے کر کیا کریں گے، آپ کے یہ کسی کام نہ آئے گی۔ شوکت تھانوی نے کہا میں اسے اسی طرح کرا لوں گا۔

مرسلہ: وزیر ہنسی، کراچی

خوف اور دہشت سے جھرجھری سی دوڑ گئی۔ بچ بستہ و ہرقانی سمندر میں رات گزارنے کا تصور ان کے لیے خاصا روج فرسا تھا۔ فرینک نے انہیں جہاز کی سست لوٹ چلنے کا حکم دیا۔ اپنے لیڈر کا حکم پا کر وہ لوگ ابھی واپسی کے سفر کی تیاری کر رہے تھے کہ ایک ہلکا سا دھماکا ہوا اور برقی زمین ان کے قدموں کے نیچے تھر تھری اٹھی۔ انہیں یوں لگا جیسے بہت دور، اچانک ہی کسی نے توپ داغ دی ہو۔ دھماکے کی آواز سن کر وہ سب کے سب بڑی طرح چونک پڑے اور حیرت سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ ابھی فرینک کی نظر خود سے بیس فٹ دور، تیزی سے پھیلتی برف کی دراڑ پر پڑی۔ برقی سطح پر یہ دراڑ دھماکے کے بعد اچانک ہی نمودار ہوئی تھی اور اس کا منہ خوفناک انداز میں بندرتیج پھیلتا جا رہا تھا۔

تیزی سے پھیلنے والی دراڑ کو دیکھ کر فرینک کا ایک ہی ٹھٹھک گیا اور خوف سے اس کے بدن میں تھر تھری سی دوڑ گئی۔ وہ چیخ کر اپنے ساتھیوں کو اس دراڑ کی موجودگی سے آگاہ کرنا چاہتا تھا لیکن وہ خوف کی اس کیفیت سے جو یکایک ہی اس پر طاری ہو گئی تھی، سنہلنے بھی نہیں پایا تھا کہ فضا سے اچانک ہی ایک انسانی چیخ گونگی۔ بدن کو لرزادینے اور جسم کے روٹ گئے کھڑے کر دینے والی چیخ۔ ایک ایسی چیخ جو آدمی کے حلقوم سے صرف اس وقت نکلتی ہے جب موت کا عنقریب اسے اپنے سینے میں لے لینے میں کامیاب ہو گیا ہو، یہ لیبرڈ کی چیخ تھی جسے برف کی سطح پر تیزی سے منہ کھولتی دراڑ نے اچانک ہی نگل لیا تھا۔ دراڑ کے دونوں جانب نوکیلے دہانوں سے بچ بستہ پانی کے سوتے اُبل رہے تھے۔

فرینک نے دیکھا کہ برف کی دراڑ پھیلتے پھیلتے برقی سرعت سے لیبرڈ کی طرف لپکی اور اس سے پہلے کہ کوئی اسے تھامتا، دیکھتے ہی دیکھتے لیبرڈ پھسل کر دراڑ کے اندر جا گر اور گوشت کو پھیل دینے والے بچ بستہ پانی میں غوطے کھانے لگا۔ لیبرڈ..... ایک ماہر اور نہایت تجربے کا جہاز تھا لیکن

کے جوش کا یہ عالم تھا جیسے وہ چند ہی لمحوں میں سخت اور ٹھوس برقی سطح کو آدھیرا کر دے، لیکن خاصی دیر گزر جانے کے باوجود وہ برقی سطح کو آدھیرا تو درکنار اس میں ہلکا سا شکاف بھی نہ ڈال سکے۔ برف کی چمکدار سطح ان کی توقع اور اندازے کے خلاف کہیں زیادہ ٹھوس اور موٹی تھی یوں لگ رہا تھا جیسے ان کے آلات کندہ کارہ ہو گئے ہوں۔

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، ان کے جوش و خروش میں کمی آتی گئی۔ برف سے لڑتے لڑتے ان کے بازو دھل ہو گئے اور شانوں کے جوڑ درو کرنے لگے تاہم انہوں نے ہمت نہ ہاری اور اپنے کام میں لگے رہے۔ فرینک ان کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے خود بھی برف کی سطح کو توڑنے میں عملی طور پر ان کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ اپنے ساتھیوں کے برعکس اس کے ہاتھ نہایت سرعت اور برقی رفتار سے چل رہے تھے۔ وہ بار بار اپنے ساتھیوں کے حوصلوں کو لگا رہا تھا اور ہر لطف و ہر مذاق جملوں کے ذریعے انہیں تازہ دم رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

برف کی سخت سطح سے لڑتے ہوئے انہیں وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا، بھاری گرم کپڑوں کے نیچے ان کے جسم پانی میں تر ہو گئے اور ہاتھوں میں بڑے بڑے آبلے اُبھر آئے۔ دن بھر کی مشقت اور ٹھکنے نے انہیں بے حد متھل اور پڑمردہ کر دیا تھا۔ ان کے چہروں پر ناکامی کی جھنجھلاہٹ اور بیزارگی اُبھر آئی، انہیں احساس ہو رہا تھا کہ ان کی ان تھک محنت اور مشقت کے باوجود وہ برف کی سخت اور موٹی سطح کو توڑنے یا اس میں کوئی شکاف پیدا کرنے میں ناکام رہے تھے۔

اب شام ہونے والی تھی، چمکیلی برف کی سطح پر قصاں روئی آہستہ آہستہ دھندلے اندھیرے میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔ فرینک کا اشارہ پا کر انہوں نے اپنے ہاتھ روک لیے اور نگاہ اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ دور آفت پر پھیلی سیاہی کسی عنقریب کی مانند منہ کھولے تیزی سے ان کی طرف بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ برف توڑنے کے جان لیوا کام کے دوران انہیں اس بات کا قطعی اندازہ نہیں ہوسکا تھا کہ وہ اپنے جہاز سے کافی دور نکل آئے ہیں۔

آفت پر پھیلی سیاہی کو تیزی سے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر ان کے چہروں پر تلک پائین چھا گیا۔ انہیں یہ خوف لاحق ہو گیا تھا کہ شاید اندھیرا اچھا جانے سے قبل وہ اپنے جہاز تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہو سکیں جبکہ جہاز پر پہنچ جانا بے حد ضروری تھا۔ حدنگاہ تک پھیلے برقی میدان کو دیکھ کر ان کے بدن پر

خوشگوار ہو چکا تھا۔ فرینک کے علم کے مطابق جہاز کے انجن بند کیے جا چکے تھے اور اب جہاز بہت دیر سے ایک جگہ ساکت کھڑا تھا۔ جہاز کے چاروں طرف حدنگاہ تک برف کی ٹھوس، سخت اور چمکیلی چادر پھیلی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہی سورج نکل آیا اور زردی مائل بھورے رنگ کا ہلکا ہلکا اجالا پھیل گیا۔ یہ قطب شمالی پر صبح کا آغاز تھا۔

جہاز پر موجود عملے نے جوش مسرت سے خوشی کے نعرے لگائے اور سیل کے شکار سے متعلق تمام ضروری اشیاء ایک جگہ اکٹھی کر لیں جن میں خود کار سیاہ بندوقیں، نوکیلے بھالے، تیز دھار کھانا بیاں، چمکی آئی والے سان، جوڑے پھل والے چاقو اور فولادی کانٹے، جن کے نوکیلے حصے خاصے چمکدار، تیز اور آگے سے نکل کھائے ہوئے تھے، شامل تھے۔

ان کے چہرے خوشی سے تھمارے تھے، ان کے نزدیک یہ ایک بہت اچھا شگون تھا۔ ڈیڑھ ماہ کے طویل سفر کے دوران انہیں کسی ناگہانی مصیبت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا اور وہ کسی حادثے اور افتاد کا شکار ہوئے بغیر اس مقام پر آ پہنچے تھے جہاں ان کے جہاز کے چاروں طرف لاتعداد سیل مچھلیاں برقی سطح کے نیچے موجود تھیں۔

فرینک کی مونچھوں کے گوشے پھڑپھڑا اٹھے اور اس کے مونے لیوں پر بے ساختہ مسکراہٹ رہ گئی۔ اس کے ساتھی جس چیز کو سیل کے نام سے پکار رہے تھے، اس کے نزدیک وہ پاؤنڈز، شلنگ اور پنس کے سیکڑوں فٹ اونچے ڈھیر تھے۔ وہ دولت کے اس ڈھیر کو اپنے جہاز میں بھر لینے کے لیے بے تاب ہو گیا جو سخت اور ٹھوس برقی سطح کے نیچے ان کی موجودگی سے بے خبر و بے نیاز، پانی میں ادھر ادھر ڈولتے پھر رہے تھے۔ اسے یقین تھا کہ صدیاں گزر جانے کے باوجود اس نطفہ زمین پر اس سے پہلے کسی انسان کے قدم نہیں پہنچے تھے۔

جہاز پر موجود تمام افراد فرینک کا اشارہ پا کر جہاز سے نیچے اتر آئے اور شکار کی تلاش میں سخت، ٹھوس اور برقی سطح پر چاروں طرف پھیل گئے۔ ان کے ہاتھوں میں برف توڑنے والے موٹے فولادی ڈنڈے اور کھانا بیاں تھیں اور ان میں سے ہر ایک کی پشت پر ضروری سامان لدا ہوا تھا۔

مختلف جگہوں پر پھیلے تیس افراد جن میں فرینک بھی شامل تھا، فولادی ڈنڈوں کے موٹے سرے، پوری طاقت سے برف کی سخت سطح پر مارنے لگے۔ ان کا جذبہ اور جوش و خروش اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا۔ ابتدائی چند لمحوں میں تو ان

برقی ہوا کے طوفان میں بے لباس کھڑا ہو۔ فرینک کا جہاز اس وقت ساحل سمندر سے سیکڑوں میل دور، قطب شمالی کے علاقے میں سفر کر رہا تھا۔ یہ جدید ساخت کا ایک بھاری بھر کم جہاز تھا جسے سیل کے شکار کے نکتہ نظر سے بنایا گیا تھا۔ سیل کے شکار سے تعلق رکھنے والی ہر ضروری شے اس جہاز میں موجود تھی۔ جہاز میں اس وقت کل تیس افراد سوار تھے۔ یہ سب کے سب سیل کے شکار میں مہارت رکھتے تھے۔ ان کی ساری زندگی سمندر کے پانی میں گزری تھی۔ سمندر کے سینے پر اکثر دیشتر مہیب و خطرناک سمندری طوفان اُبھرتے رہتے تھے لیکن وہ ان سمندری طوفانوں سے کبھی خوف زدہ نہیں ہوئے تھے۔ سمندر کے جوڑے چمکے سینے پر اُبھرنے والا ہر طوفان ان کے نزدیک حوصلے اور ہمت کی آزمائش کا بیان تھا۔

فرینک جہاز میں موجود تمام افراد کا لیڈر اور جہاز کا کپتان تھا۔ سیل پھیلنے کے شکار کی یہ تازہ مہم اس کی قیادت میں تشکیل پائی تھی۔ پانی کی اونچی نیچی سطح کی طرف دیکھتے ہوئے اسے یکایک ہی انجیلا اور میولی یاد آئیں اور اسے ہر لہر میں میولی اور انجیلا کا چہرہ نظر آنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس شکاری مہم سے فراغت پا کر وہ اپنی جیہوں میں بہت ساری دولت ٹھونسنے، ان دونوں کے لیے ڈھیر سا بے تحاشہ لے کر گھر پہنچے گا تو میولی اور انجیلا اسے دیکھ کر کتنا خوش ہوں گی۔ دو طاقت جہاز دھیرے دھیرے برف کی چادر کاٹتا اور پانی کی سطح چیرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ جہاز کے چاروں طرف برف کی سفید چادر پھیلی ہوئی تھی۔ فرینک جانتا تھا کہ برف کی اس چادر کے نیچے صرف چند فٹ کی گہرائی میں مان گت سیل موجود ہیں۔ اس نے خفیف سے انداز میں اپنے سر کو جنبش دی، تھوڑا سا مسکرایا۔ میولی اور انجیلا کے چمکتے دیکتے چہروں کو خدا حافظ کہا۔ سر پر پڑے برف کے ڈرے ہٹائے اور پائپ کے کش لگا تا اپنے لیبن کی طرف چل دیا۔ جہاز ابھی سیل مچھلیوں کے ممکنہ علاقے سے بہت دور تھا۔ اسے کل صبح تک انتظار کرنا تھا۔ صرف ایک رات درمیان میں تھی۔ رات بھر میں جہاز اپنی متعین رفتار سے چلتے ہوئے یقیناً اس جگہ پہنچ جاتا جہاں ٹھوس اور سخت برقی چادر کی سطح کے نیچے لاتعداد چھوٹی بڑی سیل مچھلیوں کے جھنڈ موجود تھے۔

☆☆☆

شرقی آفت سے سورج کی کرن پھوٹنے میں ابھی تھوڑی سی دیر باقی تھی۔ تاہم یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ موسم خاصا

سرد موسم کی آمد

ماہنامہ سسٹمز

ماہ نومبر 2011ء کے شمارے کی مدد بہار زینت



جنت

امید و ناامیدی..... ویرانی و عنایت جیسے تضادات..... کبھی بکھرتے جذبات اور کبھی کھرتے خیالات نے ہم آہنگ آخری صفحات پر ناصر ملک کے قلم سے ایک تحیر انگیز داستان۔

جہد حاصل

سوئی ماں کے ظلم اور باپ کی ناانصافی کا شکار ایک معصوم بچے کی داستان..... سطر بہ سطر شیر شاہ سوری کی حیات..... ڈاکٹر ساجد امجد کے قلم سے مزید معلومات کا خزانہ۔

نرم چارا

مرزا امجد بیگ کی ڈائری سے ایک اور عدالتی کارروائی کا منظر..... حق کا ساتھ دینا کوئی آسان کام نہیں۔

حضرت حزقیل علیہ السلام

بت پرستی کے اندھیروں میں گم بنی اسوئیل کی سرکشی اور انبیاء کی جہد مسلسل کا احوال

سکھول، اناڑی، محفل شعر و سخن اور آپ کے خط

امیر اے راحت، کاشف ذہن، مریم کے خان، منظر امام، اودنمر عباس کی مہکتی ہوئی تحریریں

نومبر 2011ء

117

طوفان کی شدت کا اندازہ لگانے لگا۔ اس نے محسوس کیا کہ ہوا میں یکایک ہی شدت پیدا ہوگئی تھی اور اوپر سے گرتی ہوئی دودھیا برف نے اچانک ہی ارد گرد کا سارا منظر دھندلا دیا تھا۔ یہ دھندلاہٹ بتدریج بڑھتی جا رہی تھی اور اب چند قدم کے فاصلے پر موجود چیز کو واضح طور پر دیکھنا مشکل ہو گیا تھا۔

فرینک نے چیخ کر اپنے باقی ساتھیوں کو طوفان کی آمد سے مطلع کیا اور انہیں ہوشیار رہنے کی تلقین کرتے ہوئے احتیاط اور تیزی سے جہاز کی طرف بڑھنے کا حکم دیا لیکن اسے احساس ہو چلا تھا کہ یہ حکم بعد از وقت ہی تھا۔ چیخ چٹکھڑاتا برفانی طوفان دم بہ دم مہیب تر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس کا دل بے ترتیب انداز میں دھڑک اٹھا۔ یہ ایک المناک ابتدا تھی، اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اب وہ بھی صحیح سلامت اپنے گھر نہیں پہنچ پائے گا جہاں اس کی وفا شعار بیوی انجیلا اور پیاری بیٹی میوٹی اپنی غزالی آنکھوں میں انتظار کے دیپ فروزاں کیے بیٹھی تھیں اور اس کی واپسی کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھیں۔

اس کے تمام ساتھی، اس کی ہدایت کے مطابق اس کے گرد آ کر جمع ہو گئے۔ تیز ہوا ان کے لمبا دوں کو پھڑ پھڑا رہی تھی اور طوفانی جھکڑوں کے باعث انہیں اپنا توازن برقرار رکھنے میں شدید دشواری پیش آرہی تھی، ان کی آنکھیں اپنے ساتھیوں کی بے وقت اور المناک موت پر آنسوؤں سے بھر گئی تھیں اور ان کے چہروں پر دہشت اور خوف کے سائے منڈلانے لگے تھے۔

”فرینک!“ ساتھیوں میں سے ایک نے پوچھا ”کیا ہم سب اتنی آسانی اور بے بسی سے برف کے اس بے رحم طوفان کا شکار ہو جائیں گے؟“

اس سے پیشتر کہ فرینک اس کی بات کا جواب دیتا، دوسرے ساتھی نے کہا ”مجھے تو یوں لگتا ہے فرینک! کہ جیسے اب ہم بھی اس برفیلے قبرستان سے باہر نہیں نکل سکیں گے، شاید یہی جگہ ہمارا دفن بن جائے۔“

”موت ہمیں اس برفیلے صحرا میں سمجھ لانی ہے دوستو!“ کوئی دہشت بھرے لہجے میں چلایا۔ یہ راڈرک تھا، سہرے بالوں اور جاذبِ نظر خدوخال کا مالک راڈرک..... جو اس گروپ میں شامل تمام افراد کی بہ نسبت، عمر میں سب سے پھوٹا تھا۔ وہ ہاؤسی کے عالم میں بیچ رہا تھا ”تم دیکھ لینا، اب ہم لوٹ کر اپنے گھروں کو نہیں جاسکتیں گے۔ یہ برف کا طوفان ہم سب کو ہلک جھپکتے میں نکل جائے گا۔ ہمیں خبر بھی نہ ہوگی۔“

وہ اپنے بکھرے اعصاب یکجا کرتا، خود کو سنبھالنے میں کامیاب ہوتا اور اپنے ساتھیوں کو اس دروازے سے بچنے کی ہدایت دیتا، دیکھتے ہی دیکھتے اس کے چہرے سہمی، تیزی سے پھیلنے والی اس دروازے میں جا کرے۔

خود کو یوں اچانک برفیلی دروازے میں گرتے دیکھ کر ان کی چیخیں نکل گئیں اور ان کی آنکھوں میں موت کا خوف جھلک اٹھا۔ ان کی فلک شکاف چیخیں فرینک کا دل دھلائے دے رہی تھیں۔ وہ بار بار برفیلی دروازے کے بھر بھرے کناروں کو پکڑ کر پانی میں اوپر اٹھنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن برف کے نوکیلے کنارے ان کی انگلیوں کی گرفت میں آ کر ٹوٹ جاتے اور وہ پھسل کر دوبارہ برفیلے پانی میں جا گرتے اور بے بسی سے غوطے لگانے لگتے۔

فرینک کی آنکھوں کے گوشے منماک ہو گئے۔ ان کی بے چارگی کا عالم دیدنی تھا۔ موت نے ان کے ہوش و حواس کو ختم کر دیا تھا۔ وہ دیوانوں کی طرح برفیلی پانی کی سطح سے اچھلتے اور پھر دوبارہ پانی میں ڈوب جاتے۔ فرینک انہیں پانی سے نکالنے کے لیے لپک کر ان کی طرف بڑھا، وہ ان کا لیڈر تھا اور انہیں یوں بے یار و مددگار موت کے منہ میں جاتے نہیں دیکھ سکتا تھا مگر اسی لمحے برف کی سطح پر نمودار ہو جانے والی دروازے کے دونوں دہانے تیزی سے ایک دوسرے کی طرف لپکے اور آپس میں جڑ گئے۔ اب برفیلی سطح دوبارہ پہلے کی مانند ہموار و شفاف ہو گئی تھی۔ اس کی ہموار سطح کو دیکھ کر کوئی بھی شخص یقین کے ساتھ یہ بات نہیں کہہ سکتا تھا کہ ابھی اس برف کے نیچے چھ جیتے جاگتے انسان زندہ دفن ہو گئے تھے۔

فرینک نے محسوس کیا کہ سخت برف کی موٹی تہ کے نیچے اب ان کی آوازیں بھی سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ برفیلی موت نے انہیں کوئی مہلت دیے بغیر تیزی سے نکل لیا تھا۔ اس نے ہاتھ کی پشت سے رخساروں پر ڈھلک آنے والے آنسوؤں کے قطرے صاف کیے۔ ذرا سی دیر میں اس کے سات گھرے دوست جو اب تک ہر گام پر اس کے شانہ بشانہ چلتے رہے تھے، ہمیشہ کے لیے اس سے جدا ہو گئے تھے۔

وہ اپنے دیرینہ ساتھیوں کی الم ناک موت پر، دل ہی دل میں خود سے اس بات پر شرمندہ تھا کہ آخری لمحوں میں وہ انہیں بچانے اور موت کے جیزوں سے نکال لینے کے لیے کچھ بھی نہ کر سکا تھا۔

اس نے افسوس کے اظہار کے طور پر گردن ہلائی، زبردست تعزیتی دعا پڑھی اور سر اوپر اٹھا کر فضا میں پھیلے برفانی

مٹھندے پانی میں گرتے ہی وہ حواس باختہ ہو گیا تھا۔ وہ بار بار ہسٹریائی انداز میں مدد کے لیے چیخ رہا تھا اور پانی سے باہر نکل آنے کے لیے تیزی سے ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا مگر دونوں طرف سے دھیرے دھیرے سرکئی ہوئی برفیلی چادر اسے ہڑپ کر جانے کی کوشش میں مصروف تھی۔ چند ثانیے بعد ہی برف کی دروازے کے دونوں دہانے آپس میں مل گئے اور لیبر یڈ، سب کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ صدیوں کی بھوکی برف نے اپنا خراج وصول کر لیا تھا اور پلک جھپکتے میں اسے ہمیشہ کے لیے آبی قبرستان میں دفن کر دیا تھا۔

دہشت اور خوف سے فرینک کا بدن کپکپا اٹھا۔ اس کے دوسرے ساتھیوں کا بھی یہی حال ہوا۔

یہ ایک ایسی لرزادینے والی اذیت ناک موت تھی جس کا تصور ہی روٹنے کھڑے کر دینے کے لیے کافی تھا۔ لیبر یڈ کو بچانے کی کوشش فضول تھی۔ اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ اسے بچا لیا جاتا۔ صرف چند ثانیے لگے تھے اور جیتا جاگتا لیبر یڈ ان سے پھج کر ہمیشہ کے لیے موت کی سرد آغوش میں جا سویا تھا۔ اتنی سی دیر میں اسے بچانے کے لیے کسی بھی تدبیر کو بروئے کار لانا بے حد دشوار بلکہ قطعی ناممکن تھا۔ وہ چاہنے کے باوجود اسے نہیں بچا سکتے تھے۔

لیبر یڈ کو موت کی آغوش میں جاتے دیکھ کر دہشت سے ان لوگوں کے روٹنے کھڑے ہو گئے اور بھاری گرم کپڑوں میں ملبوس، انتہائی سرد موسم کے باوجود ان کے مساموں سے بے اختیار پسینا پھوٹ نکلا۔ وہ لمحہ جب دروازے کے دونوں دہانے آپس میں جڑ گئے تھے، ہمیشہ کے لیے ان کی آنکھوں میں منجمد ہو گیا تھا، کبھی نہ بھولنے کے لیے۔ لیبر یڈ مر چکا تھا لیکن ان کے گوشِ سماعت میں اب بھی اس کی لرزادینے والی چیخیں گونج رہی تھیں۔ انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے لیبر یڈ چیختے ہوئے ان سے کہہ رہا ہو۔

”یارو! کیا تم اسی لیے مجھے یہاں لے کر آئے تھے؟ اس آبی قبرستان میں زندہ دفن کر دینے کے لیے؟“

فرینک نے اپنا سر زور سے جھٹکا اور گہرا سانس لیا۔ وہ اس وقت سب سے الگ تھلک کھڑا تھا جبکہ اس کے ساتھی اس سے کچھ فاصلے پر کھڑے تھے۔

میں اسی لمحے ایک زوردار ترخا ہوا اور فرینک کے قدموں تلے بھی موٹی برفیلی تہ کسی خارش زدہ کتے کی مانند کپکپائی، فرینک نے دیکھا یہ ایک نئی دروازہ تھی جو اچانک ہی اس کے ساتھیوں کے قدموں تلے نمودار ہو گئی تھی لیکن اس سے پیشتر کہ

مرجانے کے بعد ہی پتا چلے گا کہ ہم مر گئے ہیں۔“

”نہیں، نہیں..... ایسا مت کہو۔“ فرینک نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”ماویسی گناہ ہے، حوصلہ رکھو، یہ مظاہر قدرت ہمیں شکست نہیں دے سکتے، ہم زندہ رہیں گے اور کامیابی کے تمھے اپنے سینوں پر سجائے، صبح سلامت اپنے اپنے گھروں کو لوٹیں گے۔“ اگرچہ بولتے وقت فرینک کی آواز لرز رہی تھی لیکن اس کے لہجے میں ایسا یقین تھا کہ اس کے سارے ساتھی یکا یک خود کو با حوصلہ اور توانا محسوس کرنے لگے۔ فرینک کی باتوں نے ان کا زندگی پر اعتماد دوبارہ بحال کر دیا تھا۔ ان کے اوایں و سپاٹ چہروں پر کھوئی ہوئی ہلاکت یکا یک ہی عود آئی تھی۔

فرینک نے ریڈیم کپاس کے ذریعے سستوں کا تعین کیا اور طوفان کی شدت اور اس کے دورانیے کا اندازہ لگایا۔ اس کا خیال تھا کہ تندرہ فلی ہوا میں اس کے جہاز کو دھکیلے ہوئے بتدریج ان کے قریب لے آئیں گی۔

اچانک طوفانی ہواؤں کے عقب میں سے ایک دھما نمودار ہوا اور دھیرے دھیرے بڑا ہونے لگا۔ اس سفید دھبے کے پیچھے ہی چند اور سفید دھبے نظر آ رہے تھے جو مسلسل حرکت پذیر تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان حرکت کرتے دھبوں نے نیم نیم قد آور برقانی ریجھوں کی شکل اختیار کر لی۔ یہ قطبی علاقے کے وہ بھوکے ریجھ تھے جو سیل مچھلی کے گوشت کی بو پا کر اس طرف آنکلتے تھے۔

برقانی ریجھوں کو دیکھتے ہی وہ سب کے سب اپنی کلہاڑیوں اور بھالوں کی طرف لپکے۔ ایک قطار میں کھڑے برقانی ریجھ چند لمحوں تک انہیں اپنی شریر بارنگاہوں سے گھورتے رہے اور پھر فوراً ہی چھلانگیں مارتے ہوئے اندھیرے میں غائب ہو گئے۔

”یقیناً یہ ریجھ سیل مچھلی کے گوشت کی بو پا کر یہاں آ گئے تھے۔“ فرینک نے سوچا۔

اس کے چند ساتھی جو ہتھیاروں سے لیس ہو کر ان ریجھوں کو شکار کرنے کے ارادے سے ان کے تعاقب میں گئے تھے، ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ شاید برقانی طوفان ان کو نگل گیا تھا یا پھر وہ راستہ بھٹک کر کسی دوسری سمت جا نکلے تھے۔ فرینک کے ساتھ اب صرف آٹھ آدمی رہ گئے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے، جنہیں اپنی جگہ سے حرکت کرنا بھی دشوار تھا۔ برف نے ان کے ہاتھوں اور پیروں کو منجمد کر دیا تھا۔ نہ تو وہ چل سکتے تھے اور نہ ہی کسی چیز کو اپنی گرفت میں لے سکتے

تھے۔

اب وہ سب ایک مرتبہ پھر مگرے اندھیرے کی لپیٹ میں تھے۔ فرینک کے ساتھیوں کی آخری امید بھی دم توڑ گئی، وہ مایوس ہو گئے اور پاگلوں کی طرح چیختے چلاتے لگے۔ فرینک نے انہیں دلاسا دیا لیکن بے سود، ان پر کوئی اثر نہ ہوا تھا۔ ان سب کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ سب اپنے اپنے سینے کو مسلتے ہوئے ادھر سے ادھر لڑھک رہے تھے پھر ان سب نے ایک ایک کر کے دم توڑ دیا۔ فرینک کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اب وہ اس برقیلے میدان میں تنہا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

وہ اعصابی طور پر بالکل منتشر ہو گیا تھا۔ اس کے حواس نے دھیرے دھیرے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اور وہ اس کیفیت کو پہنچ گیا تھا کہ اسے وقت کا احساس ہی نہ رہا۔ اندھیرے کی گہری دیوار چاروں طرف سے اس کے حصار میں لیے ہوئے تھی اور وہ اندھوں کی مانند اپنے چاروں طرف بھٹکتی ہوئی برف کو انگلیوں سے چھو کر راستہ تلاش کر رہا تھا۔ اس کی پوری کوشش یہی تھی کہ کسی طرح وہ پوسٹ فلک تک پہنچ جائے۔

برف کے ننھے ننھے ذرات اس کے تنہوں اور منہ میں ٹھس گئے تھے جس کی وجہ سے اس کی ناک کا اوپری حصہ اور دونوں ہونٹ سن ہو کر نیلے پڑ گئے تھے۔ اس کے پردہ تصور میں یکا یک ہی وہ چھوٹا سا مکان ابھر آیا جس میں وہ اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔ مکان کے دیوار گیر آتش دان میں آگ دھک رہی تھی اور وہ چاروں طرف سے بند کمرے میں ایک آرام دہ صوفے پر نیم دراز ”ہارپر“ میگزین کے تازہ شمارے میں کھیلوں کی خبریں پڑھ رہا تھا۔ اس کی بیوی انجیلا کچن میں مٹھی اس کے لیے کافی تیار کر رہی تھی اور اس کی بیٹی میوٹی، فرش پر بیچھے قالین پر بیٹھی اپنے کھلونوں سے کھیل رہی تھی۔

یکایک وہ چونک پڑا۔ تیز ہوا کے ایک سنجستہ تھپڑے نے چشم زدن میں اسے تصوراتی دنیا سے نکال کر قطب شمالی کے اندھے، بے رحم اور برقیلے میدان میں لا کھڑا کیا۔ سردی کی شدت سے اس کا بدن کپکپا گیا اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے چاروں طرف برف پھیلی ہوئی تھی۔ سرد اور بے مہر برف، فرحت بخش گھر کا ہیضہ تصور یکا یک ہی جھنجھٹا کر حقیقت کی زمین پر گرا اور ریڑھ ریڑھ ہو کر بکھر گیا۔ اس کی پلوں کے گوشے ننھا ہو گئے۔ اسے یوں لگا جیسے اب وہ

کبھی اپنے گھر نہیں پہنچ سکے گا۔

اس کی دونوں ٹانگیں برقیلے ٹھنڈ کا شکار ہو کر بے حس و حرکت ہو چکی تھیں۔ اس نے ہتھیلیوں کی مدد سے زور زور سے اپنی ٹانگوں کو رگڑا اور دوران خون بحال کرنے کی کوشش کرنا چاہی لیکن بے سود۔ کوشش کے باوجود اس کی اکڑی ہوئی بے جان ٹانگیں سیدھی نہ ہو سکیں۔ خوف سے اس کے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہو گئی۔ یہ اندیشہ کہ اب وہ کبھی اپنے قدموں پر کھڑا نہ ہو سکے گا، اس کے لیے بے حد لرزہ خیز تھا۔ تاہم اس نے ہمت نہ ہاری اور مسلسل بے جان ٹانگوں کو حرکت دیتا رہا۔ ایسا کرتے ہوئے اسے خاصی تکلیف ہو رہی تھی لیکن پھر بھی اس نے ٹانگیں ہلانے اور انہیں حرکت دینے کا عمل جاری رکھا اور بہت دیر تک یہ عمل دہراتا رہا۔ خاصی دیر بعد جب وہ تھک گیا اور مشقت کے باعث پسینا اس کی پیشانی پر چمک اٹھا تو وہ رک گیا۔

اس نے اب محسوس کیا کہ اس کی ٹانگوں کا دوران خون رفت رفتہ بحال ہو رہا ہے۔ تاہم وہ ابھی اس قابل نہیں ہوا تھا کہ اپنے قدموں پر کھڑا ہو جائے۔ وہ سینے کے بل، برقیلے میدان میں لیٹا ہوا تھا۔ اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور چاروں طرف دیکھا لیکن اندھیرا اتنا تھا کہ اسے کچھ بھی نظر نہ آتا تھا۔ فرینک نے اپنے بھرے ہوئے حواس یکجا کیے، خود کو سنبھالا اور کبھیوں اور گھنٹوں کے بل رینگتے ہوئے آگے کی طرف بڑھا۔ اس کی ہمت جواب دے چکی تھی لیکن اس کے باوجود وہ بہت دیر تک یوں ہی آگے بڑھتا چلا گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے رنگ برنگے ستارے ناچ رہے تھے اور سانس بے ترتیب ہو چکی تھی۔

یکایک وہ رک گیا۔ اندھیرے میں اس کا ہاتھ اچانک ہی کسی نرم سی شے سے جا کھرا یا تھا۔ اس نے اپنی انگلیوں کی پوروں کی مدد سے اس نرم شے کو ٹٹول کر دیکھا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی ایک لہری دوڑ گئی۔ یہ نرم سی شے اس کے ایک ساتھی کی لاش تھی جو برف کا شکار ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چمک اٹھے۔ اس نے اپنے مردہ ساتھی کی لاش کو آخری بار پیار سے تھپکا اور آگے بڑھ گیا۔ وہ ہانپتا کا پتا ایک ایک انچ آگے بڑھ رہا تھا۔ اسے پوسٹ فلک کی سمت کا صحیح اندازہ نہیں رہا تھا۔ وہ سمتوں میں نمیز کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھا تھا لیکن اس کے باوجود وہ آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ آخر کار اس نے وہ فیلا نیلا بھی عبور کر لیا جو بہت دیر سے اس کی حد نگاہ میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ اب وہ دوبارہ ایک وسیع

میدان میں رینگ رہا تھا۔

اچانک وہ درد کی شدت سے ہلپلا اٹھا۔ درد کی یہ لہر اس کے شانے کے قریب سے اٹھی تھی اور برقی سرعت سے پورے جسم میں پھیل گئی تھی۔ تکلیف کی یہ لہر اتنی شدید تھی کہ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ اس نے اپنی قوت ارادی کے سہارے بند ہوتی پلوں کو کھولا اور آنکھیں بھاڑے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اسے یوں لگا رہا تھا جیسے کسی نوکیلی شے نے اس کے شانے کے اندر آ کر اسے جوڑے سے علیحدہ کر دیا ہو اور اس کے بازو کے گوشت کو برقی طرح اڑھیر ڈالا ہو۔

یکایک وہ ٹھٹھک گیا۔ اس نے خود سے تھوڑے سے فاصلے پر چند حرکت پذیر مدھم ہوئے دیکھ لیے تھے۔ یہ ہوئے ان برقانی ریجھوں کے تھے، جو بھوک سے بے تاب ہو کر شکار کی تلاش میں اپنی کھوہ سے باہر نکل آئے تھے۔ ان ہی میں سے ایک ریجھ کھوٹا ہوا اس کی طرف آنکلا تھا اور اس کے بازو پر سے گوشت نوج کر لے گیا تھا۔ موت..... بھیا تک موت، ازیت ناک موت کو خود سے اتنا قریب پا کر اس کے اعصاب سنسنا اٹھے اور آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا لیکن پھر دوسرے ہی لمحے اس کی مضبوط قوت ارادی نے اسے سنبھال لیا۔ وہ اتنی آسانی سے مرنے والوں میں سے نہیں تھا۔ اس نے سوچا، وہ آخری دم تک جدوجہد کرے گا اور خود کو برقانی ریجھوں کا قہر تر بننے سے بچانے کی کوشش کرے گا۔

اس نے اپنی کھوئی ہوئی توانائی کو جمع کیا اور رینگتے ہوئے ان ریجھوں کی مخالف سمت میں بڑھ گیا۔ اس نے اس بات پر اپنے دل میں خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ وہ ریجھ جو اس کے بازو سے گوشت نوج کر لے گیا تھا، دوبارہ اس کی طرف پلٹ کر نہیں آیا تھا۔ اسے حرکت کرتے دیکھ کر دوسرے ریجھ اپنی جگہ رک گئے تھے۔

وہ کسی گڑھے یا غار کی تلاش میں تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر اسے کوئی غار مل جاتا تو وہ اس میں چھپ کر بیٹھ جاتا اور اس طرح خود کو برقانی ہوا اور بھوکے ریجھوں کے حملے سے محفوظ کر لیتا۔

وہ بہت دیر تک ایک ایک انچ کر کے آگے کی جانب کھسکتا رہا اور رینگتا رہا۔ دھیرے دھیرے آگے کی طرف رینگتے ہوئے وہ ایک مرتبہ پھر اپنے ایک مردہ ساتھی کی لاش سے جا کھرایا۔ سرد موسم اور تیز ہوانے اس لاش کو برقی طرح اکڑا دیا تھا۔ فرینک کا دل بھر آیا۔ شاید اس کے تمام ساتھی برقانی موسم، تند سرد ہوا اور قطب شمالی کے طوفانی جھکڑوں کی

نشان

سید احتشام

جرم کو کتنا ہی مخفی رکھا جائے، آشکار ہو کر رہتا ہے۔ مغرب میں تو جرم کو مخفی رکھنا از حد دشوار ہے کہ وہاں کی پولیس بال کی کھال نکالنا اچھی طرح جانتی ہے۔ اس پیچیدہ کیس میں بھی قانون کے رکھوالے چونکا دینے والے انداز میں مجرم تک پہنچے تھے۔

ایک قتل کی واردات کا قصہ دل پذیر

اچلی شب اپنے یہاں مدعو کیا۔ وہ شخص حسب وعدہ اس کے یہاں پہنچ گیا۔ باربرا کی فیملی اس شخص سے حد درجہ متاثر ہوئی۔ اس کا نام رسل تھا۔ اس کے جسم پر بیش قیمت لباس تھا۔ باربرا کی فیملی کے علم میں یہ بات آئی کہ اس کی عمر ستائیس سال تھی۔ گویا وہ باربرا سے دس سال بڑا تھا۔ انہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ فلاڈیلفیا کے ایک محکمہ جاتی اسٹور میں کریڈٹ فیچر کی حیثیت سے ملازم تھا۔ کان سے کم سنتا تھا لیکن اس کی یہ خامی باربرا کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی

باربرا موگر کو مٹھائی کی اس دکان میں استقبال پر کام کرتے ہوئے ایک ہفتہ ہوا تھا کہ ایک دن ایک شخص دکان میں داخل ہوا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ وہ شیدہ قامت اور خوش شکل تھا۔ اس کی باتیں چمے دار تھیں۔ باربرا اسے دل دے نہ سکی۔ وہ سترہ سال کی ایک حسین و جمیل اور مہر شباب دوشیزہ تھی۔ اس کی راہ میں آنکھیں بچانے والے پھینکا گئے ہوں گے لیکن وہ پہلے بھی کسی کی محبت میں گرفتار نہیں ہوئی تھی۔ یہ اس کی پہلی محبت تھی لہذا وہ اپنی اس محبت میں بہت سنجیدہ تھی۔ اس نے اس شخص کو اپنی فیملی سے ملانے کے لیے

جیب میں ٹھونس لی۔ یہ رقم واپسی میں اس کے کام آ سکتی تھی بشرطیکہ وہ اس پر فیلے میدان سے نکل جانے میں کامیاب ہو جاتا۔ نوٹوں کی یہ گڈی پلاسٹک کی ٹھیلی میں ملفوف ہونے کے باعث بالکل خشک تھی۔ اس نے دوسری جیب ٹٹولی تو اس میں سے ایک ماچس کی ڈبیا نکل آئی۔ ماچس کی ڈبیا کو دیکھ کر فرینک کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی لیکن جب اس نے اس ڈبیا کو کھول کر دیکھا تو اس کے لبوں کی مسکراہٹ کا فور ہو گئی۔ اس میں صرف ایک تیلی تھی۔ باقی تیلیاں شاید اس نے مرنے سے پہلے استعمال کر لی تھیں۔ تاہم فرینک بدل نہیں ہوا تھا۔ ماچس کی ایک ہی تیلی سی لیکن تھی تو.....

اور یہ تیلی کسی بھی آڑے وقت میں کام دے سکتی تھی۔ وہ تھوڑا سا آگے بڑھا اور ایک برقی ٹیلے پر جا کھڑا ہوا۔ دور..... بہت دور اسے ایک خیمے کا ہولنا نظر آیا تھا۔ اس کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ یہ خیمہ پوسٹ فلک والوں کا تھا۔ اس کی رگ و پے میں بجلی سی دوڑ گئی۔ اس کی جانب بڑھنے والے موت کے پنجے کا ایک ہی اس سے بہت دور ہو گئے تھے۔ وہ ٹیلے سے اُترا اور دوڑتے ہوئے خیمے کی طرف لپکا۔ زندگی اچانک ہی دوبارہ اس پر مہربان ہو گئی تھی۔ پوسٹ فلک والوں کا خیمہ اس کی توقع کے برخلاف کچھ زیادہ ہی فاصلے پر تھا۔ وہ ایک کھنکھنے تک مسلسل ہانپتے کانپتے دوڑتا رہا تھا۔ خیمے کے قریب پہنچتے ہی وہ چکر اکر زمین پر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

پوسٹ فلک میں متعین عمدا سے دیکھتے ہی اس کی طرف لپکا اور اسے اٹھا کر خیمے میں لے گیا۔ خیمے میں پہلے ہی سے اس کے چند ساتھی موجود تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو کرتے پڑتے کسی نہ کسی طرح یہاں تک آنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور مرنے سے بچ گئے تھے لیکن اس حالت میں کہ ان کے ہاتھوں، پیروں اور چہروں کا گوشت گل کر ان کی جلد سے علیحدہ ہو چکا تھا۔

فوری دیکھ بھال اور نگہداشت کی وجہ سے اسے جلد ہی ہوش آ گیا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ اس کے ساتھی اسے زندہ اور صحیح سلامت دیکھ کر اسے مبارک باد دینے لگے۔

”مجھے..... ایک بار مہذب دنیا تک پہنچ جانے دو۔“ فرینک ان کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور بولا ”میں پھر آؤں گا۔ تازہ دم ہو کر..... نئے ساتھیوں کو لے کر.....“

•••

تاب نہ لاکر ہلاک ہو چکے تھے۔ اس نے اپنی جیب سے شکاری چاقو نکالا اور اسے اپنے مردہ ساتھی کی برف سے ڈھکی جیکٹ میں اتار دیا۔ ٹوٹ کر برف ادھر ادھر بکھر گئی۔ اسے اپنا یہ عمل اچھا نہیں لگا تھا لیکن وہ ایسا کرنے پر مجبور تھا۔ اس نے نہایت احتیاط سے اس کے کپڑوں کی تلاشی لی تھی اور اس کی جیبیں ٹٹولی تھیں۔ اسے یقین تھا کہ مرنے والے کے پاس ماچس ضرور ہوگی لیکن خاصی دیر کی تلاش کے باوجود فرینک کو اس کی کسی بھی جیب میں ایسی کوئی چیز نہ مل سکی جس کے ذریعے وہ آگ جلانے میں کامیاب ہو جاتا۔

وہ تلاشی کے عمل سے فارغ ہوا تو اس کے چہرے پر مایوسی کی لہر پھیل گئی۔ چند لمحے چپتر اس کے دل میں امید کی جو جمع فردزاں ہوئی تھی وہ پلک جھپکتے میں مفقود ہو چکی تھی۔ اسے یقین ہو گیا کہ اس کے مردہ ساتھی کے پاس بھی ماچس موجود نہ تھی یا اگر تھی بھی تو شاید وہ اس کی آخری تیلی تک مرنے سے پہلے اپنے لیے استعمال میں لا چکا تھا۔

☆☆☆

برف گرنے کا سلسلہ جورات بھر جاری رہا تھا، اب بند ہو گیا تھا اور مشرق کی جانب اُٹنی پر ہلکا سا آجالا پھوٹ پڑا تھا۔ زردی مائل بھورا آجالا، یہ آجالا اس بات کی علامت تھی کہ قطب شمالی میں دن نکل آیا تھا۔ ہوا کے جھکڑوں میں خاصی کمی واقع ہو گئی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی سردی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ فرینک کے کانوں میں دھماکے سے ہونے لگے۔ چاروں طرف پھیلی ہوئی برف جگہ جگہ سے تر خنے لگی تھی اور یہ دھماکے برف کے تر خنے سے ہی پیدا ہو رہے تھے۔

فرینک کا جی چاہا کہ وہ آنکھیں بند کر لے اور ہمیشہ کے لیے سو جائے۔ رات بھر مٹھتے رہنے کی وجہ سے وہ خاصا تھک گیا تھا لیکن اس نے فوراً یہ خیال اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ رُک جانے کا مطلب تھا خود کو موت کے حوالے کر دینا اور فرینک کسی حالت میں خورکشی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے اپنے تیسرے ساتھی کی لاش ایک لمبی چوڑی برف کی بیل کے نیچے دبی ملی تھی۔ جگہ جگہ سے چمکی ہوئی، اس بدن پر کئی جگہ سے گوشت غائب تھا اور سفید ہڈی باہر جھانک رہی تھی۔ فرینک سمجھ گیا کہ ان بھوکے رنجھوں کی کارستانی تھی جورات کے اندھیرے میں اس طرف آنکھ لگے تھے۔

اس نے لاش سے کتر اے آگے نکل جانا چاہا لیکن پھر وہ رُک گیا اور اس کی تلاشی لینے لگا۔ جیکٹ کی اندر دلی جیب میں اسے نوٹوں کی ایک بڑی گڈی ملی جو اس نے فوراً ہی اپنی



کیونکہ وہ نہ صرف امیر بلکہ تعلیم یافتہ بھی تھا اور کئی زبانیں جانتا تھا۔ اس کی شخصیت خاصی متاثر کن تھی۔ وہ اپنے محلے کے بچوں کو سوسائٹک پول میں تیراکی بھی سکھاتا تھا۔

اس ملاقات کے ایک ہفتے کے بعد باربرائے اس کے کہنے پر اپنی ملازمت چھوڑ دی اور اس کے بلاؤنڈز پر پارٹنر بن گیا۔ اسٹور میں اسٹینوگرافر کی حیثیت سے ملازم ہو گئی۔ پھر رسل اتنی آزادی سے اس کے یہاں آنے جانے لگا گویا وہ موگر ٹیلی کا داماد بن چکا ہو۔ مسٹر اور مسز موگر یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے کہ اگر وہ خود باربرائے کے لیے کوئی بڑا ڈھونڈتے تو انہیں اس سے اچھا داماد نہیں مل سکتا تھا۔ وہ دھوم دھام سے ان کی شادی کا پروگرام بنانے لگے لیکن تین ہی مہینے کے بعد انہیں ایک دن جب یہ خبر ملی کہ باربرائے بھاگ گئی ہے تو ان کا دل بیٹھ گیا۔ انہیں یہ خبر ایک خط کے ذریعے ملی تھی جو شکاگو سے پوسٹ کیا گیا تھا۔ اس خط میں باربرائے اپنی بچکانہ تحریر میں لکھا تھا کہ وہ اور رسل وسطی امریکا جا رہے ہیں اور یہ کہ وہ راستے ہی میں شادی کر لیں گے۔ ان کی روایتی اتنی جلدت میں ہوئی تھی کہ انہیں ان لوگوں کو مطلع کرنے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔ وہ جلد ہی دوبارہ خط لکھنے لگی اور کچھ دنوں کے بعد رسل کے ہمراہ فلاڈیلفیا لوٹنے کی اور ان کی دعاؤں میں لے گئی۔

مسٹر اور مسز موگر کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا لیکن انہیں یہ اطمینان ضرور ہو گیا کہ وہ دونوں خوش تھے۔ یہ خط پہنچا ہی تھا کہ ایک اسکینڈل رونما ہونے لگا۔ سب سے پہلے ڈیپارٹمنٹل اسٹور کے تقشیش کار وارد ہوئے اور پوچھنے لگے کہ وہ کم شدہ جوڑا کہاں ہے؟ ان کا کہنا تھا کہ رسل فرم کی رقم سات سو ڈالرز لے کر بھاگ گیا تھا۔ پھر پولیس اس خبر کے ساتھ آدھکی کہ وہ شخص جو ان کی بیٹی کو بھگالے گیا ہے، پہلے سے شادی شدہ تھا۔ دو بچوں کا باپ تھا اور یہ کہ بہت ہی دل پھینک واقعہ ہوا تھا۔

پولیس تو چلی گئی لیکن مسٹر اور مسز موگر کا سکون بھی اپنے ساتھ لے گئی۔ اب وہ اپنی بیٹی کے اگلے خط کا انتظار ہی کر سکتے تھے۔ اسی دوران پورے ملک میں ان دونوں کی تلاش شروع ہو گئی، جس کا سلسلہ آخر کار وسطی اور جنوبی امریکا اور پھر یورپ تک پھیل گیا لیکن کہیں بھی ان کا پتہ نہ چل سکا۔ دن اور رات ایک دوسرے کا تعاقب کرتے رہے۔ مسٹر اور مسز موگر اپنی بیٹی کے خط کا انتظار کرتے رہے لیکن کوئی خط نہیں آیا۔ اسی طرح چھ ماہ گزر گئے۔ پھر 2 اگست کو وہاں سے تین ہزار میل دور کیلی فورنیا کے مضافات اسٹون لیسین سے گزرنے والے دو لڑکوں کو ایک جھاڑی میں سے جھانکتا ہوا،

ایک عورت کا سر نظر آیا۔ دونوں لڑکے دیر تک اس سر کو گھورتے رہے پھر وہ مڑ کر بھاگتے ہوئے وہاں سے نصف میل دور واقع ایک کیمپ تک پہنچے اور وہاں موجود ایک شخص کو بتایا کہ انہوں نے کیا دیکھا تھا، اس شخص نے پولیس کو فون کر دیا۔

☆☆☆

اطلاع ملنے ہی لاس اینجلس ہوی سائڈ بیورو کے دو سراغ رساں لیٹننٹ فریک اور رائے کو تقشیش کے لیے وہاں بھیج دیا گیا جہاں ایک ڈپٹی کورونر، ایک پولیس کیمسٹ اور ایک پولیس فوٹوگرافر بھی آئے تھے لیکن وہاں سہرے بالوں والی کوئی لڑکی جھاڑیوں میں سے نہیں جھانک رہی تھی جیسا کہ ان لڑکوں نے بیان کیا تھا بلکہ انہوں نے جو کچھ دیکھا، وہ انسانی کھوپڑی کی کھال تھی جس سے سہرے بال اب بھی چپکے ہوئے تھے۔ اس مقام سے تقریباً دو سو فٹ کے فاصلے پر انہیں ایک لاش کی باقیات ملیں۔ لاش پشت کے بل پڑی ہوئی تھی، بالکل برہنہ تھی اور اس کی دائیں ٹانگ غائب تھی۔ ان لوگوں نے لاش کا معائنہ کیا۔ اس کا پیٹ چاک تھا اور اندرونی اعضا غائب تھے۔ یہ بظاہر کسی جنگلی جانور کی کارستانی لگتی تھی۔ ان لوگوں نے دیکھا کہ اس کی پیشانی کے بائیں طرف فریکر بھی تھا۔ وہ بلاشبہ کسی نوخیز و شیرازہ کی لاش تھی۔ عمر تیس سال سے زیادہ نہیں رہی ہوگی۔ اس کے خدو خال بتاتے تھے کہ وہ بہت حسین اور بہت خوش اندام رہی ہوگی۔ ناخن خوبصورتی سے ترشے ہوئے تھے لیکن اب وہ تو بہت کمزور جسم سکڑا ہوا لگ رہا تھا۔ سورج کی تپش نے کھال کو جھلسا دیا تھا۔ یہ ایک انتہائی دلخراش اور روح فرسا منظر تھا۔ لڑکی کی ستواں ناک کے پائے پر گولی کا ایک سوراخ تھا۔ حرید دوسراخ بائیں سینے کے اندر نظر آ رہے تھے لیکن ان سوراخوں میں گولی داخل نہیں ہوئی تھی بلکہ ان میں سے نکل گئی تھی۔ کورونر کے آدمیوں نے دستانے پہن کر لاش کو اوندھا کر دیا۔ لڑکی پر تین گولیاں چلائی گئی تھیں۔ ایک سر کی پشت پر جو ناک سے نکل گئی تھی اور باقی دو گولیاں شانے پر جو سینے کے نیچے پائے جانے والے زخم کا نتیجہ تھیں۔ ان دو میں سے ایک گولی اب بھی جسم میں موجود تھی۔ کورونر نے اندازہ لگایا کہ لاش چار سے چھ ہفتے پڑانی تھی۔

سراغ رساں فریک اور رائے، لڑکی کی گم شدہ ٹانگ کا سراغ لگانے کے لیے علاقے کو چھاننے لگے لیکن ٹانگ کا کہیں سراغ نہ مل سکا۔ ہاں، لاش سے چند ہی منٹ کے فاصلے پر انہیں کھجی جھاڑیوں میں کسی شیر خوار کی کھوپڑی اور

اس کی ٹھنی ٹھنی ٹانگوں کی دو ہڈیاں ملیں۔ ان سراغ رساںوں کی نظریں غیر ارادی طور پر لڑکی کی لاش پر چلی گئیں۔ انہوں نے بہت احتیاط سے اس کا معائنہ کیا اور اب ان کی سمجھ میں آیا کہ وہ لڑکی حاملہ تھی۔

وہ جنگل اور جھاڑیوں کو کھنگالتے ہوئے، تیس فٹ کی بلندی سے گر کر ”مل ہالینڈ ڈرائیو“ پر پہنچے۔ یہاں اس ہائی وے پر سڑک کے کنارے گرد و غبار میں انہیں چار چمکتی ہوئی چیزیں ملیں۔ یہ ہڈیوں کے تھے ہوئے چار منکے تھے جن پر بائیں دانت کی پالش تھی۔ یہ منکے ایک ٹوٹے ہوئے دھاگے میں پروئے ہوئے تھے۔ اس دریافت سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ قتل غالباً اسی مقام پر ہوا تھا۔ اس دوران اور سنان بلند ہائی وے پر لڑکی نے بھاگنے کی کوشش کی تھی اور پیچھے سے اس پر فائر کیے گئے تھے اور پھر اس کے کپڑے اتار کر اس کی لاش نیچے پھینک دی گئی تھی۔ ان سراغ رساںوں نے مزید ایک گھنٹا وہاں گزارا اور پھر لاس اینجلس واپس آ گئے، جہاں کورونر نے انہیں بتایا۔

”ہم نے لاش کی صفائی کر کے اسے سرد خانے میں رکھوا دیا ہے۔ یہ رہی اس کی انگوٹھی اور یہ رہی وہ گولی جو اس کی ریڑھ کی ہڈی میں پھنسی ہوئی تھی اور جو میں نے نکالی ہے۔ یہ اعشاریہ تین آنٹھ کی گولی لگتی ہے۔“

”ڈاکٹر، آپ کو کوئی اندازہ ہے کہ جب وہ حیات تھی تو دیکھنے میں کیسی لگتی تھی؟“

”ہاں۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا ”یہ رہی ٹائپ شدہ رپورٹ۔ قد پانچ فٹ چار انچ، وزن چار اسٹون، زلفیں سنہری، خوش جمال اور خوش اندام۔ عمر اٹھارہ اور پچیس کے درمیان۔ مجھے ایسا کوئی ثبوت نہیں ملا کہ اس کی وہی ٹانگ مصنوعی تھی۔“

”ڈاکٹر! رائے بولا ”میں اور فریک سوچ رہے تھے کہ ممکن ہے، اس کی ٹانگ میں کسی قسم کا نقص ہو، جس سے ہمیں اس کی شناخت میں مدد مل سکے۔“

”اور تم لوگ یہ سوچ رہے ہو کہ قاتل نے وہ ٹانگ کاٹ دی؟“ ڈاکٹر حیرانی سے بولا، پھر اس نے سر ہلایا ”ہاں، یہ ممکن ہے۔ جب لاش سڑنے لگی ہوگی تو یہ کام مشکل نہیں ہوا ہوگا۔“

دکانداروں کا یہ طریقہ تھا کہ وہ اس طرح چیزوں کا ریکارڈ رکھتے تھے۔ سراغ رساںوں نے ان کی ایسوسی ایشن سے رابطہ کیا تو پتا چلا کہ وہ فقہ بین اسٹریٹ کی ایک دکان کا تھا۔ اس دکان کے ریکارڈ سے یہ ظاہر ہوا کہ وہ نمبر سبز باربرا، 841 گولڈن ایونیو، لاس اینجلس کو چار جون کو جاری کیا گیا تھا۔ سبز باربرا نے 50 سینٹ کے عوض وہ انگوٹھی گروی رکھوائی تھی اور چار دن کے بعد قرض ادا کر کے انگوٹھی چھڑائی تھی۔

”مجھے وہ لڑکی اچھی طرح یاد ہے۔“ دکاندار نے کہا ”وہ اٹھارہ سال سے زیادہ عمر کی نہیں تھی اور حاملہ تھی۔ وہ انگوٹھی نہایت معمولی تھی لیکن مجھے اس پر ترس آ گیا تھا۔“

سراغ رساں گولڈن ایونیو کے پتے پر پہنچے اور 841 نمبر اپارٹمنٹ کے دروازے پر دستک دی لیکن اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ انہوں نے اپارٹمنٹ بلڈنگ کے منیجر کو ڈھونڈ نکالا۔ وہ مسز لیٹرڈ نامی ایک خاتون تھی۔ ”میں کسی مسز باربرا کو نہیں جانتی۔“ وہ بولی لیکن جب رائے نے اس کا حلیہ بیان کیا اور عمر بتائی تو اسے ایک دم یاد آ گیا ”ہاں، اب میں سمجھ گئی۔“ اس نے کہا ”کہیں اسے کچھ ہوا تو نہیں گیا؟ اگر اسے کچھ ہوا ہے تو اس میں اس کے شوہر رسل کا ہاتھ ہوگا۔“

”تم ایسا کیوں کہہ رہی ہو، مسز لیٹرڈ؟“

”کیونکہ وہ پینک پر گئی تھی اور اب تک واپس نہیں آئی، بے چاری!“ مسز لیٹرڈ نے جواب دیا ”آپ جا کر مسز برنس سے ملیں۔ وہ آپ کو بہت کچھ بتا سکتی۔ وہ شہر کے بلٹ مور ہوٹل میں کام کرتی ہے۔ شام میں لوٹے گی، وہ اور باربرا اچھی دوست تھیں۔“

”اس دوران میں آپ جو کچھ ہمیں بتا سکتی ہیں، بتائیں۔“ رائے نے کہا۔

”دونوں میاں بیوی پچھلے سال اپریل میں یہاں آئے تھے۔“ مسز لیٹرڈ بتانے لگی۔ ”باربرا امید ہے تھی اور اس کے یہاں جولائی یا اگست میں ولادت متوقع تھی۔ دونوں بہت اچھے تھے۔ وقت پر کرایہ ادا کرتے تھے اور پریشان نہیں کرتے تھے۔ رسل ہر صبح کام پر چلا جاتا تھا۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کیا کرتا تھا لیکن ظاہر ہے کہ وہ کوئی اچھی ملازمت کرتا ہوگا اور اسے اچھی تنخواہ ملتی ہوگی۔ تاہم باربرا خوش نہیں نظر آتی تھی۔ وہ اکثر روتی رہتی اور اکثر رات میں اپنے شوہر کی منتیں کرتی ہوئی سنائی دیتی تھی۔ یہ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کیا منتیں کرتی تھی۔ پھر 24 جون کو اتوار کی صبح رسل نے ایک کار کرائے پر حاصل کی اور اپنی بیوی کو پینک پر لے گیا۔ اس نے

رسل نے باربرا کو ہلاک کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اگر وہ محض اسے چھوڑ دیتا تو نہ صرف یہ کہ اس کا سارا کچا چٹھا سامنے آ جاتا بلکہ اسے سنگین نوعیت کے الزامات کا بھی سامنا کرنا پڑتا۔ چنانچہ اس کے سامنے صرف ایک ہی راستہ رہ گیا تھا اور اس نے وہی راستہ اختیار کیا۔ باربرا سے ہمیشہ کے لیے نجات پانے کا راستہ۔

☆☆☆

سراغ رسالوں نے مسز برنس کی اطلاع کی روشنی میں اس سنیما ہاؤس کا پتا چلا لیا۔ اس کا نام میٹرو پولیٹن تھیٹر تھا۔ اس کے فلیئر نے بتایا کہ مئی کے مہینے میں اس سنیما ہاؤس میں از کڈیشنڈ نصب کیا گیا تھا اور اس کا ٹھیکہ لاس اینجلس کی ایک بہت بڑی فرم کو دیا گیا تھا۔ فریک اور رائے کے لیے یہ اطلاع حد درجہ اہمیت رکھتی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ رسل کا سراغ مل گیا تھا۔ وہ دونوں وہاں سے اٹھ کر سیدھے اس فرم میں پہنچ گئے۔ وہاں رسل ایک ڈیسک پر کسی بلو پرنٹ پر کام کرتا ہوا نہیں مل گیا۔ وہ بغیر آستینوں والی شرٹ پہنے ہوئے تھا اور ایک ڈھیلی ڈھالی سیاہ ٹائی اس کے گلے میں لٹک رہی تھی۔ اس کے بال نفاست سے سنورے ہوئے تھے اور سچ سے مانگ لگی ہوئی تھی۔

”تم پولیس مین ہو اور مجھ سے میری بیوی کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہو؟“ ان کے قریب پہنچنے پر وہ مخاطب ہوا ”میں سب کچھ بتاتا ہوں۔“

دونوں سراغ رسالوں ایک لمبے کے لیے بولکھلا گئے اور پھر اس کے کچھ بتانے کا انتظار کرنے لگے لیکن اس نے جو کچھ بتایا، انہیں اس کی توقع نہیں تھی۔

”میں اسے مل ہالینڈ ڈرائیو لے گیا تھا۔“ وہ بولا ”وہاں ہمارا بنگلہ ہوا گیا۔ وہ کسی اور مرد سے پیشکش بڑھارہی تھی۔ وہ ناراض ہو کر کار سے اتر گئی اور پھر میں نے اسے آج تک نہیں دیکھا۔“

”اس حالت میں۔“ فریک نے کہا ”کہ وہ حاملہ تھی اور ایک مہینے کے بعد اس کے یہاں ولادت ہونے والی تھی، وہ کسی اور مرد سے پیشکش بڑھارہی تھی۔“

”یہ سچ ہے۔“

”وہ اس وقت کیا پہنے ہوئے تھی؟“

”وہی جو عام طور سے حاملہ عورتیں پہنتی ہیں۔ ہلکا پھلکا لباس۔“

”کیا ایک ایسے لباس میں، جسم پر کوئی کوٹ نہیں، جیب میں پیسے نہیں۔ وہ ایک سنان سڑک پر اتر گئی اور تمہاری

آئے تھے؟“

”نہیں جناب! اس نے یہ نہیں بتایا تھا۔“

”کیا اس نے بھی یہ بتایا تھا کہ اس کے دھنی ٹانگ میں کوئی نقص تھا؟“

”نہیں۔“

”کیا تمہیں معلوم ہے کہ رسل کہاں کام کرتا تھا اور کیا کرتا تھا؟“

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

☆☆☆

اس ڈر سے کہ کہیں رسل غائب نہ ہو جائے، اخبارات کو مقتولہ کا حلیہ جاری نہیں کیا گیا۔ پولیس ہیڈ کوارٹرز سے پنسلوانیا اسٹیٹ پولیس کو مطلع کیا گیا اور اس جوڑے کا حلیہ بتا کر ان سے کم شدہ افراد کی فائل چیک کرنے کی درخواست کی گئی۔ پھر علی الصباح فریک اور رائے اس کو ہستانی علاقے کو چھاننے پہنچ گئے لیکن کم شدہ ٹانگ ایک معما بنی رہی۔ تاہم اسٹون کیسین کے مشرقی حصے میں انہیں اعشاریہ تین آٹھ کی گولیوں کا ایک ڈھال مل گیا۔ اس ڈبے میں بیالیس گولیاں تھیں اور اس برلاس اینجلس کی ایک دکان کا لیبل چسپاں تھا۔ وہاں سے نکل کر وہ دونوں اس دکان پر پہنچے، جہاں ریکارڈ سے یہ ثابت ہوا کہ وہ 23 جون کو اس دن فروخت کیا گیا تھا، جس دن رسل نے اپنی بیوی باربرا کو ریو اور کا کلیئر معلوم کرنے کے لیے فون کیا تھا۔ ان سراغ رسالوں کے پوچھنے پر دکان دار نے خریدار کا جو حلیہ بتایا، وہ رسل سے ملتا جلتا تھا۔

اب مسز برنس نے پولیس کو فون کر کے بتایا کہ اسے یاد آتا ہے کہ اس نے رسل کے اپارٹمنٹ میں کسی سنیما کے روشن دان کی تعمیر کے نقشے دیکھے تھے ”غالبا وہ اسی قسم کا کام کرتا تھا۔“ وہ بولی۔

تب فلاڈیلفیا کی پولیس نے رسل کے بارے میں مکمل حقائق اور باربرا کے بارے میں تھوڑے بہت حقائق اکٹھے کر لیے۔ جن میں سے ایک حقیقت یہ تھی کہ باربرا کی دھنی ٹانگ کا ایک مرتبہ آپریشن ہوا تھا اور اس آپریشن کا ایک بڑا سائن تھا۔ ویسے اس کی ٹانگ میں کوئی نقص وغیرہ نہیں تھا۔ فریک اور رائے دونوں کو اب یقین ہو چلا تھا کہ غیر شادی شدہ باربرا چونکہ حاملہ ہو گئی تھی لہذا وہ شادی کرنے کے لیے رسل سے اصرار کرتی رہتی تھی۔ وہ اس حقیقت سے واقف نہیں تھی کہ رسل پہلے سے شادی شدہ تھا لیکن وہ یہ ضرور سمجھ گئی تھی کہ رسل اسے کسی دوسری عورت کی خاطر چھوڑنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ یہی وہ دھنی کشمکش تھی جس سے چھٹکارا پانے کے لیے

وہ ایک بار پھر مسز برنس سے ملنے گولڈن ایونیو پہنچ گئے جس کے بارے میں مسز لیئرڈ نے کہا تھا کہ وہ باربرا کی اچھی سہیلی تھی۔ مسز برنس چالیس سال کی، گداز جسم کی مالک عورت تھی۔ فریک اور رائے نے اسے منگے کی ٹوٹی ہوئی مالا دکھائی اور وہ فوراً پہچان گئی۔ ”یہ مالا باربرا اس دن پہنے ہوئے تھی، جس دن وہ لاپتا ہوئی تھی۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ زندہ نہیں ہے۔“ وہ بولی۔ پھر وہ اس پکنک کا ذکر کرنے لگی جس کا ذکر مسز لیئرڈ پہلے کر چکی تھی اور پھر گویا ہوئی ”میں نے ان کے پکنک پر جانے سے ایک دن پہلے یعنی 23 جون کو رسل کے پاس اعشاریہ تین آٹھ کا ایک ریو اور بھی دیکھا تھا۔ میں نے نہ صرف دیکھا تھا بلکہ ہاتھ میں بھی لیا تھا اور باربرا کے کہنے پر رسل کو اس ریو اور کی گولیاں بھی فراہم کی تھیں۔“

”کیا مطلب؟“ دونوں سراغ رسالوں چونک کر بولے۔

”مطلب یہ کہ اس صبح رسل نے اسلحہ کی ایک دکان سے مجھے فون کیا تھا، جہاں سے وہ ٹارگٹ پر پیکش کرنے کے لیے گولیوں کا ایک ڈبا خریدنا چاہتا تھا کیونکہ اس کے پاس جو ریو اور تھا، وہ اس نے کسی سے عاریتاً لیا تھا اور اسے اس ریو اور کے کلیئر کا علم نہیں تھا۔ اس نے اپنی بیوی باربرا سے فون پر کہا کہ وہ ریو اور دیکھ کر بتائے کہ وہ کس کلیئر کا ہے۔ باربرا نے پوچھا کہ اس نے ریو اور کہاں رکھا ہے جس پر وہ بولا کہ ریو اور ڈریسری دراز میں ہے۔ باربرا نے اسے ہولڈ کرنے کو کہا اور پھر مجھ سے درخواست کی کہ میں اس کے ساتھ نیچے اس کے اپارٹمنٹ میں چلوں کیونکہ اگر اس نے ریو اور کو ہاتھ میں بھی لیا تو ہمارے خوف کے اس کا دم نکل جائے گا۔ چنانچہ میں اس کے ساتھ چلی گئی اور ریو اور دیکھ کر بتا دیا کہ وہ کس کلیئر کا ہے، پھر باربرا نے فون پر رسل کو اس کے کلیئر سے آگاہ کر دیا۔“

”کیا وہ ریو اور تمہیں اب بھی یاد ہے؟“ سراغ رسالوں نے پوچھا۔

”ہاں، مجھے یاد ہے۔ وہ لمبی نال کا ایک وزنی ریو اور تھا۔ اس پر سن اعشاریہ تین آٹھ کندہ تھا۔“ اس نے ایک لمحہ توقف کیا پھر بولی ”باربرا نے مجھے بتایا تھا کہ وہ مشرقی سے، غالباً پنسلوانیا سے آئی تھی اور یہ اپارٹمنٹ کرائے پر لینے سے پہلے، کہیں اور دو مہینے سے زیادہ نہیں ٹھہری تھی۔ وہ مختلف ناموں سے ٹھہرتے تھے لیکن اس کے شوہر نے اس کی وجہ نہیں بتائی تھی۔“

”کیا باربرا نے یہ بتایا تھا کہ وہ پنسلوانیا کے کس شہر سے

ایسا ہی کچھ کہا تھا لیکن شام میں جب وہ لوٹا تو تھا تھا۔ اس نے ایک مضحکہ خیز کہانی سنائی۔ اس نے کہا کہ واپسی میں لاٹک سچ پر باربرا کی خالہ مل گئی جو ریلوے اسٹیشن پر ایک ٹیکسی سے اتر رہی تھی۔ وہ اپنے گھر لوٹ رہی تھی۔ باربرا ان کے ساتھ چلی گئی تاکہ ولادت کے موقع پر وہ اپنے ماں باپ کے پاس رہے۔“ وہ سانس لینے کو رکھی اور پھر گویا ہوئی۔

”اگلے روز رسل کو پچھلے احاطے میں باربرا کے بہت سے کپڑے جلاتے ہوئے دیکھا گیا۔ اس نے کئی پارسل بھی حوالہ ڈاک کیے اور باربرا کی پالتو بلی کو بھی آزاد کر دیا۔ اس کے چند ہی دنوں کے بعد وہ کچھ بتائے بغیر کہیں چلا گیا اور اس کے بعد سے اب تک ہمیں اس کی کوئی خبر نہیں۔ باربرا کا بھی کوئی پتا نہیں چلا۔“

سراغ رسالوں نے دوسرے پڑوسیوں سے بھی پوچھ گچھ کی اور پھر اپنے ہیڈ کوارٹرز لوٹ گئے۔ جب وہ وہاں پہنچے تو ایک شخص ان کے پاس آیا اور ان سے مخاطب ہوا ”میرا نام ٹینڈ ہے اور میں ایک ٹیکسی ڈرائیور ہوں۔“ اس نے اپنی آواز دہرائی ”4 جولائی کی رات کو ایک شخص نے مجھے روکا اور ”مل ہالینڈ ڈرائیو“ چلنے کو کہا۔ پھر اسٹون کیسین کے مغرب میں تقریباً سو گز پہنچ کر اس نے ٹیکسی روکوائی۔ اس کے پاس کاغذ میں لپیٹی ہوئی کوئی چیز تھی، شراب کی بوتل کا ساڑ اور شکل کی، اس نے مجھے رکے کو کہا اور یہ بھی کہا کہ وہاں کہیں چوری چھپے شراب بکتی ہے۔ میں اس کا انتظار کرنے لگا۔ تقریباً چالیس منٹ کے بعد وہ بھاگتا ہوا آیا اور اچھل کر ٹیکسی میں بیٹھ گیا، ساتھ ہی چیخا ”جلدی سے یہاں سے نکل چلو۔ میں نہیں چاہتا کہ پولیس میرے پیچھے لگ جائے۔ لہذا میں اسے واپس لاس اینجلس لے آیا۔ آپ کو پتا ہے، مجھے اس کی بات پر ذرا بھی یقین نہیں آیا تھا کیونکہ جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں وہ پکنک نہیں تھا اور اس کے جسم سے ایسی بو آ رہی تھی جیسے وہ جراثیم کش دوا سے نہا کر آیا ہو۔“

اس کی بات سن کر فریک اور رائے دونوں ہی قائل ہو گئے کہ رسل نہ صرف لاش کا نقص چھپانے بلکہ باربرا کی ٹانگ کاٹنے وہاں گیا تھا اور یہ رسل ہی تھا جس نے اسٹون کیسین کی بھیا تک تیرگی میں باربرا کی لاش اٹھا کر تیس فٹ نیچے پھینکی تھی لیکن اس نے وہ ٹانگ کہیں چھپا دی تھی۔

”ہم کل وہاں جائیں گے اور جائزہ لیں گے۔“ فریک نے کہا ”غالبا اسے یقین ہے کہ ٹانگ کے بغیر ہم اس کی بیوی کی لاش شناخت نہیں کر سکیں گے اور وہ صاف سچ لگے گا۔“

☆☆☆

ہوتا ہے کہ درجہ حرارت دن میں بھی منفی دس سے بارہ رہتا ہے اور رات کے وقت یہ تیس سے چالیس ڈگری منفی تک چلا جاتا ہے۔ سردیوں میں موسم کی سختی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ درمیانے سائز کا دانی کنگ طیارہ رکھتے ہی میں نے اس کا دروازہ کھولا اور فوراً ہی بج بستی ہوا روکی جیسے برف کے باریک ذرات لیے کہیں میں ہنس آئی۔ چند لمحے پہلے کہیں کا درجہ حرارت خوشگوار تھا وہ اچانک ہی منفی میں چلا گیا۔ اگر ہم چاروں نے پہلے سے گرم لباس نہ پہن لیا ہوتا تو ہمارا سردی سے برا حال ہو جاتا۔ پاکٹ کہیں سے راجہ نے سر نکال کر کہا۔ ”میں انجن بند نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔ ورنہ یہ دوبارہ اسٹارٹ نہیں ہوگا اس لیے تم لوگ فوراً اپنا سامان اتارو۔“

انتظار

مریم کے خان

مغرب کی دوشیزائیں مہم جوئی کے نام پر اپنی زندگی کو داف پر لگانے سے دریغ نہیں کرتیں۔ وہ سب بھی اسی جذبے کے تحت نکلی تھیں۔ ان چاروں کو منجمد کردینے والی ہواؤں کے تھینے پر ہر قدم پر غلطی کا احساس کرا رہے تھے۔

زندگی اور موت کے درمیانی فاصلے نے انہیں نیا سبق دیا



”تم نے اس کی ٹانگ کہاں چھپائی ہے؟“ فرینک نے پوچھا۔
”سراخ رساں تم ہو؟“ رسل چیخ کر بولا ”تم مجھے بتاؤ۔“

انہوں نے اسے قتل کے الزام میں گرفتار کر کے جیل بھیج دیا اور پھر اس فرم میں پہنچ گئے جہاں وہ ملازم تھا۔ انہوں نے وہاں پوچھ گچھ کی تو ایک شخص نے بتایا کہ اس نے 22 جون کو رسل کو اپنا ریوا اور نشانے کی مشق کرنے کے لیے دیا تھا لیکن رسل نے وہ ریوا اور آج تک اسے واپس نہیں کیا۔

”وہ کس کلیمبر کا تھا؟“ رائے نے پوچھا۔
”ولسن، اعشاریہ تین آٹھ کا۔“ اس شخص نے جواب دیا۔

انہوں نے رسل کی میز کھنگالی تو ریوا اور ایک دراز میں مل گیا۔ ریوا اور کی نال ساڑھے پانچ انچ لمبی تھی، جسے کاٹ کر چار انچ کر دیا گیا تھا ”جب میں نے یہ ریوا اور اسے دیا تھا اس وقت تو یہ ایسا نہیں تھا۔“ وہ شخص بولا ”پھر اس نے اس کی نال کاٹ کر چھوٹی کیوں کر دی؟“
”تاہم اس میں سائنس فٹ کو رکھے۔“ رائے نے جواب دیا۔

☆ ☆ ☆

وہ ریوا اور پولیس سائنٹفک بیورو کے ہیڈ لینڈینٹ ریکس کے حوالے کر دیا گیا جس نے اس سے ایک گولی داغنے کے بعد اس گولی کا موازنہ باربر کے جسم سے نکالی جانے والی گولی سے کیا۔ دونوں گولیوں پر ایک ہی طرح کے نشان پائے گئے۔ 24 ستمبر 1928ء کو رسل، لاس اینجلس کی عدالت میں پیش ہوا جہاں اس کے وکیل نے اس امر پر شبہ ظاہر کیا کہ واقعی وہ لاش باربر اموگر ہی کی تھی یا کسی اور عورت کی تھی؟ استغاثہ کو پہلے ہی اس شک کا اندازہ تھا چنانچہ اس نے سارے ثبوت و شواہد عدالت کے روبرو پیش کر دیے جن کے مطابق مقتولہ باربر اموگر ہی تھی، کوئی اور نہیں تھی۔
جیوری کو جو سات خواتین اور پانچ مردوں پر مشتمل تھی، کسی فیصلے پر پہنچنے میں صرف چالیس منٹ لگے۔ انہوں نے رسل کو فرسٹ ڈگری مرڈر کا مجرم قرار دے دیا اور جج نے اس فیصلے کی روشنی میں اسے جھانسی کی سزا سنائی۔ رسل نے سزا کے خلاف اپیل کی جو رد کر دی گئی۔ چنانچہ باربر کی لاش دریافت ہونے کے ٹھیک ایک سال بعد 2 اگست 1929ء کو رسل کو سان کوئین جیل میں چھانسی پر لٹکا دیا گیا۔



زندگی سے نکل گئی؟ تم نے اسے دھوڑا کیوں نہیں؟“
رسل محض شانے اچکا کر رہ گیا۔ ”کہیں تم کچھ نظر انداز تو نہیں کر رہے؟“ فرینک نے پوچھا ”تم نے اپنی پڑوسن کو ایک مختلف کہانی سنائی تھی۔ تم نے کہا تھا کہ تمہاری بیوی اپنی خالہ کے ہمراہ اس کے گھر چلی گئی ہے۔“
”وہ سچ نہیں تھا۔“

”تمہارے خیال میں، ہم تمہاری بیوی کے بارے میں پوچھنے کیوں آئے ہیں؟“
”وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی اور میں سمجھتا ہوں کہ کسی نے یقیناً اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرائی ہوگی۔“
”تم اخبارات پڑھتے ہو۔ ایک عورت کی ناقابل شناخت لاش اس مقام پر پائی گئی تھی جہاں بقول تمہارے، تمہاری بیوی نہیں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ کیا تمہیں یہ خیال نہیں گزرا کہ وہ تمہاری بیوی کی لاش ہو سکتی ہے؟“
”مجھے یہ خیال کیوں گزرتا؟“ رسل نے اُلٹا سوال داغ دیا۔ ”وہ غالباً اس شخص کے ساتھ ہوگی جس سے وہ ملتی رہتی تھی۔“

وہ دونوں اسے اسٹون کیسین میں اس مقام پر لے گئے جہاں مٹے کی ٹوٹی ہوئی مالا ملی تھی۔ پھر ان جھاڑیوں میں، جہاں لاش پائی گئی تھی۔ رسل نے ہر بات کی ترویج کی۔ یہ کہ اس نے اپنی بیوی کو ہلاک کیا تھا اور یہ کہ وہ پہلے بھی اس پہاڑی علاقے میں آیا تھا اور پھر 4 جولائی کی شب ایک ٹیکسی کے ذریعے دوبارہ آیا تھا تاکہ ان جھاڑیوں میں جہاں لاش پڑی ہوئی تھی، جراثیم کش دوا چھڑک کر اور باربر کی ٹانگ الگ کر سکے۔

وہاں سے وہ لوگ اسے لے کر ہیڈ کوارٹرز آئے جہاں انہوں نے اسے بتایا کہ اس کا پورا نام رسل بیڈل ہے اور یہ کہ اس نے جس لڑکی کو قتل کیا تھا، وہ باربر اموگر تھی۔ جواب میں وہ ایک لمحے کے لیے ہچکچایا اور پھر اس نے ان کی باتوں کو درست تسلیم کر لیا۔ اس کے بعد سراخ رساںوں نے اس ٹیکسی ڈرائیور کو طلب کیا، جس نے پہلی ہی نگاہ میں اسے پہچان لیا ”ہاں، یہی ہے وہ شخص جسے میں وہاں لے گیا تھا۔“ وہ بولا۔
رسل نے اسے جھٹلایا۔ تب وہ اسے مردہ خانے لے گئے جہاں باربر کی لاش پڑی تھی۔ انہوں نے لاش کی طرف اشارہ کیا ”کیا تم یہ جھٹلا سکتے ہو کہ یہ وہی لڑکی ہے جو بقول تمہارے کسی اور شخص کے ساتھ فرار ہو گئی تھی؟“
رسل انہیں خونخوار نظروں سے گھورنے لگا۔ منہ سے کچھ

نہ بولا۔

”کیا؟“ ”ٹیلی جلائی۔“ تم ہماری کوئی مدد نہیں کرو گے۔“ ”بالکل نہیں۔“ راجر نے صاف انکار کر دیا۔ ”ورنہ میں بھی تم لوگوں کے ساتھ ہمیں رہنا پڑے گا۔“ ”سوچ لو چار خوب صورت لڑکیوں کے ساتھ رہنے کا یہ موقع پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔“ رون نے راجر کو چھیڑا۔ ”مجھے معاف کرو، میری بیوی گھر میں میرا انتظار کر رہی ہے۔“ راجر نے کہا اور دھمکی دی۔ ”اگر تم لوگوں نے دس منٹ کے اندر اپنا سامان اور کتے نہیں اتارے تو میں روانہ ہو جاؤں گا۔“ اس کی دھمکی سن کر ہم تیزی سے حرکت میں آئے کیونکہ ابھی اسے واپسی میں بھی کوئی ایک ہزار میل کا طویل سفر طے کر کے واپس نیوفاؤنڈ لینڈ پہنچنا تھا۔ رون اور میں سامان اتارنے لگے جبکہ ٹیلی اور شیرون طیارے کے عقبی حصے میں موجود کتوں کو نکالنے لگیں۔ ہمارا سامان بڑے بڑے بیگوں اور پلاسٹک کے نیلے ڈرموں میں بھرا ہوا تھا۔ نیلے ڈرموں میں خوراک تھی۔ اس علاقے میں قدرتی آفتوں کے علاوہ برفانی ریچھوں، بھیڑیوں اور لومڑیوں کی کوئی کمی نہیں تھی جو خوراک کی بوسوگمتے پھرتے ہیں اور یہاں آنے والے ہم جو اپنی خوراک کی حفاظت کے لیے انہیں پلاسٹک کے مضبوط ڈرموں میں پیک کرتے ہیں۔ رینجہ جیسا طاقت ور جانور بھی آسانی سے ان ڈرموں کو نہیں کھول سکتا۔

چھ مہینے پہلے میڈوز یونیورسٹی کے شعبہ جیالوجی نے قطب شمالی کے لیے ایک مہم کا اعلان کیا۔ اس مہم میں مینج بافن کو عبور کر کے گرین لینڈ تک رسائی کرنی تھی اور خاص بات یہ تھی کہ سارا سفر منجمد سمندر پر کرنا تھا۔ اس مہم کے لیے یونیورسٹی کی لڑکیوں سے نام دینے کو کہا گیا تھا۔ یہ مہم اصل میں خواتین کی حوصلہ افزائی کے لیے تھی تاکہ وہ مہم جوئی میں حصہ لے سکیں۔ اس مہم کو کینیڈا محکمہ سیاحت اسپانسر کر رہا تھا۔ ہر سال محکمہ کسی کان یا یونیورسٹی کی چار لڑکیوں کو منتخب کر کے انہیں تربیت اور مہم کے لیے ہر سہولت فراہم کرتا تھا۔ اس سال قرعہ فال میڈوز یونیورسٹی کے نام نکلا تھا۔

میں ہائی اسکول کے زمانے سے مہم جوئی کی شوقین رہی تھی اور اپنے بھائی کے ساتھ میں نے نیوفاؤنڈ لینڈ کے انتہائی شمالی سرے کا سفر بھی کیا ہوا تھا اس لیے مجھے برفانی علاقوں میں سفر کا تجربہ تھا۔ میں نے اپنا نام دیا اور مجھے منتخب کر لیا گیا۔ باقی تین لڑکیاں رون فیر، شیرون مائیکل اور ٹیلی گارڈن تھیں۔ مارچ میں ہمیں دو ہفتے کے تربیتی سیشن کے لیے ہائن آئی لینڈ کے جنوبی حصے میں لے جایا گیا۔ موسم نہایت سخت اور خراب تھا۔

اس موسم میں ہمیں ان تمام کاموں کی تربیت دی گئی جو ہمیں اس مہم کے دوران کرنا تھے، ساتھ ہی ہمیں خطرات سے نمٹنے کی تربیت بھی دی گئی۔ یہ بتایا گیا کہ ہم کسی حادثے کا شکار ہو جائیں تو اس صورت میں ہمیں کیا کرنا ہوگا۔ دو ہفتے کے اس تربیتی سیشن میں ہم نے بہت کچھ سیکھا تھا۔

ہماری مہم بھی دو ہفتوں پر محیط تھی۔ گرما میں یونیورسٹی کی چھٹیاں ہوتے ہی ہم نے گھروں کے لیے رخصت سفر باندھا کیونکہ تین ہفتے بعد ہمیں واپس آنا تھا۔ میرا گھر خلیج بڈسن کے کنارے واقع ایک چھوٹے سے ماہی گیروں کے گاؤں میں ہے۔ یہ گاؤں صوبہ کیوبک میں ہے۔ یہاں اکثریت فرانسیسی بولنے والوں کی ہے لیکن میرا خاندان انگریز ہے۔ میرے پردادا انگلینڈ سے آکر یہاں آباد ہوئے تھے اور انہوں نے زمین لے کر اس پر بہت بڑا اور شاندار فارم بنایا تھا۔ میں اسی فارم میں ملٹی پلٹی بڑھی تھی اور اب یہاں ہمارا بہت بڑا خاندان آباد ہے جو مل جل کر فارم کے سارے کام کرتا ہے۔ بہت سارے لوگ یہاں سے چلے گئے ہیں اور انہوں نے شہروں میں ملازمتیں اور دوسرے روزگار اختیار کر لیے تھے لیکن اب بھی خاندان کے بہت سارے لوگ یہاں رہتے تھے۔ سربما کے دوران اکثر دور دراز رہنے والے بھی یہاں آتے تھے اور خوب محفلیں جتنی تھیں۔ گرما میں صرف دور دراز پڑھنے والے واپس آتے تھے۔ ان دنوں فارم پر کام جاری ہوتا تھا اس لیے محفلوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہمارا علاقہ اکتوبر کے آخر سے لے کر اپریل کے وسط تک برف سے ڈھکا رہتا ہے اور صرف چھ مہینے کے لیے زمین برف سے آزاد ہوتی ہے۔

میں نے مام اور پاپا کو اپنے سفر کے بارے میں بتایا تو وہ فکر مند ہو گئے تھے لیکن میں نے انہیں تسلی دی۔ ”میرے لیے پہلا موقع نہیں ہے اس سے پہلے بھی میں جو رڈن (بھائی) کے ساتھ کئی بار مہمات پر جا چکی ہوں۔“ ”وہ الگ بات ہے میڈی۔“ پاپا نے کہا۔ ”لیکن منجمد آرکٹک پر سفر کرنا بہت خطرناک کام ہے۔“

”پاپا یہ پروگرام محکمہ سیاحت نے تشکیل دیا ہے اور انہوں نے اس بات کا پورا خیال رکھا ہے کہ ہمیں کم سے کم خطرات کا سامنا کرنا پڑے، انہوں نے ہمیں تربیت بھی دی ہے اور تمام سہولیات بھی فراہم کر دیں گے۔“

مگر مام اور پاپا کی تشویش کم نہیں ہوئی تھی۔ جب میں واپس جا رہی تھی تو انہوں نے ہدایات کا ایک پلندہ میرے ساتھ کر دیا تھا۔ میں واپس میڈوز پہنچی تو ٹیلی، رون اور شیرون آچکی تھیں۔ اس مہم کا انسٹرکٹر اور منصوبہ ساز یونیورسٹی

کا پروفیسر جیم پلیز تھا۔ اس نے روانگی سے پہلے ہمیں آخری ہدایات دیں۔ سب سے آخر میں اس نے کہا۔ ”یاد رکھنا کہیں بھی اپنی ہمت سے بڑھ کر کچھ کرنے کی کوشش مت کرنا لیکن کسی ایسی مشکل میں گھر جاؤ جس سے نکلنا مشکل لگ رہا ہو تو بھی حوصلہ مت ہارنا اور آخر تک پُر امید رہنا۔“

میڈوز سے طیارے نے ہمیں نیوفاؤنڈ لینڈ کے ایک چھوٹے شہر تک پہنچایا۔ یہاں ہماری ٹیم کا سامان اور کتے موجود تھے۔ ان ہی کتوں کے ساتھ ہم نے تربیتی سیشن کیا تھا اور وہ ہم سے مانوس تھے۔ انہیں سنبھالنے اور سچ چلانے کی خصوصی تربیت ٹیلی اور شیرون نے حاصل کی تھی۔ میں یعنی میڈیلین اس ٹیم کی لیڈر تھی۔ راستے کا تعین کرنا اور کسی مشکل کی صورت میں فیصلہ کرنا میرا کام تھا۔ رون ندی کیشن کرتی۔ یعنی وہ سمتوں اور راستوں کا پتا چلاتی اور میں فیصلہ کرتی کہ ہمیں کس طرح سفر کرنا ہے۔

ہمارے پاس خوراک کا محدود ذخیرہ تھا کیونکہ سلیج گاڑی پر صرف پانچ سو پونڈ سامان کی گنجائش تھی۔ اس میں ہمارا سامان بھی تھا۔ جیسے خیمے، اضافی لباس اور جوتے، ایندھن، چولہے اور کتوں کی خوراک بھی شامل تھی۔ سلیج کو بچھنے کے لیے کل پانچ کتے تھے۔ ان کا لیڈر نام تھا۔ یہ بڑا اور مضبوط کتا تھا۔ ہموار برف پر ہم اسکیور کی مدد سے سفر کرتے اور جہاں ناہموار راستے سے واسطہ پڑتا وہاں ہم پیڈل سفر کرتے۔ یہ سارا سفر ہمیں اپنے پیروں پر کرنا تھا۔ بیرون دنیا سے رابطے کے لیے ہمارے پاس دو ریڈیو تھے۔ ایک لائٹ رینج دو طرفہ رابطے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کی مدد سے ہم آرکٹک ڈیزاسٹر منسٹری سے رابطہ کر کے ہنگامی مدد طلب کر سکتے تھے۔ دوسرا اندادی ٹیلیفون دینے والا ریڈیو تھا۔ اسے آن کر دیا جاتا تو یہ ہر ایک منٹ بعد سنسل دیتا لیکن اس کی رینج محدود تھی اس پاس چند کلومیٹرز اور اوپر آسمان سے گزرتے طیاروں تک ہی اس کا سنسل جاسکتا تھا۔

گرین لینڈ دنیا کا سب سے بڑا جزیرہ ہے۔ بعض لوگ آسٹریلیا کو دنیا کا سب سے بڑا جزیرہ سمجھتے ہیں لیکن یہ غلط فہمی ہے آسٹریلیا جزیرہ نہیں بلکہ بحرہ اعظم ہے۔ اس لحاظ سے گرین لینڈ دنیا کا سب سے بڑا جزیرہ ہے۔ مگر اس پر کوئی باقاعدہ آبادی نہیں ہے، صرف محققین اور مخصوص مقاصد کے لیے سرد ماحول کو استعمال کرنے والے یہاں رہتے ہیں۔ اس کے جنوبی ساحلوں پر گرمیوں کے چار مہینوں کے دوران برف پگھل جاتی ہے اور ہزاروں گاؤں آگ آتی ہے۔ اسی وجہ سے جب

اس جزیرے کو دریافت کیا گیا تو اسے گرین لینڈ کا نام دیا گیا تھا۔ یہ جزیرہ اتنا بڑا ہے کہ اگر ریشم فیڈریشن کو چھوڑ کر باقی سارا یورپ جمع کر لیا جائے تب بھی یہ اس کے مقابلے میں بڑا ہے۔ اصل میں اس کا بیشتر حصہ بحرہ منجمد شمالی کے ساتھ اس طرح ملا ہوا ہے کہ سمندر اور خشکی کا پتا نہیں چلتا ہے۔ انیسویں صدی کے آخر میں جب انسانوں کے قدم قطب شمالی تک پہنچے اور پھر انہوں نے برف تلے چھپے گرین لینڈ کا سروے کیا تب اس جزیرے کو سچ معنوں میں دریافت کیا گیا تھا۔ ماہرین کہتے ہیں کہ مستقبل میں برف پگھلنے اور موسم گرم ہونے کے بعد گرین لینڈ یورپ کے لیے اہم ہو جائے گا کیونکہ پھر اس پر انسانوں کی آبادی ممکن ہو سکے گی۔

ہمیں ہائن آئی لینڈ سے گرین لینڈ تک کوئی پانچ سو کلومیٹر سمندر کے اوپر سفر کرنا تھا۔ درحقیقت یہ سفر ہزار کلومیٹر سے زیادہ کا تھا کیونکہ ہمیں جانا تھا اور واپس اسی جگہ آنا تھا۔ راجر ٹھیک دو ہفتے بعد ہمیں لینے بیٹھیں آتا۔ سارا سامان اتار لینے کے بعد راجر نے کاک پٹ سے ہاتھ ہلایا اور طیارہ برف پر دوڑنے لگا۔ چند منٹ کے بعد وہ آسمان پر غائب ہو چکا تھا۔ ہم سب آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے جو سرمئی ہو رہا تھا۔ ابھی صبح کے نو بجے تھے لیکن دھوپ کا نام و نشان نہیں تھا۔ شیرون اور ٹیلی کتوں کو سنبھال رہی تھیں جو سفر کے خیال سے مجرہ جوش ہوئے جا رہے تھے۔ برف پر چاروں طرف ہمارا سامان بھرا ہوا تھا۔ رون نے کہا۔

”سب سے پہلے ہمیں ہیک اپ پیک تیار کر لینا چاہیے۔“

ہمارے پاس خوراک اور ایندھن کے اضافی ذخیرے کے ساتھ ایک بڑا خیمہ بھی تھا اور یہ ہمیں اسی مقام پر محفوظ کر کے جانا تھا۔ اگر ہماری مہم کسی حادثے کا شکار ہو جاتی اور ہم اپنا سامان گنوا بیٹھتے تو واپس نہیں آکر ہم اس وقت تک گزارہ کر سکتے تھے جب تک راجر طیارہ لے کر نہ آ جاتا۔ اس پیک اپ پیک میں کوئی بیس کلو گرام خوراک اور پچاس کلو گرام ایندھن تھا۔ ہم نے ان تمام چیزوں اور خیمے کو ایک نیلے ڈرم میں محفوظ کیا اور اسے ایک نزدیکی ٹیلے کے اوپر لے جا کر اس طرح برف میں دفن کر دیا کہ یہ اوپر سے نظر نہ آئے اور نشانی کے طور پر سرخ رنگ کیا ہوا بانس لگا دیا۔ یہ کوئی دس فٹ اونچا تھا اور صاف موسم میں ایک کلومیٹر دور سے صاف دکھائی دیتا۔ اسے مضبوطی سے برف میں لگایا تھا تاکہ تیز ہوائیں اور طوفان بھی اسے نہ گرا سکیں۔

جب تک ہم نے یہ کام نمٹایا شیرون اور ٹیلی کتوں کو سلیج

سے جوت کر سامان سلج پر بار کر چکی تھیں۔ یہاں آنے سے پہلے ہم سارا سامان ترتیب دے چکے تھے۔ سلج کے سامان کے علاوہ ہمارے پاس چار عدد بیگز تھے جنہیں ہم پشت پر باندھتے۔ ہر بیگ میں دو گلوگرام خوراک اور ہنگامی حالات میں کام آنے والی اشیائیں تھیں۔ اگر کسی وجہ سے ہم سلج کا سامان گنوا دیتے تب بھی ہمارے پاس کچھ نہ کچھ ہوتا۔ تمام کام نمٹنا کر ہم روانگی کے لیے تیار ہوئے۔ ہم میں سے تین کو پیدل سفر کرنا تھا اور کوئی ایک سلج میں بیٹھ کر کتوں کو قابو کرنی۔ سب سے پہلے رون کا نمبر تھا۔ ہم تینوں نے پاؤں میں اسکیز پہن لیے، میں نے اپنی ساتھیوں کی طرف دیکھا۔

”دوستو! ہماری ہم کا آغاز ہے اور ہم گرین لینڈ تک ہوا نہیں گئے۔“

”گرین لینڈ۔“ انہوں نے مل کر نعرہ مارا اور اس کے ساتھ ہی ہم چل پڑے۔ یہاں راستہ ہموار، برف کی قدر سخت تھی اس لیے اس پر اسکیز کرنا بہت آسان ہو رہا تھا۔ قابض سے بنے یہ خصوصی اسکیز برف نہیں پکڑتے تھے اور رواں رہتے تھے۔ ہمیں ایک دن میں ساٹھ سے ستر کلو میٹر کا سفر کرنا تھا۔ قطب شمالی میں سمندر کے اوپر جمی برف زیادہ تر ہموار ہوتی ہے۔ بس اس میں دراڑوں کا خطرہ ہوتا ہے۔ دراڑ اس طرح سے آتی ہے کہ کہیں کلیئر کھسنے سے برف کی چادر پھٹ جاتی ہے اور سمندر کا پانی اوپر آ جاتا ہے لیکن منفی درجہ حرارت میں یہ جم جاتا ہے۔ دراڑ پر برف کی پکلی سی تہ جم جاتی ہے اور بظاہر اوپر سے یہ ٹھوس برف کا حصہ لگتی ہے۔ مگر اس پر بوجھ پڑے تو یہ تہ ٹوٹ جاتی ہے اور اوپر سے گزرنے والی چیز فوراً سمندر برد ہو جاتی ہے۔ ان دراڑوں سے بچنے کا سوائے احتیاط کے اور کوئی طریقہ نہیں ہے۔

لینڈر کی حیثیت سے میں سب سے آگے سفر کر رہی تھی۔ میرے پیچھے شیلی اور شیرون تھیں اور سلج کے ساتھ رون سب سے آخر میں تھی۔ کتے سلج کو بارہ تیرہ کلو میٹر زنی گھنٹے کی رفتار سے کھینچ رہے تھے۔ اس لیے ہمیں آگے رہنے کے لیے اسی رفتار سے اسکیٹنگ کرنا پڑ رہی تھی۔ میں سلج سے کوئی سو گز آگے تھی۔ مجھے سے کوئی تیس گز پیچھے شیلی اور اس سے اتنے ہی فاصلے پر شیرون تھی۔ میں کسی جگہ سے گزرتے ہوئے محسوس کرنے کی کوشش کرتی تھی کہ یہاں برف ٹھوس ہے یا نہیں۔

جولائی کا آخری ہفتہ تھا اس کے باوجود یہاں سردی کا یہ عالم تھا کہ درجہ حرارت دن کے وقت بھی منفی سات ڈگری سینٹی گریڈ تھا۔ رات میں یہ یقیناً منفی تیس ڈگری سینٹی گریڈ تک گر جاتا ہوگا۔ اس درجہ حرارت میں سمندر کے اوپر دراڑیں

آنے کا امکان کم ہوتا ہے۔ جب دن میں درجہ حرارت صفر سے اوپر چلا جائے تب دراڑیں بننے کا عمل تیز ہو جاتا ہے۔ روانگی کے ایک گھنٹے بعد ہم سمندر کے اوپر سفر کر رہے تھے۔ ساحلی پٹی کو چھوڑ کر باقی ہر جگہ سمندر بہت گہرا ہے اور کہیں کہیں تو یہ ایک کلو میٹر سے زیادہ گہرا ہو جاتا ہے۔ اتنے گہرے سمندر کے اوپر جمی برف پر سفر کرنا آسان نہیں ہے۔ سچی بات ہے ہم لڑکیاں شروع میں سہم گئی تھیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہمارا موڈ بحال ہو گیا تھا۔

شام سات بجے تک ہم کوئی ستر کلو میٹر کا سفر طے کر چکے تھے اور اب تک ہمیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ برف کے ایک اونچے ٹیلے کو ہم نے پڑاؤ ڈالنے کے لیے چنا۔ سلج اور کتوں کو مضبوطی سے برف میں سلیں گاڑ کر باندھ دیا اور خیمہ لگایا۔ ہمارے پاس ایک درمیانے سائز کا آسانی سے لگ جانے والا خیمہ تھا۔ خیمہ لگا کر ہم سب ریختے ہوئے اس میں داخل ہوئے۔ میں نے بیٹری سے روشن ہونے والا ایک لمپ خیمے کی چھت سے لٹکا یا تو خیمہ روشن ہو گیا۔ سردی سے سب کا برا حال تھا اس لیے ہم نے برز جلایا۔ یہ چھوٹا سا جدید ترین چولہا تھا، اس پر ہم کھانا بھی بنا سکتے تھے اور یہ خیمے کو گرم بھی کر دیتا تھا۔ کھانے کے لیے سب نے اپنی اپنی پسند کے ٹکڑے لٹکائے اور گرم کر کے کھانے لگے۔ دوپہر میں ہم نے کھانا بغیر گرم کیے کھایا تھا۔ کھانے کے فوراً بعد سب سونے کے لیے لیٹ گئے۔ باہر تیز برفانی ہوا میں چٹکھڑ رہی تھیں لیکن خیمہ گرم ہو چکا تھا اور کسی خطرے کی صورت میں کتے بھونک کر ہمیں خبردار کر دیتے اس لیے ہم بے فکری سے سو گئے۔ رات خیریت سے گزری۔ صبح سات بجے ہم سب اٹھ گئے تھے۔ یہاں رات تو ہوتی نہیں تھی بس ایک دو گھنٹے کے لیے ایسا ماحول ہوتا جیسے نارمل علاقوں میں سورج ڈوبنے کے بعد ہوتا ہے۔ اس لیے ہر کام گھڑی کے حساب سے کرنا پڑتا تھا۔

دوسرے دن کا سفر مزید بہتر گزرا تھا اور اس دن ہم نے دس گھنٹوں کے دوران کوئی سو کلو میٹر کا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ اب ہم فائن آئی لینڈ سے ایک سو ستر کلو میٹر دور نکل آئے تھے۔ اس دشوار گزار خطے میں اتنا سفر ایک اچھی پیش رفت تھی۔ دوسرے دن بھی آسان پر گہرے بادل تھے اور شمال کی جانب سے تیز سرد ہوا چل رہی تھی۔ ہماری مہم کے لحاظ سے یہ اچھی بات تھی کیونکہ موسم سرد رہتا تو برف میں دراڑیں آنے کا امکان کم ہو جاتا مگر جب ہم نے تیسرے دن سفر کا آغاز کیا تو ہوا رک گئی بادل چھپ گئے اور تیز چمکتا ہوا سورج نکل آیا۔ سورج کی چمک اتنی تیز تھی

کہ ہمیں سن گھاسز لینے پڑے۔ آنکھیں روشنی سے خیرہ ہو رہی تھیں۔ موسم کی اس غیر متوقع تبدیلی نے ہمیں فکر مند کر دیا تھا۔ موسم کے لحاظ سے یہ دنیا کا متغیر ترین خطہ ہے یہاں ایک گھنٹے میں درجہ حرارت میں تیس سے چالیس ڈگری سینٹی گریڈ کا فرق آ جاتا معمول کی بات ہے۔ کینیڈا کے شمالی علاقے میں واقع ایک چھوٹے شہر میں درجہ حرارت صرف دو منٹ میں مثبت پینتیس ڈگری فارن ہائیٹ سے منفی چالیس ڈگری فارن ہائیٹ ہو گیا تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ موسم کتنی جلدی بدل جاتا ہے۔ لیکن درجہ حرارت میں یہ اچانک تبدیلی عام طور سے گرمی سے سردی کی طرف ہوتی ہے اور سردی سے گرمی کی طرف موسم اتنی تیزی سے تبدیل نہیں ہوتا ہے۔

مگر اس دن درجہ حرارت چند گھنٹوں میں سات ڈگری سینٹی گریڈ بڑھ گیا تھا۔ صبح بچے جب ہم بیدار ہوئے تو درجہ حرارت منفی پانچ درجے سینٹی گریڈ تھا لیکن آٹھ بجے یہ دو درجے مثبت ہو چکا تھا۔ درجہ حرارت کی اس تبدیلی نے ہمیں پریشان تو کیا تھا ساتھ ہی گرمی بھی لگنے لگی تھی اس لیے ہم نے اپنی بھاری جیکٹیں اور گرم ٹراؤزر اتار کر نسجتا کم گرم کپڑے پہن لیے البتہ بیروں میں جوتے وہی رکھے کیونکہ ہمارے بیروں کو نیچے برف کی ٹھنڈک سے محفوظ رکھتے تھے۔ گزشتہ دو دن میں ہم اچھا خاصا سفر کر چکے تھے اس لیے فیصلہ کیا کہ سستی سے اور احتیاط سے سفر کریں گے تاکہ برف میں چھپی دراڑوں سے محفوظ رہیں۔ اس روز پہلی بار ہم نے ایک دوسرے کو رسی سے باندھا تھا۔ یہ احتیاط ضروری تھی تاکہ کوئی کسی دراڑ میں گر جائے تو رسی اسے بچالے۔

برف میں اسکیٹنگ کرتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ برف نرم پڑ رہی تھی اور اس میں اسکیٹنگ کرنے کے لیے پہلے سے زیادہ زور لگانا پڑ رہا تھا۔ پھر دراڑوں کے خوف کی وجہ سے بھی ہماری رفتار سست تھی۔ پانچ گھنٹے میں ہم صرف تیس کلو میٹر کا سفر کر سکے تھے۔ اس کے بعد سلج کے دو ٹکڑے لے رک گئے۔ برفانی اور سرد علاقوں میں بھوک بہت زیادہ لگتی ہے۔ یہی وجہ تھی ہم گزشتہ دو دن سے معمول سے زیادہ کھا رہے تھے۔ اس کے باوجود ہمارے معدے مسلسل کام کرتے رہتے تھے اور کھانے کے چند گھنٹے بعد ہی ہمیں شدید بھوک لگ جاتی تھی۔ صبح ناشتے کے وقت سلج گرم کر کے ایسے ہاٹ پائس میں رکھ دیا جاتا تھا جو اسے جسنے سے محفوظ رکھتا تھا کیونکہ سلج کے ٹکڑے میں ہم رک کر برز نہیں جلا سکتے تھے۔ ایک تو ہمارے پاس ایندھن محدود تھا دوسرے کھلی فضا میں حرارت

تیزی سے ضائع ہو جاتی تھی اور چیز گرم نہیں ہو پاتی تھی۔ ایک گھنٹے کے وقفے کے بعد ہم نے دوبارہ سفر شروع کیا تو پہلی دراڑ سے واسطہ پڑا۔ خوش قسمتی سے یہ ابھی نی تھی اور اس میں تو سلج ہو رہی تھی پھر گرمی کی وجہ سے پانی بھی نہیں جمنا تھا اس لیے ہمیں اس کا پتا چل گیا۔ اگر ہم چند گھنٹے بعد اس جگہ سے گزرتے تو دراڑ کے اوپر برف جم چکی ہوتی اور ہمیں اس وقت پتا چلتا جب ہم میں سے کوئی اس میں گر گیا ہوتا۔ یہ کوئی ایک کلو میٹر چوڑی دراڑ تھی اور اسے عبور کرنے کے لیے ہمیں شمال کی طرف جانا پڑا تھا۔ دراڑ ابھی مزید پھیل رہی تھی۔

شمال کے سمندر پر گرمیوں میں دراڑیں نمودار ہونے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور ان میں سے بعض دراڑیں تیس تیس کلو میٹر تک طویل ہو جاتی ہیں لیکن یہ زیادہ چوڑی نہیں ہوتی ہیں۔ ان کی چوڑائی عام طور سے تیس چھپیس گز سے زیادہ نہیں ہوتی ہے۔ کیونکہ جیسے ہی دراڑ بنتی ہے پانی ہوا میں آتے ہی جھٹکا شروع ہو جاتا ہے۔ ہاں کسی سال غیر معمولی گرمی پڑے تو پورا سمندر ہی برف کے تیرتے ٹکڑوں سے ڈھک جاتا ہے اور اس پر سفر کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ دراڑ عبور کر کے ہم آگے روانہ ہوئے۔ سلج راستے پر آنے میں ہمارا ایک گھنٹا ضائع ہو گیا تھا۔ شام سات بجے جب ہم نے پڑاؤ ڈالا تو موسم کی گرمی برقرار تھی اور سورج ویسے ہی چمک رہا تھا۔ درجہ حرارت صفر سے اوپر تھا اور یہی وجہ تھی کہ ہمارا خیمے میں جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا جب میں اور رون خیمہ لگا رہے تھے تو شیرون اور شیلی سلج پر لیٹ گئے تھے۔ شیرون نے وہیں سے کہا۔

”دل چاہ رہا ہے سن ہاتھ لے لوں۔“

”ایسی غلطی مت کرنا۔“ میں نے اسے خبردار کیا۔ ”یہاں سورج کی شعاعیں بہت تیز ہیں اور ان میں الٹرا وائلٹ ریز شامل ہوتی ہیں، یہ تمہاری جلد کو جلا دیں گی۔“

زمین کو چاروں طرف سے اوزون کی ایک تہ نے گھیر رکھا ہے جو سورج کی نقصان دہ شعاعوں کو روکتی ہے لیکن انسانوں نے آلودگی پھیل کر اس تہ کو کافی جگہوں سے توڑ دیا ہے خاص طور سے دونوں قطبین کے اوپر اس میں بہت بڑے سوراخ ہو چکے ہیں۔ اس لیے قطبین پر سورج کی ضرر رساں شعاعوں سے انسانوں کو زیادہ خطرہ رہتا ہے۔ شیرون یہ بات جانتی تھی بلکہ ہم سب جانتے تھے، یہی وجہ تھی کہ آج سفر شروع کرنے سے پہلے سب نے چہرے پر سن بلاک کریم لگائی تھی۔ ہمارے جسم میں یہی حصہ کھلا ہوا تھا۔ ڈنر کھا کر ہم پھر باہر آ گئے تھے لیکن سونے کے لیے تو خیمے میں جانا تھا۔ ہم

نے حسب معمول سلج اور کتوں کو زمین میں کھونٹوں سے باندھ دیا تھا۔ کیونکہ اگر ایسی گرمی پڑے تو اس کے بعد شمال کی جانب سے طوفانی ہوا میں چلنے کا امکان ہوتا ہے۔ اگر رات کسی وقت اچانک طوفان آجائے تو ہماری چیزیں محفوظ رہیں۔ لیکن طوفان آنا تو ایک طرف رہا صبح موسم ویسا ہی گرم ملا۔ ہوا بند تھی اور سورج پوری تابناکی سے چمک رہا تھا۔ ہمارے خیمے کے آس پاس پانی بہہ رہا تھا کیونکہ مسلسل پڑنے والی گرمی سے برف پگھلنے لگی تھی۔ ہم فکر مند ہو گئے۔ شیلی نے کہا۔ ”اگر برف اسی طرح پگھلتی رہی تو ہمارے لیے سفر کرنا دشوار ہو جائے گا۔“

”اور خطرناک بھی۔“ رون نے لقمہ دیا۔

شیرون نے میری طرف دیکھا۔ ”کیا ہمیں ایسے موسم میں سفر کرنا چاہیے؟“

میں ہچکچاتی لیکن پھر اثبات میں سر ہلایا۔ ”ہاں کیونکہ صرف موسم کی وجہ سے ہم اپنی ہم ترک نہیں کر سکتے۔“

”کیا بہتر نہیں ہوگا کہ ہمیں آج سفر سے گریز کرنا چاہیے۔“ رون بولی۔ ”جب تک موسم دوبارہ سرد نہیں ہو جاتا ہے۔“

”تب ہمیں انتظار کرنا پڑے گا اور ہم کہہ نہیں سکتے کہ یہ انتظار کتنا طویل ہوگا۔ ہمارے پاس مہم کے لیے ایک مخصوص وقت ہے اور دو ہفتے بعد ہمیں واپس پہنچنا ہے۔ اگر ہم نہ پہنچ سکے تو راجر پکڑ لگا کر واپس چلا جائے گا اور دو دن بعد دوبارہ آئے گا۔ ہمارے پاس خوراک اور ایندھن بھی محدود ہے۔ اس صورت میں رکنے کا چانس نہیں لے سکتے، ہمیں سفر کرنا ہوگا۔“

وہ تینوں بھی یہ بات جانتی تھیں لیکن جب میں نے صورت حال ان کے سامنے رکھی تو وہ زیادہ بہتر طور پر سمجھ گئی اور انہوں نے بھی سفر کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے سامان باندھا اور سلج میں کتے جوت کر آگے روانہ ہو گئے۔ برف کا پگھلاؤ تیزی سے بڑھ رہا تھا اور ہمارے اسکیو پانی میں ڈوب رہے تھے۔ سفر کے پہلے گھنٹے میں ہمارا راستہ ایک وسیع ہوتی دراڑ نے روک لیا تھا اور یہ شرفاً غریباً تاحد نگاہ پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی چوڑائی چار گز سے کم نہیں تھی یعنی ہم کسی صورت اسے پھلانگ کر پار نہیں کر سکتے تھے۔ اگر ہم خطرہ مول لے کر اسے پھلانگ سے پار کر لیتے تب بھی کتے اور سلج پار نہیں جاسکتے تھے۔ اسے پار کرنے کے لیے ہمیں اس کے ساتھ ساتھ چلنا تھا اور جہاں دراڑ ختم ہو جاتی وہاں سے ہم دوسری طرف جاسکتے تھے۔ کیونکہ دونوں طرف دراڑ دور تک پھیلی نظر آ رہی تھی اس

لیے میں نے ٹاس سے فیصلہ کیا اور کتے نے مشرق کے حق میں فیصلہ دیا اس لیے ہم اس طرف چل پڑے۔ میں نے محسوس کیا کہ دراڑ وقت گزرنے کے ساتھ چوڑی ہو رہی تھی اس کا مطلب تھا کہ یہ لہائی میں بھی بڑھ رہی تھی۔ کئی کلومیٹر سفر کے بعد بھی دراڑ تاحد نگاہ پھیلی ہوئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ یہ دس کلومیٹر سے زیادہ طویل ہو چکی تھی۔

اس صورت حال میں ہمارے پاس ایک طریقہ تھا لیکن یہ پرخطر تھا اور انسٹرکٹر پروفسر جم نے ہمیں پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ اسے انتہائی ناگزیر صورت میں استعمال کرنا تھا ورنہ ہم کسی حادثے سے بھی دوچار ہو سکتے تھے۔ سلج کی ساخت ایسی تھی کہ یہ پانی میں بھی تیر سکتی تھی۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”ہمیں کشتی استعمال کرنا پڑے گی۔“

شیرون نے تائید کی۔ ”میرا بھی یہی خیال ہے۔“

رون اور شیلی ہچکچا رہی تھیں لیکن وہ بھی مان گئیں۔ ہمارے سامان میں ایک ہوا سے بھرے والی بربر کی کشتی تھی۔ یہ اسی مقصد کے لیے ساتھ لی گئی تھی کہ ناقابل عبور دراڑوں کو عبور کیا جاسکے۔ رون نے کشتی کا پیک نکالا اور اسے کھول کر بچھا دیا پھر اس سے خشک گیس کا چھوٹا سا سلینڈر کھولا تو ایک منٹ میں چھوٹ لہی اور چار فٹ چوڑی کشتی میں ہوا بھر گئی۔ ہم نے اسے پانی میں اتار دیا۔ اس دوران میں شیلی کتوں کو سلج سے الگ کر چکی تھی۔ میں نے خود کوری سے باندھا اور ایک رسی کشتی سے خشک کی۔ میں کشتی میں اتری اور چھوٹے سے چھوکی مدد سے اسے دوسرے کنارے تک لے گئی یہاں دراڑ سات گز سے زیادہ چوڑی ہو چکی تھی۔ دوسرے کنارے پر پہنچ کر میں نے چھوکی مدد سے برف کی موٹائی کا اندازہ لگایا۔ پھر کنارے پر چڑھ گئی۔ شیلی نے رسی کی مدد سے کشتی واپس کھینچی۔ اس بار شیرون آئی۔ تیسری باری میں شیلی دو کتوں کے ساتھ آئی اور انکس اتار کر واپس چلی گئی۔ باری باری اس نے پانچوں کتے اس طرف پہنچا دیے۔ اب باری سلج کی تھی۔ سلج تین سو کلو گرام وزن کے ساتھ تیر سکتی تھی اور ابھی اس پر کوئی پونے پانچ سو کلو گرام وزن تھا اس لیے سامان کم کیا گیا اور جب یہ تین سو کلو گرام سے نیچے آ گیا۔ شیرون اور میں واپس آئے۔ ہم چاروں نے سلج رسی کی مدد سے پانی میں اتار دی یہ آسان کام نہیں تھا کیونکہ سلج اب بھی وزنی ہو رہی تھی اور ذرا سی بے احتیاطی سے یہ الٹ سکتی تھی۔ اس کے بعد ہم کشتی پر بیٹھ کر باری باری دوسرے کنارے پر گئے۔ کشتی اوپر کھینچی لی اور پھر رسی کی مدد سے سلج کو دوسرے کنارے کی طرف لائے گئے۔

سلج پانی میں اتر گئی تھی اور دوسرے کنارے تک بھی آ گئی تھی لیکن جب اسے اوپر کھینچنے کا مرحلہ آیا تب ہمیں پتا چلا کہ یہ کام کتنا مشکل تھا اور ہم نے نا تجربہ کاری میں خود کو مشکل میں ڈال دیا تھا۔ تین سو کلو گرام سامان کے ساتھ سلج کو اوپر کھینچنا بہت مشکل تھا۔ ہم سامان بھی کم نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اس کے لیے سلج میں اترنا پڑتا اور اگر سلج توازن بگڑنے سے الٹ جاتی تو اترنے والا پانی میں جا کر تباہی کا توازن بہت نازک تھا۔ ہمارے پاس سوائے اس کے کوئی راستہ نہیں تھا کہ کسی بھی طرح سلج کو اوپر کھینچ لیں۔ سامان کا مسئلہ نہیں تھا وہ سلج میں اس طرح بندھا ہوا تھا کہ کسی صورت نہیں گر سکتا تھا۔ مسئلہ اس طاقت کا تھا جو سلج کو اس کے وزن سمیت اوپر کھینچنے کے لیے درکار تھی۔ ہم چاروں میں اتنی طاقت نہیں تھی اس لیے کتوں سے بھی کام لینے کا فیصلہ کیا۔

کتوں کو رسیوں سے باندھا اور یہ رسیاں آگے سے ہم نے پکڑ لی ہوئی تھیں۔ رون اور شیلی کنارے پر سلج کو سیدھا رکھیں اور ہم کتوں کی مدد سے اسے اوپر کھینچتے۔ رون اور شیلی اسکس کی مدد سے سلج کو سیدھا رکھ رہی تھیں۔ میں نے اور شیرون نے زور لگایا تو کتے بھی پیچھے ہٹنے لگے۔ سلج کنارے تک آئی اس کی اسکیو برف سے ٹکرا کر پھنس رہی تھیں۔ اگر ہم اسکیو اتار دیتے تو سلج کا وزن بھی کم ہو جاتا اور وہ آسانی سے کنارے پر چڑھ جاتی لیکن وہی نا تجربہ کاری کی وجہ سے ہمیں اس کا خیال نہیں رہا تھا۔ ہمیں بہت زور لگنا پڑ رہا تھا۔ رون اور شیلی بھی رسی کھینچنے میں ہمارے ساتھ شامل ہو گئی تھیں۔ سلج کا اگلا سرا اوپر آیا تھا اور اس موقع پر وہ ہوا جس کا مجھے خدشہ تھا اچانک برف کا کنارہ ٹوٹا اور سلج الٹ کر پانی میں جا گری۔ اٹھتے ہی سامان کے وزن سے وہ سمندر کے اندر جانے لگی۔ رون نے سب سے آگے رسی تھام رکھی تھی۔ وہ جھٹکے سے آگے گئی اور پانی میں گر گئی۔ میں، شیلی اور شیرون کھینچے جا رہے تھے۔ میں نے چلا کر کہا۔

”رسی کو مضبوطی سے پکڑ کر رکھو۔“

”ہم نہیں پکڑ سکتے۔“ شیلی نے کہا۔

”رون کو دیکھو۔“ شیرون چلائی۔

اگر ہم رسی چھوڑ دیتے تو ہماری مہم یہیں ختم ہو جاتی اور رسی نہ چھوڑتے تو بخ ترین پانی میں ہاتھ پاؤں مارتی رون ڈوب جاتی۔ لیڈر کی حیثیت سے مجھے فیصلہ کرنا تھا۔ ظاہر ہے مجھے رون کا انتخاب کرنا تھا۔ میں نے چلا کر شیرون سے کہا۔ ”کتوں والی رسی کاٹ دو۔“

اگر ہم رسی چھوڑ دیتے تو اس کے ساتھ بندھے کتے

بھی بے بسی سے پانی میں جا گرتے۔ شیرون نے چاقو نکال کر رسی کاٹ دی اور اس کے ساتھ ہی ہم نے سلج کی رسی چھوڑ دی۔ اب ہمیں سلج کے بجائے رون کی فکر تھی جو پانی میں غوطے کھا رہی تھی۔ موسم گرم تھا لیکن اس پانی کا درجہ حرارت منفی میں تھا۔ سب سے پہلے شیلی پہنچی اور اس نے رسی کھینچی جو رون نے تھام لی ہم نے اسے باہر کھینچ لیا لیکن اتنی دیر میں وہ بری طرح بھیگ چکی تھی اور سردی سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ ہم تینوں نے جلدی جلدی اس کا لباس اتارا۔ ہمارا سارا سامان سلج میں تھا۔ خاص طور سے کپڑے اسی میں تھے۔ میں نے اپنی جیکٹ اتار کر رون کو پہنا دی۔ اتنی دیر پانی میں رہنے کی وجہ سے اس کے انڈر گارمنٹس تک بھیگ گئے تھے۔ شیلی نے اپنی گرم ٹراؤزر تیلے بھاری لیکن پہن رکھا تھا۔ اس نے اپنا ٹراؤزر اتار کر رون کو پہنا دیا۔ تیز دھوپ کی وجہ سے اس کا جسمانی درجہ حرارت جلد بحال ہو گیا تھا ورنہ اب ہمارے پاس ایندھن نہیں رہا تھا جس سے گرمائش حاصل کر سکتے۔ سارا ایندھن..... کیونیکشن کے سارے آلات اور خوراک کا بڑا حصہ سلج کے ساتھ زیر آب جا چکا تھا۔

”ہماری مہم ناکام ہو گئی ہے۔“ شیلی رو دینے والے انداز میں بولی۔

”ہماری مہم ناکام ہوئی ہے لیکن ابھی ہمیں ایک مہم سر کرنی ہے۔“ میں نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ ”ہمیں واپس جانا ہے اور کوئی تین سو کلو میٹر کا سفر طے کرنا ہے۔“

وہ تینوں مہم کے ناکام ہونے کے دکھ میں تھیں اور انہوں نے یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ اب ہمیں زندہ رہنے کے لیے جدوجہد کرنا تھی۔ ہنگامی امداد کے لیے استعمال ہونے والا لانگ رینج ریڈیو سمندر کی نذر ہو گیا تھا اب ہمارے پاس ایک فکس سگنل دینے والا ریڈیو تھا۔ جب رون کی حالت بہتر ہوئی تو ہم نے فحج جانے والے سامان کا جائزہ لیا۔ اس میں خوراک کا پچاس کلو گرام کا ایک پیک، کتوں کے خوراک کے دو پیک تھے۔ مزے کی بات تھی کہ برز اور دوسرے آلات فحج گئے تھے لیکن ایندھن جس ڈرم میں تھا وہ ڈوب چکا تھا۔ خوراک دیکھ کر میرا دل ڈوب گیا تھا۔ کیونکہ میرا اندازہ تھا کہ واپسی کے سفر میں ہمیں کم سے کم ایک ہفتہ لگے گا۔ منجھد سمندر پر جگہ جگہ دراڑیں نمودار ہو رہی تھیں اور یہ ہمارے سفر کو مشکل بنائیں اور ان سے بھی زیادہ دھوپ سے نرم پڑتی برف ہمارے لیے دشواری پیدا کرتی کیونکہ اس قسم کی برف پر سفر کرنا آسان نہیں ہوتا ہے۔ مجھے مشکل لگ رہا تھا کہ اس خوراک کے ساتھ ہم واپس بافن آئی لینڈ پہنچ سکیں۔

موٹاپا آپ کی جان بھی لے سکتا ہے!!

سمارٹ بنو

سماٹیب
لو!

سماٹیب بدن میں موجود فالتو چربی کو ختم کرتی ہے
اور بڑھے ہوئے وزن سے نجات دلاتی ہے۔



مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے

0334-4266255, 0334-4266244

Email: toptreatments@gmail.com, Website: www.toptreatments.net

www.facebook.com/TT.Smartab

تھے۔ یہ رفتار بہت کم تھی اور اگر ہم اس رفتار سے چلتے تو ہمیں واپس بائن آئی لینڈ تک پہنچنے میں پندرہ دن سے زیادہ لگ جاتے۔ پیدل ہماری رفتار تین کلومیٹر فی گھنٹہ سے زیادہ نہیں تھی اور اس پر درازیں رکاوٹ بن گئی تھیں۔ گرمی کے ساتھ ہی برف پگھلنے کا عمل تیز ہوتا جا رہا تھا۔ تڑخنے اور ٹوٹنے کی آوازیں ہمیں رات بھر ڈرائی رہیں۔ لیکن وہاں رات کہاں تھی۔ دو بجے سورج کچھ دیر کے لیے افق کی طرف گیا تھا اور پھر دوبارہ اسی آب و تاب سے چمکنے لگا۔

ہمارے پاس خیمہ نہیں رہا تھا۔ لیکن گرمی کی وجہ سے ہمیں اس کی خاص ضرورت بھی نہیں تھی۔ رات کا بھگ جانے والا لباس کشتی میں پھیلا دیا گیا تھا اور وہ سفر کے ابتدائی گھنٹوں میں سوکھ گیا تھا۔ رات نے اپنا لباس پہن لیا۔ شام کو ڈنر سے پہلے میں نے ان تینوں سے کہا۔ ”ہم نہیں جانتے کہ بائن آئی لینڈ تک واپس پہنچنے میں کتنا عرصہ لگے گا اس لیے ہمیں موجود خوراک کو بہت احتیاط سے استعمال کرنا چاہیے۔“

”میرا خیال ہے ہمیں خوراک کو پندرہ دن کے حساب سے بانٹ دینا چاہیے۔“ ٹیلی نے تجویز دی۔ ”تاکہ ہم روز کچھ نہ کچھ خوراک لیتے رہیں اور کمزور نہ پڑیں۔“ ہم سب نے ٹیلی سے اتفاق کیا۔ ہم نے اپنی خوراک کا ذخیرہ نکالا اور اسے پندرہ مساوی حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اس طرح ہمیں جو خوراک مل رہی تھی وہ ہماری معمول کی خوراک کا نفع سے بھی کم تھی۔ مگر ہمیں اسی میں گزارہ کرنا تھا۔ اس کے بعد ہم نے کتوں کی خوراک کے بھی اسی طرح پندرہ حصے کیے۔ انہیں پندرہ دن تک ہمارا ساتھ دینا تھا۔ انہیں بھی روز کچھ نہ کچھ کھانے کو ملتا تو ان کی توانائی کسی حد تک برقرار رہتی۔ شیر دن نے کہا۔

”ہمیں ان کتوں کی ضرورت صرف دس دن رہے گی۔“

”اور اس کے بعد؟“ رات نے پوچھا۔

”اس کے بعد سچ پر موجود وزن تقریباً ختم ہو جائے گا اور صرف اتنا سامان رہ جائے گا جسے ہم اپنے بیگز میں رکھ کر بھی سفر کر سکتے ہوں گے۔“

شیر دن کی بات نے ہمیں سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ واقعی دس دن بعد خوراک میں کمی سے وزن تہائی رہ جاتا اور اتنے وزن کو ہم اپنی پشت پر لا کر سفر کر سکتے تھے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا کہ ہمیں اسکیڑ مل جاتیں اور ہم چلنے کے مقابلے میں اسکیڑ پر تین گنا زیادہ رفتار سے سفر کر سکتے تھے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو ہم بارہ دن میں سفر مکمل کر سکتے تھے۔ اس خیال نے ہمیں پرجوش کر دیا تھا۔ کیونکہ اب مستقل دن والی کیفیت تھی

کتوں کی خوراک صرف تیس کلوگرام تھی اور اس خوراک کے سہارے یہ ہفتہ بھر مشکل سے گزارہ کر سکتے تھے۔ مجموعی طور پر بچ جانے والا سامان سوا سو کلوگرام تھا۔ اگر ہم سب مل کر اٹھاتے تو سب کے حصے میں تیس کلوگرام سے زیادہ وزن آتا جبکہ ہم پہلے ہی دس کلوگرام کا بیک پشت پر باندھے ہوئے تھے۔ شیر دن نے تجویز دی۔ ”کیوں نہ سامان کشتی پر رکھ کر اسے کتوں کی مدد سے کھینچا جائے۔“

”نہیں۔“ میں نے ٹیلی میں سر ہلایا۔ ”اگر سفر میں کشتی کو کوئی نقصان ہو تو ہم آنے والی درازیں عبور نہیں کر سکیں گے۔“

”پھر یہ سامان کون اٹھائے گا؟“

ہمارے پاس اسکیڑ تھیں۔ میں نے کہا۔ ”ہم ان اسکیڑ کو جوڑ کر ایک چھوٹی سیج بناتے ہیں اور سامان اس پر رکھ کر سفر کریں گے۔“

یہ تجویز سب کو پسند آئی تھی اس میں ایک قباحت تھی کہ پھر ہمیں پیدل سفر کرنا پڑتا۔ لیکن اتنا وزن اٹھا کر سفر کرنا بھی آسان کام نہیں تھا۔ تمام اسکیڑ کو جمع کر کے ان کو اس طرح باندھا گیا کہ ایک چھوٹی سی سیج بن گئی۔ اس پر ہم نے اپنا تمام سامان بار کر دیا۔ اسے کھینچنے کے لیے صرف دو کتے کافی تھے۔ اس لیے ہم نے تین کتے وہیں چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ اگر چہ ان بے چاروں کو وہاں چھوڑ کر جاتے ہوئے ہمارا دل دکھ رہا تھا لیکن اس کے سوا کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا کیونکہ کتوں کی خوراک بہت کم رہ گئی تھی۔ کتوں کو اپنے پیچھے آنے سے روکنے کے لیے ہم نے انہیں دروازے کے دوسری طرف چھوڑ دیا اور جب ہم روانہ ہو رہے تھے تو وہ حسرت سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ ٹیلی کو کتوں سے لگاؤ ہو گیا تھا اور وہ رونے لگی۔ ہم نے نام اور اس کے ایک طاقت ور ساتھی کو رکھا تھا۔ کشتی کو ہم نے ایسے ہی اٹھالیا تھا اس کا کل وزن صرف آٹھ کلوگرام تھا۔ ہم اس میں سے ہوائیں نکال سکتے تھے ورنہ دوبارہ ہوا بھرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ ایک ہی گیس سلینڈر تھا۔ اضافی سلینڈر سیج میں تھے۔ ہم میں سے دو کشتی اٹھا کر چل رہی تھیں اور دو کتوں اور بنائی ہوئی سیج کو سنبھال رہی تھیں۔

پہلے ہی گھنٹے میں ہمیں اندازہ ہو گیا کہ بہت مشکل وقت آ گیا ہے۔ برف بہت نرم پڑ چکی تھی اور اس کے تڑخنے کی آوازیں ہمیں ڈرائی تھیں۔ دوسری دراز جو پہلے نہیں تھی ایک گھنٹے بعد ہی مل گئی اور اسے بھی کشتی کی مدد سے گرا کر اٹھا کر اٹھا۔ اس دن شام سات بجے تک ہم نے نصف درجن درازیں عبور کیں اور صرف تیس کلومیٹر کا سفر طے کر پائے

اس لیے ہم نے طے کیا کہ چھ گھنٹے سفر کے بعد چار گھنٹے آرام کریں گے اور اس طرح ہم زیادہ سفر کر سکتے تھے۔ معمول کے مطابق ہم چوبیس میں سے بارہ گھنٹے سفر کرتے تھے اور اس طریقہ کار سے ہمیں چوبیس گھنٹے میں سفر کے لیے دو اضافی گھنٹے مل جاتے۔ ہماری ہر ممکن کوشش ہوتی کہ راجر کے چکر لگانے سے پہلے ہم واپس بائیں آئی لینڈ پہنچ جائیں۔

دوسرے دن کا سفر مزید دشوار ثابت ہوا کیونکہ اب دراڑوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ایک دراڑ عبور کرتے اور کچھ دیر بعد ایک اور دراڑ راستہ روکے ہوتی۔ ہم کشتی کے معاملے میں محتاط ہو گئے کیونکہ اسی کشتی کی مدد سے ہم دراڑ عبور کر سکتے تھے اگر کسی وجہ سے اس کی ہوائی جاتی اور ہم اسے دوبارہ ہوا نہیں بھر پاتے تو ہمارے لیے معمولی سی دراڑ پار کرنا بھی ناممکن ہو جاتا۔ اس صورت میں ہمیں دراڑ کے ساتھ ساتھ چلنا پڑتا تھا کہ ہم اس کے آغاز تک پہنچ جاتے اور وہاں سے گھوم کر دوبارہ اپنی منزل کی طرف روانہ ہوتے۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ اس طرح کتنا زیادہ وقت لگتا اور ہم چند دراڑیں پار کرنے میں مارے جاتے۔ تیسرے دن تک دراڑوں کا سلسلہ اتنا پھیل گیا تھا کہ اب ہم عملاً برف کے پلٹے کڑوں پر سفر کر رہے تھے۔ گزشتہ روز ہم نے صرف دس کلومیٹر کا سفر کیا تھا اور تیسرے دن اس سے بھی کم فاصلہ طے کر پائے تھے۔ آنے والے ایک ہفتے میں ہم نے مشکل سے سو کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا تھا۔

ہمارے پاس ہنگامی شکل دینے والا ریڈیو تھا لیکن اسے استعمال کرنا بے کار تھا۔ اس علاقے میں کہیں کوئی ہمارا شکل ریسیو کرنے والا نہیں تھا۔ بد قسمتی سے یہ علاقہ طیاروں کے روٹ سے ہٹ کر تھا اور اب تک ہمیں آسمان پر کوئی طیارہ گزرتا ہوا دکھائی نہیں دیا تھا۔ مسلسل گرمی کے چار دن گزر گئے تھے اور اس کے بعد شمال کی طرف سے برف ہوا چلنے لگی تھی اور آسمان پر بادل آگئے تھے۔ یہ ظاہر صورت حال بہتر ہوئی تھی کیونکہ برف میں دراڑیں پڑنا کم ہو گئی تھیں۔ لیکن ہمارے لیے مزید دشواریاں پیدا ہو گئیں، دراڑوں میں آنے والا پانی جم رہا تھا۔ مگر اس کی رفتار بہت سست تھی کیونکہ موسم اتنا سرد نہیں ہوا تھا۔ اس لیے ہمیں مزید محتاط ہو کر سفر کرنا پڑ رہا تھا۔ مزید احتیاط کا مطلب تھا کم سفر اور کم سفر کا مطلب تھا ہماری خوراک بائیں آئی لینڈ تک پہنچنے سے پہلے ختم ہو جائے گی۔

کم خوراک اثر انداز ہونے لگی تھی۔ ہمارا وزن گر گیا تھا اور جسم میں پہلے کی طرح توانائی محسوس نہیں ہو رہی

تھی۔ کام کرتے ہوئے ممکن جلد غالب آجاتی تھی۔ جب چھ گھنٹے بعد آرام کے لیے رکتے تو بہت دیر پڑے ہانپتے ہی رہتے تھے۔ ہماری طرح کتوں پر بھی کم خوراک کا اثر ہو رہا تھا۔ وہ ہم وقت بوقت بھوکے رہتے تھے اور جب کھانا ڈالنے کا وقت آتا تو پاگل ہو جاتے تھے۔ ان کی طاقت بھی گھٹ گئی تھی اور وہ پہلے جیسی رفتار سے یہ پھوٹی سی سیج بھی نہیں کھانچ پارہے تھے۔ حالانکہ اس کا وزن روزانہ ہی کم ہو رہا تھا۔

نویں دن موسم یک دم بدلا اور شمال کی طرف سے برفانی جھکڑ چلنے لگے۔ پہلے تو ان کی رفتار کم تھی اور سردی بھی زیادہ نہیں تھی لیکن چند گھنٹوں بعد اصل طوفان آگیا۔ سردی کی شدت میں یک دم ہی اضافہ ہو گیا۔ دو دن پہلے جو کپڑے ہمیں بوجھ لگ رہے تھے اب وہ ناکافی محسوس ہونے لگے۔ درجہ حرارت صفر سے گر کر منفی سات درجے تک چلا گیا۔ ہوا کا زور اتنا زیادہ تھا کہ یہ ہمیں اٹھا کر پھینکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجبوراً ہمیں اپنا سفر روکنا پڑا تھا۔ ہم نے کتوں اور سیج کو کشتی سے باندھا اور خود اس میں قس کر لیٹ گئے۔ طوفان سے بچنے کے لیے ہم اس کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ طوفان دسویں دن بھی جاری رہا تھا اور درجہ حرارت گر کر منفی دس ہو گیا۔ سردی سے سب کا برا حال تھا۔ ہم چاروں ایک دوسرے سے جز کر بیٹھے تھے۔ لیکن کشتی فضا میں حرارت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کشتی کے آس پاس برف کا ڈھیر لگ رہا تھا۔ اندر جمع ہونے والی برف بھی ہم باہر ڈال رہے تھے۔

گیارہویں دن طوفان کی شدت میں کمی آئی تھی۔ شام تک اس کی شدت اتنی کم ہو گئی کہ ہم نے سفر کا فیصلہ کر لیا۔ ان دو دنوں میں ایک اچھے کام کی امید ہوئی تھی اور وہ یہ کہ سردی اور مسلسل برف باری کی وجہ سے دراڑیں بند ہو گئی ہوں گی اور ان پر آنے والا پانی مکمل طور پر جم گیا ہوگا جس سے ہمیں سفر میں آسانی رہتی۔ اب ہمارے پاس سامان اتنا کم رہ گیا تھا کہ ہم اسے اپنی پشت پر اٹھا کر بھی سفر کر سکتے تھے۔ ہم نے اپنی عارضی سیج کھول کر اسکیئر نکال لیں۔ سارا سامان پشت پر باندھنے والے بیگز میں ختم کیا۔ کتوں کی خوراک بس اتنی رہ گئی تھی کہ انہیں دو دفعہ دی جاسکتی تھی۔ ہم نے انہیں باقی رہ جانے والی ساری خوراک ایک ساتھ دے دی تاکہ ان میں اتنی توانائی آجائے کہ وہ تیز رفتار سفر میں ہمارا ساتھ دے سکیں۔

راستہ جاننے کے لیے ہمارے پاس کمپاس کے ساتھ جدید ترین دستی سائز کے جی پی ایس ریسیور تھے۔ ان سے ہمیں درست طور پر علم رہتا کہ ہم کہاں ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے راستہ بھٹکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہم نے کتوں

کو آزاد چھوڑ دیا اور اسکیئر پر آگے روانہ ہوئے۔ کچھ دیر کے سفر کے بعد ہی ہمارا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا تھا کہ سردی سے برف جم گئی ہے اور اس پر تیزی سے سفر آسان ہوگا۔ برف کی نیچے والی سہیقنا جم گئی تھی لیکن اس کے اوپر تازہ پڑنے والی برف کی تہ ابھی نرم تھی اور یہ تیز رفتاری سے سفر میں رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔ ہمیں آگے بڑھنے کے لیے بہت زور لگانا پڑ رہا تھا۔ آنے والے چھ گھنٹوں میں ہم نے تیزی سے سفر کیا تھا لیکن اس نے ہمیں تھکا مارا تھا۔

چار گھنٹے کے آرام کے وقفے میں ہم کشتی میں لینے تو ہمیں ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ وقت پورا ہوا تو ہم بادل ناخواست اٹھے اور آگے کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ کشتی ہم باری باری خود سے باندھ کر گھسیٹ رہے تھے۔ ہر آٹھ گھنٹے بعد باری بدل جاتی تھی کیونکہ جس سے کشتی بندھی ہوئی تھی اسے زیادہ محنت کرنا پڑتی تھی۔ کھانے کے بارے میں طے کر لیا تھا کہ وہ پوئیس گھنٹے میں ایک ہی بار کھایا جائے گا کیونکہ اسے دو حصوں میں کر کے کھانے سے لگتا تھا کہ پیٹ میں کچھ گیا ہی نہیں ہے۔ ایک ساتھ کھانے سے کچھ تسلی ہوتی تھی۔

بارہویں دن ہم نے کوئی ساٹھ کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا اور اب بھی ہم اپنی منزل سے ایک سو چالیس کلومیٹر دور تھے۔ اگر ہم دو دن میں بائیں آئی لینڈ واپس پہنچ جاتے تو ہمیں راجر مل جاتا۔ دوسری صورت میں وہ دو دن بعد چکر لگاتا۔ ہماری کوشش تھی کہ ہم دو دن میں واپس پہنچ جائیں اور موسم بھی اچھا ہو کیونکہ اگر موسم خراب ہو جاتا تو طیارہ نہیں آتا۔ طیارہ صرف صاف موسم میں آسکتا تھا، مگر لگ رہا تھا قدرست لیگال ہماری دعاؤں سننے کے لیے تیار نہیں تھی کیونکہ تیرہویں دن موسم پھر خراب ہو گیا۔ طوفانی ہواؤں کے جھکڑ چلنے لگے تھے اور یہ ہمیں جنوب کی طرف دھکیل رہے تھے جبکہ ہمیں مغرب کی طرف جانا تھا۔ درست راستے پر رہنے کے لیے ہمیں بہت زور لگانا پڑ رہا تھا۔ اس دن رفتار بہت سست رہی اور دن بھر میں ہم نے صرف تین کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا تھا۔ اب ہمارے پاس صرف ایک دن تھا اور ہمیں ایک سو دس کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنا تھا جو موجودہ حالات میں کسی صورت ممکن دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس رات جب ہم آرام کرنے کے لیے رکتے تو ہم نے آخری کھانا کھایا۔ اب ہمارے پاس کھانے کو کچھ نہیں رہا تھا تو بدافعت میں کمی سے بچنے کے لیے ہم منرلز اور وٹامنز کی گولیاں لے رہے تھے۔

چودھویں دن سورج بادلوں میں چھپا رہا اور سردی کی شدت برقرار تھی۔ ہواؤں کے زور میں کمی آئی تھی۔ پھر بھی

ہمیں آگے بڑھنے کے لیے جدوجہد کرنا پڑ رہی تھی۔ اس سارے دن میں ہم نے پچاس کلومیٹر کا سفر پورا کیا۔ رات ہمارے پاس کھانے کو کچھ نہیں تھا بھوک سے سب بے حال تھے۔ درجہ حرارت منفی نو تھا اور ہم کشتی میں لینے بکھر رہے تھے۔ بھوک اور سردی سے کسی کو نیند نہیں آرہی تھی۔ بس آرام کا وقت پورا کیا اور ہم کھڑے ہو گئے۔ اب ہمیں بائیں آئی لینڈ پہنچنے کی بے تابی تھی کیونکہ وہاں بیک اپ پیک میں خوراک موجود تھی۔ مسلسل سردی سے برف جم گئی تھی۔ اس پر اسکیئر سے سفر... کرنا آسان ہو گیا تھا۔ ہمیں اسکیئر پر کھڑے رہنا تھا لیکن ناتوانی کی وجہ سے ہمارے لیے بازو چلاتا مشکل ہو رہا تھا۔

کتے اب تک وفاداری اور ثابت قدمی سے ہمارا ساتھ دے رہے تھے حالانکہ انہیں آخری بار کچھ کھائے ہوئے کئی دن ہو چکے تھے۔ کمزوری کی وجہ سے ان کے قدم لڑکھڑاتے تھے لیکن وہ ہمارے ساتھ چل رہے تھے۔ اس دن ہم عزم کر کے چلے تھے کہ بائیں آئی لینڈ ضرور پہنچا ہے۔ راجر کے بارے میں ہمیں یقین تھا کہ وہ آکر واپس چلا گیا ہوگا، مگر وہاں خوراک تو تھی۔ ہم نے پہلے پیش میں چھ کے بجائے سات گھنٹے سفر کیا اور صرف تین گھنٹے آرام کیا اس دوران میں ہم نے پچیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کر لیا اور اب منزل پچیس کلومیٹر دور رہ گئی تھی۔

آخری بار کچھ کھائے ہوئے ہمیں چالیس گھنٹے گزر چکے تھے اس لیے جب ہم دوبارہ سفر کے لیے اٹھے تو ہمارے ہاتھ پاؤں لرز رہے تھے اور تھکوت سے حرکت کرنا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ نام اور اس کا ساتھی ابھی تک ہمارے ساتھ تھے لیکن کمزوری سے ان کے پیٹ بالکل کمر سے جا لگے تھے اور جڑہ مستقل کھلا ہوا تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

”دوستو... اب یہ آخری مرحلہ ہے ہمیں ہمت کرنا ہو گی اس کے بعد ہم اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے۔“

شیلی سفر کے دوران ڈائری لکھتی رہی تھی۔ اس وقت بھی وہ ڈائری لکھ رہی تھی۔ میری بات سن کر اس نے ڈائری واپس رکھی اور ہم آگے روانہ ہونے کے لیے تیار ہو گئے۔ کیونکہ کشتی کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی اس لیے میں نے اس میں سے ہوا نکال کر اسے اپنے بیک میں رکھ لیا۔ بائیں آئی لینڈ کی طرف سفر چڑھائی کا تھا اور ہمیں اس میں بہت محنت کرنا پڑ رہی تھی، مگر کھانے کا تصور ہمارے حوصلوں کو جوان رکھے ہوئے تھا۔ یہاں موسم صاف تھا۔ آسمان پر ہلکے بادل تھے اور کبھی کبھی سورج نکل آتا تھا۔ درجہ حرارت بھی اب منفی

تھی۔ ان تین دنوں میں ہم نے سو کر جو وقت گزارا وہی سب سے بہترین تھا۔

بارہ گھنٹے بعد رات نے مجھے جگایا تو مجھے لگ رہا تھا میرے جسم میں جان باقی نہیں رہی ہے۔ مجھ سے اٹھا نہیں جا رہا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ کہیں میرا آخری وقت تو نہیں آ گیا ہے۔ یہ خیال اتنا خوفناک تھا کہ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ سب کے چہرے مرجھائے ہوئے تھے۔ میں نے ہمت کر کے غار سے باہر جھانکا۔ موسم صاف ہو رہا تھا اور ہوا معتدل ہو گئی تھی لیکن آسمان پر بادل تھے اور جب تک آسمان پر بادل تھے موسم کسی وقت دوبارہ بدل سکتا تھا۔ فاقے کو آج چوتھا دن تھا۔ صبح کے بارہ بج رہے تھے۔ راجہ کو اب آ جانا چاہیے تھا۔ میں باہر نکل آئی۔ جنوب مشرق کی طرف آسمان صاف تھا اور راجہ کو اسی طرف سے آنا تھا۔ کمزوری کی وجہ سے میری ٹانگیں لرز رہی تھیں اور مجھے لگ رہا تھا کہ میں زیادہ دیر کھڑی نہیں رہ سکوں گی۔

رات نے سکتل دینے والا ریڈیو غار کے اوپر اس طرح لگایا تھا کہ اس پر برف نہ جمع ہو سکے۔ میں نے اسے چیک کیا تو پریشان ہو گئی۔ ریڈیو کام نہیں کر رہا تھا۔ میں نے اس کا آؤن کرنے والا سوچا۔ بار بار دیا لیکن ریڈیو خاموش رہا اس کی سرخ روشنی نہیں چلی تھی۔ ریڈیو میں شاید کوئی خرابی آ گئی تھی یا اس کی بیٹری قتل اندر وقت ہی ختم ہو گئی تھی۔ ہمارے پاس اس کی اضافی بیٹریاں تھیں لیکن وہ دوسرے سامان کے ساتھ ہی سمندر میں ڈوب گئی تھیں۔ اب ہم امداد کا سکتل دینے کے قابل بھی نہیں رہے تھے۔ آج تک ہی مجھے ہال آ یا نہیں راجہ آ یا اور اسے سکتل نہ ملا تو وہ داناں چلا گیا ہو۔ غراب موسم میں وہ صرف ہماری موجودگی میں بچے اڑنے کا خطرہ مول لے سکتا تھا۔ آج ہماری ہم کو شروع ہوئے انیسواں دن تھا اور اگر میں دن تک ہماری دہائی نہیں ہوتی تو ہمیں لاپتہ سمجھا جاتا۔ اس کے بعد سمندر کے اوپر تو ہماری تلاش کی جاتی لیکن یہاں کوئی نہیں آتا۔ ریڈیو کی خرابی نے ہمیں سنگین خطرے سے دوچار کر دیا تھا۔

میں نے پُر امید نظروں سے آسمان کی طرف دیکھا اور دل سے دعا کی کہ راجہ آ جائے۔ مجھے لگ رہا تھا وہ آج نہیں آیا تو پھر کبھی نہیں آئے گا اور اس موسم میں ہمیں بھوک سے ہلاک ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگتا۔ سرد موسم میں جسم اپنا درجہ حرارت برقرار رکھنے کے لیے توانائی کا زیادہ استعمال کرتا ہے نتیجے میں انسان جلد موت کے منہ میں پہنچ جاتا ہے۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں تھا اور یہ شاید آخری موقع تھا۔ ہم نے سو کر شاید اس سے پہلے ملنے والا موقع گنوا دیا

لڑائی جاسکتے ہیں۔“

”توانائی رہی کہاں ہے۔“ شیلی نے کہا۔

”ہمیں موت سے لڑنا ہے۔“ اس بار میں نے سخت لہجہ میں کہا۔ ”ہم ہم جو ہیں عام لڑکیاں نہیں ہیں جو حالات کا رونا دوسا نہیں ہر حال میں اپنا حوصلہ بلند رکھنا ہے۔“

میری بات سن کر وہ سنجیدہ ہو گئی تھیں۔ رات نے نقطہ اٹھایا۔ ”اگر ہمارے سونے کے دوران راجہ آ گیا تو؟“

”ہم سب نہیں سوئیں گے بلکہ کوئی ایک جاگے گا۔ ہر چار گھنٹے بعد ایک لڑکی جاگے گی۔“ میں نے کہا۔ ”پہلی باری میری ہے اور تم سب سو جاؤ۔ سونے کی شعوری کوشش کرو۔“

انہوں نے کوشش کی اور سو بھی گئیں۔ اُن کے ذہن بھوک کے احساس سے بچنے کے لیے نیند میں پناہ لینے پر راضی ہو گئے تھے۔ خود میری آنکھوں پر بھی نیند چل رہی تھی۔

چار گھنٹے بعد میں نے شیلی کو اٹھا دیا اور خود سو گئی۔ شیلی کے بعد شیرون کی باری تھی اور پھر رات کی باری تھی۔ بارہ گھنٹے بعد رات نے مجھے اٹھایا تو باہر طوفان اسی شدت سے جاری تھا۔ گویا راجہ کے آنے کا وقت گزر چکا تھا۔

”میں نے سکتل دینے والا ریڈیو باہر رکھ دیا ہے۔“

”اس موسم میں مشکل ہے کہ اس کا سکتل کسی کام کی جگہ پہنچے۔“ میں نے مایوسی سے کہا۔ ”یہاں طیارے بھی نہیں گزرتے ہیں۔“

”ممکن ہے موسم کی خرابی کے باوجود راجہ آئے اور یہ سکتل دیکھ لے۔“

”ہاں اس کا امکان ہے۔“ میں نے سوچا۔ ”اب تم سو جاؤ۔“

رات نے سونے کے لیے لیٹی تو میں غار سے باہر آئی۔ ہوا کی شدت برقرار تھی اور برف کے باریک ذرے اڑ رہے تھے میں نے عینک نہ پہن رکھی ہوتی تو یہ چہرے کی طرح لگ کر آنکھ کو زخمی کر سکتے تھے۔ آسمان تقریباً تاریک تھا اور ایسے موسم میں طیارے کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ نام

اور اس کا ساتھی غار سے لگے اور برف میں تقریباً ڈن سو رہے تھے انہوں نے بھی ہواؤں سے بچنے کے لیے یہ طریقہ نکالا تھا۔ مجھے ان پر ترس آنے لگا۔ میں کتوں کو اندر لے آئی۔ وہ لڑکیوں کے درمیان گھس کر لیٹ گئے۔ ہمیں آخری بار کچھ کھائے ہوئے چھپا سٹھ گھنٹے گزر چکے تھے۔ مجھے لگ رہا تھا

میرے پیٹ میں اندر سے بل پڑ رہے تھے اور وہ رہ کر نہیں سی اٹھتی تھی۔ چار گھنٹے بعد میں شیلی کو اٹھا کر دوبارہ سو گئی۔ تعجب کی بات ہے بھوک کی تکلیف کے باوجود نیند آ جاتی

”لیکن اس صورت میں کچھ نہ کچھ تو ملنا چاہیے تھا؟“ شیلی نے اعتراض کیا۔ ”کچھ ڈرم تو اٹھا کر لے جانے سے رہے۔“

”انہوں نے ڈرم توڑ دیا ہوگا اور کھانے والی چیزیں کھا گئے ہوں گے۔ باقی جو بچا وہ آنے والے طوفان نے برف میں دفن کر دیا۔“

شاید ایسا ہی ہوا تھا مگر اس کے ساتھ امید تھی کہ شاید ایسا نہیں ہوا تھا۔ طوفان نے بانس اکھاڑ دیا ہوگا اور شاید ہمارے سامان کو بھی دکھیل دیا ہو۔ اسی امید پر سستانے کے بعد ہم دوبارہ برف کھودنے میں لگ گئے۔ لیکن اس بار بھی

اور اس سے اگلی بار بھی کھدائی بے سود رہی تھی۔ ہمیں کچھ نہیں ملا تھا کوئی معمولی سی چیز بھی نہیں تھی۔ تھک ہار کر ہم نے سردی سے بچنے کے لیے برف میں غار کھودا۔ اور کشتی کو اس کے

دروازے پر پردے کی طرح ٹانگ لیا تھا۔ اس طرح ہم شمال سے چلنے والی ہواؤں سے کسی قدر محفوظ تھے۔ اس تھک غار میں ہم ایک دوسرے سے بڑ کر بیٹھ گئے۔

”اب ایک ہی امید ہے۔“ رات نے کہا۔ ”کل راجہ آ جائے۔“

راجہ سے ملے ہوا تھا کہ وہ دو گھنٹے بعد آئے گا اور اگر اس دوران میں ہم نہیں آئے ہوں تو وہ ہر دوسرے دن یہاں کا چکر لگائے گا۔ وہ گزشتہ روز آ کر چلا گیا ہوگا اور اب اسے کل آنا تھا۔ وہ لازمی آتا اگر موسم ٹھیک رہتا۔ میں نے کہا۔ ”راجہ کل آئے گا لیکن دعا کرو موسم اسی طرح ٹھیک رہے۔“

”پلیز موسم کے بارے میں کوئی بات نہ کرو۔“ رات نے جلدی سے کہا۔ ”یہاں موسم کا کچھ پھر و سنا نہیں ہے اس نے اپنے بارے میں ہماری رائے سن لی تو بدل بھی سکتا ہے۔“

رات کی بات سن کر ہم سب ہنس دیے تھے اور کئی دنوں بعد یہ پہلی ہنسی تھی جو ہمارے ہونٹوں پر آئی تھی۔ لیکن کچھ دیر بعد ہی رات کی بات درست ثابت ہونے لگی۔ ایسا لگا جیسے موسم نے ہماری بات سن لی تھی۔ چند گھنٹے بعد ہواؤں کی شدت میں تیزی آ گئی۔ پھر باقاعدہ جھکڑ چلنے لگے اور برف کے ٹکڑے اڑنے لگے۔ یہ درمیانے درجے کا برفانی طوفان تھا لیکن کسی طیارے کا راستہ روکنے کے لیے کافی تھا۔ ہمارے اندازے کے مطابق

اب سے دس گھنٹے بعد راجہ کو یہاں آنا تھا مگر اس موسم میں اس کی آمد ناممکن تھی۔ اگر وہ دس گھنٹے بعد نہیں آیا تا تو اس کی آمد چوبیس گھنٹے کے لیے ٹل جاتی۔ ہمیں آخری بار کچھ کھائے ہوئے پچاس گھنٹے گزر چکے تھے۔ میں نے کہا۔ ”ایسا لگ رہا ہے کہ شاید راجہ آئے نہیں چاہیے کہ سوچائیں اسی طرح ہم اپنی

تین رہ گیا تھا۔ سفر کے تیسرے گھنٹے میں ہم بائن آئی لینڈ کی زمین تک پہنچ چکے تھے۔ یہاں سمندر سے آنے والے گلے شیر خشک پر چڑھ گئے تھے اس لیے ڈھلان زیادہ تھی اور ہمیں اوپر چڑھنا پڑا تھا۔ اس کے لیے ہمیں بہت محنت کرنا پڑی تھی۔ دو گھنٹے کی جان توڑ کوشش کے بعد ہم اس جگہ پہنچ گئے تھے جہاں بیک اپ بیک موجود تھا۔ جی پی ایس بتا رہا تھا کہ ہم اس جگہ پہنچ گئے تھے لیکن ہمیں سرخ رنگ کا وہ بانس نظر نہیں آ رہا تھا جو ہم نشانی کے طور پر لگا گئے تھے۔ ہمارے دل رک گئے تھے۔

”میرے خدا بانس کہاں ہے؟“ شیرون نے رو دینے والے لہجے میں کہا۔ سب کے دل ڈوب رہے تھے کیونکہ وہ بانس ہی نشانی تھی۔ ورنہ یہاں ہر طرف ایک جیسی برف تھی اور برف کے ٹیلے تھے۔ جس میں کسی خاص جگہ کا پتا چلانا تقریباً ناممکن تھا۔

”شاید گزشتہ دنوں آنے والے طوفان نے بانس گرا دیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم نے بانس بہت مضبوطی سے لگایا تھا۔“ شیلی تیز لہجے میں بولی۔

”طوفان بھی شدت کا تھا۔“ رات نے کہا۔

”دیکھو بانس نشانی تھی لیکن جی پی ایس پر ہم نے یہ جگہ بھی نوٹ کی تھی اس کے مطابق ہم یا نکل ٹھیک جگہ پہنچ گئے ہیں۔ بیک اپ بیک پچاس گز کے دائرے میں کہیں ہونا چاہیے۔ اس کا مطلب ہے طوفان کی وجہ سے یہاں بہت برف گری ہے۔“

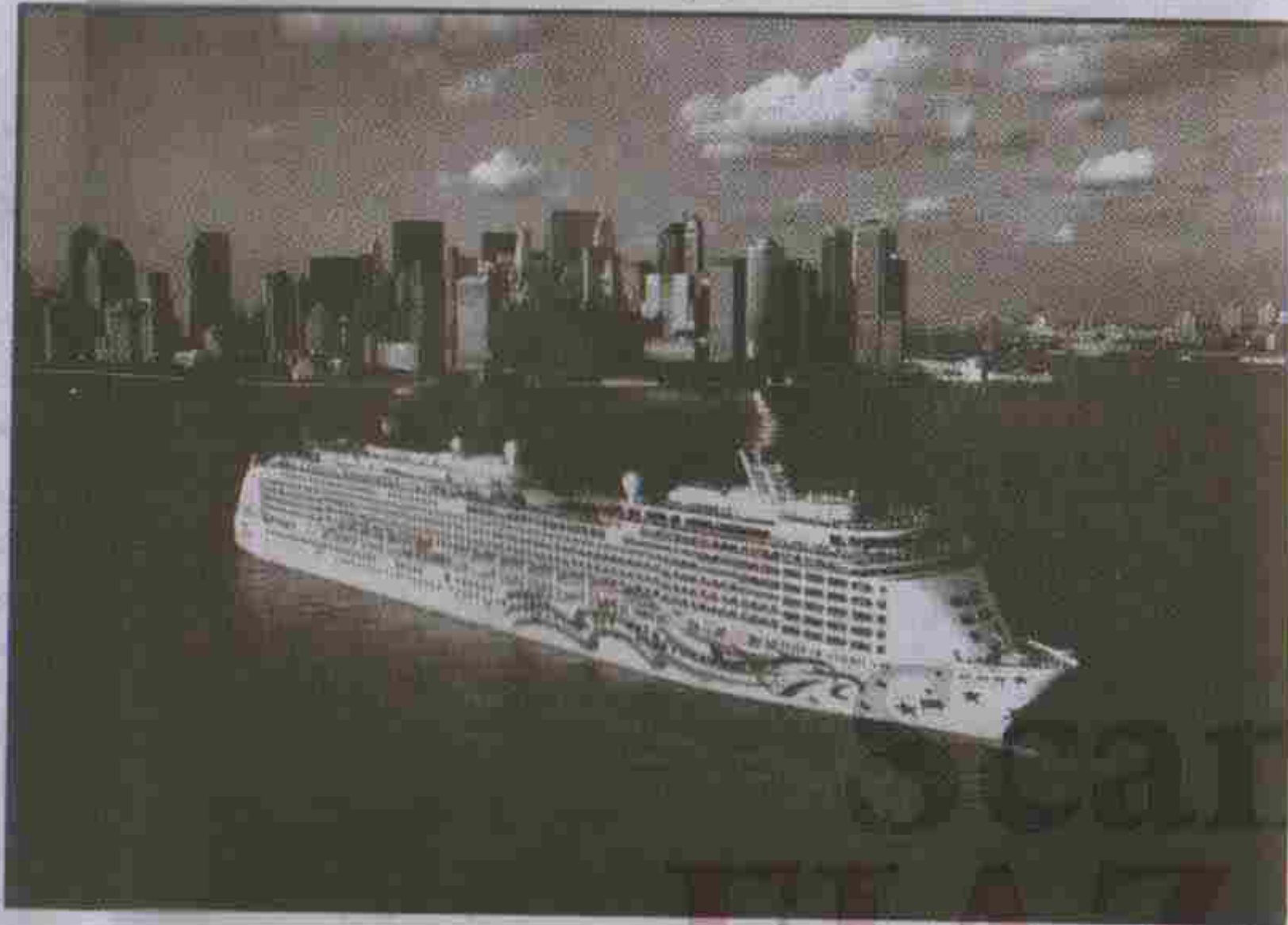
”لیکن وہ کہیں نہیں ہے۔“ شیرون نے برف کو اپنی اسٹک سے کریدا۔ ”کیا ہمیں اب برف کھودنا پڑے گی۔“

”اگر ہمیں راجہ کی دوبارہ آمد تک زندہ رہنا ہے تو خوراک والا ڈرم تلاش کرنا پڑے گا۔“ میں نے کہا۔ ہمارے پاس برف کھودنے کے لیے چھوٹی نوکدار کلہاڑیاں تھیں۔ یہ کل تین کلہاڑیاں تھیں۔ ان کی مدد سے برف کھودنے میں لگ گئے۔ ایک گھنٹے میں ہم نے کئی جگہوں پر برف کو کٹی فٹ

تک کھود ڈالا لیکن ہمیں بیک اپ بیک کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ دکھ اور بھوک سے ہمارا برا حال تھا۔ تقریباً سب ہی رو رہی تھیں لیکن شیرون نے دھاڑیں مار کر رونا شروع کر دیا۔

”کہاں ہے بیک؟“

ہم سب ہی تھک کر بیٹھ گئے تھے اور اب کسی میں کھدائی کی ہمت بھی باقی نہیں رہی تھی۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”شاید ہماری خوراک برفانی ریچھوں کے ہتھے چڑھ گئی ہے اور انہوں نے بانس بھی گرا دیا۔“



امریکا اور امریکا

الطاف شہزاد احمد: ابراہیم جمالی
تیسرا حصہ

امریکا مواقع کی سرزمین ہے۔ اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتی ہے۔ لوگ اس کی چکاچوند میں آنکھیں خیرہ کر لیتے ہیں اور یہ تک بھول جاتے ہیں کہ روشنی کے عقب میں اندھیرا بھی ہوتا ہے۔ الطاف شہزاد احمد کی سفر ناموں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ خود میں معلومات کا خزانہ لیے ہوئے ہیں۔ بہتر تجزیوں سے سچے ہوئے ہوتے ہیں۔ زیر نظر سفرنامہ بھی انہی خوبیوں سے مزین ہے۔ روشن رخ کے علاوہ اندھیرے گوشے کا نظارہ بھی کرائے والی سفر کہانی ہے۔

سرزمین امریکا کے سفر کی ایک جداگانہ سرکہانی

میں منگل کے روز امریکا پہنچا تھا اور دو دن کے بعد جمعہ تھا۔ صبح دس بجے میرے بھانجے کبیر نے آفس سے فون کر کے پوچھا ”اگر آپ جمعہ کی نماز پڑھنا چاہتے ہیں تو میں ساڑھے بارہ بجے آپ کو لینے کے لیے آ جاؤں؟“

”یہاں اوٹل میں کوئی مسجد ہے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔ جہاں ہماری رہائش تھی، اس قصبے کا نام Avenil تھا اور کبیر کا آفس وہاں سے تین میل دور قریبی شہر راہ وے (Rahway) میں تھا۔

ڈرنک لے آیا جسے پی کر ہمارے حواس ٹھکانے آئے تھے۔ اس کے پاس کھانے کے لیے بھی کچھ تھا لیکن اس نے ہمیں تھوڑا تھوڑا دیا۔ اس نے کہا۔ ”بس اب روانگی کے لیے تیار ہو جاؤ علاقے کی موٹی رپورٹ درست نہیں ہے یہاں طوفان آنے والا ہے۔“

”تم آخری بار کب آئے تھے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں تو روز پچکر لگا رہا تھا لیکن تم لوگوں کی طرف سے کوئی سنگٹل ہی نہیں ملا۔“

ہم اور کتے طیارے میں سوار ہوئے اور جب راجر طیارہ بلندی پر لے گیا تو ہم نے شمال سے آنے والے سیاہ بادلوں کو بھی دیکھ لیا جن کے جلو میں یقیناً طوفان تھا۔ راجر نے کہا۔ ”یہ میرا آخری پچکر تھا کیونکہ اس کے بعد کم سے کم چار دن اس علاقے میں موسم نہایت خراب رہتا۔“

”چار دن۔“ رون نے جھرجھری لی۔ ”اس کے بعد یقیناً یہاں ہماری لاشیں باقی رہ جاتیں۔“

”میں دو دن سے پچکر لگا رہا ہوں لیکن تمہاری طرف سے سنگٹل نہیں ملتا تو وہ اپس چلا جاتا۔“ راجر نے اسے بتایا۔

”اصل میں ریڈیو ہی خراب ہو گیا تھا۔“ میں نے بتایا اور اسے مختصر اپنی ناکامی کا احوال بتایا۔

”کوئی بات نہیں۔“ راجر نے تسلی دی۔ ”اصل چیز تو یہ ہے کہ تم لوگوں نے نہایت خراب حالات میں بھی حوصلہ نہیں ہارا اور اپنی زندگی بچانے کے لیے آخر تک لڑتی رہیں۔“

”لیکن ہم اپنی مہم میں کامیاب تو نہیں ہوئے۔“ شبلی کو اب ہم کا دکھ ستانے لگا تھا۔

”فکرت کرو دوستو! ہم دوبارہ آئیں گے اور پھر گرین لینڈ تک جانے کی کوشش کریں گے۔“ میں نے کہا۔

واپسی پر خلاف توقع ہمارا شاندار استقبال ہوا تھا اور پروفیسر جیم خود آیا ہوا تھا۔ میری مام اور پاپا بھی نیوفاؤنڈ لینڈ کے اس چھوٹے سے ائرپورٹ پر موجود تھے جہاں راجر کے طیارے نے لینڈ کیا۔ انہیں دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ جس وقت ہم اپنی ناکامی پر افسردہ تھے تو پروفیسر جیم نے کہا۔ ”لڑکیو... ہم جو وہ ہوتا ہے جو اپنا مقصد کسی حادثے یا خراب حالات کا شکار ہوئے بغیر حاصل کر لے لیکن اصل مہم جو وہ ہوتا ہے جو حادثے کا شکار ہونے اور کوئی امید باقی نہ رہنے کے باوجود ہمت نہ ہارے اور اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جان بچانے میں کامیاب رہے تو تم لوگ اصل مہم جو ہو۔“

●●

تھا۔ میرے لیے کھڑے رہتا دشوار ہو رہا تھا لیکن میں نے اندر جانے کے بجائے باہر رکنے کو ترجیح دی۔ میں اس ٹیلے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی جس میں غار کھودا تھا اور میری نظریں مستقل آسمان کا طواف کر رہی تھیں۔ طیارے کی آواز سے پہلے وہ نظر آتا۔ راجر کے طیارے کا نچلا حصہ سرخ رنگ کا تھا جو آسمان پر واضح نظر آتا۔

سنگٹن اور کمزوری سے حالت ایسی ہو رہی تھی کہ دل چاہ رہا تھا کہ میں لیٹ کر سو جاؤں۔ میرے اندر کوئی خبردار کر رہا تھا کہ میں لیٹ گئی یا سو گئی تو یہ ہمیشہ کی نیند میں بدل جائے گی۔ اس کے بعد مجھے یا میرے ساتھیوں کو جاگنا نصیب نہیں ہو گا۔ کئی گھنٹے اسی طرح بیٹھے ہوئے گزر گئے آسمان پر کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی سوائے اس کے کہ جنوب مشرق کی طرف آسمان مزید صاف ہو گیا تھا لیکن ہمارے اوپر بدستور بادل چھائے ہوئے تھے۔ مجھے جاگتے ہوئے چار گھنٹے سے زیادہ گزر گئے تھے۔ میں سوچ رہی تھی کہ شیردن کو جگا دوں۔ میں اٹھ کر غار میں جانے والی تھی کہ میری پچھی جس نے خبردار کیا اور میں نے پلٹ کر آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان صاف تھا۔ اس پر کہیں معمولی سا دھبہ بھی نہیں تھا۔ میں چند منٹ تک دیکھتی رہی اور پھر جانے لگی تھی کہ آسمان میں کوئی تبدیلی آئی۔ میں نے غور سے دیکھا تو مجھے شبہ ہوا ایک پچھر کے برابر کوئی چیز ہے۔ میں غور سے اسے دیکھتی رہی۔ وہ بڑھ کر کبھی کے برابر ہوئی اور پھر ایسا لگا جیسے کوئی چھوٹی چڑیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی ایک گنگنائی آواز آئی تو میں اچھل پڑی تھی۔ یہ طیارہ تھا۔ میں نے جھپٹ کر کشتی اٹھائی۔ ہوائی جہاز نے اس کا ربر کسی چادر کی طرف پھیل گیا تھا۔ میں نے چلا کر ان تینوں سے کہا۔ ”طیارہ آ گیا ہے۔“

وہ جھپٹ کر باہر آئیں اس دوران میں میں نے کشتی کو ایک نمایاں جگہ بچھا دیا تھا سفید برف پر اس کا میرون رنگ یقیناً میلوں سے نمایاں نظر آتا۔ طیارہ اب نزدیک تھا اور اس کی ساخت نظر آنے لگی تھی۔ نیچے کا سرخ رنگ بتا رہا تھا کہ یہ راجر کا طیارہ ہے۔ راجر نے طیارے کو دائرے میں گھما کر ہمیں پیغام دیا کہ اس نے ہمیں دیکھ لیا ہے اور پھر وہ لینڈ کے لیے مشرق کی طرف چلا گیا۔ یہ ٹائروں اور اسکیڑ دونوں سے لینڈ کر سکتا تھا۔ یہاں برف تھی اس لیے اس نے اسکیڑ نکالیں اور چند منٹ بعد وہ ہمارے سامنے رک رہا تھا۔

راجر باہر آیا تو ہم سب اس سے پلٹ گئے تھے۔ ہم خوشی سے رو رہے تھے اور شاید کچھ کہہ بھی رہے تھے۔ راجر نے ہماری حالت سے اندازہ لگا لیا۔ وہ طیارے سے اترتی

”بعد کی نماز پڑھنے کے لیے ہم تمام دوست شیزان ہوئے جاتے ہیں۔“ سیر نے جواب دیا ”ہوئے کے مالک کی جانب سے وہاں کا بیگنٹ ہال نماز کے لیے خالی رکھا جاتا ہے۔“

امریکا میں مسلمانوں کی تعداد میں اضافے کے ساتھ مساجد کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے لیکن اس کے باوجود بعض علاقوں میں مسجد نہ ہونے کے سبب اردگرد کے رہنے والے مسلمان نمازیں خاص طور پر جمعہ کی نماز کسی آفس یا گھر میں پڑھتے ہیں۔ اس کے علاوہ کئی ہوٹل یا ریسٹورنٹ کا ہال چند گھنٹوں کے لیے کرائے پر حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ عبادت کے ساتھ ساتھ ہفتے میں کم از کم ایک مرتبہ اردگرد رہنے والے مختلف ملک کے مسلمانوں کی ایک دوسرے سے ملاقات ہو، تعارف اور شناسائی پیدا ہو۔ اس معاملے میں شیزان ہوٹل کے مالک کو فراخ دل اور نئی مرد کہا جاسکتا ہے کیونکہ اسے ہفتے میں کم از کم ایک دن لٹج کی آمدنی سے دستبردار ہونا پڑتا ہے۔ پورے ہال میں تقریباً ایک ہزار مرد اور دو سو خواتین نماز ادا کر سکتی ہیں۔ عورتوں کے حصے کو پردے لگا کر الگ کیا جاتا ہے۔

مذکورہ پاکستانی ”شیزان ہوٹل“ جس علاقے میں واقع ہے وہ انڈین دکانوں کے حوالے سے مشہور ہے۔ یہاں کی پاکستانی اور انڈین یعنی ”دبئی“ دکانیں اور ہوٹل پوری نیوجرسی ریاست میں شہرت رکھتے ہیں۔ دکانیں بھی ہر قسم کی ہیں۔ تائی اور کان چھیدنے والوں سے لے کر اچار، سبزی اور حلال گوشت کی دکانیں جا بجا نظر آتی ہیں۔ سڑک سے گزرتے ہوئے دکانوں کے نام پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم کراچی یا ممبئی کی کسی سڑک پر چل رہے ہیں۔ کئی دکانوں پر انگریزی کے علاوہ ہندی، گجراتی اور اردو میں لکھے ہوئے بورڈ بھی نظر آئے۔ مثلاً بمبئی چاٹ ہاؤس، ٹیل کیش اینڈ کیری، پاکیزہ بوتیک، شیش کلاکس، دیسی بازار، نور محل حلال میٹ اس کے علاوہ چاندنی، شالیمار، مہارانی جیسے نام کی دکانیں وغیرہ بھی نظر آئیں۔

سیر ایک گھنٹا پہلے ہی آدھکا اور بولا ”مجھے بینک میں کچھ کام ہے۔ اس لیے یہاں سے کچھ جلدی روانہ ہوتے ہیں، آپ کا کیا خیال ہے؟“

”چلو بھی، مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“ میں نے جواب دیا ”میں ویسے ہی یہاں فارغ بیضا پور ہو رہا ہوں۔ تمہارے ساتھ چلتے پھرتے اچھا وقت گزرے گا۔“

میں نے کیرا، قلم اور نوٹ بک اٹھائی اور اس کے ساتھ چل دیا۔ ہم اپنی کالونی سے نکل کر سامنے والی سڑک پر آ گئے جہاں ایک طرف اس علاقے کا مشہور اوپن اسکول اور اس کے سامنے چار ایکڑ پر پھیلا سرسبز باغیچہ تھا۔ شام کو یہاں ہندوستان کے صوبے گجرات سے تعلق رکھنے والے مرد اور عورتیں ٹولیوں کی صورت میں آ کر ٹیٹھی ہیں۔ نہ صرف اس شہر اوپن اسکول میں بلکہ قریبی قصبے Iselin سمیت پورے امریکا میں انڈین گجراتی بھرے پڑے ہیں۔ ان میں تقریباً تمام لوگ ”ٹیل“ ذات کے ہیں۔ اب امریکن حکومت اپنے ہاں اتنی تعداد میں ”ٹیلوں“ کو رکھ کر انہیں کم کم ویزا دیتی ہے۔ میرے خیال کے مطابق امریکا میں پورے پاکستان کے لوگ مجموعی طور پر اتنی تعداد میں نہیں ہوں گے جتنے صرف گجرات صوبے سے تعلق رکھنے والے موجود ہیں۔ گجرات والوں کے نہ صرف امریکا میں بلکہ یورپ میں بھی بڑے ٹھاتے ہیں کیونکہ وہ کہیں بھی تنہائی محسوس نہیں کرتے۔ ہر جگہ ان کے لوگ موجود ہیں۔ انڈیا میں بھی انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ کیونکہ ان کا صوبہ سب سے زیادہ فاران ایٹس پہنچ کھاتا ہے۔ یہ لوگ ہندو مذہب کی طرح برصغیر کی تقسیم کے بعد اور اس سے پہلے بھی دنیا کے مختلف ملکوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ سندھ اور گجرات کے لوگوں میں یہ فرق تھا کہ سندھ کی نصف سے زیادہ آبادی بالکل متحرک نہیں تھی اور یہ تمام لوگ مسلمان تھے۔ ہندوؤں کے مقابلے میں وہ جہاں تھے، وہیں موجود رہے۔ ان کے لیے قریبی گاؤں بھی ”پردیس“ تھا۔ تعلیم کے لحاظ سے بھی ہندو، مسلمان کے درمیان واضح فرق رہا۔ گجرات کا پورا صوبہ تعلیم میں آگے تھا اور وہاں کے لوگ نت نئی ملازمتیں کرنے اور کاروبار میں بھی ماہر تھے۔

میں حال ہی میں انڈیا، خاص طور پر گجرات کے شہروں بڑودہ، احمد آباد اور گودھرا کی سیاحت کر کے آیا تھا۔ اس لیے شام کو میں ان بوڑھے گجراتیوں کے ساتھ جا بیٹھتا تھا۔ ایک دو مرتبہ میں نے ان کی بوڑھی بیویوں کے ساتھ بیٹھ کر گپ شپ کی اور ان کے فونو بنائے۔ ڈھیلی ڈھالی پتلونوں میں ان کے مرد اور غیر استری شدہ ساڑیوں اور کرتے پا جاسے میں ملبوس بوڑھی عورتوں کے فونو جب میں اپنے دوستوں کو مختلف ممالک میں ای میل کرتا ہوں تو وہ یقین نہیں کرتے کہ یہ امریکا ہے یا ہندوستان کا کوئی شہر! خالص کاروباری ذہن رکھنے والے ان گجراتیوں کی

گفتگو نے مجھے بور ضرور کیا تھا۔ ہماری رہائش گاہ کے سامنے رہنے والی ایک پاکستانی خاتون نے ایک دن مجھ سے پوچھا ”میں نے آپ کو کھوسٹ گجراتیوں کے ساتھ بیٹھ دیکھا تھا۔ خیریت تو ہے؟“ وہ نہ جانے کیوں بوڑھی گجراتی عورتوں سے خار کھاتی تھیں۔ ان کا تعلق پشاور سے تھا اور ان کے شوہر پچھلے میں برس سے یہاں چکن فرائی کارپوریشن چلا رہے تھے۔

”ہاں، سب خیر ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ”اس عمر میں بوڑھی عورتیں ہی مجھے اپنے قریب بیٹھنے کی اجازت دے سکتی ہیں۔“

”لیکن پھر بھی۔۔۔۔۔“

”دراصل میں اس تاک میں تھا کہ شاید ان سے کوئی ایسی کہانی یا دلچسپ گفتگو سن سکوں جو میرے پڑھنے والوں کے لیے مزے دار ثابت ہو۔“ میں نے اسے اصل بات بتائی۔ اسے معلوم تھا کہ میں جہاز کا انجینئر ہونے کے ساتھ ساتھ مصنف بھی ہوں۔

”آپ کی یہ کوشش بیکار جائے گی۔“ خاتون نے منہ بناتے ہوئے کہا ”یہ بوڑھی کھوسٹ عورتیں کسی کے سامنے مجال ہے جو کام کی ایک بات بھی کہہ جائیں۔۔۔۔۔ ہاں، میں نے سنا ہے کہ یہ روزانہ ٹولیاں بنا کر دنیا جہاں کی باتیں کہیں بلکہ سب اپنی بہوؤں کی غیبت کرتی ہیں۔ یہی رونا روتی رہتی ہیں کہ بہو نے ان کے بیٹے کو اپنے قابو میں کر لیا ہے، گھر کا کام بھی نہیں کرتیں، نوکری کے بہانے باہر پیش کرتی ہیں اور وہ ان کے بچوں کو بہلانے اور ان کی نیپیاں دھونے کے لیے گھر میں پڑی رہتی ہیں۔“

☆ ☆ ☆

سیر، اوپن اسکول کے سامنے سے گزر کر گاڑی کو دائیں جانب سینٹ جارج ایونیو پر لے آیا۔ بائیں سمت میں وہی آئسکریم کی دکانیں اور فرنیچر کے شورومز تھے۔ امریکا کی بعض دکانیں دیکھ کر مجھے ہمیشہ تعجب ہوتا ہے کہ اس قدر وسیع اور کشادہ، پھر ان میں نوع بہ نوع ورائٹی! جاپان، ہانگ کانگ، کورین ٹیکن اور سنگا پور جیسے ملک چاہتے ہوئے بھی ایسی دکانیں نہیں کھول سکتے کیونکہ وہاں زمین کی قلت ہے۔ ایک مرتبہ گھر کی ضرورت کے لیے پانے، پلاس، ہینکس اور ہتھوڑی جیسے اوزاروں کی خریداری کے لیے بیہوش مجھے ایسی ہی ایک Home Dept دکان میں لے آیا۔ اندر چلتے ہوئے ایسا معلوم ہوا کہ ہم دکان کے آخری سرے تک

پہنچے پہنچتے تھک جائیں گے۔ وہاں سوئی، دھاکا اور پانی کے پمپ سے لے کر ٹریکٹر تک فروخت کے لیے موجود تھا۔ پلاس، پانا اور ریتی سے لے کر گھر کی دیواروں، کھڑکیوں اور دروازوں کے لیے پینٹ بھی دستیاب تھا۔ قالین، میز، کرسیاں، لان میں رکھنے کے لیے بچوں کے جھولے غرضیکہ گھر کی ہر ضرورت کا سامان آپ ایک دکان سے خرید سکتے ہیں۔ پورے شہر میں ایسی دکان صرف ایک نہیں بلکہ کئی تھیں۔ ہاں، ان کے درمیان چند میل کا فاصلہ ضرور تھا۔

یہاں واقع چین اسٹورز کا بھی یہی حال ہے۔ ان میں اولڈ نیوی، کے مارٹ، وال مارٹ اور جیسی جیسی اسٹور شامل ہیں۔ اسی طرح ہمارے پاکستانی اور انڈین اسٹورز ہیں۔ ایک زمانہ تھا یعنی تقریباً چالیس برس قبل جب 1968ء سے ہماری امریکا آمد درفت شروع ہوئی تو یہاں آباد برصغیر کے لوگ اچار، چٹنیوں، مسالے، نان، پوریوں، بیلن اور توڑے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ جب ہم امریکا کے لیے روانہ ہوتے تھے تو اپنے دوستوں اور شناساؤں کی فرمائش پر ان کے لیے باسکی چاول، سویاں، اچار اور دوسری ایسی ہی چیزیں ساتھ لے جاتے تھے جن کا امریکا میں ملنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ کچھ گرم مسالہ امریکا کی جنوبی ریاستوں ٹیکساس اور نیو آریلیئس وغیرہ میں ایٹنی دکانداروں سے مل جاتا تھا۔

اور اب، ایسی کون سی چیز ہے جو امریکا میں دستیاب نہیں؟ برصغیر اور ایران، افغانستان کی خاص اور مخصوص سوغاتیں بھی شہروں کے علاوہ قصبوں تک میں یہ آسانی مل جاتی ہیں۔ ہماری دیسی دکانوں کے علاوہ مقامی گوروں کی شاپس پر بھی کچی پکائی روٹیاں، نان، نمکو، جھاڑو، لوٹے تک فروخت ہوتے ہیں۔ سبزی منڈی، دیسی بازار، وانا بازار جیسی سپر مارکیٹوں میں انڈیا اور پاکستان کے ہر برانڈ کے مسالے، چاول، ڈرائی فروٹس، دالیں، موم بتیاں، اگر بتیاں، لالٹینیں، چپاتی اور نان رکھے نظر آتے ہیں۔ ہمارے ملک میں تو کیا سنگا پور اور دہلی میں بھی چیزوں کی اس قدر ورائٹی دکھائی نہیں دیتی۔ سخت مقابلے اور مسابقت کے سبب ان چیزوں کی قیمتیں بھی نہایت مناسب ہیں۔

یہاں مٹھائی اور نمکو، سمو سے، نمک پارے، پاپڑ وغیرہ کی بھی کئی دکانیں ہیں۔ ماضی میں یہ چیزیں اس وقت سامنے آتی تھیں جب کوئی ہم وطن وہاں پہنچتا تھا اور ”سوغات“ کے طور پر اپنے ساتھ لاتا تھا۔ میں اس مرتبہ بیہوش اور سیر کے

ماہنامہ سوسائٹی ڈائجسٹ



ماہنامہ سوسائٹی ڈائجسٹ

گھر کا چراغ / ایچ اقبال

چراغ کی لو جلتی ہے تو ہر سو روشنی بکھر جاتی ہے
اور جب بجتی ہے تو ہر شے کو خاکشیر دیتی ہے

لکڑا / طاہر جاوید مغل

کھنکھانے والی اور اعصاب شکن ماحول میں لمحہ بہ لمحہ
آگے بڑھتی داستان کی دل فریب سحر انگیزیاں

گرداب / اسماعیل قاری

بے پیدہ و خاردار راستوں پر
گامزن دوشیزہ کی دشواریاں

سورق

محبت، انتقام اور نفرت کی مثلث پہلا ٹکڑا رنگ
گم گشتہ اوراق سے ایک قصہ۔ دو سر انگشتیں رنگ

جرم کتنائیں

ہر جرم کے پیچھے کوئی نہ کوئی واقعہ مضر ہوتا ہے۔ انہی
تغییرات سے جنم لینے والی ناقابل فراموش کہانیاں

چنی نکتہ چنی

آپ کے تہرے... مشورے... سمجھتیں...
دکھائیں... اور نئی دلچسپ باتیں... آپ کے قلم سے

اور ہم میلہ دیکھنے کے بجائے تماشاخیوں اور انتظامیہ
کے درمیان ہونے والے جھگڑے کا کچھ حصہ دیکھ کر لوٹ
آئے۔

”یہ آرٹسٹ کیوں نہیں آسکے؟“ میں نے انتظامیہ کے
ایک شخص سے پوچھا تھا۔

”ہم نے ان کے ٹکٹوں پر لاکھوں روپے خرچ کیے۔“
اس نے گہرا سانس لے کر تاسف سے کہا ”ان کے ویزا کا
انتظام کیا، یہاں ہوٹل میں ان کی رہائش کے اخراجات
برداشت کیے اور اب عین موقع پر انہوں نے فرمائش کی ہے
کہ انہیں ملے شدہ معاوضے سے زیادہ ادا کیا جائے۔ ٹکٹس
بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ وہ نہ جانے کیا سمجھتے ہیں، شاید یہ کہ
امریکا میں رہنے والے ہم پاکستانیوں کے پاس دولت کے
اجارے لگے ہوئے ہیں۔“

اس کی دیگر تمام باتیں اپنی جگہ، لیکن آخری بات حقیقت
پر مبنی معلوم ہوئی۔ امریکا سے باہر رہنے والے یہاں ملازمت
کرنے والوں کی تنخواہ کا سن کر یہ فرض کر لیتے ہیں کہ امریکا
میں رہنے والے تمام لوگ انتہائی دولت مند ہیں جبکہ حقیقت
اس کے برعکس ہے۔ کئی بات یہ کہ یہاں رہنے والے تمام
ایسی لوگ اپنے عزیزوں اور وطن کو بہت متن کرتے ہیں۔
دوسرے یہ کہ امریکا میں اس قدر مہنگائی ہے اور گزشتہ تین چار
برسوں کے دوران اس میں اس حد تک ہوشربا اضافہ ہو چکا
ہے کہ یہاں بھی ایسی مہنگائی نہیں رہی۔ ہر چیز کی قیمت میں
سو فی صد تک اضافہ ہو چکا ہے۔ گزر بسر کے لیے یہاں ہر
شخص کو سخت محنت کرنا پڑتی ہے۔ ہمارے ایسی بھائیوں کو تو
مزید سادگی کے ساتھ زندگی گزارنی پڑتی ہے کیونکہ ان کے
ساتھ بیوی بچے، بہن بھائی والدین بھی ہوتے ہیں۔ ان کے
لیے بچت کرنا ضروری ہوتا ہے۔ یقین کیجئے کہ یہاں اگر
میاں بیوی، دونوں ملازمت کرتے ہیں تب بھی ان کی
گزر بسر بہت مشکل سے ہوتی ہے۔ کئی لوگ چوبیس گھنٹوں
میں چند گھنٹے ہی سو جاتے ہیں۔ اوور ٹائم اور دو دو جگہ ملازمت
کرتے ہیں۔ چند ایک کو چھوڑ کر باقی اکثر لوگ روز کھانا اور
روز کمانے کے چکر میں گھم چکر رہتے ہیں۔

پہلی نظر میں آپ یہی رائے قائم کریں گے جس کا ذکر
کیا جا چکا ہے۔ ان کے پاس بڑی سی گاڑی ہوتی ہے۔
ایئر کنڈیشنڈ یا سینٹرلی ہیٹڈ فلیٹ میں رہتے ہیں، گھر میں
ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔ لیکن ہر چیز رن شدہ ہوتی
ہے۔ وہ ہر مہینے اپنی تنخواہ کا ایک بڑا حصہ گھر، کار، فرنیچر کی قسط

نعمانہ جعفری، پریاء، ربیہ، امیر اور طاہر وغیرہ اپنے فن کا مظاہرہ
کرنے والے تھے۔ جلی حروف میں ملے کا نام ”دھوم بھاو
پاکستان میلہ“ تحریر تھا۔ اشتہار میں پیشگی بنگلہ کرانے کی
صورت میں ٹکٹ کی قیمت 13 ڈالرز اور اسی دن گیٹ سے
ٹکٹ خریدنے کی قیمت 15 ڈالرز لکھی تھی۔

اس قسم کے میلوں کے حوالے سے بھی نیو جرسی ریاست
خاصی مشہور ہے۔ یہاں منعقد ہونے والے میلے زیادہ تر انڈیا
کے باشندوں کی جانب سے ہوتے تھے۔ جن میں ان کی فلمی
دنیا اور ٹی وی سے تعلق رکھنے والے آرٹسٹ آتے تھے۔ ان
کے مہنگے ٹکٹ خرید کر انڈین بلکہ پاکستانی بھی بڑی تعداد میں
شریک ہوتے تھے کیونکہ یہاں بھی اشارہ ٹیس، زری، سہارا اور
سوٹی جیسے ٹی وی چینلوں کی موجودگی کے سبب ہمارے پاکستانی
لوگ بھی انڈیا کے ایک ایک آرٹسٹ سے واقف رہتے ہیں۔

”آخر کار پاکستانیوں نے ایک بار پھر میلہ منعقد کرنے
کی ہمت کر لی لی ہے۔“ میرے قریب کھڑے ہوئے ایک
شخص نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ بھی میری طرح اشتہار پڑھ
رہا تھا۔ ”ہماری دعا ہے کہ یہ میلہ کامیاب ہو۔“

”کیا اس سے پہلے بھی پاکستانیوں نے یہاں میلوں کا
انعقاد کیا ہے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”جی ہاں۔ ایک مرتبہ تو اجازت نامہ حاصل کرنے کی
ضرورت ہی نہیں تھی۔ حکومت کو معلوم ہوا تو اس نے فوراً
ایکشن لیا اور تنظیمیں، آرگنائزرو وغیرہ نے جرمانہ ادا کر کے
اپنی جان چھڑائی تھی۔ دوسری مرتبہ پچاس ٹکٹ بھی فروخت
نہیں ہو سکے تھے۔“ اس نے بتایا۔

بہر حال افسوس کی بات یہ ہے کہ اس میلے کی تاریخ
میری موجودگی کے دوران آگئی۔ مجھے میلہ دیکھنے سے زیادہ
اس کے شرکا سے ملنے کا شوق تھا لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ
میں نے اس میلے میں داخل ہونے کا پیشگی ٹکٹ نہیں خریدا
تھا۔ میں نے اضافی دو ڈالرز ادا کر کے عین وقت پر ٹکٹ
خریدنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ میلے میں آنے والوں کی تعداد کچھ
زیادہ نہیں تھی۔ ممکن ہے بعد میں ان کی تعداد بڑھ گئی ہو۔ لیکن
جب یہ خبر آئی کہ اتنا قس کیے گئے آرٹسٹوں میں سے کئی اس
میلے میں شریک نہیں ہو سکیں گے خاص طور پر عمر شریف۔ یہ
معلوم ہوتے ہی گیٹ کے پاس ٹکٹ خریدنے والوں نے
اپنے ہاتھ روک لیے۔ جو لوگ پیشگی ٹکٹ لے چکے تھے، جب
انہیں معلوم ہوا کہ ان کے ساتھ دھوکا ہوا ہے تو وہ انتظامیہ کے
ساتھ ”ہاتھ پائی“ پر اتر آئے۔

لے حیدر آباد کی برہانی بیکری سے ایک اور نان ختائی لے گیا
تھا لیکن میں وہاں انڈین دکانوں پر انڈین کیک، بسکٹ اور
نان ختائی کی ورائٹی اور تازگی دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ معلوم
ہوا کہ اس قسم کی کئی چیزیں روزانہ انڈیا سے یہاں (امریکا)
پہنچتی ہیں کیونکہ دہلی اور ممبئی سے نیویارک روزانہ ڈائریکٹ
فلائٹ پہنچتی ہے۔

☆☆☆

ہم سینٹ جارج ایونیو پر سفر کرتے ہوئے روٹ 27 پر
پہنچے۔ وہاں سے اوک ٹری روڈ پر آنے کے لیے ہم نے ہائیں
جانب کا رخ کیا۔ سیر سے یہ جان کر تعجب ہوا کہ شیراز ہوٹل
کے قریب امریکا کے حبیب بینک کی ایک شاخ ہے۔
نیویارک کے علاوہ کئی دیگر شہروں میں بھی اس کی برانچیں
ہیں۔ سیر نے بتایا کہ ”اسٹین“ والی برانچ کے منیجر ندیم جو نیو
جارج اور ان کا تعلق سندھ سے ہے۔

”جو نیو صاحب آپ کو جانتے ہیں۔“ سیر نے بتایا
”وہ پچھلے بارہ سال سے یہاں کے مختلف بینکوں میں کام
کر رہے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ جب تمہارے
ماموں یہاں آئیں تو ہمیں ضرور بتانا۔ ہم ان کی دعوت
کریں گے۔“

”کون ہو سکتے ہیں؟“ میں نے سوچتے ہوئے کہا
”تمہیں ان کے والد صاحب کا نام معلوم ہے؟“
”نہیں لیکن وہ آپ سب لوگوں کو جانتے ہیں۔“

بہر حال میں نے سوچا کہ ملاقات ہونے پر معلوم
ہو جائے گا کہ موصوف کس خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں۔
شیراز ہوٹل کے عقب میں پارکنگ کے لیے خاصی کشادہ جگہ
تھی۔ ہم نے وہاں گاڑی پارک کی۔ وہ حبیب بینک کا بھی
عقبی حصہ تھا۔ سیر چیک جمع کرانے کے لیے بینک میں
چلا گیا۔ بینک کے گیٹ پر روزی نامی کلرک نے بتایا کہ منیجر
صاحب تھوڑی دیر پہلے ہی بینک سے جا چکے ہیں۔ یہ سن کر
میں نے بینک کے اندر جانا ضروری نہیں سمجھا اور مسجد کی
جانب چل دیا یعنی شیراز ہوٹل کے بینک کوٹ ہال کی طرف۔

ہوٹل کے مرکزی گیٹ پر چند پوسٹر آویزاں تھے۔ ان
میں سے ایک نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کرائی۔ میں
غور سے پوسٹر کی عبارت پڑھنے لگا۔ وہ نیو جرسی کی پاکستانی
امریکن ایسوسی ایشن اور اے آر وائی کے تعاون سے قریبی شہر
ایڈیسن میں منعقد ہونے والے ایک میلے کا اشتہار تھا۔ اس
میلے میں پاکستانی آرٹسٹ عمر شریف، ابرار الحق، رحیم شاہ

آہ منشا یاد

منشا یاد کا جنم 15 ستمبر 1937ء کو تحصیل نسر نرند فرخ آباد ضلع شیخوپورہ میں ہوا۔ ان کے والد حاجی نظیر احمد حکمت کرتے تھے۔ انہوں نے میٹرک 1955ء میں، ایم بی ہائی اسکول حافظ آباد سے کیا۔ سول انجینئرنگ میں ڈپلوما 1957ء میں حاصل کیا اور پی ڈبلیو ڈی میں 1958ء سے 1960ء تک سب انجینئر کی حیثیت سے رہے۔ بچپن سے ہی ادبی ذوق کے حامل تھے۔ ساتویں کلاس میں تھے کہ انہوں نے بچوں کے پرچوں میں کہانیاں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ فاضل اردو کا امتحان 1964ء میں، بی اے 1965ء میں اور ایم اے 1967ء میں اردو اور 1972ء میں پنجابی میں کیا۔ 1997ء میں وہ ڈپٹی ڈائریکٹر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ انہوں نے لاہور میں اپنی کزن فرحت نسیم اختر سے 1960ء میں شادی کی۔ ایک لڑکی اور تین لڑکے تھے۔ ان کے بڑے بیٹے فرخ جمیل آر می پبلک اسکول وکالج کے وائس پرنسپل ہیں۔ بیٹی نوما نسیم ماڈل کالج فار گرلز اسلام آباد میں ٹیچر ہیں۔ دوسرے بیٹے ڈاکٹر عامر جمیل یونیورسٹی آف ٹیکساس، ڈیلاس امریکا میں پروفیسر آف میڈیسن ہیں۔ سب سے چھوٹے صاحب زادے کا شرف نوید اسلام آباد کے ایک ٹی وی چینل میں اسسٹنٹ منیجر ہیں۔ منشا یاد نے اسلام آباد میں حلقہ ارباب ذوق کی بنیاد 1972ء میں رکھی۔ انہوں نے کئی اور ادبی تنظیمیں بھی بنائی تھیں جن میں لکھنے والوں کی انجمن، رابطہ، بزم کتاب، فلشن فورم قابل ذکر ہیں۔

ان کی پہلی کہانی 1955ء میں کافی سراہی ملی تھی۔ پہلا مجموعہ 1975ء میں آیا۔ اب تک 9 افسانوی مجموعے آچکے ہیں۔ ایک پنجابی ناول اور کئی ٹی وی سیریلز اور ڈرامے کافی مشہور ہوئے۔ انہیں 2004ء میں پرائیڈ آف پرفارمنس بھی دیا گیا۔ صدارتی ایوارڈ کے علاوہ بھی کئی ایوارڈز حاصل کیے۔ 15 اکتوبر 2011ء کی رات ان کی زندگی کی آخری رات ثابت ہوئی۔

ہوتی ہے۔ اس لیے پہلے دن میں سنتیں نہیں پڑھ سکا۔ اس کے علاوہ یہاں وعظ کے لیے کوئی باقاعدہ مولوی مقرر نہیں ہے۔ نماز پڑھنے کے لیے آنے والوں میں سے کوئی اٹھ کر انگریزی میں لیکچر دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ خود یا کوئی دوسرا نماز پڑھاتا ہے۔ انگریزی میں اس لیے کہ یہاں صرف اردو یا سندھی سمجھنے والے نہیں آتے۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی تو مجھے عرب ملکوں خاص طور پر عراق، مصر اور لبنان..... افریقا کے ملکوں سوڈان، کینیا، تانزانیہ..... فارایسٹ کے ملکوں ملائیشیا، تھائی لینڈ، انڈونیشیا، فلپائن وغیرہ کے لوگ نظر آئے۔ البتہ اکثریت بنگالیوں، بھارتیوں، کشمیریوں، پاکستانیوں اور مدراسیوں کی تھی۔

اس دن محمد یوسف نامی ایک نوجوان نے لیکچر اور خطبہ پڑھا۔ ان کی عمر تیس برس کے لگ بھگ تھی۔ وہ شکل صورت سے برصغیر کے معلوم ہوتے تھے۔ پنشن اسٹورٹ اور داڑھی میں وہ احمات لگ رہے تھے۔ جیسی ان کی دلکش شخصیت تھی، ایسی ہی خوبصورت عربی اور انگریزی تھی۔ ان کا پورا لیکچر قرآنی آیات پر مشتمل تھا۔ لوگ پوری توجہ اور انتہا کے ساتھ سن رہے تھے۔

کئی سال پہلے جب میں سویڈن کی ورلڈ میری ٹائم یونیورسٹی سے گریجویشن کر رہا تھا، اس شہر مالمو اور ہالنگ سمندر کے اس پار کوپن ہیگن کی مسجدوں میں مقامی نو مسلم گوروں اور دیگر ملکوں، خاص طور پر ساؤتھ افریقا اور امریکا سے آنے والے سیاہ فام اور گورے نو مسلم علما کے پرمغز لیکچر سننے کا موقع ملتا تھا۔ ان کی باتیں ہم جیسے آوارہ گرد اور کم علم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ سوئیڈن جیسے یورپی ملک میں کئی مقامی گورے اور دیگر ملکوں سے تعلق رکھنے والے لوگ ان علما کی گفتگو بڑے غور سے سنتے تھے۔

بلال فلیپ (ڈاکٹر ابومینہ) جعفری لیگ، چیٹ اسٹیونس (یوسف اسلام) یوسف ایس، ڈاکٹر الوالی احمد الشیخ، مارک ہینس (حمزہ یوسف) ڈاکٹر گیری طر (عبدالاحد عمر) اور برصغیر سے تعلق رکھنے والے علما دین احمد دیدات، ڈاکٹر ذاکر نانک، طارق جمیل اور ڈاکٹر اسرار احمد کے لیکچرز نے مالمو اور قرچی شہر کو پین ہیگن کے مسلمانوں اور غیر مسلموں کو اسلام کی درست معلومات فراہم کیں۔

مجھے میرے پڑوسی حسین نے بتایا تھا کہ اس نے بلال فلیپ کی رہنمائی میں اسلام قبول کیا ہے۔ اس کا تعلق افریقا سے تھا اور وہ سوئیڈن کا شہری تھا۔ اس سے پہلے وہ عیسائی

آ کر اور انہیں دیکھ کر بخوبی ہوتا ہے۔

☆☆☆

میں تیزان ہوٹل کے مین گیٹ سے اندر داخل ہوا اور ایک جانب جوتے اتار کر پتلی سی راہداری میں آگے بڑھا۔ سامنے ہی ایک خاصا وسیع ہال تھا۔ نماز پڑھنے کے لیے فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہی اس ہوٹل کا مینکونٹ ہال ہے۔ ایک گوشے میں میز اور کرسیاں ایک دوسرے کے اوپر رکھی تھیں۔ زیادہ تعداد میں لوگوں کی آمد کے پیش نظر ہوٹل کے بیرے مزید قالین بچھا رہے تھے اور ایک میرا ہم عمر شخص انہیں ہدایات دے رہا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ عمر رسیدہ شخص اس ہوٹل کے مالک میاں عبدالعزیز ہیں۔ نماز کے بعد ان سے اور ان کے منبر آصف رشید سے ملاقات ہوئی۔

میاں عبدالعزیز نے بتایا کہ انہوں نے امریکا کے لیے 1978ء میں پاکستان چھوڑا۔ وہ پہلے نیویارک آئے۔ وہاں انہوں نے کسی دوسرے کے ہوٹل میں ملازمت کی اور اس کے بعد یہاں اوک ٹری روڈ پر گروسری اسٹور کھولا۔ 1993ء میں انہوں نے اس ہوٹل "تیزان" کا آغاز کیا۔ وہ ہوٹل کے علاوہ کیرنگ کا کام بھی کرتے تھے۔ یعنی شادی اور دیگر تقریبات میں ضرورت کے مطابق مختلف ڈشز تیار کر کے گھروں تک پہنچاتے تھے۔

"آپ روزانہ کتنے کھنے کام کرتے ہیں؟" میں نے میاں عبدالعزیز سے پوچھا۔

"چوبیس کھتے" انہوں نے قہقہہ لگا کر جواب دیا پھر وہ بولے "صرف اس اوک ٹری روڈ پر کم از کم چالیس انڈین اور پاکستانی ریسٹورانٹس ہیں۔ سوا گھر ہے مقابلہ سخت ہے۔ ہر ایک یہی چاہتا ہے کہ قیمت مناسب ہو، کھانا تازہ اور لذیذ ہو، ماحول اور کھانے والے صاف ستھرے ہوں۔ ایک جیسے کھانوں کے بجائے مختلف ڈشز ملتی رہیں۔ ہمیں ان تمام باتوں کو مدنظر رکھنا پڑتا ہے اور کئی کام خود انجام دینے پڑتے ہیں کیونکہ یہاں ملازموں کو بھاری تنخواہ دینی پڑتی ہے۔ کسی بھی معاملے میں ذرا سی غفلت اور سستی نقصان کا باعث بنتی ہے۔ سو کبھی بھی اٹھارہ اٹھارہ کھتے کام کرتا پڑتا ہے۔"

ہمارے ہاں جمعہ کی نماز میں مولوی صاحب اردو یا سندھی میں وعظ کرتے ہیں۔ اس کے بعد چار رکعت سنت پڑھنے کے لیے پانچ منٹ کا وقت دیتے ہیں اور پھر خطبہ پڑھتے ہیں لیکن یہاں وعظ کے بعد فوراً خطبہ اور پھر نماز شروع

کی ادائیگی میں صرف کر دیتے ہیں۔ پردیس میں رہنے والے ہر شخص کو اپنے وطن کی یاد ستاتی رہتی ہے۔ سنگاپور، مانگ کانگ، لندن، دہلی گنجان آبادی والے شہر ہیں۔ وہاں ہر کوئی ایک دوسرے کے قریب ہی ہوتا ہے۔ امریکا میں آباد ہمارے یہ ہم وطن بھائی اپنے دیس کے لوگوں سے ملنے اور کچھ وقت خود کو "اپنوں" کے درمیان محسوس کرنے کی آسودگی حاصل کرنے کی غرض سے کبھی کبھی اس قسم کے میلوں اور جشن کا اہتمام کرتے ہیں۔ وہ سال بھر چندہ جمع کر کے اپنے ملک کے فنکاروں کو بلواتے ہیں تاکہ ان کی خوشی کی تکمیل ہو اور اس کے ساتھ ہی ان کے ہم زبان، ہم وطن، شاعروں، ادیبوں، گلوکاروں، اداکاروں اور دیگر فنکاروں کی عزت افزائی ہو۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے ہم وطن یہی سمجھتے ہیں کہ امریکا میں رہنے والے پاکستانیوں کے پاس بڑی دولت ہے اور ان سے جس قدر ممکن ہو سکے ہوئی جائے۔ ایسی صورت حال میں میزبان مجبور ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات وہ اپنی جیب سے رقم خرچ کر کے فنکاروں کی ڈیمانڈ پوری کرتے ہیں۔ کبھی فنکشن کے ٹکٹ کی قیمت میں اضافہ کر کے یا ڈنر اور ریج کی فیس زیادہ وصول کرتے ہیں۔

گزشتہ چند مہینوں کے دوران یہاں کے مختلف شہروں، نیویارک، نیوجرسی، ورجینیا، واشنگٹن اور ہالٹی مور میں فنکشن منعقد ہوئے۔ ان میں کئی ایسے لوگ شریک ہو سکے جو اس قسم کے میلوں اور فنکشنز میں بڑے شوق سے شرکت کرتے تھے۔ دریافت کرنے پر انہوں نے اس کا یہ سبب بتایا کہ وہ مالی طور پر پریشان ہیں۔ کچھ لوگوں نے شکوہ کیا کہ ڈنر کی فیس پچھڑ ڈالر مقرر کی گئی تھی جو وہ افورڈ نہیں کر سکتے تھے۔

یہاں یہ سب کچھ تحریر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ملک سے امریکا، انگلینڈ یا جاپان آنے والے فنکار یہ ضرور سوچیں کہ وہ کسی عرب ملک کے ارب پتی شیخ یا کسی رشوت خور بیوروکریٹ کی دعوت پر نہیں بلکہ ان محنت کش اور مزدور (ملازمت پیشہ) پردیسیوں کے بلاوے پر جا رہے ہیں جو اپنے وطن سے دور، عزیز واقارب اور پیاروں کی جدائی کا احساس لیے سخت محنت کر کے حق حلال کے محض اتنے پیسے کماتے ہیں جس سے ان کا اور ان کے بچوں کا گزر بسر ہو سکتا ہے۔ ان کی کمائی کا ایک ایک ڈالر صحیح معنوں میں "خون پسینے" کی کمائی کہلانے کی مستحق ہے کیونکہ ایسے ملکوں میں کوئی مزدور ہو یا افسر، ان کی ڈیوٹی کی نوعیت انتہائی سخت ہوتی ہے۔ اس بابت کا احساس ہمارے لوگوں کو امریکا میں

تھا۔ اس کی ماں سوئیڈش اور باپ افریقن سیاہ فام تھا۔
سین، بال قلب کا بڑا معتقد تھا۔

مجھے ان علما کے بارے میں مالمو کی یونیورسٹی کے ایک ہندو کولیک کیشن وجہ نے بتایا تھا۔ ایک دن یونیورسٹی کے کیشن میں اس نے کہا ”یار تم نماز پڑھتے ہو نہ روزے رکھتے ہو۔ تم میں اور مجھ میں بہت تھوڑا فرق ہے۔ کبھی کوپن ہیگن کی مسجد میں میرے ساتھ چلا کرو۔ وہاں امریکن اور افریقن علما سے اسلام کی باتیں سن کر آئیں گے۔“

ایک ہندو دوست کی زبانی ایسی باتیں سن کر میری کیا حالت ہوئی تھی، اس کا آپ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ پہلے تو سخت شرمندگی محسوس ہوئی۔ ایک غیر مسلم اس شخص سے یہ بات کر رہا تھا جو خود کو اسلامی ملک کا باشندہ اور ”یک“ مسلمان کہتا تھا۔ وجہ تو کہ مسلمان نہیں تھا لیکن اس کی جستجو کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ وہ مسلمان ہونے کی شدید خواہش رکھتا ہے۔ وہ مختلف مذاہب کی معلومات حاصل کرنے کے لیے ہر وقت بے چین رہتا تھا۔ اس کی زیادہ توجہ اسلام کو سمجھنے پر تھی۔

اب میں سوچتا ہوں کہ یہ عالم اور دینی ہی ہیں جن کے ذریعے مجھ جیسے نہ جاننے والے گناہ گار، بے علم اور بے عمل لوگ دین کی روشنی میں خود کو راہ راست پر لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ آفریقن ہے ان دیدار لوگوں پر جو دین کی راہ میں اپنا پیسا اور وقت قربان کرتے ہیں۔ کبھی بھی مغرب کے یہ عالم مجھے آج کے ولی معلوم ہوتے ہیں جو اپنے وطن کو خیر باد کہہ کر پردیس میں انجانے لوگوں کو اسلام کی روشنی سے روشناس کراتے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے احساس ہوتا ہے کہ ہم اپنے منہ میاں مٹھوین کر دوسروں پر کس قدر غلبت میں الزامات عائد کرتے ہیں۔ ہم اس ”Holier than thou“ کلچر کے تحت خود ہی کو دوسروں سے بہتر قرار دینے کی سند دیتے ہیں۔ یہ فیشن بن گیا ہے کہ ہر برائی کی تہمت مغرب پر لگادی جائے لیکن یہ یوسف اسلام، عبدالاحد عمر، جیفری لنگ، ابوابینہ اور ان جیسے دیگر بزرگ بھی تو مغرب سے تعلق رکھتے ہیں جنہوں نے نہ صرف خود اسلام قبول کیا بلکہ دوسروں کو بھی اس کی حقیقت سے آگاہ کرتے رہتے ہیں۔ اسلام کی دعوت میں وہ اپنا مال اور وقت خرچ کرتے ہیں۔ فرانس، انگلینڈ، امریکا میں دیکھیے کس تیزی سے مسجدوں اور نمازیوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔

ورجینیا میں مٹیم میرے پٹارو کے کلاس میٹ محمد سچ نے ہتے ہوئے یہاں کے ایک امریکن دوست سے کہا تھا ”میں

معلوم ہے، دنیا پر ایک دن مسلمانوں کی حکومت ہوگی۔“ امریکن نے استہزائیہ لہجہ میں جواب دیا تھا ”تم جیسے پاکستانی، جو نہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں ماہر ہیں اور نہ تعلیم میں نمایاں، وہ دنیا پر حکومت کریں گے، ہاں ہم امریکیوں کے بارے میں کہہ سکتے ہو۔“

”میں اپنے لیے کب کہہ رہا ہوں یار!“ سچ نے جواب دیا ”میرا مطلب یہ ہے کہ ایک دن تم سب لوگ اسلام قبول کر لو گے اور تم ہی دنیا پر حکومت کرو گے بلکہ اب بھی کر رہے ہو۔ امریکا میں جو سب سے زیادہ اور تیزی کے ساتھ مذہب پھیل رہا ہے وہ اسلام ہی تو ہے۔“

بہر حال یہ تمام باتیں اپنی جگہ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، یہاں امریکا میں بھی مسلمان ہیں، یہاں مساجد بھی ہیں۔ یہاں کے نو مسلم اور دوسرے ملکوں سے آنے والے Immigrant مسلمان سکون سے نمازیں پڑھتے ہیں۔ ان کے بچے دینی اسکولوں میں قرآن کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ بے سبب یہ کہنا کہ مغرب کے لوگ کافر ہیں، کچھ عجیب معلوم ہوتا ہے۔

☆ ☆ ☆

پاکستان اور برصغیر کے دیگر ملکوں یعنی انڈیا اور بنگلہ دیش وغیرہ سے تعلق رکھنے والا ایک عام مسلمان یہ سمجھتا ہے کہ تائن ایون کے حادثے یا دہشتگردی کے بعد امریکا میں مسلمانوں کے لیے زمین تنگ ہوگئی ہے اور ان کی مذہبی آزادی ختم ہوگئی ہے لیکن یہاں امریکا میں پہنچ کر بڑے شہروں کے علاوہ چھوٹے شہروں اور قصبوں میں انڈین، پاکستانی، ایرانی، عرب اور مقامی مسلمان خواتین کو حجاب میں آتے جاتے دیکھ کر حیرت ضرور ہوتی ہے۔ جگہ جگہ پر قائم مساجد اور بازاروں میں جالی والی ٹوپی پہنے باریش مسلمان بھی کثرت سے دکھائی دیتے ہیں۔

میں اپنے سفر نامے میں لکھ چکا ہوں کہ نیویارک جیسے شہر میں 33 برس قبل صرف تین مسجدیں دیکھ کر گیا تھا اور آج یہاں سو سے زائد مساجد ہیں جو نمازیوں سے بھری رہتی ہیں۔ اس رفتار سے تو حیدرآباد اور بالاجیسے شہروں میں بھی مسجدیں تعمیر نہیں ہوئیں۔

میں گیارہ، بارہ برس کی عمر میں اپنے شہر ہالا کی مسجدوں میں فجر کی نماز پڑھنے جاتا تھا تو وہاں مٹی کے صرف چند بزرگ ہی نظر آتے تھے اور جماعت میں پہلی صف بھی مکمل نہیں ہوتی تھی اور آج، پچاس سال بعد، جبکہ ہالا کی آدم شماری

25 ہزار سے بڑھ کر دولاکھ تک پہنچ گئی ہے، تب بھی فجر کی جماعت میں پہلی صف بہ مشکل مکمل ہوتی ہے اور یہاں امریکا کی مساجد میں بزرگوں کے ساتھ ساتھ نوجوانوں اور بچوں کو دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ کبھی کبھی میں اپنی گفتگو اور تحریر میں اس بات کی وکالت کرتا ہوں کہ امریکی حکومت کی پالیسیوں پر ضرور تنقید کیجئے لیکن یہاں کے عوام نے کیا قصور کیا ہے؟ ہم یہاں کے جس عوام کو ”امریکن“ کہتے ہیں وہ کوئی خاص نسل کا جاتور نہیں بلکہ یہ دنیا کے بھارت بھانت کے ملکوں اور قوموں کے لوگ ہیں۔ ان میں ہمارے برصغیر کے ہندو اور مسلمان بھی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ منگول اور لاوارث فلسطینی مسلمان اور مغلس ودرہ درصوبائی عیسائی بھی ہیں۔ کرد اور پارسی، بنگالی اور بلوچ بھی امریکی شہری ہیں جو مجبوراً اپنے وطن کو خیر باد کہہ کر یہاں پہنچے ہیں اور وہ بھی ”امریکن“ ہی کہلاتے ہیں۔ یہ تمام لوگ اس نئے دیس میں نہ صرف خوشحال زندگی گزار رہے ہیں بلکہ اپنی آمدنی میں سے کچھ حصہ اپنے ملک میں موجود رشتے داروں کو بھی بھیجتے ہیں۔

امریکا کے اصل باشندوں کی تعداد بہت ہی قلیل ہے اور وہ لوگ کم کم ہی نظر آتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی قابلیت اور حیثیت کے مطابق سکون کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ان میں سے کسی کے ساتھ اس قسم کا ظلم و ستم نہیں ہوتا جو ہمارے دیس کے ”اصلی“ باشندوں کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے۔ ان کا کوئی ”منوبھیل“ کسی شہر کے پریس کلب کے سامنے انصاف کے لیے پریشان نظر نہیں آتا۔

نیوجرسی ریاست کے جس چھوٹے سے قصبے میں، میں رہائش پذیر تھا وہاں کے مسلمان شاپنگ ایریا کے ہوٹل ”شیزان“ میں باجماعت نماز ادا کرتے تھے لیکن ایک سال کے اندر ہی ان کی اپنی مسجد تعمیر ہو کر مکمل ہو جائے گی۔ پھر انہیں شیزان ہوٹل کے ٹیکوٹ ہال میں نماز نہیں پڑھنی پڑے گی جو نمازیوں کی تعداد میں اضافہ ہونے کے سبب تنگ معلوم ہونے لگا تھا۔ میں اس نئی مسجد کے بارے میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ یہاں کے مسلمانوں نے چندہ جمع کر کے مسجد کے لیے زمین خریدی تھی، اس سے پہلے اس زمین پر عیسائیوں کا ایک پرانا چرچ تھا۔ یہاں کے چرچ دراصل لوگوں کے ذاتی ملکیت ہوتے ہیں اور ان کے مالک انہیں فروخت کرنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ اس پرانے چرچ کو منہدم کر کے اب وہاں مسجد تعمیر کی جارہی ہے۔ اس سلسلے میں اردگرد آباد عیسائیوں

اور یہودیوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ سب کو معلوم ہے کہ یہاں آباد مسلمان ہر کام قانون کے مطابق کرتے ہیں۔ ان مسلمانوں میں پاکستان کے پنجابی، انڈیا کے گجراتی اور تامل بھی شامل ہیں۔ ان کے ساتھ پنجاب، اردو بولنے والے اور سندھی بھی شریک ہیں۔ سب لوگ پیار و محبت سے رہتے ہیں اور کوئی آسان نہیں ٹوٹا، کسی کو اسلام خطرے میں محسوس نہیں ہوتا جو ہمارے ہاں عموماً محسوس کیا جاتا ہے بلکہ محسوس کرایا جاتا ہے۔

نماز کے لیے جاتے اور واپسی پر پارکنگ میں اکثر ندیم جو نوجو سے ملاقات ہوتی راتی تھی۔ وہ قریب ہی واقع ”حبیب امریکن“ بینک میں ٹیبلر تھے۔ کبھی کبھی نواب شاہ کے مقبول ڈاہری اور دادو کے خالہ چچا، مسعود چچا بھی نظر آتے تھے۔

میرے پڑوس میں مہران یونیورسٹی کے گریجویٹ انجینئر ریش تھاروالی رہتے تھے۔ وہ ملازمت کے علاوہ لوگوں کے کاموں میں مصروف نظر آتے۔ ان کا زیادہ تر وقت مسلمانوں کے مسائل حل کرنے میں گزرتا تھا۔ وہ ہفتے میں ایک بار نیوجرسی میں قائم ”تھاروالی سینٹر“ جاتے اور مجھے اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ مختلف مندروں اور امریکا میں قائم ہندو سوسائٹیوں کی جانب سے منعقد ہونے والے فنکشنز اور پارٹیوں کے بارے میں مجھے بتاتے رہتے۔ اس سے پہلے ہم اس قسم کی پارٹیوں کے لیے ترستے رہتے تھے اور پردیس میں اپنا وطن بہت یاد آتا تھا۔ آج اپنے وطن سے زیادہ یہاں پردیس میں خوشیوں کے جشن منائے جاتے ہیں۔ اس قسم کے فنکشنز میں سکھ، یہودی اور مسلمان سب ہی شریک ہوتے ہیں لیکن کسی فنکشن اور پارٹی میں ہم نہیں پہنچتا اور نہیں پولیس کا لاشی چارج نہیں ہوتا اور نہ ہی سیاسی ہتھکنڈوں سے انہیں سیوا ڈکایا جاتا ہے۔ یہاں کوئی ایسا ہفتہ نہیں گزرتا جس میں ہم لہشیز کا کوئی جشن، گید رنگ اور مذہبی وسعتی اور ثقافتی پروگرام منعقد نہ ہوتا ہو۔

پچھلے ہفتے ورجینیا میں منہاج القرآن کمیٹی کے زیر اہتمام عید میلاد النبی منایا گیا۔ جس میں پاکستان اور ہندوستان کے طلباء و طالبات نے تلاوت قرآن پاک اور نعت رسول پیش کی۔ اس تقریب میں ”منہاج القرآن کینیڈا“ کے ڈائریکٹر علامہ صادق قریشی مہمان خصوصی تھے۔ دوستوں نے بتایا تھا کہ یہ جشن یہاں ہر سال منایا جاتا ہے۔ اس مرتبہ روٹون کے ہوٹل ”Best Western“ میں یہ تقریب منعقد کی گئی تھی۔ مہمان خصوصی کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر علامہ

ظفر اقبال نوری اور میاں عبدالرشید نے تقاریر کی تھیں۔ مغرب اور عشا کی نمازیں وہیں ادا کی گئی تھیں۔ اس کے بعد کھانا پیش کیا گیا تھا جس کا انتظام یہاں کے دیسی ہوٹل اور کچھ گھروں سے کیا گیا تھا۔

مہمان خصوصی کے ساتھ وہاں عثمان خان نوری، الحاج نور محمد جرال، میاں عبدالرشید اور خرم یوسف زکی سے بھی ملاقات ہوئی۔ یہ تمام لوگ اب امریکا کے شہری ہیں اور امریکا میں مقیم مسلمان نوجوانوں کو ذہنی تعلیم سے آگاہ کرنے کے جن میں مصروف رہتے ہیں۔

انہی ایام میں بروکلین کے کوئی آئی لینڈ ایونیو پر ”مدینہ ریسٹورنٹ“ کے نام سے ایک نئے ہوٹل کا افتتاح ہوا تھا۔ اس علاقے یعنی ”کوئی آئی لینڈ“ کو ”لعل پاکستان“ کہا جاتا ہے۔ جس طرح سنگاپور کے سرنگون روڈ پر انڈین دکانوں اور ہوٹلوں کی کثرت کے سبب اس علاقے کو ”لعل انڈیا“ کہا جاتا ہے۔

ان اطراف میں کسی ایشین کا کوئی تیا ہوٹل، دکان یا اسٹور کھلتا ہے تو مقامی علاقائی اخبارات میں اس کے متعلق خبر اور اشتہار شائع ہوتا ہے۔ اشتہار میں اس ہوٹل یا دکان کی تصویر ہوتی ہے یا اس شخصیت کی فیتہ کا نئے ہوئے تصویر ہوتی ہے جو افتتاح کرتا ہے۔ تصویر کے اوپر یا تصویر پر ہی ”ماشاء اللہ طہ امن فضل ربی یا“ ”یہ سب تمہارا کرم ہے آقا“ ضرور لکھا ہوتا ہے۔ اس خیال سے بھی کہ امریکا میں مقیم مسلمانوں کو معلوم ہو کہ یہ ہوٹل کسی مسلمان نے کھولا ہے اور یہاں ہر چیز حلال ملے گی۔ جس طرح تھائی لینڈ کے جنوبی شہروں پٹائی، سوئٹاکلا، حادیا وغیرہ میں ٹھیلوں پر کھانا فروخت کرنے والے مسلمان اپنے ٹھیلوں پر ”بسم اللہ الرحمن الرحیم“ پینٹ کر دیتے ہیں یا اس عبارت کا فوٹو فریم کرا کے آویزاں کرتے ہیں۔ یہ اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ بیرون ملک سے آنے والے سیاح جان سکیں کہ یہاں حلال چیزیں ملتی ہیں۔ (بھارت کے دیہی علاقوں میں مسلمان ہوٹل والے دکانوں پر ٹوٹی والے لوٹے رسی سے باندھ کر لٹکا دیتے ہیں کیونکہ ہندوؤں کا لوٹا بغیر ٹوٹی کا ہوتا ہے۔ اسی طرح لوگ دیکھ کر سمجھ جاتے ہیں کہ یہ مسلمان کا ہوٹل ہے)

امریکا اور یورپ میں جن ہوٹلوں پر نان، چپاتی، پوری، بریانی اور سائمن وغیرہ ملتے ہیں انہیں عموماً ”انڈین ہوٹل“ کہا جاتا ہے۔ خواہ وہ ہوٹل کسی بنگلادیشی کے ہوں یا پاکستانی کے۔ اس سلسلے میں کوئی پاکستانی اپنے ہوٹل پر ”پاکستانی

ہوٹل“ لکھواتے ہوئے کھڑا ہے کیونکہ اسے معلوم ہے کہ کھانے کے شوقین مقامی گورے انڈین کھانوں اور ہوٹلوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یہاں پاکستانی، کشمیری اور شمالی انڈیا کے کھانوں کے لیے لفظ ”انڈین“ استعمال ہوتا ہے۔ کئی یورپین اور امریکن سیاح ملائیشیا اور سنگاپور کے انڈین ہوٹل اور وہاں کے کھانے دیکھ کر مایوس ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان ملکوں میں جنوبی ہندوستان کے تامل، ملیالم، ملباری، تیلگو اور کانڈازبان بولنے والے رہتے ہیں۔ ان کے اڈی ڈوما اور مرچوں والے کھانوں کے لیے انگریزوں اور یورپین کا ٹیسٹ ابھی ڈیولپ نہیں ہوسکا۔ وہ پراٹھے، نان اور بھنے ہوئے لیکن کم مسالوں والے کھانوں کو پسند کرتے ہیں۔

نیویارک میں نئے کھلنے والے ہوٹل ”مدینہ ریسٹورنٹ“ کی خبر، اشتہار کی شکل میں اردو اخباروں میں اس طرح شائع ہوئی تھی۔

”بروکلن (نیویارک) کے علاقے ”کوئی آئی لینڈ“ جسے ”لعل پاکستان“ بھی کہا جاتا ہے، میں مدینہ ریسٹورنٹ اینڈ سوئٹس کے نام سے ایک نئے ریسٹورنٹ کا اضافہ ہوا ہے۔ 563 کوئی آئی لینڈ ایونیو بروکلن پر کھلنے والے اس ہوٹل کا ”عظیم الشان افتتاح“ جمعہ کے دن ہوا۔“

کراچی کے سیمارک میں آنے والی نئی فلم کی طرح یہاں کے ہوٹلوں اور دکانوں وغیرہ کا افتتاح بھی کسی ”مبارک جمعہ“ کے دن ہوتا ہے کیونکہ جمعہ کی شام سے یہاں ہفتے وار چمٹی شروع ہوتی ہے اور محنت کش مزدوروں اور ملازمت پیشہ افراد کو ہفتے وار تنخواہ یا اجرت ملتی ہے۔ ”عظیم افتتاح“ نہیں نے اپنی طرف سے لکھا ہے۔ جبکہ یہاں کے انگریزی اور اردو اخبارات میں لفظ ”گریٹ اوپننگ“ لکھا جاتا ہے۔

خبر نما اشتہار میں مزید لکھا تھا۔ ”پاکستانی امریکن کمیونٹی کی معروف سماجی و سیاسی شخصیت اور کشمیر یو ایس اے کے ڈائریکٹر خالد شاہین بٹ نے مدینہ ریسٹورنٹ کی ”گریٹ اوپننگ“ کی۔ اس تقریب میں پاکستانی امریکن کمیونٹی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے اہم افراد نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ مدینہ ریسٹورنٹ خالص کھانوں اور ذائقے کے حوالے سے اپنی مثال آپ ہے۔ یہاں صد فی صد حلال گوشت کے علاوہ صحت کے اصولوں پر بھی مملی توجہ دی جاتی ہے۔“

یہاں کھلنے والے ہوٹلوں کے بارے میں چھپنے والے

اشتہارات کا یہ خاص انداز ہے۔ باقی رہا سوال ”صحت کے اصولوں پر توجہ“ دینے کا، تو اس سلسلے میں یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ اس میں ”خوف خدا“ کا فرما ہے یا قانون کی سختی کے سبب ان باتوں کا خیال رکھا جاتا ہے۔ یہاں اس قسم کے سرکاری ادارے خاصے متحرک ہیں۔ یہاں کسی کی سفارش اور رشوت نہیں چلتی۔ باسی کھانا فروخت کرنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ امریکا ہو یا یورپ کا سویڈن اور جرمنی، ایشیا کا ملائیشیا ہو یا سنگاپور، ان ملکوں کو جانے والوں کو ہمیشہ یہی کہتا ہوں کہ کسی بڑے ہوٹل میں کھانا کھانے کے بجائے بہتر یہی ہے کہ چھوٹے ہوٹل، بلکہ ٹھیلوں پر فروخت ہونے والا کھانا کھائیں۔ اس طرح ان کی خاصی بچت ہو سکتی ہے۔ ان ملکوں میں بھی پولیس اور صحت کے ادارے انتہائی سخت ہیں۔ تھائی لینڈ کی سرحد سے سنگاپور تک ملائیشیا کے کسی شہر اور قصبے میں آپ کو کھانوں میں کسی قسم کی ملاوٹ نظر نہیں آئے گی۔

☆☆☆

تیس پینتیس برس قبل، یعنی گزشتہ صدی کی سائنس والی دہائی کے آخری برسوں میں جب پہلی مرتبہ میرا اس اطراف میں آنا ہوا تھا، تب یورپین گوروں اور سیاہ فام افریقین کے علاوہ ماضی قریب میں بیرون ملک سے آکر امریکا میں سکونت اختیار کرنے والوں میں زیادہ تر پورٹوریکی، میکسیکن اور ارد گرد کے کئی جزیروں کے باشندے تھے۔ ان میں کیریبین سمندر میں واقع جزائر ہائی، ہیٹیا، کیوبا اور ویسٹ انڈیز وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ امریکا کے ملکوں کاسٹاریکا، گوئٹے مالا اور نکاراگوا جیسے ملکوں کے باشندے بھی امریکا میں آباد تھے جو ہسپانوی استیلا زبانی بولتے ہیں۔

ان ایام میں ہمارے ہاں کے لوگ یعنی برصغیر، جنوب مشرقی ایشیا اور وسط مشرق کے باشندے بالکل قلیل تعداد میں امریکا یو ایس اے میں آباد تھے۔ تب تک عرب اس قدر دور نہیں نکلے تھے۔ چند اکا دکا لبنانی اور شامی عرب ضرور امریکا میں پائے جاتے تھے۔ جن میں زیادہ تر عیسائی عرب تھے۔ ملائیشیا اور انڈونیشیا کی اطراف کے لوگ آج بھی اپنے ملک سے باہر جانا پسند نہیں کرتے کیونکہ وہ ایک ہی ”برسانی موسم“ کے عادی ہیں اور سرد ملکوں میں جانے سے اس لیے بھی کتراتے ہیں۔ ایرانی ضرور نظر آتے تھے لیکن وہ بھی نوے فیصد ”زور سٹن“ یعنی ”آتش پرست“ تھے جنہیں ہمارے ہاں پاری کہا جاتا ہے۔ بہائی مذہب سے تعلق رکھنے والے بھی امریکا میں آباد تھے۔ ایرانی مسلمان اکا دکا ہی دکھائی دیتے

تھے۔ یورپ اور امریکا میں ایرانی مسلمانوں کی آمد خفیہ کے انقلاب کے بعد شروع ہوئی تھی۔

ان دنوں برصغیر سے تعلق رکھنے والوں میں سے انڈین، یو ایس اے میں خاصی تعداد میں آباد تھے۔ بہر حال یورپ اور برطانیہ میں ان کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔ پاکستانی، سری لنکن، بنگالی اور گورکھے، نیپالی، انتہائی قلیل تعداد میں تھے۔ جنوبی امریکا کے باشندوں کی یو ایس اے میں آمد یقیناً ان کی عقلندی تھی، لیکن ہمارے ملکوں کے لوگ، یعنی ایشیائی باشندے اتنا طویل سفر کر کے کیوں آتے جبکہ ان لوگوں کو برطانیہ اور یورپ کے کئی ملکوں میں آرام سے نوکری مل جاتی تھی، دیگر سہولیات یعنی بے روزگاری کی حالت میں سوشل الاؤنس اور دو تین برس کی رہائش کے بعد شہریت اور پاسپورٹ بھی مل جاتا تھا لہذا وہ جرمنی، فرانس، اٹلی اور انگلینڈ کی جانب جانا بہتر سمجھتے تھے۔ انہوں نے سویڈن، ناروے اور ڈنمارک کی طرف بھی کافی بعد میں رخ کیا تھا۔ وہ بھی اس وقت جب دوسرے ملکوں میں داخلے پر خاصی سختیاں پیش آنے لگی تھیں۔ بہر حال ان دنوں امریکا میں مقیم ہمارے ہم شکل، انڈین باشندوں کی تعداد زیادہ گئی۔ اس کے علاوہ پاکستانی، سیلونی اور نیپال کی اطراف کے باشندے بہت کم تعداد میں تھے۔ یکساں رنگ و روپ، ناک نقش ہونے کے سبب ہم سب ہی انڈین کہلاتے تھے۔

اب تقریباً پینتیس برس بعد امریکا آکر ایک نئی ٹرم ”دیسی“ کا اضافہ سننے کو ملا ہے۔ دیسی لوگ، دیسی کھانے، دیسی میوزک، دیسی چھٹیل اور دیسی عادات وغیرہ! اس ”دیسی“ کے دائرے میں نہ صرف شمالی انڈیا کے لوگ بلکہ جنوب اور مشرقی انڈیا کے لوگ، پاکستانی، سری لنکن، بنگلادیشی اور نیپالی وغیرہ سب ہی شامل ہیں۔

ان تمام ملکوں کے باشندوں میں سوائے مذہب کے دوسری تمام باتیں، عادات اور شوق یکساں ہیں۔ جنوبی ہندوستان کے لوگ اور انڈیا کے صوبوں گجرات اور بنگال کے باشندے جو ملائیشیا اور سنگاپور کی اطراف میں سکونت پذیر ہیں، انہیں اردو اور ہندی بالکل نہیں آتی۔ یہ مقامی زبان یا انگریزی بولتے ہیں یا اپنی مادری زبانوں تامل، گجراتی اور بنگلہ میں گفتگو کرتے ہیں۔ انہیں ہندی بولنے کی ضرورت ہی کیا ہے کیونکہ ملائیشیا کی اطراف میں ہندی سے زیادہ ان کی اپنی تامل زبان میں فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ سنگاپور کی چار قومی زبانوں میں تامل بھی شامل ہے، اس کے

خوبصورتی خوبصورت جلد سے جبکہ خوبصورت جلد سکن ٹونر سے وہ بھی چند سیکنڈز میں

جلد کی خوبصورتی کیلئے سب سے بہتر سکن ٹونر آج آزمائیں فائدہ نہ ہو تو قیمت واپس / 225/- قیمت پر

یوں تو اپنے آپ کو خوبصورت بنانے کیلئے انسان صدیوں سے مختلف جتن کرتا چلا آ رہا ہے۔ خاص طور پر چہرہ تو ہر کوئی خوبصورت چاہتا ہے اس سلسلے میں بعض چہرے کی کچھ خصوصیات درخشاں کر کے چہرے کے عضلات کو مضبوط بناتے ہیں تاکہ وہ چاک چوبند اور جوان نظر آئیں۔ خاص طور پر مرد۔ جبکہ بعض چہرے پر کچھ لگا کر جلد کو گورا، نرم، ملائم اور چمکدار بناتے ہیں کہ وہ خوبصورت نظر آئیں خاص طور پر خواتین۔ ہم نے بھی اپنی تحقیقات کو اس مقصد کے حصول پر مرکوز کیا۔ یعنی جلد کی خوبصورتی کیلئے کہ جلد کو نرم ملائم اور چمکدار ہو۔ طویل تحقیق کے بعد ہم ان نتائج کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ جو کہ گتے ہی دو چار سیکنڈز میں اپنا اثر دکھاتا ہے۔ یعنی جلد نرم ملائم گوری اور چمکدار ہو جاتی ہے۔ دانے اور خارش ختم ہو جاتی ہے۔ ایسا ہماری دن رات تھکا دینے والی طویل تحقیق اور محنت سے ہی ممکن ہو سکا۔ رنگ گورا کرنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ کسی بھی پتھج کریم سے آسانی سے رنگ گورا ہو جاتا ہے۔ مگر یہ کیا ہے کہ رنگ بھی گورا ہو۔ اور معجز اثرات بھی نہ ہو۔ اگر استعمال چھوڑ دیا جائے تو چہرہ بھی خراب نہ ہو اور بھی دیر پا ہو اس وقت مارکیٹ میں مختلف ناموں سے منجی سستی کریمیں دستیاب ہیں جن کے اثرات سے آپ بخوبی واقف ہیں کہ استعمال کرتے رہیں تو لہیک چھوڑ دیں تو چہرہ ایک دم خراب لہذا ہم نے اپنی تحقیق میں سب سے زیادہ توجہ اس پردی کے روزانہ کا استعمال بھی نہ ہو استعمال چھوڑ دیں تو چہرہ خراب بھی نہ ہو اور دیر تک رہے سو ہم اس میں کامیاب ہوئے سکن ٹونر استعمال کرنے سے جلد 5 سیکنڈز میں ہی نرم ملائم گوری اور چمکدار ایک دفعہ استعمال کا اثر مہینوں تک اپنی ہی جلد پر ہاتھ

بھیر کر یاد کیجئے کہ خود ہی پر پیار آ جائے سکن ٹونر ہماری اب تک کی ایجادات میں ایک بڑی ہی اہم ایجاد ثابت ہوئی جس کا طریقہ استعمال بھی نہایت آسان اور فوری موثر ہے جتنی کہ لگائیں اور فوراً دھوئیں تو بھی اپنا اثر دکھاتا ہے کہ دیکھنے والے بھی کہیں اور خود کو بھی محسوس ہو سکن ٹونر کے استعمال فوائد:

تھوڑا سا سکن ٹونر دونوں ہاتھوں پر مل کر چہرے پر لگائیں 5 سیکنڈ بعد بغیر صابن تازہ پانی سے اتار مل کر دھوئیں کہ چمکنا ہٹ باقی نہ رہے اور اب چہرہ خشک ہونے پر ہاتھ بھیر کر دیکھیں خود ہی پر پیار آ جائے گا اور آئینہ دیکھیں تو حیرانگی ہوگی کہ سیکنڈز میں ہی اتنا اثر اور اب یہ اثر کم از کم ایک مہینے تک رہے گا لہذا سکن ٹونر کا ایک بار کا استعمال ایک مہینے کیلئے کافی ہے پھر بھی زیادہ سے زیادہ ایک مہینے میں دوبارہ استعمال کر سکتے ہیں اسی طرح چہرہ، ہاتھ، پاؤں اور گردن پر بھی سکن ٹونر لگائیں اور 5 سیکنڈ بعد بغیر صابن تازہ پانی سے اتار مل کر دھوئیں کہ چمکنا ہٹ باقی نہ رہے تو ہاتھ، پاؤں بھی نرم ملائم گورے اور چمکدار ہو جائیں گے پھٹی ابریاں ٹھیک ہو جائے گی اور یہ اثر ایک ماہ تک رہے گا پھر سکن ٹونر ایک ماہ میں دوبارہ استعمال ہو سکتا ہے اور اگر پورے جسم کو نرم و ملائم اور چمکدار بنانا ہو تو پورے جسم پر سکن ٹونر لگا کر 5 سیکنڈ بعد بغیر صابن تازہ پانی سے اتار مل کر دھوئیں کہ چمکنا ہٹ باقی نہ رہے آپ حیران ہوں گے کہ اپنے ہی جسم پر ہاتھ بھیر کر یاد کیجئے کہ خود ہی پیار آ جائے گا کہ جسم نرم و ملائم گورا اور چمکدار ہو جائے گا دانے اور خارش ختم ہوگی سکن ٹونر پورے جسم پر ہر مہینے ضرور لگائیں حسب ضرورت مہینے میں دوبارہ بھی استعمال کر سکتے ہیں

نوٹ: ہر بوتل کریم 100 گرامی (پچاس ڈائریکٹ) ہر بوتل کریم 100 گرامی (پچاس ڈائریکٹ) ہر بوتل کریم 100 گرامی (پچاس ڈائریکٹ)

042-37666818
0300-9486848

تیار کردہ: اے۔ کے۔ کاسکو پائڈ، میٹروہ (سوات)

051-5552509, 5535650
0321-5557537

022-3641343
0300-9376764

021-35673194, 0300-2858664
041-2636215, 0300-6628069

042-37640516, 0321-4444542
042-36314149, 36375769

061-4586946, 0300-6308784

021-35673194, 0300-2858664
041-2636215, 0300-6628069

042-37640516, 0321-4444542
042-36314149, 36375769

061-4586946, 0300-6308784

021-35673194, 0300-2858664
041-2636215, 0300-6628069

042-37640516, 0321-4444542
042-36314149, 36375769

061-4586946, 0300-6308784

خواتین کے طور پر جانی جاتی ہیں۔ داڑھی والے مرد مسلمان بھی ہو سکتے ہیں اور ہندو بھی۔ لہذا ان سے پوچھا جاتا ہے ”آر یو ڈاٹ؟“ یعنی ”کیا آپ کا تعلق ہندو دھرم سے ہے؟“

بہر حال یہ تمام باتیں اپنی جگہ، بعض باتوں کی وجہ سے دیکسی لوگوں کی امریکا میں بدنامی بھی ہوئی ہے لیکن عام طور پر دیکسی لوگوں، دیکسی کھانوں، دیکسی ادب اور میوزک نے یہاں کے گوروں اور ان کے ملک میں خاصی جگہ بنالی ہے کیونکہ یہاں کے گورے اب کئی دیکسی چیزیں اس طرح پسند کرنے لگے ہیں جیسے جاپانی باشندے فریج ڈس پسند کرتے ہیں۔ صرف دیکسی ادب ہی کو دیکھا جائے تو آج کے فی وی اور انٹرنیٹ کے دور میں بھی یہاں کے لوگ اپنے ادب سے زیادہ ”دیکسی ادب“ کو پسند کرتے ہیں۔ آر کے نارائن کی کلاسیکی تحریروں اور وی ایس ایس تانپال کی کتابوں کے علاوہ انیتا ڈیسا، گیتا مہتا اور راج کمال جیسے ادیبوں کی کتابیں نیویارک، واشنگٹن، ہالی وڈ کے علاوہ اٹلانٹک سٹی، ایڈیسن اور ساگرینو جیسے شہروں کے ڈیپارٹمنٹل اسٹورز اور بک اسٹالوں پر نظر آتی ہیں۔

دیکسی میوزک میں ہندی اردو گانے یہاں خاصے مشہور ہیں۔ دوسرے نمبر پر پنجابی اور گجراتی گانے ہیں۔ برصغیر میں بولی جانے والی تقریباً ہر زبان کے لوگ امریکا میں پائے جاتے ہیں لیکن زیادہ تر زبانیں گھروں تک محدود ہیں۔ فنکشنز، تہلیل اور سنیما گھروں میں عام طور پر ہندی، اردو گانے سنائی دیتے ہیں۔ دکانوں پر کئی مختلف زبانوں کے آڈیو، ویڈیو کیسٹ ملتے ہیں جو فروخت ہونے کے لیے نہ صرف پاکستان اور ہندوستان سے یہاں آتے ہیں بلکہ مقامی طور پر بھی تیار کیے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں سرینام اور ٹرینیڈاڈ جیسے ملکوں میں مقیم انڈین باشندے پیش پیش ہیں۔ ٹرینیڈاڈ کا ایک جوڑا ”کچن اور بابلا“ یہاں خاصا مشہور ہے۔ ایک اور گروپ ”سندر پوپو“ نام کا ہے۔ ان کے میوزک کا نام ہے ”پچھی میوزک“ پاکستانی گروپ ”جنون“ بھی یہاں بہت مشہور ہے اور پاکستانیوں کے علاوہ انڈین بھی انہیں پسند کرتے ہیں۔

میں فلک شیر کے ساتھ واشنگٹن سے نیوجرسی آ رہا تھا۔ سفر کے دوران ہم ”دیکسی میوزک“ سنتے رہے تھے۔ ان میں سے ایک سندھی کیسٹ بہت پسند آیا تھا جس میں یہ گیت تھا۔ ”گھرے، سنبھالو..... لے چلو اس پار“

علاوہ چینی، ملٹی اور انگریزی ہیں لیکن یہاں امریکا میں موجود تامل، بنگالی، گجراتی اور نیپالی سب ہی ہندی بولتے اور سمجھتے ہیں۔ ہم پاکستانیوں کی اردو زبان سے جو ہندی سے ملتی جلتی ہے۔ لہذا یہاں ”دیکسی“ لوگ انگریزی کے علاوہ جس دوسری زبان میں زیادہ تر Communicate کرتے ہیں وہ ہندی ہے۔ یہاں کیمل نیٹ ورک کے ذریعے جو چار پانچ انڈین فی وی چینل دکھائے جاتے ہیں وہ فی وی، سہارا، اشارنی وی وغیرہ ہیں۔ یہ تمام ہندی چینل ہیں۔ حالانکہ تامل، بنگالی اور خاص طور پر گجراتی زبان بولنے والے بہت بڑی تعداد میں امریکا میں رہتے ہیں۔

امریکا میں برصغیر کے کھانوں کو ”انڈین فوڈ“ کہا جاتا تھا۔ اس کا مطلب تھا اتر پردیش، پنجاب، کشمیر یعنی انڈیا کے شمالی علاقوں کے کھانے۔ لیکن اب ”دیکسی فوڈ“ کی اصطلاح زیادہ مشہور ہونے لگی ہے۔ اس میں دال بھات، سالن، اڈلی، ڈوسا، روٹی چپاتی اور دیگر گجراتی، بنگالی کھانے۔ مدراسی اور جنوبی ہندوستان کے طعام شامل ہیں۔ میوزک کے حوالے سے امریکا میں اس سے قبل انڈین فلمی گانے اور پنجابی بھنگرا خاصا شہرت رکھتے تھے جس سے انڈین موسیقی کی نمائندگی ہوتی تھی لیکن اب یہ سب محض انڈین کھانے کے بجائے ”دیکسی“ کھانے لگے ہیں۔ اس میں بنگالی اور نیپالی ڈانس بھی شامل ہیں اور راس، بھنگرا، بھرت ناٹیم، کٹھک بھی۔

سندھ یونیورسٹی کے پروفیسر جاوید بھی آج کل یہاں امریکا کی ایک یونیورسٹی سے وابستہ ہیں۔ میں نے ایک دن ان سے پوچھا تھا ”دیکسی لوگوں کی تمام خصوصیات تقریباً یکساں ہیں لیکن یہاں کے مقامی باشندے ان میں مذہب کے حوالے سے کس طرح امتیاز کرتے ہوں گے کہ کون مسلم ہے اور کون ہندو؟“

”مسلمانوں کو داڑھی سے شناخت کرتے ہیں اور ہندوؤں کو ”ڈاٹ“ (Dot) کہتے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے پوچھا تھا ”یہ ”ڈاٹ“ کیا چیز ہے؟“

”ڈاٹ کا مطلب ہے وہ سرخ رنگ کا تلک جو ہندو عورتیں اپنی پیشانی پر لگاتی ہیں۔“

یعنی یہاں کے گورے یہ سوال ان مردوں سے کرتے ہیں جن کی داڑھی نہیں ہوتی جن عورتوں کی پیشانی پر تلک لگا ہوتا ہے انہیں ہندو سمجھا جاتا ہے اور بغیر تلک والی مسلمان

ان جاہلوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ظلم کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ انٹرنیٹ اور سٹیلائیٹ کا دور آچکا ہے۔ ہیومن رائٹس اور وومن وائج ڈاگ تحریکوں کا عمل ورلڈ وائڈ ہو چکا ہے۔ آج کھڑو اور ٹھری میرواہ جیسے قصوں میں ہونے والے قتل کی ٹبر آنا فانا سان فرانسسکو اور لاس اینجلس تک جا پہنچتی ہے۔ پنوعاقل اور گھونگی میں ہونے والے اغوا اور "کاروکاری" کے کیسوں کی خبر سکھر اور خیر پور تک پہنچنے سے پہلے دنیا کے دوسرے سرے سرے مشی گن اور اوہائیو تک پہنچ جاتی ہے۔ ان جاہلوں کے کروت نہ صرف اپنے علاقوں، اپنے ملک بلکہ پردیس میں رہنے والے دیسی بھائیوں کے لیے بھی مشکلات کا باعث بنتے ہیں۔

بہر حال ہم امریکا میں آباد اپنے ہم وطنوں کی بات کر رہے تھے۔ امریکا یعنی یو ایس اے پچاس ریاستوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں ٹیکساس، الارکا اور کیلی فورنیا جیسی ریاستوں کا پھیلاؤ تقریباً پاکستان کے برابر ہے۔ ہمارے اطراف کے لوگ یعنی پاکستانی، انڈین اور بنگلادیشی وغیرہ امریکا کی تمام ریاستوں میں پھیلے ہوئے نہیں ہیں۔ بلکہ چند ریاستوں میں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ مثلاً نیویارک، نیوجرسی، کیلی فورنیا اور ایلی نیا۔ اس کے بعد دوسرے غیر پرنسپل انیا، مشی گن، ٹیکساس، اوہائیو اور فلوریڈا ریاستیں ہیں جہاں دیسی لوگوں کی زیادہ تعداد آباد ہے۔

ان ریاستوں کے شہروں میں نیویارک، ٹی، سان فرانسسکو، سان ہوس، "لیکین ویل"، "ہاکو"، اس اینجلس، "واشنگٹن ڈی سی" اور "فلوریڈا" کے علاوہ ایک اور شہر جس میں دیسی لوگوں کی آبادی کا تناسب گہری سے زیادہ ہے، وہ ہے "چن برک"۔

کہا جاتا ہے کہ برصغیر کے لوگوں کی امریکا میں آمد کا سلسلہ 1700ء کے بعد شروع ہوا تھا۔ 1790ء میں امریکا میں آنے والا پہلا انڈین برٹش نیوی کا خلاصی تھا۔ میسویں صدی کی پہلی دہائی میں متحدہ ہندوستان کے صوبے پنجاب کے سکھ، پنجابی ہندو اور مسلمان بڑی تعداد میں امریکا پہنچے تھے۔ ان تمام لوگوں نے کیلی فورنیا ریاست میں سکونت اختیار کی تھی۔ اس زمانے میں کہا جاتا تھا "Soon to be Indian State of Punjab" یعنی امریکی ریاست کیلی فورنیا، انڈیا کی ریاست پنجاب کی صورت اختیار کرتی جارہی ہے۔ اس کے بعد تیس چالیس برس تک یہ سلسلہ رکا رہا۔ پھر 1950ء میں انڈیا سے بہت بڑی تعداد میں لوگ

ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے پڑوس میں رہنے والی امریکن خاتون سے کہا تھا "ہم پاکستانی ترقی یافتہ، تعلیم یافتہ، سمجھ دار اور مہمان نواز ہیں۔ ہماری تہذیب پانچ ہزار سال سے بھی زیادہ قدیم ہے۔ موہن جو دڑو اس کی ایک مثال ہے۔"

اگلے روز وہ ایک نئے وار میگزین طرز کا اخبار اٹھالائی جس میں منوجیل کی دردناک کہانی شائع ہوئی تھی اور پنجاب میں مختار امانی کے ساتھ ہونے والے مظالم کی داستان اسی کی زبانی چھاپی گئی تھی۔ سنا ہے کہ مختار امانی پر یہاں ایک فلم بھی بن رہی ہے۔ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ ہمارے ملک کے لوگ کس قدر غربت و افلاس، بے روزگاری اور بیماریوں میں جکڑے ہوئے اور نا انصافیوں کے ستارے ہوئے ہیں، جو ظالم ہیں، جو دوسروں کے پورے پورے خاندانوں کو اپنی ذاتی جیلوں میں قید کر دیتے ہیں، جو اپنی بیٹیوں کو "کاری" (سیاہ کار) قرار دے کر ہلاک کر دیتے ہیں۔ زمین، جائداد اور ملکیت کو ہمارے سے بچانے کے لیے بچیوں کی شادیاں قرآن سے کراتے ہیں، جو عورت کے تقدس کو بامال کرتے ہیں، چوریاں کرتے ہیں، ڈاکے ڈالتے ہیں اور لوگوں کو اغوا کرتے اور کراتے ہیں۔ وہ سردار، ڈیرے، خان، پیر اور میر۔ پولیس کی کالی بھینٹیں پورے پاکستان کی آدم شماری میں ایک فی صد بھی نہیں ہیں لیکن ان ظالموں نے ہمارے ملک کو پوری دنیا میں کس طرح رسوا کر دیا ہے۔ انہی کی وجہ سے ہمارا ملک دہشت گردوں اور ڈاکوؤں کا دیس گردانا جاتا ہے۔

یورپ اور امریکی ملک تو ایک طرف، عرب ملکوں میں بھی پاکستانیوں کو ملازمت میں رکھتے ہوئے سوہانے اور عذر تراشے جاتے ہیں۔ وہ لوگ ملائیشیا کے شہر ملاکا میں واقع سو سالہ قدیم مختصر سا قلعہ دیکھنے کے لیے تو خوشی سے جاتے ہیں لیکن ہمارے ہاں حیدر آباد کا قدیم و عظیم قلعہ اور موہن جو دڑو کو دیکھنے کی ہمت نہیں کر پاتے، مقام فکر ہے!

ایک جانب تو ہم بیٹیوں اور بہنوں کو اعلیٰ مقام دیتے ہیں اور دوسری جانب..... حقیقت تو یہی ہے کہ محض گائے، بھینس کی چوری کے عوض جرمانے کے طور پر پانچ پانچ معصوم بچیاں دے دی جاتی ہیں۔ اس قسم کے فیصلے کرنے والے سردار اور ڈیرے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ نیکی کا کام انجام دے رہے ہیں۔

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
اور کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

امریکا کے شہر بوسٹن میں دیسی لوگوں کا ایک بینڈ ہے جس کا نام ہے "کمینڈر" "The Komina's" یہ گروپ خود کو "پنجابی پنک" کہلاتا ہے۔

☆☆☆

امریکا میں برصغیر کے لوگ اتنی زیادہ تعداد میں رہتے ہیں اور ان کا "دیسی میوزک" مقامی امریکن میں بھی اس قدر پاپولر ہو چکا ہے کہ دنیا کے مشہور میوزک چینل ایم ٹی وی والے یہاں امریکا میں ایک نیا چینل "ایم ٹی وی دیسی" کے نام سے شروع کرنے والے ہیں۔ جن گورے امریکن کو لفظ "دیسی" کا علم نہیں تھا، اس چینل کی وجہ سے وہ بھی جان جائیں گے کہ "Desi" کا کیا مطلب ہے اور اس میں کیسے لوگ اور کس قسم کی چیزیں آتی ہیں۔

یہاں امریکا میں کچھ دیسی لوگوں کے ایف ایم ریڈیو اسٹیشن بھی قائم ہیں جہاں سے پاکستانی اور انڈین گانے، غزلیں، گیت، شعر و شاعری کے پروگرام اور مزاحیہ خاکے جو زیادہ تر داہیات اور لچر قسم کے لطائف وغیرہ پر مبنی ہوتے ہیں، نشر ہوتے رہتے ہیں۔ ان ایف ایم ریڈیو اسٹیشنز کا دائرہ، نشریات محدود ہوتا ہے۔ جب میں خالد چنا، میر و سطوہ، فلک شیر اور ریش تھاروانی کے ساتھ نیوجرسی میری لینڈ، پینسلوانیا اور ورجینیا کی سڑکوں پر محسوس ہوتا ہوں تو وہ ریڈیو کی سونی ٹھہرا کر آخر کار کوئی نہ کوئی دیسی اسٹیشن تلاش کر ہی لیتے ہیں۔ امریکا کی سڑکوں پر سفر کرتے ہوئے اپنے وطن کی آواز اور موسیقی کانوں میں پڑتی ہے تو حیرت کا احساس ہوتا ہے حالانکہ جب ابتدائی دنوں (70-1969ء) میں ہم یہاں کی بندرگاہوں بالٹیور، فلاڈیلفیا، نیویارک وغیرہ میں جہاز لے کر آتے تھے تو بندرگاہ کے مزدور تو کیا کئی تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی معلوم نہیں ہوتا تھا کہ کراچی اور پاکستان دنیا کے کس حصے میں واقع ہیں۔

یہ بات دیگر ہے کہ آج بھی کئی گھریلو قسم کی امریکن خواتین سے دریافت کیا جائے کہ انہوں نے پاکستان کا نام سنا ہے؟ وہ فوراً جواب دیں گی "ہاں، جہاں روزانہ ہم پھنتے ہیں اور جہاں عورتوں کے ساتھ زیادتی کی جاتی ہے۔"

دراصل ان "بے چاریوں" کا بھی کوئی قصور نہیں ہے۔ بیرونی دنیا کے بارے میں ان کی معلومات کا وسیلہ صرف مقامی ٹی وی اسٹیشن کا "خبرنامہ" ہے اور یہ اسی طرح ہے جیسے ہمارے ہاں شام کے اخبارات ہوتے ہیں، جو جرائم، جنسی تشدد اور گھر سے بھاگی ہوئی لڑکیوں کی کہانیوں سے بھرے

میں اپنے مہینوال سے مل لوں اک بار"۔
فلک شیر نے مجھے بتایا تھا کہ پچھلے سال نیوجرسی میں انڈین سندھیوں کا سمیلن ہوا تھا۔ اس میں یہ گلوکارہ، کماری تہی بھو جوانی، بھی شریک ہوئی تھیں۔ اس تقریب میں ہونے والے موسیقی کے پروگرام کا آڈیو کیسٹ ایک مقامی ریکارڈنگ کمپنی نے تیار کیا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کماری تہی کی آواز میں اتنا منگیلہ جیسا لوج ہے یا شاید پنسلوانیا اور میری لینڈ کے خوشگوار موسم میں فلاڈیلفیا کی ڈیلاریر ندی سے گزرتے وقت ارد گرد کے خوبصورت نظارے کا اثر تھا جو اس گیت میں رومانویت پیدا کر رہا تھا۔

"بھولیو! لہروں سے لڑوں گی میں

جان کی بازی لگاؤں گی

درد سے دل سلگتا ہے

ساجن کی یاد ستاتی ہے

گھر سے اچھے سنبھالو، لے چلو اس پار

میں اپنے مہینوال سے مل لوں اک بار....."

فلک شیر نے بتایا تھا کہ کماری تہی بھو جوانی انڈیا کے صوبہ گجرات کے شہر "گاندھی رام" میں رہائش پذیر ہیں، جہاں وہ ایک اسکول کی پرنسپل ہیں۔ میں تقریباً دو ہفتے تک نیویارک اور نیوجرسی کی دیسی دکانوں پر کماری تہی کی کیسٹ تلاش کرتا رہا لیکن ہر جگہ یہی معلوم ہوا کہ تمام کیسٹ ختم ہو چکے ہیں۔ آخر کار میں نے فلک شیر سے کہا کہ وہ اپنے کیسٹ سے کاپی کر کے مجھے بھی دے۔

سندھی گیتوں کے کیسٹ کراچی میں بھی ملتے ہیں لیکن یہاں رہنے والے پاکستانیوں اور ہندوستانیوں کے پاس عجیب کیسٹ نکل آتے ہیں۔ انہوں نے کچھ کیسٹ حیدر آباد، سندھ اور انڈیا سے منگوائے ہیں اور بعض ایسے کیسٹ بھی ہیں جو یہاں ہونے والی ملن پارٹیوں اور میلوں میں شپ کے گئے ہیں۔ ورلڈ سندھی اسٹی نیٹ (WSI) کے چیئرمین نے بھی مجھے سندھی میوزک کی ایک سی ڈی پیش کی تھی جو یہاں واشنگٹن میں تیار کی گئی تھی۔

انگینڈ کا ایک دیسی گلوکار ہے جو پنجابی ایم سی کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے گانوں کا ایک البم یہاں امریکا میں بہت مشہور ہے۔ اس البم کا نام ہے "Desi" چند گانے پنجابی ناچ بھنگڑا اور پنجابی اور انگریزی کا ملغوبہ ہیں یعنی اس میں ایک بول پنجابی اور ایک بول انگریزی کا شامل ہے۔

”کیوں نہ میں اپنے بیٹے کو پاکستان لے جاؤں اور اپنے خاندان کی کسی لڑکی سے اس کی شادی کرادوں؟“

”ایسا کرنے سے کیا ہوگا؟“ میں نے جاننا چاہا تھا۔

”ممکن ہے وہ راہ راست پر آجائے؟“

”یہ بھی تو ممکن ہے تاکہ وہ ایک معصوم اور غریب لڑکی کو غلطاب میں مبتلا کر دے۔ اگر وہ لڑکی اس کے مزاج سے مطابقت نہ رکھ سکی تو وہ بے چاری پر دہلیس میں کیا کر سکے گی؟

اس کی تو زندگی ہی تباہ ہو جائے گی۔“

بعض والدین نے اس پر افسوس اور ندامت کا بھی اظہار کیا کہ اس سلسلے میں قصور وار وہ خود ہیں۔

”یہاں امریکا میں آنے کے بعد خود کو مشرقی تہذیب سے منسلک رکھنے کے بجائے ہم نے یہاں کے کلچر کو اپنا لیا۔“

ایک بزرگ ہمدون نے کہا تھا ”ہم نے خود کو یہاں کی رنگین سوسائٹی میں مدغم کر دیا۔ شراب اور ناچ گانے جیسی مصروفیات میں مگن ہو گئے۔ اور بچوں نے اس دیکھ کر خود کو بھی اسی رنگ میں رنگ لیا۔“

کچھ والدین اپنی جوان اولاد کو بے راہروی کی جانب مائل دیکھ کر اس قدر پریشان ہو گئے کہ انہوں نے پاکستان واپس لوٹنے کا فیصلہ کر لیا لیکن ان کے بچوں نے اس فیصلے کی سخت مخالفت کی اور امریکا ہی میں رہنے کی ضد کی۔ والدین اس صورت حال میں کچھ کر بھی نہیں سکتے کیونکہ ان کے پاس امریکا کی شہریت اور پاسپورٹ ہے۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کے بچے تو اپنے وطن واپس جانے پر آمادہ نہیں، ساتھ میں ان کی بیویاں بھی اپنے آبائی وطن جانے کے لیے راضی نہیں تھیں۔

میرے ایک دوست کی تین بیٹیاں ہیں۔ ان کی سب سے بڑی بیٹی اٹھارہ برس کی اور بالغ ہے۔ اپنی جوان بیٹی کی گوروں کے ساتھ دوستی کو وہ پسند نہیں کرتے اور اس سلسلے میں وہ سخت پریشان رہتے ہیں۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کی بیٹی امریکا میں مزید تعلیم حاصل کرنے کے بجائے کراچی جا کر آغاخان میڈیکل یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرے۔

”میں اسے سمجھانے کی بہت کوشش کر چکا ہوں۔“

میرے دوست نے بتایا ”میں تمام اخراجات برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں اور کراچی میں اس کی خالہ بھی رہتی ہے۔ وہاں اسے کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوگی لیکن وہ کسی بھی صورت میں امریکا کے ماحول سے دور ہونا نہیں چاہتی۔ افسوس کی

یعنی آیا، یو آئے، باورچی اور ڈرائیور کے لیے جاری کیا جانے والا ویزا، اے بی سی ڈی ویزا کہلاتا ہے۔ جب میں کویت اور سعودی عرب میں موجود ہوتا تھا تو وہاں میں نے کئی اپنے ہم وطن ڈاکٹر اور انجینئرز کی زبانی سنا کہ وہ اے بی سی ڈی ویزا پر یہاں آئے ہیں۔ پھر وہ جدوجہد کر کے اپنے پرویشن والی ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

یہاں امریکا میں بھی کبھی کبھی لفظ ”اے بی سی ڈی“ سننے میں آتا ہے جو ہمارے دہلی لوگوں یعنی ساؤتھ ایشیا کے ایک مخصوص طبقے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ وہ پاکستانی اور انڈین نوجوان، جن کے والدین برصغیر سے یہاں پہنچے لیکن وہ خود کہیں پیدا ہوئے اور بچے ہوئے، انہیں بچپن ہی سے والدین نے آزاد چھوڑ دیا تھا تاکہ وہ یہاں کے کلچر میں ریج بس جائیں، یہ اے بی سی ڈی کہلاتے ہیں یعنی

”American born Confused Desi“

یہ نوجوان سخت الجھن کا شکار رہتے ہیں کہ وہ یہاں کے کلچر، ناچ گانے، شراب وغیرہ کو اپنائیں یا اپنے بڑوں کی روایات، رسموں اور مذہب کو اپنائیں؟

میری چند ایسے ہم وطن خاندانوں سے بھی ملاقات ہوئی تھی جنہوں نے ابتدا میں بے خیالی اور مصروفیت کے سبب اپنے بچوں پر توجہ نہیں دی تھی بلکہ وہ اس بات پر فخر کرتے تھے کہ ان کے بچے مقامی بچوں کے ساتھ دوستی کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں اور اس قدر ”میچور“ ہو گئے ہیں کہ غلوٹ پارٹیوں میں شریک ہونے لگے ہیں۔ لیکن اب وہ ”بچے“ جوان ہو چکے ہیں اور ان کے والدین سخت پریشان ہیں۔ وہ نوجوان بھی سخت الجھن کا شکار ہیں کہ اب وہ کیا کریں؟

والدین چاہتے ہیں کہ ان کے بچے اپنے مقامی دوستوں اور ان سے اپنائی ہوئی عادات کو ترک کر کے ”انسان“ بن جائیں اور والدین کی عزت کریں۔ ان کے لیکچرسن کر بالغ اولاد بے زاری کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ ان بوزھوں سے عاجز آ گئے ہیں۔ چند بچوں کو میں نے دیکھا تھا جو اپنے والدین سے ضد کر کے الگ فلیٹ لے کر اس میں رہنے لگے تھے جہاں انہیں روک ٹوک کرنے والا کوئی نہیں۔ ان کے فلیٹ میں گرل فرینڈز کی آمدورفت اور وہاں ہونے والی غلوٹ اور آزاد پارٹیوں کے بارے میں سن کر ان کے والدین کو اس عمر میں سخت صدمہ پہنچتا ہے۔ ایک دوست نے مجھ سے مشورہ کرنے کی غرض سے کہا تھا۔

1- آیا (Aye)

2- گھر کے کام کاج کے لیے لڑکا (Boy)

3- کھانا پکانے کے لیے باورچی (Cook)

4- گاڑی چلانے کے لیے ڈرائیور (Driver)

بی بی ڈی ”ویزا کے بارے میں ضرور سنا ہوگا۔ ستر کی دہائی سے قبل عرب ممالک کچھ زیادہ امیر نہ تھے۔ ستر کی دہائی میں عرب سرزمین سے جگہ جگہ تیل دریافت ہونے لگا اور تیل کی قیمتوں میں یکا یک انتہائی اضافہ ہونے کے سبب عرب ملک یورپین ممالک سے بھی زیادہ امیر ہو گئے۔ اپنے ملک کی ترقی اور عوام کی سہولت کے لیے عرب ملکوں کے سربراہوں نے دوسرے ملکوں سے ڈاکٹر، انجینئر، پروفیسر اور عام کام کاج کے لیے ملازم اور خدمتگار بلوانے شروع کر دیے۔ ہر عرب کو یہ اجازت تھی کہ وہ اپنے ملک میں فیکٹری، کارخانہ، اسکول اور اسپتال قائم کر سکتا ہے اور اس سلسلے میں وہ ضرورت کے مطابق بیرون ملک سے افرادی قوت حاصل کر سکتا ہے۔ فیکٹری وغیرہ لگانے کے لیے سرکاری جانب سے بلا سوتلر ضرر بھی فراہم کیا جاتا تھا۔

میں برس کے بعد عربوں کی دولت میں کمی آنے لگی اور دوسری جانب پاکستان، انڈیا، سری لنکا اور بنگلہ دیش جیسے غریب ملکوں کے لوگوں میں ”دہلی چلو“ کلچر عام ہو گیا۔ اس کے بعد ملازمین دستیاب نہ ہونے کے باوجود لوگ جدوجہد کر کے ویزا حاصل کرتے اور وہ عرب ملکوں میں پہنچنے لگے۔

وہاں جا کر وہ کسی نہ کسی طرح ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتے تھے۔ ایک طرف تو عرب ملکوں میں ملازمین کم ہو گئے اور دوسری جانب یہ ہوا کہ شاہ خرچیوں کی عادت کے سبب عربوں کی دولت میں کمی آنے لگی۔ ایسے میں بعض عربوں نے آمدنی کا ایک نیا طریقہ ایجاد کر لیا۔ انہوں نے سوچا کہ کسی اور ”کاروبار“ میں سرکھپانے سے بہتر اور آسان طریقہ یہ ہے کہ پاکستان اور ہندوستان جیسے ملکوں میں جا کر وہاں کے لوگوں کو مفت ویزا دینے کے بجائے قیمت دیا جائے۔ اس قسم کے ویزا ”اوپن ویزا“ کہلاتے ہیں اور اس میں کوئی بھی عرب ملازمت کی فراہمی کا ذمے دار نہیں ہوتا تھا۔ یہ ”کاروبار“ جب حدود سے تجاوز کرنے لگا تو عرب حکومت نے اپنی عوام کے لیے یہ قانون بنایا کہ ہر عرب ضرورت کے مطابق صرف چار افراد بیرون ملک سے بلوا سکتا ہے۔ یعنی وہ اپنی آسائش، سہولت اور ضرورت کے مطابق چار قسم کے کام والوں کو ویزا دے سکتا ہے۔

1- آیا (Aye)

2- گھر کے کام کاج کے لیے لڑکا (Boy)

3- کھانا پکانے کے لیے باورچی (Cook)

4- گاڑی چلانے کے لیے ڈرائیور (Driver)

امریکا پہنچے۔ یہ ہندوستان کی تقسیم کے بعد کے اثرات کا نتیجہ تھا۔

برصغیر (انڈیا) سے ہجرت کر کے امریکا آنے والے لوگ خواہ ”وہی انڈین یا ایشین“ کہلاتے ہوں لیکن وہ باضابطہ طور پر ”انڈین امریکن“ سمجھے جاتے ہیں۔ یعنی انڈیا کے وہ لوگ جو اب امریکن قومیت کے حامل ہیں اور ان کے پاس امریکی شہریت اور پاسپورٹ ہے۔ انہیں وہ تمام سہولتیں میسر ہوتی ہیں جو یہاں کے گورے امریکن کو حاصل ہیں۔

انڈیا سے آنے والے انڈیز کے علاوہ ایک اور قوم بھی یہاں آباد ہے جو یورپین کی آمد سے قبل اس سرزمین پر موجود تھی۔ یورپ سے آنے والی قوموں پرنگالی، انگریز، ایتھنی، اطالوی، المانی (جرمنی) وغیرہ نے وہاں پہلے سے موجود لوگوں کو مار پیٹ کر، ڈرا دھمکا اور لالچ دے کر ان سے زمینیں ہتھیالیں اور وہ ان پر قبضہ کر کے مالک بن بیٹھے۔ وہ لوگ ”ریڈ انڈین“ کہلاتے ہیں اور عام طور پر انہیں ”انڈین“ بھی کہا جاتا ہے۔ کبھی کبھی انہیں صرف ”انڈین“ کہنے سے الجھن بھی پیدا ہوتی ہے کہ مذکورہ شخص یہاں کا ”ریڈ انڈین“ ہے یا ایشیا سے تعلق رکھنے والا ”انڈین“۔

”انڈین چیف“ سے مراد یہاں کے اصلی باشندوں کا سردار ہے جس کے سر پر تلوں والا ہیٹ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے کسی نواب اور راجا مہاراجا کے لیے بھی یہی لفظ استعمال کیا جاتا ہے جو یہاں محض عیش و عشرت کی غرض سے آتے ہیں۔ لفظ ”ریڈ انڈین“ کبھی کبھی برا بھی لگتا ہے کیونکہ بعض لوگ انہیں نچلے درجے کا شہری ثابت کرنے کے لیے یہ لفظ استعمال کرتے ہیں لہذا باضابطہ طور پر انہیں ”امریکن انڈین“ کہا جاتا ہے۔ ویسے بھی آج کے جمہوری دور میں وہ لوگ بھی ایسے ہی شہری ہیں جیسے یہاں کے یورپین گورے ہیں۔ بلکہ اصولی طور پر دیکھا جائے تو وہ زیادہ عزت کے مستحق ہیں۔ کیونکہ وہ یہاں کے اصلی باشندے ہیں۔ یہ دھرتی ان کی اپنی ہے جبکہ گورے تو بعد میں آ کر یہاں قابض ہو گئے تھے۔

امریکا میں برسوں سے جمہوری حکومت، پریس اور خلافت کی آزادی اور حقوق کی بحالی کے سبب یہاں کے اصلی باشندے ریڈ انڈین بھی تعلیم حاصل کر کے اعلیٰ ملازمتوں اور کاروبار میں شامل ہو گئے ہیں۔

☆ ☆ ☆

جو افراد عرب ممالک میں رہ چکے ہیں انہوں نے ”اے

دیکھو ایڈ کے موقع پر..... وہ لوگ میری ایک بوتل یا ایک پیگ و ہسکی کو کافی سمجھتے ہیں۔ ہمارے ملک کے بے کشوں والا معاملہ یہاں نہیں ہے کہ پی پی کر اٹلیاں کرنے لگیں یا بے سندھ ہو جائیں اور دوسرے لوگ انہیں اٹھا کر گھر پہنچا آئیں۔

ہمارے ملک کے لوگوں کے ذہن میں عجیب مانجھ لیا ہے۔ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ انگریزوں کے جانے کے بعد ہمارے کالے حاکموں اور دولت مندوں نے ان کی نقل کرنے کے لیے سگریٹ اور شراب پینے کو باعث افتخار سمجھا تھا اور وہ اس میں فخر محسوس کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اس طرح انگریزوں جیسے ہو جائیں گے۔ اب انہیں یہ سمجھانے والا کوئی نہیں کہ یہی انگریز سگریٹ اور شراب نوشی کو برا سمجھتے ہیں۔ میڈیکل سائنس نے ثابت کر دیا ہے کہ سگریٹ اور شراب نہ صرف صحت کے لیے مضر ہیں بلکہ اخلاق کے لیے بھی نقصان دہ ہیں۔ میرے ایک ہندو دوست نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”شراب ایک ایسی بیماری ہے جو بوتلوں میں فروخت ہوتی ہے اور ہم رقم خرچ کر کے اسے خریدتے ہیں۔“

☆☆☆

امریکا دنیا کا ایک عجیب ملک ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ اسی ملک پر لعن قلع کی جاتی ہے اور سب سے زیادہ اسی ملک کو پسند کیا جاتا ہے۔ ہماری اپنی مثال ہمارے سامنے ہے۔ پاکستان کا ہر فرد امریکا کے خلاف بولتا نظر آئے گا لیکن جب امریکن لائبرٹی کا اعلان ہوتا ہے تو ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے سوا کوئی دوسرا امریکن ویزا لائبرٹی کا فارم جمع کرانے۔ ہمارے ہاں کے سیاست دان لیڈر، بزنس مین اور ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد محفلوں میں بیٹھ کر امریکا کو برا بھلا کہتے ہیں لیکن اپنے طور پر ان کوششوں میں بھی مصروف رہتے ہیں کہ ان کے بچے کسی طرح وہاں پہنچ جائیں۔ اس سلسلے میں غیر قانونی طریقوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاتا۔ بچوں کے وہاں سیٹ ہو جانے پر خود اپنا کاروبار بھی وہیں منتقل کرنے کے جنم کرتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ امریکا میں مذہب کی آزادی ہے، وہاں کوئی معاشی مسئلہ درپیش نہیں ہے، روزگار کے بہترین مواقع ہیں، بہتر تعلیم، بہتر موسم، بہتر ماحول، بہتر آمدنی اور خواہ..... سب سے اہم بات یہ کہ امریکا میں امن و امان کی صورت حال قابل رشک ہے اور وہاں ہر شخص پر سکون زندگی

”نہیں۔“ منور نے بتایا ”انہوں نے ہر بچے کو وقت دیا ہوا ہے۔ ہمارے بچوں کا قرآن پڑھنے کا ناٹم شام پانچ بجے ہے۔ ٹھیک پانچ بجے وہ فون کر کے بچوں سے سابقہ سنتی ہیں اور پھر انہیں نیا سبق دیتی ہیں۔ ہم نے فون کے ساتھ ٹیپ ریکارڈر منسلک کر دیا ہے۔ تاکہ بعد میں اس کی مدد سے بچے اپنا تلفظ درست کر سکیں۔“

میں نیو جرسی میں فلک شیر کے گھر پر تھا تو میں نے دیکھا کہ وہ بھی دیک ایڈ پر اپنے بچوں کو صبح ہی سے قریبی در سے لے جاتے تھے جسے اسلامک سینٹر کہا جاتا ہے۔ شام کو اسکواش اور سوئمنگ سکھانے کے لیے بچوں کو کلب لے جاتے تھے۔ وہاں میری کراچی کے کئی یمن تاجروں سے ملاقات ہوئی۔ امریکا میں ان کے ”ون ڈالر شاپ“ اور کئی دوسرے کاروبار ہیں۔ ان میں اسے آردائی ٹی وی کے عبدالرزاق یعقوب کے بچے بھی تھے۔ وہ بھی اپنے بچوں کے ساتھ وہاں آئے تھے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ صحت مند ذہن کے لیے جسم کا صحت مند ہونا بھی ضروری ہے۔ وہاں پر فلک شیر نے مجھے ایک بچے منزل سے ملوایا تھا جس نے پورا قرآن حفظ کیا ہوا تھا۔

اسی طرح نیویارک میں مقیم بالائی ڈاکٹر لیلی کیر یو اور ان کے شوہر ڈاکٹر رمضان اغوا بھی تعطیل کے دنوں میں اپنے چاروں بچوں کو مدرسے لے جاتے ہیں۔ نماز اور قرآن شریف پڑھنا یقیناً ایک اچھا عمل ہے لیکن اس کے علاوہ ہم نے دیکھا تھا کہ امریکا میں رہنے والے ہمارے ہم وطن لوگوں کے بچے کئی معاملات میں اپنے ان ہم عمر بچوں سے بہتر تھے جو کراچی، بمبئی اور ڈھاکہ میں رہتے ہیں۔ جن کے والدین ان کی ذہنی اور اخلاقی تربیت پر توجہ نہیں دیتے۔

مسلمانوں کی نسبت گوکہ ہندوؤں کو مذہب کی جانب سے شراب پینے کی ممانعت نہیں، لیکن اس کے باوجود میرے مشاہدے میں آیا کہ ہندو یہاں کے گوروں کی طرح آج کل سگریٹ اور شراب سے اجتناب کرتے ہیں۔ ان چیزوں کو صحت کے لیے مضر سمجھا جاتا ہے۔ اب ایسا بھی نہ سمجھا جائے کہ وہ لوگ بالکل ڈرک نہیں کرتے، ایسا بھی نہیں ہے۔ یہ ایسا ملک ہے جہاں ہر شہر اور قصبے میں شراب کی دکانیں اس طرح کھلی ہوئی ہیں جیسے ہمارے ہاں جگہ جگہ پان سگریٹ کے کیبن کھلے ہوئے ہیں۔ ہمارے ملک کے مقابلے میں یہاں بیئر اور و ہسکی خاصی سستی ہے۔ کئی ہندو مقامی گورے کرچن اور یہودی ڈرک ضرور کرتے ہیں لیکن کسی پارٹی یا

سے ایک یہاں پیش کرتا ہوں۔

میں بالٹیمور میں اپنے ایک دوست ڈاکٹر منور عباسی کے گھر پر چند دن مہمان رہا تھا۔ میں نے وہاں دیکھا کہ ان کے دو بیٹے والدین کے ساتھ باقاعدگی سے پنج وقتہ نماز ادا کرتے تھے۔ منور نے بتایا تھا کہ ان کی بیگم نے ابتداء ہی سے بچوں پر پوری توجہ دی ہے۔ وہ انہیں یہی تربیت دیتی ہیں کہ وہ خواہ کبھی بھی رہیں، اپنے گھر اور مذہب کو نہیں چھوڑنا ہے۔

”فجر کے وقت بیدار ہونے اور بستر چھوڑنے میں کبھی کبھی مجھ پر سستی سوار ہو جاتی ہے۔“ منور نے بتایا تھا ”لیکن بچے شور مچا کر مجھے اٹھنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ Papa Get up“

منور نے بتایا تھا کہ صرف گھر پر ہی نہیں بلکہ اگر بچے کہیں باہر بھی ہوتے ہیں تو نماز کی پابندی ضرور کرتے ہیں۔ ”چند دن پہلے ہمارے بچے اسکول والوں کے ساتھ ایک ہفتے کے لیے پکنک منانے گئے تھے۔ ہم نے ہینڈ ماسٹر کو تحریری طور پر درخواست کی تھی کہ اس شہر میں فلاں وقت پر فجر کا ناٹم ہوتا ہے، وہ مہر بانی فرما کر اس وقت ہمارے بچوں کو بیدار کر دیں۔“

منور نے بتایا تھا کہ کمپیوٹر ان کے کمرے میں رکھا رہتا ہے تاکہ بچے ان کے سامنے اسکول کا کام کمپیوٹر پر کرتے رہیں۔

”ہم انہیں یہ سمجھاتے ہیں کہ دنیا کی طرح کمپیوٹر کی بھی کئی ایسی ویب سائٹس ہیں جن سے ہمیں کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔ ہمیں صرف اچھی باتوں کو فالو کرنا ہے۔“

منور کا بڑا بیٹا بارہ برس کا اور چھوٹے کی عمر صرف دس سال ہے۔ دونوں نے قرآن پاک کے پانچ پارے حفظ کر لیے ہیں۔ بالٹیمور شہر میں کئی مساجد ہیں جہاں گورے مسلمان بھی نماز پڑھتے دکھائی دیتے ہیں لیکن جہاں منور کا گھر ہے وہ مضافاتی علاقہ ہے۔ میں نے منور سے پوچھا تھا۔

”آپ کے بچے قرآن پڑھنے کہاں جاتے ہیں؟“

”ہمارے علاقے میں ایک عرب نے مسجد تعمیر کرائی ہے۔“ منور نے بتایا ”مسجد کے امام صاحب ایک مصری ہیں۔ ان کی بیگم بچوں کو قرآن پڑھاتی ہیں لیکن بچے مسجد میں جانے کے بجائے اپنے گھر پر ہی قرآن کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔“

”مصری امام صاحب کی بیگم گھر گھر جا کر بچوں کو پڑھاتی ہیں؟“

بات یہ ہے کہ اسے اپنی ماں کی بھی حمایت حاصل ہے۔“ میں نے اپنے دوست کی درخواست پر اس کی بیٹی کو سمجھانے کی کوشش کی اور اسے آغا خان یونیورسٹی کے معیار اور دیگر اچھائیوں کے بارے میں بتایا لیکن وہ کسی بھی صورت سے پاکستان جانے کے لیے تیار نہیں ہوئی۔ وہ ٹیکساس ریاست کے شہر ہیوسٹن جانا چاہتی تھی جہاں کے ایک میڈیکل کالج میں اس کے دوست لڑکے بھی داخلہ لے رہے تھے۔

اس کے والد کو اس بات کا افسوس تھا کہ اس نے ابتداء ہی میں بچوں کو اپنے مذہب اور گھر کی اہمیت سے آگاہ نہیں کیا۔ اب وہ اس کے ہاتھوں سے نکل چکے تھے۔ اب میرا دوست اس دن کو کوستا ہے جب اس نے اپنا وطن چھوڑ کر امریکا جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ بہر حال امریکا میں مقیم اس قسم کی نوجوان نسل کو ”اے بی سی ڈی“ کہا جاتا ہے۔

ان مثالوں سے یہ نہ سمجھا جائے کہ یورپ اور امریکا میں جو خاندان آتے ہیں ان کے بچے اپنے گھر، ثقافت اور مذہب سے دور ہو جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو مثالیں پیش کی گئی ہیں، اسی قسم کے کہیں یہاں آباد خاندانوں کی تعداد کی نسبت بڑائے نام ہیں۔ یہاں رہنے والے ہمارے اکثر دیسی اور ان کے بچے اس قدر فحشی، نیک اور بااخلاق ہیں کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔

ایک وہ زمانہ تھا جب ہمارے ملک کے جاہل و ذیروں، سرداروں، بیروں اور جاگیرداروں کے بیٹے دولت لٹانے اور عیاشی کی خاطر ولایت آتے تھے لیکن اب لوہڑ اور منڈل کلاس کے غریب لوگ یہاں آ کر سخت محنت کرتے ہیں اور پیسا بچاتے ہیں۔ ان کا پیسا ان کے خاندان کی خوشحالی پر صرف ہوتا ہے، خواہ وہ یہیں امریکا میں موجود ہوں یا اپنے وطن پاکستان میں، میں نے کراچی اور پاکستان کے دیگر شہروں میں کئی لڑکوں اور لڑکیوں کو نامناسب لباس میں اخلاق سے گری ہوئی حرکتیں کرتے ہوئے دیکھا ہے..... لیکن یہاں نہیں۔ یہاں ہفتے کے پانچ دن ڈٹ کر محنت کرنے کے بعد ویک ایڈ کی ایک یا دو دن کی چھٹی میں آرام کرنے کے بجائے وہ اپنے بچوں کو دینی تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے اسلامک سینٹر لے جاتے ہیں۔ یہاں بچوں کی دلچسپی کے کئی ٹیم کلب قائم ہیں۔ ہمارے سمجھ دار دیسی لوگ اپنے بچوں کو ان کلبوں میں بھی اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ کئی والدین اپنے بچوں کو کمرے میں تنہا کمپیوٹر پر انٹرنیٹ کھولنے کی بھی اجازت نہیں دیتے۔ اس قسم کی بھی کئی مثالیں موجود ہیں۔ ان میں

گزارتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

ضرور ایسا ہی ہوگا تب ہی تو جو بھی وہاں جاتا ہے وہیں کا ہو کر رہ جاتا ہے اور واپسی کا نام تک نہیں لیتا۔ واپس صرف وہ لوگ آتے جو وہاں کسی جرم میں ملوث ہو جاتے ہیں یا اس طرح کہنا چاہیے کہ ان سے دانستہ یا غیر دانستہ کوئی جرم سرزد ہو جاتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے بھاگنے کی کوشش کرتا ہے۔ کیونکہ اسے معلوم ہے کہ وہ قانون کی گرفت سے نہیں بچ سکتا۔ چور، بد معاشرے اور جرم کرنے والوں کے لیے جائے عافیت صرف اپنا وطن ہے۔

دوسرا سبب یہ ہوتا ہے کہ کسی کے پاس امریکا میں رہنے کے لیے قانونی دستاویزات نہیں ہوتیں اور وہ وہاں غیر قانونی طور پر مقیم ہوتا ہے۔ ایسے شخص کو بھی وہاں سے ڈی پورٹ کر دیا جاتا ہے۔ ایسے لوگ وہاں سے گویا ”بے آبرو“ ہو کر نکالے جاتے ہیں لیکن اپنے وطن پہنچ کر یہ لوگ اکثر اس قسم کے ڈائلاگ بولتے ہیں۔ ”اپنا ملک اپنا ہی ہوتا ہے۔“

”روکھی سوکھی کھائیں گے لیکن اپنے وطن میں رہیں گے، وغیرہ وغیرہ۔“ حالانکہ حقیقت اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ یہ شخص زبانی ڈائلاگ بولتے ہیں۔ بہر حال یہ بھی ممکن ہے کہ ایک دو کس واقعی ایسے ہی ہوں جو بیان کیے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے امریکا میں دنیا بھر کے لاکھوں افراد مقیم ہیں۔ ان میں سے ایک دو افراد خوشحال اور امن وامان کی زندگی کو چھوڑ کر وطن کی محبت میں واپس لوٹ آتے ہوں بہر حال عام طور پر کوئی لوٹ آیا..... "I have yet to see"

آج سے 38 برس قبل، 1968ء کے لگ بھگ جب میں میرین انجینئر کی حیثیت سے جہاز پر پہلی مرتبہ امریکا پہنچا تھا تو وہاں پاکستانی نہایت قلیل تعداد میں رہائش پذیر تھے اور انڈین بھی زیادہ نہ تھے۔ پاکستانی لوگ صوبہ سرحد اور پنجاب سے تعلق رکھتے تھے اور انڈین صوبہ گجرات کے تھے۔ اس حساب سے USA سے زیادہ سینٹرل امریکا اور ساؤتھ امریکا میں ایشین آباد تھے۔

وہاں جو اکاڈمک سندھی مسلمان تھے، وہ وڈیروں، جاگیر داروں، چودھریوں کے فرزند تھے۔ جن کا مقصد صرف عیش کی زندگی گزارنا اور وقت اور دولت کو ضائع کرنا تھا۔ جب ان کے پاس رقم باقی نہیں رہتی تھی تو اپنے وطن سے مزید رقم منگوا لیتے تھے۔ رقم موصول نہ ہونے پر وہ مجبوراً واپس لوٹ آتے تھے۔ میں کئی ایسے افراد کو ذاتی طور پر جانتا ہوں جنہیں

امریکا کی شہریت اور پاسپورٹ مل چکا تھا لیکن انہوں نے سب کچھ گنوا دیا۔ رقم نہ ہونے کے سبب ان سے کوئی کام اور ملازمت نہیں ہو سکتی تھی ایسے لوگ وطن کا رخ کرتے تھے۔ یا اپنے والد کی وفات کا سن کر ملکیت کو اپنے قبضے میں کرنے کے لیے مراجعت پر مجبور ہوتے تھے۔

میں نے 1968ء میں حیدرآباد کے بشیر مغل، منڈو جان محمد کے باپ اور اس کے بھائی یوسف ڈاہری جیسے لوگوں کو بھی امریکا آتے دیکھا جو ہم جیسے عام آدمی تھے۔ ان کے پاس کچھ بھی مال و ملکیت نہیں تھی اور نہ ہی کوئی ان کی مدد کرنے والا تھا۔ انہوں نے اپنے، اپنی اولاد اور اپنے گاؤں کے لوگوں کے لیے جدوجہد کی۔ امریکا جیسے ملک میں پہنچ کر ان لوگوں نے سخت محنت کی حتیٰ کہ فاقے تک کیے۔ میں ایسے لوگوں کو سلام کرتا ہوں۔

بہر حال امریکا میں بھی جاپان اور یورپ کی طرح غیر ملکیوں کی آمد پر سخت قوانین بنائے جاتے رہے ہیں اور دن بدن ان کی سختیوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ امریکا ایک دور دراز کا ملک ہے لیکن اس میں اس قدر کشش ہے کہ ان تمام باتوں کے باوجود سب سے زیادہ ہمارے ایشیائی اور افریقی وہاں جاتے رہتے ہیں۔ ساتھ ہی وہاں کے آخری برسوں اور ستر کے عشرے کی ابتدا میں وہاں ایشیائی لوگوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ ہر طرف ہسپانوی (Spanish) بولنے والے نظر آتے تھے۔ ظاہر ہے USA کے قریب میکسیکو، گوئے مالا، نکاراگوا جیسے وسطی امریکا کے ملک واقع ہیں اور اس کے علاوہ برازیل، کولمبیا، چلی، ایکواڈور جیسے جنوبی امریکا کے ملک ہیں جہاں اسپینش اور پرتگالی زبان بولی جاتی ہے۔

ہسپانوی اور پرتگالی زبانیں خاصی ملتی جلتی ہیں۔ جس طرح ہمارے ہاں سرائیکی اور پنجابی زبانیں ایک دوسرے سے مماثلت رکھتی ہیں اور کوئی اجنبی اور غیر ملکی ان میں تفریق نہیں کر سکتا۔

آج ہمارے برصغیر کے لوگ تعداد میں ان اتنی بولنے والوں کے تقریباً برابر ہیں۔ امریکا کے چھوٹے بڑے شہروں میں انڈین اور پاکستانی موجود ہیں۔ جگہ جگہ ان کی دکانیں نظر آتی ہیں جہاں حلال گوشت کے ساتھ ساتھ آپ کو ہر قسم کے مسالا جات، گز، پننے، پودینے کی ٹکیاں، احمد کا اچار، ہلدی، باجرہ، املی، مندروں میں رکھا جانے والا پرساد، جائے نماز اور ہاتھ روم کے لیے لوٹا تک مل سکتا ہے۔

”پہلے اس کی قیمت تو معلوم کرلو۔“ میں نے کہا تھا۔ ظاہر ہے ماضی میں صرف تین چار صفحات کے اخبار کی قیمت کافی زیادہ تھی۔ جبکہ وہ کئی صفحات پر مشتمل رنگین چھپائی والا اخبار تھا لہذا مناسب قیمت ہونے کی صورت میں ہی اسے خریدا جاسکتا تھا۔ دوسری صورت میں ٹی وی اور کیبل نیٹ ورک، انٹرنیٹ کے ذریعے مفت میں خبریں دیکھی اور پڑھی جاسکتی ہیں۔ اس کے علاوہ SANA (سندھ ایسوسی ایشن آف نارٹھ امریکا) کے SANA List خطوط سے بھی اپنے ملک کا احوال معلوم ہو سکتا ہے۔

”یہ تمام اخبارات مفت کے ہیں۔“ سمیر نے بتایا۔

”یعنی ان کی کوئی قیمت نہیں۔“

”لیکن ان میں سے کسی پر دو ڈالر اور کسی پر تین ڈالر قیمت درج ہے۔“ میں نے ایک اخبار اٹھاتے ہوئے کہا۔

”قیمت ضرور لکھی ہے لیکن آپس کی مٹا بقت کے سبب ہر اخبار مفت میں تقسیم کیا جاتا ہے۔“

میں سمجھ گیا تھا، ہر اخبار کو اس قدر اشتہارات ملتے تھے کہ اخبار کو مفت میں تقسیم کرتے ہوئے بھی مالکان کو نقصان نہیں ہوتا تھا۔ میں نے چھ مختلف اخبارات کی ایک ایک کاپی اٹھالی۔ یہی منظر میں نے دوسری دہائیوں میں بھی دیکھا۔ چند انگریزی اخبار یہاں کی اسلامی تنظیموں اور ہندو ایسوسی ایشنز کی جانب سے شائع ہوتے ہیں۔ کچھ انگریزی اخبار یہاں کی علاقائی خبروں کے لیے مخصوص ہیں جو تقریباً ہر علاقے سے شائع ہوتے ہیں۔ ان میں علاقائی خبروں کے علاوہ مقامی دکانوں، وہاں لگنے والی سیل (Sale) پلانوں اور گاڑیوں کی خرید و فروخت کے اشتہار شائع ہوتے ہیں۔ ہر اخبار کو اشتہارات سے ہی اس قدر آمدنی ہو جاتی ہے کہ لوگوں تک اخبار پہنچانے کے لیے انہیں دکان داروں کی منتیں کرنی پڑتی ہیں کہ وہ اپنی دکان پر اخبار رکھیں تاکہ ان کے گاہک مفت میں ہی سہی، اخبارات اپنے ساتھ لے جائیں۔ بعض اخبارات کے امیر مالکان، خاص طور پر کیونٹی نیوز پیپر والے اپنا اخبار گھروں تک بھی پہنچاتے ہیں۔ بہر حال مجھ جیسے فارغ شخص کے لیے ان مفت کے اخبارات کا مطالعہ کرنا خاصا دلچسپ مشغلہ تھا اور تین چار ماہ تک یہ مشغلہ جاری رہا۔ میں جب بھی خریداری کے لیے بازار جاتا، تازہ اخبارات کی کئی کاپیاں اٹھاتا۔

میں اپنے بھانجوں سمیر اور ضمیر کے ساتھ ایک ایسی ہی دکان میں داخل ہوا تھا۔ وہ دونوں جب تک گوشت خرید کر فارغ ہوتے، تب میں دکان کے دروازے کے قریب رکھے ہوئے اردو اور انگریزی اخبارات کے مختلف بنڈل دیکھنے لگا۔ میں ایک اردو اخبار اٹھا کر اس کے صفحات پلٹا رہا۔ تقریباً بیس صفحات کا اخبار تھا۔ پاکستانی اور انڈین خبروں کے علاوہ اس اخبار میں اپنے ہم وطنوں کے امریکا میں انجام دینے والے ”کارنامے“ بھی اہتمام سے شائع کیے گئے تھے۔ ہر صفحے پر کافی اشتہارات تھے۔

ان ایام میں امریکا میں مقیم پاکستانی ہمارے جہاز پر آکر مہینہ بھر پرانے جنگ اخبار اور ڈان اٹھا کر لے جاتے تھے اور انہیں بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ اگر کوئی اخبار جہاز پر رہ جاتا تھا تو واپسی کے سفر میں ہم اسے کئی کئی بار پڑھتے تھے۔ خبروں، کالم اور اشتہارات سمیت ایک ایک سطر پڑھی جاتی تھی۔ کوئی امیر شخص پاکستان سے ڈاک کے ذریعے اخبار منگواتا تھا۔ گو کہ وہ اخبارات باقی اتریں وہاں پہنچتے تھے۔ اس کے باوجود مالکوں کے ہاتھ میں ہفتے بعد ہی آتے تھے۔ اس پر خاصے اخراجات صرف ہوتے تھے۔ انٹرنیٹ اور کیبل نیٹ ورک کا تو ان دنوں تصور ہی نہیں تھا۔

اسی (80) کی دہائی کی ابتدا میں ہم نے سنا کہ جنگ والوں نے جنگ اخبار کی اشاعت کراچی اور لاہور کے علاوہ لندن اور نیویارک سے بھی شروع کر دی ہے۔ جب میں ملائیشیا میں تھا تو نیویارک سے آنے والا میرا ایک دوست جنگ اخبار کے دو پرچے بھی لایا تھا۔ ہر اخبار شخص چار صفحات پر مشتمل تھا۔ اس کی قیمت بھی خاصی تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اخبار کے خریدار کم تھے، اشتہارات نہیں ملتے تھے، وغیرہ۔

اور اب میں 35 برس بعد امریکا آیا ہوں تو یہاں کا منظر ہی مختلف نظر آتا ہے۔ امریکا کے بڑے شہروں کے علاوہ چھوٹے شہروں اور قصبوں میں بھی برصغیر کے لوگ نظر آتے ہیں۔ حلال گوشت کے لیے کسی یہودی کی شاپ تلاش کرنے کے بجائے دیسی بازار سے مرغ مسالے کی دکانوں کے ساتھ حلال گوشت کی دکانیں بھی نظر آتی ہیں۔ جہاں کمرے، گائے اور مرغی کے گوشت کے ساتھ ساتھ بٹی، پالے اور سری وغیرہ بھی فروخت ہوتی ہیں۔ یہ چیزیں مقامی لوگ کھانا پسند نہیں کرتے۔

میں اپنے بھانجوں سمیر اور ضمیر کے ساتھ ایک ایسی ہی دکان میں داخل ہوا تھا۔ وہ دونوں جب تک گوشت خرید کر فارغ ہوتے، تب میں دکان کے دروازے کے قریب رکھے ہوئے اردو اور انگریزی اخبارات کے مختلف بنڈل دیکھنے لگا۔ میں ایک اردو اخبار اٹھا کر اس کے صفحات پلٹا رہا۔ تقریباً بیس صفحات کا اخبار تھا۔ پاکستانی اور انڈین خبروں کے علاوہ اس اخبار میں اپنے ہم وطنوں کے امریکا میں انجام دینے والے ”کارنامے“ بھی اہتمام سے شائع کیے گئے تھے۔ ہر صفحے پر کافی اشتہارات تھے۔

وہاں سے روانہ ہوتے ہوئے سمیر نے پوچھا تھا ”ماموں جان! اخبار اٹھا لیں؟“

Scan & PDF FIAZ AHMED Friends Korner.com

سراب

راوی : شہباز ملک

تحریر : کاشف زبیر

55:16



وہ پیدائشی مہم جو تھا۔ بلند ویلا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری نہیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکار سی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحرے میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب۔ ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے دھن و دل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر اسودگی اور اطمینان چھپیں لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندمی ایک تہلکہ خیز کہانی

بابا کا اصرار تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج بھیج دیا جائے تاکہ میں بھی اپنے بھائیوں کی طرح آری جو ان کرسکوں جبکہ میں آری میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ میرے انکار کو انہوں نے انا کا مسئلہ بنالیا۔ وہ بہت مشکل دور تھا۔ اس دور میں میرے لیے واحد اچھی یا دوسرا ہے جو میرے دل کا حصہ تھی لیکن اس سے پہلے کہ میں اس کے لیے ماں جی کے سامنے دست سوال دراز کرتا وہ میرے بھائی کا مقدر بنادی گئی اور میں ہمیشہ کے لیے غولی سے نکل آیا۔ یہاں سے زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ تعلیم مکمل کر کے میں نے کاروبار شروع کیا۔ سفیر، مونا اور ندیم جیسے دوست ملے اور زندگی ایک ڈھب سے گزرنے لگی لیکن ایک روز مری سے واپس آتے ہوئے ایک معمولی سے حادثے نے میری زندگی کا رخ بدل دیا۔ تاور علی کا اپنے اہواش دوستوں سمیت ہم سے ٹکرا ہوا گیا تھا پھر یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ دشمنی اور درپردہ کی ایک سلسلہ شروع ہوا جو دراز ہوتا چلا گیا۔ کچھ کم طرف گھٹیا لوگوں نے مجھ سے یہ پرسکون زندگی بھی چھین لی۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شاہ جیسے لوگ میرے دشمن ہو رہے تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وہم جیسے جاں نثار دوست بھی تھے۔ راجا امر دراز جیسا ذہین اور با اثر میرا مہربان بن گیا تھا اور اس کے بعد ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا جس کی کڑیاں سرحد پار کر کے دور تک پھیلی گئی تھیں۔ میں قسمت کے ہاتھ میں کھلونا بن گیا اور قسمت مجھے کسی مندرجہ ذیل ہندوستانی لہری کی طرح اپنے دوش پر لیے پھرتی رہی۔ میں دوبارہ اپنے وطن لوٹا تو فتح خان سے ٹکرا ہوا گیا۔ اس کے آدمیوں کو شکست دے کر میں اندرون ملک کی طرف بڑھ رہا تھا کہ فتح خان نے دوبارہ مجھے گھیرنے کی کوشش کی۔ میں اپنے ساتھی جیتو کے ساتھ ایک دوست کے یہاں پہنچا تو وہاں فتح خان پہلے سے موجود تھا۔ اس نے مجھے بے ہوش کر دیا۔ جب آنکھ کھلی تو میں اپنے آبائی گھر میں تھا۔ میری بھانجی جی اپنے دو بھائیوں جبار جی جی اس کی کار پر فارنگ ہوئی۔ فارنگ سے اس کا معیتر بری طرح ڈھچی ہو گیا۔ میں نے عبداللہ کے ساتھیوں کو قہقہے کی حفاظت کے لیے بلایا تھا۔ انہیں رفتی بھائی کے ساتھ کر دیا تھا کہ وہ گھر کی حفاظت بھی کرتے رہیں پھر میں جیب لے کر نکل پڑا۔ میں اسلام آباد آیا۔ عبداللہ نے بتایا کہ شہلا رخصتی کی گیلری سے کوئی کوہر ہاتھ جسے اندر والوں نے پکڑ لیا۔ مجھے شک ہوا کہ وہ جیتو ہے۔ میں شہلا رخصتی کے جنگلے میں داخل ہو گیا۔ جیتو ہاں موجود تھا۔ فتح خان کو بے ہوش کر کے میں ساتھ لے آیا۔ اسے اور جیتو کو عبداللہ کے حوالے کیا اور ہسپتال کے لیے نکل پڑا۔ قہقہے کے کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ ایک لمبے بالوں والا شخص قہقہے کے آئینوں میں ایک کو کھول رہا ہے۔ میں نے لکھا تو وہ کھڑکی سے کود کر بھاگا۔ اس کے پیچھے میں بھی کود گیا مگر وہ نہ ملا پھر میں اپنی کار میں بیٹھا ہی تھا کہ پیچھے سے گردن پر ہتھول کی ٹال آگئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا، وہی شخص تھا جس کے تعاقب میں میں کھڑکی سے کود تھا۔ وہ مجھے گرفتار کر کے مرشد کے پاس لے گیا۔ کئی دن کے بعد میں اس کی قید سے فرار ہوا۔ میرے ساتھ زرین نامی وہ مظلوم لڑکی بھی تھی جس کی عمرانی میں مجھے رکھا گیا تھا۔ راستے میں عبداللہ سے رابطہ کر کے گاڑی منگوائی اور صاحب کے جنگلے پر پہنچ گیا۔ زرین کا علاج کر دیا پھر ایک روز ہم سب قہقہے کو اسپتال سے لانے پہنچے تاکہ اس کا علاج حکیم قانوس سے کرائیں۔ جب اسے لے کر آ رہے تھے تو راستے میں دشمنوں نے اسے اغوا کر لیا۔ اسے فتح خان کے حوض رہا کر لیا۔ حکیم قانوس اس کا علاج کرنے لگا۔ زرین نے فرمائش کر دی کہ میں یہاں بند رہ کر خود کو قیدی محسوس کر رہی ہوں۔ میں اسے لے کر میر کے لیے نکلا تھا کہ دشمنوں نے گھیر لیا۔ ان سے بچتے بچاتے ہم نکلے تو راستہ تنگ کر ایک ایسے علاقے میں پہنچ گئے جو مری وغیرہ کی طرف جاتا تھا۔ ہماری گاڑی بھی خراب ہو گئی۔ ایک ڈاکٹر نے آبادی تک پہنچانے کا وعدہ کر لیا۔ ہم اس کے ساتھ اس کے جنگلے پر پہنچے تو احساس ہوا کہ ہم قید ہو چکے ہیں۔ زرین کی طبیعت بھی خراب ہو گئی تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ ڈاکٹر نے ہم پر ایک خطرناک وائرس کا تجربہ کیا ہے۔ زرین کا تجربہ ہو گیا۔ ڈاکٹر کی آواز مانیک سے آ رہی تھی کہ اب تمہارا نمبر ہے۔ تمہی ڈیوڈ شاہ گیا۔ وہ ڈاکٹر کا فنانسر تھا۔ اس نے مجھے رہا کر لیا اور کہا کہ اگر تم مجھے پراسرار وادی تک پہنچاؤ تو میں مرشد سے بھی گھوڑا سی کرادوں گا۔ اس نے مرشد کو بلایا۔ وہ شاہ کے کہنے پر مخالفت پر آمادہ ہو گیا مگر اس کی آنکھوں میں نفرت تھی۔ اس کے جانے کے بعد شانے مجھے اپنے ایک آدمی کے ساتھ کر دیا کہ وہ مجھے شہر بھجوا دے مگر راستے میں ہی اس کی نیت بدل گئی۔ وہ دروازہ کھول کر بیچے کودا۔ وہ ہتھول سے فائر کرتا کہ ایک ہولنا سا پکا۔ وہ ایک کتا تھا جس نے مارشل کے ہتھول والے ہاتھ پر منہ مارا تھا۔ براؤن نامی وہ کتا مونا کا تھا۔ سفیر وغیرہ اس کی مدد سے مجھ تک پہنچے تھے۔ ان کی مدد سے ہی شہر آ گیا۔ وہ سب ایران کے راستے پاکستان پہنچے تھے، پہلے ہم اس جنگلے میں پہنچے جہاں وہ لوگ ٹھہرے ہوئے تھے پھر اسلحہ وغیرہ بیچانے کا انتظام کیا اور مونا و سادھنا کو عبداللہ والے جنگلے پر پہنچانے کا انتظام کیا پھر شہلا کی تلاش میں نکلے۔ اس نے بتایا کہ اس سے ہوش میں آ کر ملوں۔ میں اس سے ملنے پہنچا تھا بانیک کھڑکی کر رہا تھا کہ کتا کی چھین محسوس ہوئی اور آواز آئی "ادھر سے چلو اس سے پہلے کہ یہ چل جائے۔" یہ آواز فتح خان کی تھی۔ وہ مجھے نزدیکی پارک میں لایا اور بولا کہ میں دشمنی ختم کر رہا ہوں۔ تمہیں ایمین کو پاکستان بلانا ہوگا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ ایمین کو قبضے میں کر کے اس کے باپ سے ہیروں کے متعلق معلومات چاہتا ہے۔ اتنا کہہ کر وہ پارک سے نکل گیا۔ میں گھر آیا تو پتا چلا کہ میرے دوست شہلا کو اغوا کر لائے ہیں۔ اسے کمرے میں بند کر رکھا ہے۔ تمہی مجھے عبداللہ کے ذریعے معلوم ہوا کہ راجا صاحب نے مجھ اپنے محل میں بلایا ہے۔ میں نکلی کا پتہ سے وہاں پہنچا تو پتا چلا کہ راجا صاحب کو کینسر ہو گیا ہے۔ وہ پھر بھی پراسرار وادی کی طرف جانا چاہتے تھے۔ جب میں انڈیا میں تھا تو وہ ایک بار جانے کی کوشش کر چکے تھے، راستے میں انہیں ڈیوڈ شاہ بھی ملا تھا مگر برف والے نے انہیں واپس کر دیا کہ ہاتھ والے کو لے کر آؤ۔ (اب آگے پڑھیں)

ایک لمحے کو مجھے لگا کہ ڈیوڈ شاہ کے ہاتھ نے بوڑھے برف والے کو تنگ راستے سے نیچے لا متناہی خلا میں ڈھیل دیا ہے اور وہ نیچے گرنا چلا جا رہا ہے۔ لیکن نہیں.... ایسا نہیں ہوا تھا۔ جو ہوا وہ میری تو کیا ڈیوڈ شاہ کی سمجھ میں بھی نہیں آیا تھا۔ ڈیوڈ شاہ کا ہاتھ بوڑھے کے وجود سے یوں گزر گیا جیسے وہ گوشت پوست کا نہیں بلکہ دھوئیں سے بنا انسان ہو۔ ڈیوڈ شاہ نے یقیناً اسے دھکا دینے کے لیے اپنی پوری قوت استعمال کی تھی اور اب یہی قوت اس کے خلاف چلی گئی تھی۔ اس کا جسم غیر متوازن ہوا۔ بوڑھا اس دوران میں ذرا آگے چلا گیا تھا اور ڈیوڈ شاہ راستے کے بالکل کنارے کھڑا ہو گیا تھا۔ میں دم بہ خود کھڑا تھا اور میرا خیال تھا کہ ڈیوڈ شاہ کافایت محل کا شکار ہونے والا ہے۔ توازن مسلسل بگڑ رہا تھا اور صاف لگ رہا تھا پاؤں پر کھڑا رہنے کی کوشش نامکام رہے گی۔ نیچے سوائے خلا کے کچھ نہیں تھا اور یہ یقینی موت کا خلا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ ڈیوڈ شاہ اس خلا میں جاتا اچانک بوڑھا مڑا اور اس نے ڈیوڈ شاہ کا ہاتھ تھام کر اسے آگے کھینچ لیا اور ایک سیکنڈ میں اس کا وجود گرنے کے خطرے سے نکل آیا تھا۔ یہ سب مشکل سے چار یا پانچ سیکنڈ میں ہوا تھا۔

جب ڈیوڈ شاہ نے بوڑھے کو راستے سے نیچے گرانے کی کوشش کی اور پھر نامکام ہونے کے بعد خود گرنے والا تھا۔ پھر بوڑھے نے اسے بچا لیا اور یہ سب چند سیکنڈ میں ہوا لیکن مجھے لگا جیسے میں نے کتنا طویل اور تفصیلی واقعہ دیکھا ہو۔ مزے کی بات تھی کہ بوڑھے نے ایسا کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا جس سے پتا چلے کہ وہ ڈیوڈ شاہ کی حرکت سے واقف ہو گیا تھا۔ اس نے صرف اتنا کہا۔ "سنبھل کر.... راستہ خطرناک ہے۔" کہہ کر بوڑھا دوبارہ چل پڑا۔

میں حیرت کے جنگلے سے سنبھلا اور ڈیوڈ شاہ کے پاس سے گزرتا ہوا بوڑھے کے پیچھے جانے لگا۔ بادل ناخواست ڈیوڈ شاہ بھی ہمارے پیچھے آیا تھا۔ وہ سہم گیا تھا یا کوئی اور بات تھی اس کے بعد اس نے مجھ سے یا بوڑھے سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ بلکہ ہم میں سے کسی نے بات نہیں کی تھی۔ سفر خاموشی سے طے ہوا اور کوئی دو گھنٹے بعد ہم وادی سے باہر آ چکے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق ہم نے تیزی سے سفر کیا تھا حالانکہ چڑھائی بہت دشوار تھی۔ نصف صدی پہلے جب میں اس راستے سے گزرا تھا تب یہ اتنا دشوار نہیں تھا۔ اب اس کی حالت مزید خراب ہو گئی تھی۔ اتنی آسانی سے سفر کرنے کا مطلب تھا کہ ہماری جسمانی حالت بہت بہتر ہوئی تھی۔ جب

ہم اوپر پہنچے تو دن نکل آیا تھا اور ہم نے گرم لباس پہنا دیا تھا۔ اس کے باوجود سردی سے بُرا حال تھا۔ درجہ حرارت اس درجے منفی سے نیچے ہی تھا اور اس سردی میں بوڑھا "مدولی لباس میں سکون سے کھڑا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "راستہ تمہیں یاد ہے موسم بھی بہتر ہوگا۔ بس چوتھے اور پانچویں دن معمولی طوفان آئیں گے۔ تم آرام سے واپس پہنچ جاؤ گے۔ اس کے بعد تم اسے لے کر واپس آؤ گے۔"

"میں کوشش کروں گا۔" میں نے کہا۔ اس کا اشارہ یقیناً تمہاری طرف ہے شہباز ملک۔ "ضرور کرو لیکن ہلدی کرو، کیونکہ تمہارے پاس وقت کم رہ گیا ہے۔" بوڑھے نے کہا اور پھر ڈیوڈ شاہ کی طرف دیکھا۔ "اس بار تم کامیاب نہیں ہو سکتے لیکن ایک وقت آئے گا جب تم کامیاب رہو گے۔ جب تم اپنی دنیا میں پہنچ جاؤ گے تو تمہیں جسمانی سزا ملے گی۔ اسے ٹھیک کرنے کی کوشش مت کرنا وہ اپنے وقت پر خود ٹھیک ہو جائے گی۔"

ڈیوڈ شاہ کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ بوڑھا اچانک مڑا اور نیچے جانے والے راستے کی دراڑ میں غائب ہو گیا۔ ڈیوڈ شاہ کچھ دیر کھڑا رہا پھر اس کے پیچھے لپکا۔ میں نے عقب سے اسے آواز دی۔ "ڈیوڈ بیکار ہے راستہ پھر نہیں ملے گا واپس آ جاؤ۔"

اس نے میری بات نظر انداز کی اور دراڑ میں غائب ہو گیا۔ کوئی دس منٹ بعد وہ واپس آیا تو اس کے چہرے پر مایوسی تھی۔ اس نے اپنا تھیلا لپکے لپکے اور اس پر بیٹھ گیا۔ وہ دہلی زبان میں گالیاں دے رہا تھا۔ مجھے خیال آیا اور میں نے تھیلا کھول کر دیکھا تو اس میں دیہاتی اُبلّا ہوا گوشت بھرا ہوا تھا جیسا کہ برف والے بوڑھے نے ہمیں کھلایا تھا۔ یہ ہماری کل رسد تھی۔ میں نے ڈیوڈ شاہ کی طرف دیکھا۔ "میرا خیال ہے تمہاری سلی ہو گئی ہے اس لیے اب چلتے ہیں۔"

ڈیوڈ شاہ کی دشمنی حالت کسی قدر خراب تھی اس نے بگڑے انداز میں کہا۔ "تم نے دیکھا میں نے اس بوڑھے کو دھکا دیا لیکن میرا ہاتھ اسے نہیں چھو سکا تھا۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں میرا ہاتھ اس کے جسم سے یوں گزر گیا جیسے اس کا جسم ہوا سے بنا ہو۔"

"میں نے دیکھا تھا اور پھر تم نیچے گرنے والے تھے۔ اس نے ایک بار پھر تمہاری زندگی بچا لی۔" میں نے سرد

لجے میں کہا۔ ”لیکن تمہارے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔“
”تبدیلی آنے کی بھی نہیں۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔ ”بات
فطرت کی ہے ہر آدمی اپنی فطرت پر چلتا ہے۔“

میں نے اور اس نے اپنے تھیلے شانوں پر لا دیے۔
ان دونوں تھیلوں میں تقریباً دس دس کلو گرام گوشت تھا اور
بوڑھے نے ٹھیک کہا تھا یہ ہمارے دس دن کی خوراک کے
لیے کافی تھا۔ میری غڑی میں دن کے گیارہ بجے کا وقت تھا
اور سردیوں میں یہاں شاید چار بجے ہی سورج غروب ہو
جاتا ہے۔ اس سے پہلے پہلے ہمیں جتنا ممکن ہوتا سفر کر لینا
تھا۔ اس لیے ہم فوراً روانہ ہو گئے۔ کئی گھنٹے چڑھائی کے
باوجود ہم تازہ دم تھے۔ اس سارا دن ہم سفر کرتے رہے اور
جب آسمان تاریک ہو گیا تو ایک ڈھلان کے ساتھ برف کھود
کر ہم نے غار بنایا اور اس میں گھس کر لیٹ گئے۔ تقریباً جھا
ہوا گوشت چبا کر اپنی بھوک کا دباؤ ادا کیا۔ سردی کی شدت سے
تھکن کے باوجود نیند نہیں آرہی تھی میں نے ڈیوڈشا سے کہا۔
”تمہیں اندازہ ہے بوڑھے نے تم سے کیا کہا تھا؟“
”ہاں اس نے کہا تھا کہ میں ابھی اسے ٹل کرنے میں
کامیاب نہیں ہوا ہوں لیکن ایک وقت آنے کا جب میں
کامیاب رہوں گا۔“

میں نے بے یقینی سے کہا۔ ”بوڑھے نے یہ کیا تھا؟“
”تو اس کی بات کا اور کیا مطلب ہو سکتا ہے بچے ڈیوڈ
شا بولا۔“ اگر یہ بات درست ہے تو مجھے بہت خوشی ہوگی کہ وہ
بوڑھا میرے ہاتھ سے مارا جائے گا۔“

میں ڈیوڈشا کی لاف گزاف سن رہا تھا اور مجھے بالکل
یقین نہیں آ رہا تھا کہ برف والا بوڑھا جو اتنی طاقتوں کا مالک
تھا ڈیوڈشا کے ہاتھوں مارا جائے گا۔ ”میرا خیال ہے اس نے
واڈی میں اترنے کے بارے میں کہا تھا۔“

”نہیں اس نے اس بارے میں نہیں کہا تھا۔“ ڈیوڈشا
کا لہجہ عجیب سا ہو گیا۔ ”اس نے اپنے مرنے کے بارے میں
کہا تھا اور نہ جانے کیوں مجھے لگتا ہے کہ میں واڈی میں نہیں اتر
سکوں گا۔“

غار کے سوراخ سے ہلکی سی روشنی جھلک رہی تھی لیکن ہم
ایک دوسرے کو دیکھنے سے قاصر تھے۔ میں اس کے تاثرات
نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ”تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے؟“

”بس لگتا ہے، ہم جیسے لوگوں کی پٹھلی جس تیز ہوتی
ہے۔“

”جب تمہیں لگتا ہے کہ تم واڈی میں نہیں اتر سکو گے تو

تم اس کی کوشش کیوں کر رہے ہو؟“
”کیونکہ میں کوشش کا قائل ہوں۔ تم کہہ سکتے ہو کہ
میں عملی آدمی ہوں۔“

مجھے وہ عملی سے زیادہ ضدی اور اتنا پرست شخص لگا تھا جو
اپنی ضد بہر صورت پوری کر کے رہتا ہے۔ میں نے اس سے
بحث نہیں کی تھی۔ رات کی وقت ہمیں نیند آگئی تھی۔ اگلے تین
دن ہم آرام سے سفر کرتے رہے تھے۔ سردی کی شدت سے
ایک فائدہ یہ بھی ہوا تھا کہ برف جم کر سخت ہو گئی تھی اور اس پر
سفر کرنا آسان تھا۔ موسم صاف رہا اور صرف دو دن معمولی سا
برفانی طوفان آیا تھا جس کی پیش گوئی برف والے بوڑھے
نے پہلے ہی کر دی تھی۔ سفر کے نویں دن ہم ہمالیہ کی برفانی پی
سے نکل آئے تھے اور مزید ایک دن کے سفر کے بعد ہم پہلی
انسانی بستی تک پہنچے تھے اس وقت ہماری خوراک تقریباً ختم
ہونے والی تھی اگر ایک دن مزید ہمیں کوئی آبادی نہ ملتی تو ہم
فاقہ کرنے پر مجبور ہو جاتے۔ اس سفر کے دوران اگرچہ ہم
ساتھ ساتھ رہے اور بعض مشکلات سے بھی ایک ساتھ
گزرے لیکن یقین کرو ہمارے اندر موجود فاصلے میں ذرا بھی
کی نہیں آئی تھی۔ مجھے ڈیوڈشا سے ویسی ہی نفرت محسوس ہو
رہی تھی اور مجھے یقین ہے کچھ ایسے ہی احساسات اس کے دل
میں بھی میرے لیے موجود ہوں گے۔

یہ گاؤں ایک شہر یا قبیلے کا تھا اور انہوں نے ہماری بہت
خدمت اور مدد کی۔ دو دن ہم ان کے مہمان رہے اور پھر
انہوں نے گھوڑوں اور ایک گائیڈ کے ساتھ ہمیں روانہ کیا۔
پہلی شہری آبادی آتے ہی ڈیوڈشا ہم سے الگ ہو گیا اور میں
نے رانا ویاس کو کال کی۔ اس کے آدمی جو ہمالیہ کے پاس
میری پارٹی کا انتظار کر رہے تھے وہ آئے اور مجھے رانا ویاس
کے پاس لے گئے کیونکہ ہم اس جگہ نہیں آئے تھے جہاں سے
روانہ ہوئے تھے۔ رانا ویاس کے پاس پہنچ کر مجھے تم سب کے
بارے میں پتا چلا کہ تم چلے گئے ہو۔ رانا ویاس تمہاری مدد کرنا
چاہتا تھا لیکن اسے ہر بار تمہارے بارے میں ذرا تاخیر سے
علم ہوتا اور اس دوران میں یہ بات بھی کھل گئی تھی کہ بھارتی
حکومت کو مطلوب تم اور تمہارے ساتھی رانا ویاس کے پاس
رہے تھے اس پر انکو انری شروع ہو گئی۔“

”اوہ....“ میں نے کہا۔ ”وہ خاصی مشکل میں پڑ گئے
ہوں گے؟“

”نہیں وہ سیاست داں ہے اور پھر حکومت میں شامل
بھی ہے اس لیے اس کا بال بھی بیکا نہیں ہوا۔ ویسے بھی بنگال

کی حکومت سے دلی والے بھی دبتے ہیں۔ اس لیے جب تک
میری واپسی ہوتی رانا ویاس معاملے کو دبا چکا تھا۔ اب یوں
کچھ لوگ بھارتی حکومت کے پاس تمہاری فائل تو ہے لیکن
اوہ نہیں ہے۔ کیونکہ رفتہ رفتہ ان قبائلیوں کے بارے میں
ثقافتی ساجھے آ رہے ہیں جن کو بھارتی سرکار نے صرف
ہیردوں کی کان پر قبضے کے لیے ان کے علاقے سے نکال دیا
اور ان میں سے بہت ساروں کو فوج سے مروا دیا۔ اس لیے
معاملے کو دبانے میں عافیت بھی گئی۔“

”ان سارے واقعات کا میں چشم دید گواہ ہوں
بھارتی فوج جدید ترین ہتھیاروں اور فضائی قوت کی مدد سے
ان نبتے اور محصور قبائلیوں کے خلاف کارروائی کر رہی تھی۔
مارے جانے والے ہزاروں افراد میں بہت بڑی تعداد
مورتوں، بوڑھوں اور بچوں کی تھی۔“

”مارے جانے والے بے چارے فحشی ذات کے
لوگ تھے اس لیے ان کی کہیں شنوائی نہیں ہوئی۔“ راجا عمر
دراز نے سر ہلایا۔

مجھے خیال آیا۔ برف والے بوڑھے نے ڈیوڈشا کی
حرکت پر اسے عتاب کی نوید سنائی تھی اور ایمین نے مجھے بتایا
تھا کہ ڈیوڈشا کے ہاتھ کے ساتھ کوئی مسئلہ ہوا ہے۔ ”راجا
صاحب پچھلے دنوں ڈیوڈشا کا ایک ہاتھ کہنی تک آبلوں سے
بھر گیا تھا لیکن جب وہ مجھے ملا تو بالکل ٹھیک تھا کہیں یہ اسی
برف والے بوڑھے کو دھکا دینے کی سزا تو نہیں....؟ اس نے
اسی ہاتھ سے بوڑھے کو نیچے دھکا دینے کی کوشش کی تھی۔“

”شاید۔“ راجا عمر دراز نے سر ہلایا۔ ”بوڑھے نے کہا
تھا کہ سزا کچھ وقت کے بعد خود بخود ختم ہو جائے گی ڈیوڈشا
اس کا علاج کرانے کی کوشش نہ کرے۔“

”اس نے ہدایت پر عمل کیا اور اب اس کا ہاتھ بالکل
ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ وقت خاصا ہو گیا تھا اور پھر راجا عمر
دراز کی دووا کی اور نیند کا وقت آ گیا تھا۔ اس لیے میں نے اسے
”شورہ دیا۔“ راجا صاحب اب آپ آرام کریں۔“

”شہباز.... تم نے جواب نہیں دیا۔“ وہ پُر امید لہجے
میں بولا۔

”راجا صاحب یہ معاملہ اتنا آسان نہیں.... مجھے
اپنے ساتھیوں سے بھی پوچھنا ہوگا۔ موٹا، سفیر اور ویم دینی
سے آگئے ہیں۔ مرشد ایک بار پھر ہمارے درپے ہے اور میں
اسے فری ہینڈ نہیں دے سکتا کہ وہ میرے پیاروں اور میرے
گروالوں کے خلاف جو چاہے کرے لیکن میں آپ کو یقین

دریائے سندھ یوں تو خاموشی سے بہا جا رہا ہے
لیکن اگر اس کے منہ میں زبان ہوتی تو یہ رات دن
تاریخ کی داستانیں سنایا کرتا۔ یہ بتایا کرتا کہ کیسے
کیسے لشکروں نے اسے پار کیا۔ کیسی کیسی فوجیں اس
کے کنارے آپس میں ٹکرائیں اور کب کب اس کا
پانی سرخ ہوا۔

دریائے سندھ کے دو کناروں پر دو مقامات
ایسے ہیں جو میں خاص طور پر دیکھنا چاہتا تھا۔ پشاور کی
جانب ہند اور راولپنڈی کی طرف حضرد۔

شمال سے جو لشکر ہندوستان آیا کرتے تھے ان
کے گھوڑے اسی ہنڈ کے مقام پر دریا میں اترتے
تھے اور احتیاط سے قدم اٹھاتے ہوئے اسی حضرد کے
قریب دوسرے کنارے پر چڑھتے تھے۔ یہی کنارہ
پچھم کہلاتا ہے۔ میں اسی پچھم کو دیکھنے حضرد پہنچا۔

کہتے ہیں کہ 24 میل چوڑا اور بارہ میل لمبا یہ
علاقہ پیالے کی شکل کا اور پان کے پتے جیسا ہے۔ اس
کے تین کنارے اونچے اور چوتھا کنارہ نیچا ہے۔ بالکل
جیسے اپنی طرف دانے پھٹکنے کا چھانچا ہوتا ہے۔ پرانی
کتابوں میں لکھا ہے کہ پہلے اس علاقے کا نام چھانچ
تھا۔

حضرت علیؑ نے 327 سال پہلے سکندر اعظم
اسی پچھم کے گاؤں ملاح میں داخل ہوا تھا۔ اس ایک
ہزار کے دربار کا آئینہ مال اور گھوڑوں کی لڑائی
تھیں حضرد کے مقام پر ہولی اور سید احمد شہید نے بہتیں
سکھوں سے ٹکری تھی اور مولانا ظفر علی خاں کو یہیں حضرد
میں مجرم قرار دیتے ہوئے سزائے قید کا حکم سنایا گیا تھا۔
اقتباس: شیر دریا از رضا علی عابدی
تلاش: اعظم جمیل صدیقی

دلاتا ہوں اگر ذرا سی بھی مختاش نکلے تو میں آپ کے ساتھ ضرور
چلوں گا لیکن ابھی آپ کو کوئی واضح جواب نہیں دے سکتا۔
اس کے لیے میں آپ سے معذرت چاہوں گا۔“

راجا عمر دراز نے اپنا سر نیچے پر رکھ لیا۔ ”میں جانتا
ہوں بیٹے تم جو کہتے ہو وہ کرتے ہو، ٹھیک ہے میں انتظار
کروں گا اور دعا کروں گا کہ خدا تمہارے تمام مسائل حل

کر دے۔

”مجھے آپ کی دعاؤں کی ضرورت بھی ہے راجا صاحب۔“ میں نے جواب دیا۔ ”آپ کا عملی تعاون تو مجھے ویسے ہی میسر ہے۔“

”ریاست سے باہر میرے تمام امور کا نگران اب عبداللہ ہے اور میں نے اسے مکمل آزادی دے رکھی ہے کہ وہ تمہارا ساتھ جس طرح چاہے دے، میں جانتا ہوں وہ تمہارا جانشین ہے لیکن میری ملازمت کی وجہ سے کہیں مجبور ہو جاتا ہے۔ بہر حال اب تم اس سے جس طرح چاہے کام لے سکتے ہو۔“

”میں اس کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں اور عبداللہ واقعی میرا مخلص ساتھی ہے۔ میں اسے وسیم یا بیتو سے کم نہیں سمجھتا ہوں۔ اس وقت بھی میری ساتھی خواتین عبداللہ کی کوششیں میں ہیں۔“

راجا عمر دراز کچھ سوچ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ ”مرشد اس وقت جس آمر کے بل پر آکر رہا ہے اس کا وقت بھی قریب آ گیا ہے اور نئی حکومت آتے ہی وہ اپنی اوقات پر آجائے گا۔ میرا مشورہ ہے اس وقت تک اس سے دور رہنے کی کوشش کرو۔“

”میں نے بھی اس سے اُلٹنے کی کوشش نہیں کی لیکن بات اب میرے گھر والوں اور رشتے داروں تک آچکی ہے اس لیے میں اسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔“

راجا عمر دراز نے سر ہلایا۔ ”میں سمجھتا ہوں، وہ گھٹیا قسم کا شخص ہے۔“

”وہ ان دنوں فرعون بنا ہوا ہے، آپ سوچ سکتے ہیں کہ اس نے ڈیوڈ شا کی ضمانت کو بھی جوتے کی نوک پر رکھ دیا۔“

”وہ اسی قسم کا آدمی ہے اور جب اسے ڈیوڈ شا کا سامنا کرنا پڑے گا تو وہ اس کے قدموں میں لوٹنے سے گریز نہیں کرے گا۔“

”آپ کا کیا خیال ہے ڈیوڈ شا اسے معاف کر دے گا؟“

”اگر ڈیوڈ شا کا مفاد اس میں ہوگا تو وہ اسے ضرور معاف کر دے گا ورنہ اسے دوسروں کے لیے نمونہ عبرت بنا دے گا۔ وہ بھی مرشد سے کچھ خاص مختلف نہیں۔۔۔ صرف بننا ہے۔“

میں راجا عمر دراز کے تجزیے سے متفق تھا۔ مرشد اور

ڈیوڈ شا میں فرق صرف محل کا تھا ورنہ ڈیوڈ شا اندر سے مرشد سے کچھ خاص مختلف نہیں تھا۔ میں کچھ دیر راجا عمر دراز سے بات کرتا رہا پھر وہاں سے اٹھ گیا۔ باہر حکیم قانوس اور نو عمر خادمہ منتظر تھے۔ حکیم قانوس نے اتنی دیر کرنے پر مجھے گھورا اور کمرے میں چلا گیا۔ نو عمر خادمہ مسکرائی اور اشارے سے مجھے اپنے ساتھ آنے کو کہا۔ اس کے نقوش کسی قدر چینی تھے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ وہ بہت دل کش اور تروتازہ حسن کی مالک تھی۔ قد بوٹا سا تھا اور مخصوص طرز کے مقامی لباس میں بھی اس کی جسمانی دل کشی نمایاں تھی۔ اس کی چال اس دل کشی کو مزید نمایاں کر رہی تھی۔ وہ یقیناً مجھے مہمان خانے تک لے جا رہی تھی۔ راجا عمر دراز کے محل کا پرنٹو کوئل تبدیل کر دیا گیا تھا اب باہر کا کوئی فرد چاہے وہ میرے جیسا قریبی آدمی کیوں نہ ہو اکیلے محل میں داخل و حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ خاص طور سے اس حصے میں جہاں راجا عمر دراز کی رہائش تھی۔ پہلے یہ جگہ مہمان خانے سے ملی ہوئی تھی لیکن اب اسے بند کر دیا گیا تھا اور محل میں آمد و رفت ایک سرنگ سے ممکن تھی جس پر ہم وقت پہرہ رہتا تھا۔ پہرہ دار نے نو عمر خادمہ کی طرف دیکھا تو اس نے شاید اسے سیکرٹری بیک کی طرح کوئی اشارہ کیا اور اس نے بنا کسی مزاحمت کے ہمیں جانے دیا۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ لڑکی صرف خادمہ نہیں تھی بلکہ اسے اور بھی کچھ اختیارات حاصل تھے اور وہ مجرم راز بھی تھی۔ اب مجھے خیال آیا کہ وہ اتنی کم سن بھی نہیں تھی جتنی اپنے نازک ہاتھ پاؤں اور معصومانہ نقوش سے لگتی تھی۔

مہمان خانے میں داخل ہونے کے بعد میں خود اپنے کمرے کی طرف جانے لگا اور میرا خیال تھا کہ وہ واپس چلی جائے گی لیکن وہ میرے ساتھ رہی اور جب میں کمرے میں داخل ہوا تو وہ بھی پیچھے سے آگئی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ نشیے انداز میں مسکرائی اور صاف اردو میں بولی۔ ”میں آپ کی خادمہ ہوں اور آپ کی خدمت کے لیے آئی ہوں۔“

میں دنگ رہ گیا تھا۔ راجا عمر دراز ایک ذرا مختلف قسم کا شخص تھا۔ میرا خیال تھا اس کی جاگیر اس قسم کی لعنتوں سے پاک ہوگی جو ہمارے جاگیردار طبقے میں عام پائی جاتی ہیں اور ان میں ایک وہ کثیرین بھی ہیں جو نہ صرف جاگیرداروں اور ان کے اہل خانہ کی جسمانی ضرورتوں کو پوری کرتی ہیں بلکہ ان کے مہمانوں کی دل بستگی کا سامان بھی کرتی ہیں۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ راجا عمر دراز کے محل میں بھی اس قسم کی

خادما نہیں پائی جاتی ہوں گی۔ میں نے غور سے اسے دیکھا تو وہ نہ جانے کیا سمجھی اور اس نے اپنی بھاری چادر اتار دی۔ اس کے نیچے اس نے مقامی طرز کا لیکن بہت ہلکا سا اور چست لباس پہن رکھا تھا جو اس کی بدنی دل کشی کو نمایاں کر رہا تھا۔ خاص طور سے وسیع گریبان دائروں تک پہنچ رہا تھا۔

”تم میری کیا خدمت کر سکتی ہو؟“ میں نے پوچھا۔ اس کی آنکھوں اور چہرے سے شوخی جھلکنے لگی۔ چند لمحے پہلے والی معصومیت کہیں غائب ہو گئی تھی۔ اس نے کوچ دار نیچے میں کہا۔ ”جو آپ چاہیں۔ میں آپ کے پاؤں اور جسم دبا سکتی ہوں ماش کر سکتی ہوں۔ میں ماش بہت اچھی۔۔۔ کرتی ہوں اور جو آپ چاہیں۔“

”مجھے ایسی کسی خدمت کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے کہا اور بستر کے کنارے بیٹھ کر جوتوں کے فیتے کھولنے لگا تو وہ جلدی سے آگے آئی اور خود فیتے کھولنے لگی۔ میں نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ ”اس کی ضرورت نہیں ہے اب تم جا سکتی ہو۔“

لیکن اس نے میری بات سنی ہی نہیں تھی اس کے بجائے اس نے فیتے کھولے اور پھر جوتے اتارے، موزے اتارے اور اپنی نرم و نازک انگلیوں سے میرے پاؤں سہلانے لگی۔ میں اسے کسی قدر رنجی سے منع کرنے جا رہا تھا لیکن اس کی انگلیوں نے ایسا سرور دیا کہ میں رک گیا۔ وہ ہدایت مہارت سے انگلیاں اور پاؤں دبا اور سہلا رہی تھی۔ اس کی انگلیوں سے جیسے خفیف سی برقی رد عمل رہی تھی۔ پھر اس کے ہاتھ پنڈلیوں کی طرف بڑھتے تو میں چوک گیا۔ وہ بہت قریب آگئی تھی۔ میں نے اسے روک دیا۔

”بس اتنا کافی ہے اب تم جاؤ۔“ میں نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے چہرے پر مایوسی دکھائی دی تھی۔

”کیا میں آپ کو اچھی نہیں لگی؟“

”تم اچھی ہو لیکن میں اچھی چیزوں کو دور سے دیکھنے کا قائل ہوں۔“ میں نے پاؤں سمیٹ لیے تو وہ کھڑی ہو گئی۔

”ایک بات بتاؤ کیا تمہیں راجا صاحب یا بیک صاحب کی طرف سے کوئی حکم ملا ہے؟“

”نہیں جناب۔“ اس نے نظریں جھکا کر کہا۔ ”میں خود آپ کے پاس آئی ہوں۔“

”اس سے پہلے تم محل میں آنے والے کتنے مہمانوں کی خدمت میں اس طرح آچکی ہو؟“

میرے سوال پر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور احتجاجی انداز میں کہا۔ ”آپ غلط سمجھ رہے ہیں ایسی لڑکی نہیں ہوں، آپ مجھے اچھے لگے اس لیے آپ کے پاس آئی ہوں۔“

مجھے اس کی بات کا بالکل یقین نہیں آیا تھا۔ کوئی بھی شریف لڑکی یا عورت کسی غیر مرد کے کمرے میں رات کے اس وقت آکر ہر طرح کی خدمت کی پیش کش نہیں کرتی ہے اور نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ وہ جس کے معاملے میں تا تجربے کا تجربہ نہیں تھی۔ بہر حال مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں تھا کہ وہ تجربے کا تجربی یا نا تجربے کا تجربہ۔ میں اسے نظر انداز کر کے بستر پر دراز ہو گیا اور ہلکا کمبل سینے تک اوڑھ لیا۔ باہر شدید سردی تھی لیکن اندر اس کا اثر نہ ہونے کے برابر تھا بل یوں سمجھ لیں کہ پتا چل رہا تھا موسم سرد ہے اور رات گزارنے کے لیے یہ کمبل بھی کافی تھا۔ وہ کچھ دیر کھڑی رہی پھر اس نے ایک جھٹکے سے اپنی چادر اٹھائی اور اسے اوڑھتے ہوئے باہر کی طرف بڑھ گئی البتہ دروازہ اس نے بے آواز بند کیا تھا۔ میں نے دیکھا تھا کہ یہاں ملازم اور دوسرے لوگ بے آواز طریقے سے چلتے تھے اور چیزوں کو بھی اسی طرح استعمال کرتے تھے کہ کوئی غیر ضروری اور نمایاں کرنے والی آواز پیدا نہ ہو۔ ملازمہ کے جانے کے بعد میں کسی قدر بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ اسے نظر انداز کر کے میں بولنے کی کوشش کر لے گا۔ کچھ دیر بعد اپنی اس کوشش میں کامیاب رہا تھا۔ لیکن رات کی وقت اچانک میری آنکھ مل گئی۔ انداز دے ہی میری آنکھیں اس کے سر پر جم گئیں۔ میں نے اس کی آنکھیں بند کر دیں۔ میں نے غلطی کی تھی کہ وہ دیکھا تو ام پر غور کر گیا۔ کمرے میں خادمہ موجود تھی اور وہ اس حال میں تھی کہ اس کے جسم پر لباس کے نام پر ایک تار نہیں تھا اور اس کا شالاب چاندنی جیسا جسم جگہ جگہ کھربچوں اور لہو کی سرخی سے سجا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی کی وحشت اور زندگی کا شکار ہو کر میرے کمرے میں آئی ہو۔ اس کے چہرے پر بھی وحشت تھی۔

وہ دونوں ہاتھ پشت پر رکھے اور تن کر کھڑی تھی۔ اس کا یہ پوز نہایت قاتلانہ تھا لیکن فی الحال وہ کسی مشکل میں گرفتار نظر آرہی تھی۔ میں اٹھنے کا سوچ رہا تھا کہ اس کا اپنی پشت پر موجود بایاں ہاتھ سامنے آیا اور میں اس میں وہ سب دیکھ کر چوک گیا جو میرے کمرے میں ایک طرف آرائش کے طور پر لگا تھا۔ یہ یقیناً قدیم نوا اور تھا اور اس وقت خادمہ کے

ہاتھ میں تھا۔ اس نے پاس آکر ہاتھ بڑھا کر میرے سینے سے کھیل بٹا دیا۔ اس کے قاتلانہ عزائم پہلے سے اس کے چہرے پر نظر آ رہے تھے۔ لیکن میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کیا کرتی ہے۔ اس نے خنجر والا ہاتھ بلند کیا اور تیزی سے میرے سینے پر وار کیا کہ میں یہ مشکل ہی بروقت اس کا ہاتھ روک سکا تھا۔ سینکڑے دسویں حصے کی تاخیر میری ساری خوش فہمی ہمیشہ کے لیے دور کرنے کا باعث بن سکتی تھی جو میں اسے اتاری اور کمزور جان کر کر رہا تھا۔ جیسے ہی میں نے اس کا ہاتھ تھما وہ کسی شیرنی کی طرح غرائی اور اس کے جسم نے ٹل کھایا۔ اس حرکت کی وجہ اس وقت میری سمجھ میں آئی جب دوسرا ہاتھ جو بدستور پشت پر تھا اچانک گھوم کر سامنے آیا اور اس میں دبے خنجر کی نوک میری گردن کی طرف لپک رہی تھی۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کا ہاتھ تھما تھا کیونکہ اس وار کے پیچھے اس کا وزن بھی تھا اور یہ وزن اچھا خاصا تھا۔ اگر میں ایک ہاتھ چھوڑتا تو وہ خنجر میرے سینے میں نہ بھی اتارتی تب بھی مجھے زخمی کر سکتی تھی۔ اگر میں اس کا دوسرا ہاتھ نہ روکتا تو لازمی مارا جاتا کیونکہ سینے کی نسبت گردن پر کیا جانے والا وار زیادہ مہلک ہوتا ہے۔

اب میرے پاس ایک ہی راستہ تھا میں اسے لے کر بائیں طرف گھوما۔ وہ میرے دائیں طرف تھی اور میں نے اسے بائیں طرف اٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن اس نے میری حرکت بھانپ لی اور اپنا وزن یک دم مجھ پر گرایا اس کی کوشش تھی کہ مجھ سے اتنے پاس رہے کہ خنجر سے مجھے نقصان پہنچا سکے اور میری کوشش تھی کہ میں اسے اتنا دور کر دوں کہ وہ خنجر سے کوئی مہلک وار نہ کر سکے۔ میری حرکت کی وجہ سے ہم دونوں ہی جزوی طور پر کامیاب رہے، میں اسے دور کرنے میں کامیاب رہا اور اس نے دائیں ہاتھ والا خنجر میرے بائیں بازو پر مارا۔ میں نے یہ مشکل وار بچایا اور تڑپ کر اسے دور اچھال دیا یہ کام یوں آسان ہوا کہ وہ مجھ پر سوار تھی۔ وہ اچھلی اور بستر سے نیچے جا گری۔

اس کے گرتے ہی میں تیزی سے حرکت میں آیا اور اپنی طرف سے بستر سے نیچے اتر آیا۔ اس دوران میں وہ دوبارہ کھڑی ہو کر میری طرف چبھتی تھی۔ اس کا انداز نہایت وحشیانہ اور ڈرانے والا تھا۔ لگ ہی نہیں رہا تھا یہ وہی حسین اور معصوم نظر آنے والی لڑکی ہے جسے دیکھ کر کسی مرد کے دل کی دھڑکن تو تیز ہو سکتی تھی لیکن اسے دیکھ کر موت کا خیال نہیں آتا تھا۔ اس وقت وہ سر پاپا موت بنی ہوئی تھی اور میرے ذہن

میں اگر کہیں اس کی جسمانی دل کشی کا خیال تھا تو وہ اب غائب ہو چکا تھا اور میں اس سے نمٹنے کے لیے پوری طرح مستعد تھا۔ جیسے ہی وہ پاس آئی اور اس نے مہارت سے خنجر لہرا کر مجھے معزوب کرنے کی کوشش کی میں یک دم سلب ہوا اور پاؤں اس کے پیروں پر مارا۔ وہ ٹکڑا کر بڑی طرح گر گئی اور اس کا ایک خنجر خود اس کی ران میں اتر گیا۔ زخم زیادہ گہرا نہیں تھا لیکن اس کے لیے بہت تھا۔ میں نے عقب سے لات مار کر دوسرے ہاتھ کا خنجر اڑا دیا۔

اپنا ہی خون دیکھ کر اس کی وحشت ختم ہو گئی تھی اور اس کی جگہ خوف نے لے لی تھی۔ وہ رو رہی تھی اور چیخ رہی تھی۔ شاید اس کی چیخ باہر پہنچی تھی کیونکہ فوراً ہی دھڑام سے دروازہ کھلا اور مجھے ایک اجنبی مرد نظر آیا۔ اس نے محل کے محافظوں والا لباس پہن رکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں خود کار رائل گن تھی پہلے میں سمجھا کہ وہ میری مدد کے لیے آیا ہے۔ میں فرش سے اٹھنے والا تھا کہ میں نے رائل گن کا رخ اپنی طرف ہوتے دیکھا اور میں دوبارہ فرش پر گرنا۔ اس سے پہلے وہ رائل گن کا رخ میری طرف کرتا میں نے خادمہ کو عقب سے پکڑ کر اپنے اوپر کھینچ لیا اور اس کی ران میں اتر کر خنجر کھینچ کر اس کی گردن سے لگا دیا۔ زخم کھا کر اس کی مزاحمت دم توڑ گئی تھی۔ میں نے اونچا آواز میں کہا۔ ”خنجر دار۔۔۔ اگر کوئی چلائی تو پہلے میرے کی۔“

خادمہ نے چلا کر مقامی زبان میں کچھ کہا تو محافظ تذبذب میں نظر آنے لگا۔ خادمہ نے یقیناً اس سے جان بچانے کو کہا تھا اور اس کا مطلب تھا کہ وہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ خادمہ مسلسل کچھ کہہ رہی تھی۔ یہ زبان میری سمجھ سے باہر تھی اس لیے میں نے اس کا منہ دبا دیا اور محافظ سے کہا۔ ”تم اردو یا پشتو سمجھتے ہو؟“ یہ جملہ میں نے اردو اور پشتو دونوں زبانوں میں کہا تو اس نے سر ہلایا اور پشتو میں بولا۔

”اسے چھوڑ دو تم نے اس کی ساتھ زیادتی کی ہے۔“

”کو اس۔۔۔ میں سو رہا تھا اس نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی ہے اور تم اس کے ساتھ ہو۔“ میں نے خنجر خادمہ کی گردن میں ذرا سا چھبھوایا تو خون نکل آیا تھا۔ وہ تڑپتی تھی لیکن میری گرفت سے نہیں نکل سکتی تھی۔ منہ دبا ہونے کی وجہ سے چیخ بھی نہیں سکتی تھی۔ ”فوراً محل کے دوسرے محافظوں اور بیگ کو بلاؤ۔“

محافظ کے چہرے پر تذبذب کے آثار نظر آئے۔ خادمہ اس کے لیے اہم تھی۔ لیکن اس کی اپنی ذات اور

کے لیے اہم تر تھی۔ اگر وہ اسے بچانے کے چکر میں پڑتا تو اور مارا جاتا۔ وقت بھی نہیں تھا کیونکہ یہاں ہونے والے شور و ہنگامے کی آوازیں کہیں اور بھی سنی جاسکتی تھیں۔ دوسرے محافظ آجاتے تو وہ پکڑا جاتا۔ اس لیے اس نے اچانک فیملہ لہا اور رائل گن کا رخ ہماری طرف کر دیا۔ وہ میرے ساتھ خادمہ کو بھی قتل کرنے جا رہا تھا۔ میں غور سے اسے دیکھ رہا تھا اس لیے جیسے ہی وہ حرکت میں آیا اس سے پہلے میں بھی حرکت میں آ گیا اور میں نے خادمہ کو اس کی طرف اچھال دیا۔ ساتھ ہی میں رول ہوا اور اس جگہ سے ہٹ گیا جہاں ایک لمحے پہلے تھا۔ محافظ نے جسے اب قاتل کہنا زیادہ بہتر تھا برست مارا تھا اور خادمہ تو ہوا میں پھلتی ہو گئی تھی۔ وہ زمین پر گری تو لاش کے سوا کچھ نہیں تھی۔ کچھ گولیاں اس سے نچ کر قالین پر اس جگہ لگیں جہاں ایک لمحے پہلے میں تھا۔ خادمہ کی لاش نے ایک لمحے کو قاتل کی توجہ اپنی طرف کرائی تھی اور میں نے اسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے خنجر پھینک کر مارا۔

لیکن میں ماہر خنجر باز نہیں تھا جو میرا خنجر سیدھا اس کے سینے یا گردن میں اتر جاتا جیسا کہ فلموں میں دکھایا جاتا ہے۔ خنجر دستے کی طرف سے اس کے شانے سے ٹکرایا اور نیچے گر گیا۔ ظاہر ہے اسے کچھ نہیں ہوا تھا لیکن وہ خنجر سے بچنے کے لیے غیر شعوری طور پر جھکا اور اس کی توجہ چند لمحے کو میری طرف سے ہٹ گئی تھی۔ میں نے اس کا فائدہ اٹھایا اور اس بار دیوار کے ساتھ لگے ریک سے پتھر کا ایک بھاری شوچیں اٹھا کر اسے دے مارا۔ شوچیں اس کے سینے پر لگا اور وہ ٹکڑا کر پھینچے ہٹ گیا تھا۔ میں نے زمین سے اٹھتے ہوئے اس کی طرف چھلانگ لگائی اور بروقت رائل گن کی نال تھامتے ہوئے اس پر جا کر اٹھا۔ رائل گن کی نال کا رخ اوپر کی طرف تھا اور اس نے ٹیکر دبا دیا تھا۔ برست چلا تو میری پھلتی میں جیسے آگ لگ گئی تھی کیونکہ فائر سے نال دھکنے لگتی ہے۔ لیکن میں نے نال نہیں چھوڑی کیونکہ وہ نیچے سے اسے گھما کر میری طرف کرنے کی انتہائی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے سرک کر ذرا جگہ ہٹائی اور سر کی ٹکر اس کے منہ پر رسید کی۔ اس نے ہلہلا کر اپنی زبان میں کچھ فرمایا جو یقیناً میرے جھوٹے تھا۔ دوسری ٹکر نے اس کے کس نل نکال دیے تھے اور تیسری ٹکر نے اسے عارضی طور پر بے ہوش کر دیا۔ میں نے ہانپتے ہوئے پیچھے ہٹ کر پہلے رائل گن اس کے قبضے سے لی اور اس کی تلاشی لی۔ اس کے پاس سوائے ایک اور میگزین کے کچھ نہیں تھا۔ یہ جدید ترین اس کے سینوٹی فور رائل گن تھی۔

میں اسے چھوڑ کر پیچھے ہٹا اور پھر خادمہ کو دیکھا۔ اسے سینے اور پیٹ میں کم سے کم نصف درجن گولیاں لگی تھیں اور وہ فوراً ہی مر گئی تھی۔ میری سمجھ میں یہ گورکھ دھند نہیں آیا تھا۔ وہ اس حالت میں میرے کمرے میں کیا کر رہی تھی جبکہ اس کا لباس اس کے جسم پر نہیں تھا اور ایسا لگ رہا تھا وہ کسی کی درندگی کا شکار ہوئی ہو۔ پھر اس نے جس انتقامی انداز میں مجھے مارنے کی کوشش کی اس سے مجھے لگا کہ دال میں بہت کچھ کالا ہے۔ یہ گارڈ بھی اس کے ساتھ ملا ہوا تھا اور بالآخر وہ اسی کے ہاتھوں مار دی گئی تھی۔ اچانک میں چونکا اور میں نے اٹھ کر ہلدی سے اندر سے دروازہ بند کر لیا کیونکہ مجھے باہر کچھ افراد کے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ زیادہ لوگ اس منظر کو دیکھیں۔ دروازہ پر دستک ہوئی اور کسی نے پوچھا۔

”شہباز صاحب آپ ٹھیک ہیں؟“

”میں ٹھیک ہوں۔“ میں نے بلند آواز سے جواب دیا۔ ”یہاں کچھ مسئلہ ہوا ہے کوئی فوری طور پر بیگ صاحب کو بلائے۔“

”ان کو اطلاع کر دی ہے وہ آرہے ہیں۔“ بولنے والے نے کہا اور پھر کچھ وقف کے بعد بولا۔ ”آپ دروازہ کھولیں جناب۔“

”نہیں جب تک بیگ صاحب نہیں آ جاتے میں دروازہ نہیں کھولوں گا۔ اور کوئی دروازے کے پاس بھی نہ آئے۔“ میں نے سخت لہجہ میں کہا۔ ”سب پیچھے ہٹ جائیں۔“

اس گفتگو کے دوران میں کمرے کا جائزہ بھی لے رہا تھا اور یہ انکشاف ہوا کہ خادمہ کے پیچھے اور تقریباً پچیسویں ہو جانے والے کپڑے کمرے میں مختلف جگہوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ اب سین کچھ ایسا لگ رہا تھا کہ رات میں نے خادمہ کو زبردستی کا نشانہ بنایا۔ جب میں نے اپنا مقصد حاصل کر لیا تو اس نے مجھے غافل پا کر کمرے میں دیوار پر لگے خنجر کو اتار کر ہلاک کر دیا۔ کیونکہ میرے پاس موقع تھا اس لیے میں نے کسی قدر ہنگامہ سے خادمہ کا مخصوص انداز میں جائزہ لیا تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ سچ کی زیادتی کا شکار ہوئی تھی۔ یہ کام اس کی مرضی سے ہوا یا مرضی کے بغیر لیکن ہوا ضرور تھا۔ میں نے بستر سے چادر کھینچ کر اس کے عریاں جسم پر ڈال دی۔ البتہ کمرے کی مزید کسی چیز کو ہاتھ لگانے سے گریز کیا تھا۔ حتیٰ کہ خادمہ کے کپڑے بھی وہیں پڑے رہنے دیے جہاں وہ پڑے

ہوئے تھے۔ کوئی دس منٹ بعد دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی اور مجھے بیک کی آواز سنائی دی۔

”شہباز صاحب میں بیک ہوں دروازہ کھولیں۔“

”بیک صاحب کیا آپ کے ساتھ دوسرے محافظ موجود ہیں؟“ میں نے احتیاطاً پوچھا۔

”ہاں موجود ہیں آپ دروازہ کھولیں فائرنگ کی آواز راجا صاحب نے بھی سنی ہے اور وہ اس بارے میں فکر مند ہیں۔“

میں نے راقول ایک طرف رکھ کر دروازہ ڈرا سا کھولا اور بیک صاحب سے کہا۔ ”ان لوگوں سے کہیں یہاں سے چلے جائیں اور صرف آپ اندر آئیں۔“

بیک نے مڑ کر وہاں موجود چار پانچ محافظوں سے کچھ کہا اور وہ چلے گئے۔ بیک اندر آیا تو میں نے دروازہ بند کر دیا۔ بیک رک گیا۔ اس نے چادر تلے خادمہ کی لاش اور بے ہوش گارڈ کو دیکھ لیا تھا جو آب ہوش میں آگیا تھا اور کھلا رہا تھا۔ بیک نے خادمہ کے پچھلے کپڑے بھی دیکھ لیے تھے۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ ”یہ سب کیا ہے شہباز صاحب؟“

میں نے شانے اچکائے۔ ”نئی بات تو یہ ہے کہ یہ سب میں نہیں سمجھ سکا ہوں لیکن ایک بات یقینی ہے۔ یہ لڑکی اور اس کا ساتھی مجھے ہر صورت ختم کرنا چاہتے تھے۔ اس کوشش میں لڑکی ماری گئی اور گارڈ کو میں نے قابو کر لیا اب یہ آپ کو ساری کہانی سنائے گا۔“

”ٹھیک ہے لیکن یہاں کیا ہوا ہے؟“

میں نے بیک کو بتایا کہ کس طرح میری آنکھ کھلی اور خادمہ کس حالت میں یہاں موجود تھی اور پھر اس نے سوتا سمجھ کر مجھے خجروں سے قتل کرنے کی کوشش کی لیکن اس میں ناکام رہی۔ اس دوران میں گارڈ بھی اندر گھس آیا تھا اور اس نے خادمہ سے جس طرح بات کی اس سے پتا چلتا تھا کہ وہ اس کا ساتھی ہے اور رہا سہا شک اس نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کر کے دور کر دیا۔ میں بچ گیا لیکن خادمہ ماری گئی اور مجھے گارڈ کو قابو کرنے کا موقع مل گیا۔ بیک غور سے سن رہا تھا اور گفتگو کے دوران اس نے چادر اٹھا کر خادمہ کی لاش کا معائنہ بھی کیا تھا۔ جیسے ہی میں نے بات مکمل کی وہ حرکت میں آگیا اس نے مجھے بازو سے پکڑا۔

”آپ میرے ساتھ آئیں۔“

”اس کا کیا کرنا ہے؟“ میں نے تقریباً ہوش میں

آجانے والے گارڈ کی طرف اشارہ کیا تو بیک نے اپنی جیب سے کوئی چیز نکالی اور گارڈ کی ناک سے لگائی۔ اس نے ایک جھٹکا لیا اور پھر بے ہوش ہو گیا۔ میں وہ چیز نہیں دیکھ سکا تھا کیونکہ بیک نے نہایت پھرتی سے اسے واپس جیب میں رکھ لیا تھا۔ اس نے پھر میرا بازو پکڑا اور مجھے باہر لاکر کمر بند کر دیا۔ اس نے ایک محافظ کو طلب کیا اور اسے مقامی زبان میں حکم دیا۔ پھر وہ مجھے لے کر راجا صاحب والے محل کی طرف روانہ ہو گیا اور سرنگ سے گزار کر وہ مجھے ایک کمرے میں لایا جو خواب گاہ لگ رہی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”آپ یہاں آرام کریں اس دوران میں میں معاملے کو دیکھتا ہوں۔“

”بیک صاحب میرا بانی فرما کر مجھے جلد از جلد آگام کریں کہ یہ کیا پتھر ہے۔ اگر میں کوئی عام آدمی ہوتا تو اس وقت کمرے میں میری لاش پڑی ہوتی۔ آخر اس لڑکی نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کیوں کی؟“

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا اور پھر اس نے کہا۔ ”آپ اطمینان رکھیں میں جلد از جلد آپ کو آگاہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن پہلے مجھے تو معاملات کو سمجھنے کا موقع دیں۔“

میں نے محسوس کیا کہ میں اعصاب زدہ ہو رہا تھا۔ میں نے گہری سانس لے کر خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کی اور بولا۔ ”ٹھیک ہے بیک صاحب آپ جا کر دیکھیں یہ کیا پتھر ہے؟“

بیک چلا گیا تو میں نے اندر سے دروازہ بند کیا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ مہمان خانے میں سوتے وقت میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ مجھے ”ہر قسم کی خدمت“ آفر کرنے والی آدمی رات کے بعد اس حالت میں مجھے قتل کرنے کی کوشش کرے گی۔ آخر اس کی مجھ سے کیا دشمنی تھی۔ میں پہلی بار اس سے ملا تھا اور مجھے نہیں یاد کہ اس علاقے میں فتح خان کے علاوہ بھی کوئی میرے خون کا پیاسا موجود تھا۔ اس واقعے نے مجھے پریشانی میں ڈال دیا تھا اور مجھے دوبارہ مشکل سے نیند آئی تھی۔ اگلی بار آنکھ کھلی تو کوئی دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے بیک کھڑا ہوا تھا اس کا حلیہ اور آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ رات بھر جاگتا رہا ہے۔ اس وقت صبح کے چھ بج رہے تھے۔ اس نے کہا۔

”شہباز صاحب جلدی سے تیار ہو کر آجائیں۔“

”ایک منٹ میں منہ دھو لوں۔“ میں نے کہا اور اندر آگیا۔ واش روم یہاں بھی ساتھ تھا۔ میں نے گرم پانی سے منہ ہاتھ دھویا، بالوں میں کنکھی کی اور جوتے پہن کر بیک کے

اس آگیا۔ ”میں تیار ہوں۔“

بیک مجھے لے کر روانہ ہوا اور کچھ دیر بعد ہم محل کے اس درخانے میں تھے جو شاید راجا عمر دراز نے خاص کاموں کے لیے مخصوص کر رکھا تھا اور اس میں ایک کام اس کے فرسوں کو قید رکھنا یا ان کو سزا دینا بھی تھا۔ میرا اندازہ درست لگا جب بیک مجھے قید خانے والے حصے میں لایا۔ وہاں ایک گہرائی سے سرد تار بیک اور خوف ناک نظر آنے والے کمرے میں وہ گارڈ زنجیروں سے ہاتھوں کے بل لٹکا ہوا تھا جس نے خادمہ کو ہلاک کیا تھا اور وہ اس سازش میں اس کا ساتھی بھی تھا۔ اس کے ہاتھ کڑوں سے بندھے تھے اور وہ تقریباً قضا میں جمبول رہا تھا۔ مجھے یہ کمرایا تھا کیونکہ یہیں میں ایک بار تعذیب سے گزر چکا تھا جب راجا عمر دراز کے جلاوٹ نے میری پشت کی کھال اتار دی تھی اور اگر حکیم قاضی جیسا باکمال طبیب نہ ہوتا تو آج بھی میری پشت کی کھال تڑی مڑی اور خستہ حال ہوتی لیکن اس کی دواؤں میں نہ جانے کیا جادو تھا کہ اب میری پشت کی کھال بالکل ہموار اور بے داغ ہے۔

اس وقت وہاں ایک دیو قامت جلاوٹ موجود تھا اور یہ وہ جلاوٹ نہیں تھا جس نے میری کھال اتاری تھی۔ وہ فتح خان کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ یہ اس کی جگہ آیا ہوگا۔ گارڈ کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ اذیت کے دور سے گزر چکا ہے۔ بیک نے جلاوٹ سے مقامی زبان میں کچھ پوچھا اور جواب میں اس نے ایک طرف رکھی بالٹی سے مگا بھر پانی گارڈ کی پشت پر ڈال دیا اور وہ ذبح کیے جانے والے بکرے کی طرح ڈکرانے لگا۔ پھر وہ سبک سبک کر کچھ کہنے لگا۔ زبان مقامی تھی اس لیے میری سمجھ سے باہر تھی۔ میں انتظار کر رہا تھا کہ بیک اس سے بات مکمل کر لے تو مجھے بتائے۔ بیک اس سے سوال بھی کرتا جا رہا تھا اور وہ جواب دے رہا تھا۔ اس کی جرات نہیں تھی کہ جواب دینے سے انکار کرے کیونکہ جلاوٹ اتنے کڑے تیوروں کے ساتھ اسے گھور رہا تھا جیسے اسے موقع ملے تو وہ گارڈ کے ہارے جسم کی کھال اتار کر ٹیک مرچ لگا دے۔ اس نے ہنر سے اس کی پشت ادبیر دی تھی۔ بیک کا انٹرویو کوئی میں منت ہا رہی رہا اور مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ ساری باتیں ایک گھوٹے سے ریکارڈ میں ریکارڈ کرتا جا رہا تھا۔ انٹرویو ختم کر کے بیک نے جلاوٹ کو کچھ ہدایات دیں تو وہ مایوس نظر آنے لگا۔ شاید بیک نے گارڈ پر مزید تشدد سے روک دیا تھا پھر اس نے مجھ سے کہا۔

”آئیے جناب میرے ساتھ، میں راجا صاحب کو رپورٹ دینے جا رہا ہوں آپ بھی سن لیجئے گا۔“

مجھے یقین تھا کہ اس کی ہدایت راجا عمر دراز نے دی ہوگی۔۔۔ ورنہ بیک کو بلا جبر درازداری کا مرض لاحق تھا اور وہ بھی راجا عمر دراز کو میرے سامنے رپورٹ نہ دیتا۔ کچھ دیر بعد ہم ایک بڑی نشست گاہ میں راجا عمر دراز کے سامنے تھے اس نے مجھ سے حال احوال دریافت کیا اور میں نے اس کی مزاج پرسی کی۔ ویسے وہ کل کے مقابلے میں کہیں بہتر نظر آ رہا تھا ورنہ وہ اپنی خواب گاہ کے بجائے یہاں نہ ہوتا۔ بیک نے اس کا اشارہ پاتے ہی کہنا شروع کیا۔ ”راجا صاحب، کل رات والے واقعے کے بارے میں پکڑے جانے والے گارڈ نے انکشاف کیا ہے کہ درز بینہ شہباز صاحب سے انتقام لینا چاہتی تھی۔“

میں اور راجا عمر دراز چونک گئے میں نے کہا۔ ”کس بات کا انتقام؟ میں تو اسے جانتا تک نہیں ہوں۔“

”آپ کو یاد ہوگا محل کی ایک خادمہ کو فتح خان نے جھوٹ بول کر اپنے جال میں پھنسا لیا تھا اور اسے باور کرایا تھا کہ اس کے باپ کو اصل میں راجا صاحب نے ذاتی انتقام کے لیے مروا دیا ہے۔ اس نے فتح خان کے ساتھ مل کر سازش کی اور اس وجہ سے محل میں بہت تباہی پھیلی تھی، کئی لوگ مارے گئے۔ ان کے قصاص میں اس خادمہ کو سزا دے موت سنائی گئی تھی۔ روزینہ اسی خادمہ گل زمین کی چھوٹی بہن ہے۔ اس نے اپنی خالہ کے گھر پرورش پائی اور اس لیے جب یہ یہاں ملازمت کے لیے آئی تو معلوم نہیں ہوا کہ یہ گل زمین کی بہن ہے اور اسے گل میں ملازمہ رکھ لیا گیا۔ یہ انتظار میں تھی کہ شہباز صاحب آئیں تو یہ اپنا انتقام لے سکے کیونکہ وہ اپنی بہن کی موت کا ذمے دار شہباز صاحب کو سمجھتی تھی۔“

میں نے گہری سانس لی۔ ”ایک تو لوگ نہ جانے کیوں مجھے مختلف باتوں اور واقعات کا ذمے دار سمجھ لیتے ہیں۔“

بیک نے بات جاری رکھی۔ ”اس نے منصوبہ پہلے ہی بنالیا تھا اور اس گارڈ کو ساتھ ملا لیا تھا۔ اس نے بخت خان کو چارہ ڈالا کہ وہ شہباز صاحب سے انتقام لینے کے بعد اس سے شادی کر لے گی۔“

”اس نے شہباز سے انتقام لینا تھا تو اس کے لیے اتنا پیچیدہ طریقہ اختیار کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“ راجا عمر دراز نے سوال کیا۔

”اپنی جان بچانے کے لیے اس نے یہ ڈراما تیار کیا۔ اگر وہ شہباز صاحب کو مارنے میں کامیاب ہو جاتی تو ان پر اپنی عزت لوٹنے کا الزام لگاتی اور آپ جانتے ہیں ہمارے قانون میں عورت اپنی عزت کے مجرم کو قتل کر سکتی ہے اسے کوئی سزا نہیں ہوتی۔ اس طرح وہ بچ جاتی۔“

”لیکن اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔“ میں نے کہا۔

”بیک نے سر ہلایا۔“ گارڈ نے اس کا بھی اقرار کیا ہے۔ روزینہ کے مجبور کرنے پر اس نے نہ صرف اس کے ساتھ زیادتی کی بلکہ اسے جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا تاکہ آپ کا مبینہ جرم یقین کیا جاسکے۔ لیکن آپ کی خوش قسمتی کہ آپ کی بروقت آنکھ کھل گئی۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”ورنہ آپ روزینہ کی بات مان کر مجھے ہی مجرم سمجھتے رہتے۔“

”نہیں وہ بے وقوف عورت تھی جو سمجھتی تھی کہ ہمیں بے وقوف بنانے کی اس کا طبیعی معائنہ ہوتا اور آپ کا بھی ہوتا تو سب کھل کر سامنے آ جاتا۔ انتقام نے اسے اندھا کر دیا تھا اور وہ شاید اپنی جان کی قیمت پر بھی آپ کو مارنے کی کوشش کرتی۔“

”شکر ہے اللہ کا کہ اس نے ہمیں محفوظ رکھا۔“ راجا عمر دراز نے کیا۔

”جب تک میرا وقت نہیں آئے گا مجھے کوئی نہیں مار سکتا۔۔۔۔۔ اور جب وقت آ جائے گا تو مجھے کوئی بچا نہیں سکے گا۔“ میں نے کہا۔ ”وہ آپ لوگوں نے دیکھ لیا ہے کہ ہنگامے کس طرح میرا پیچھا کرتے ہیں۔“

راجا عمر دراز مسکرایا۔ ”ہاں شاید تمہارے وجود میں ہنگاموں کے لیے کوئی مقناطیس نصب ہے جو وہ تمہاری طرف کھینچے چلے آتے ہیں۔“

”ایک طرف کھڑکی سے پردہ سرکا ہوا تھا اور شیشے کے باہر صبح کی روشنی نمودار ہو رہی تھی۔ میں نے کہا۔“ اس سے پہلے یہاں مزید کوئی ہنگامہ رونما ہو مجھے یہاں سے رخصت ہو جانا چاہیے۔“

”بالکل جناب۔“ بیک نے میری بات کی تائید کی۔ ”نہ جانے محل کے ملازموں اور محافظوں میں کوئی اور بھی روزینہ کے ساتھ شامل نہ ہو، ابھی تمام ملازمین اور محافظوں کی چھان بین کرنا ہوگی۔“

کچھ دیر میں ہم ناشتے کی میز پر تھے جہاں ناشتے کے

لیے مخصوص بہترین لوازمات موجود تھے۔ رات والے واقعے کا اثر ذرا کم ہونے کے بعد میں معمول پر آ گیا تھا اور مجھے بھوک لگ رہی تھی اس لیے میں نے دل کھول کر تمام چیزوں سے استفادہ کیا۔ آخر میں خاص پلیٹ کی گرین فی نے ناشتے کا مزہ دو بالا کر دیا تھا۔ بیک حسب معمول دست بستہ موجود تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ گارڈ کے ساتھ کیا ہوگا؟ بیک نے بتایا۔

”اسے زنا کے جرم میں جرمے کے سامنے پیش کیا جائے گا اور اس کا اقرار جرم اسے سزا دلوانے کے لیے کافی ہے۔“

”کیا وہ جرمے کے سامنے بھی اپنے اقرار پر قائم رہے گا؟ وہ کہہ سکتا ہے کہ اسے تشدد کا نشانہ بنا کر اقرار جرم پر مجبور کیا گیا ہے۔“

”وہ انکار کر ہی نہیں سکتا۔“ بیک مسکرایا اور اپنے لہجے سے ایک عدد چھوٹا سا ڈیجیٹل وائس ریکارڈر نکال کر اسے آن کیا تو اسے بیک سے گارڈ کی آواز آنے لگی وہ اقرار جرم کر رہا تھا۔ یہ وہی بیان تھا جو اس نے بیک کے انٹرویو کے جواب میں دیا تھا۔ بیک نے اسے سزا دلوانے کا پورا ہندوستان کر رکھا تھا اور اگر یہ اقرار جرم نہ بھی ہوتا تو راجا عمر دراز کا جلاوطن ہونا ایک منٹ میں اس کی زبان سے اقرار کر دیا سکتا تھا۔ گارڈ کو سزا دلوانے کے لیے کسی جرمے کی ضرورت نہیں تھی لیکن راجا عمر دراز جیسے مقامی حاکم اس قسم کی نام نہاد عدالتوں سے اپنے من پسند فیصلے حاصل کرتے ہیں اور خود محفوظ رہتے ہیں۔ صرف یہیں نہیں بلکہ اس قسم کی عدالتیں اور ہنگامے تین پورے ملک میں پھیلی ہیں۔ اب تو میڈیا کے ذریعے ان نام نہاد عدالتوں کے کروت سانسے آنے لگے ہیں لیکن یہ ایک زمانے سے گاؤں دیہاتوں میں اپنے حاکموں کے من مانے فیصلوں پر اپنی مہر ثبت کرتی آئی ہیں۔

ناشتے کے بعد میں اور راجا عمر دراز باہر آئے جہاں محل کے اندر کسی حد تک برف صاف کر دی گئی تھی لیکن وہاں موجود سبزہ جل گیا تھا۔ پودوں کی شاخیں پتوں اور پھولوں سے عاری تھیں۔ راجا عمر دراز نے اپنے محل میں دنیا جہاں سے پھولدار پودے منگوا کر لگوائے تھے اور ان میں سے اکثر ایسے تھے جو میں نے کہیں نہیں دیکھے تھے۔ جب میں راجا کے محل کا باغ دیکھتا تو مجھے خیال آتا جب کبھی زندگی نے مجھے سکون کے لمحے بخشے اور میں نے اپنا گھر بسایا تو اس گھر میں ایسے ہی پھولوں والے پودے لگاؤں گا۔ ہماری حویلی میں بھی بہار

بڑا باغ ہے جس میں بے شمار پھولدار پودوں کے ساتھ پھولدار پودے بھی لگے تھے۔ لیکن راجا عمر دراز کے پاس تو نایاب پھول والے پودے تھے۔ میں پورا لباس پہنے ہوئے تھا اور راجا عمر دراز نے ایک اور کوٹ نمائندگی کی تھی جو فیس قسم کے اون سے بنی تھی اور اس پر ہاتھ سے خوب صورت کشیدہ کاری کی گئی تھی۔

پاکٹ فرائز ناشتا کر کے آ گیا تھا اور اس وقت پہلی کا پٹر کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ پرواز کے لیے ایندھن کی کمی اس نے محل سے پوری کر لی تھی۔ دس بجے اس نے مجھے پرواز کے لیے اوکے کا اشارہ کیا اس وقت میں اور راجا عمر دراز کئی دن بعد نکلنے والی بھرپور دھوپ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ہمارے درمیان مام موضوعات پر بات ہوئی تھی لیکن ہم نے وادی یا دوسرے مسائل پر بات نہیں کی تھی۔ شاید راجا عمر دراز نے اس معاملے میں تقدیر یا برف والے یوڑھے کی اس بات پر انحصار کر لیا تھا کہ میں ضرور اس کے ساتھ وادی کا سفر کروں گا۔ میں پاکٹ کا اشارہ دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور راجا عمر دراز سے کہا۔

”راجا صاحب اب مجھے اجازت دیں۔“

راجا عمر دراز بھی کھڑا ہو گیا۔ ”ٹھیک ہے شہباز ملک مجھے امید ہے تم جلد واپس آؤ گے اور ہم وادی کی طرف سفر کریں گے۔“

”اگر خدا نے چاہا تو ایسا ہی ہوگا۔“ میں نے جواب دیا اور اس سے ہاتھ ملایا۔ اس کا انداز گرم جوشی ہے ہوا تھا۔

”میرے بچے مجھے یقین ہے ایسا ہی ہوگا۔“

راجا عمر دراز سے مل کر میں پہلی کا پٹر کی طرف بڑھ گیا تھا۔ بیک نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاید اس نے مجھے الوداع کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ کمپن فرائز پاکٹ کی سیٹ پر بیٹھا کنٹرول پنل اور دیگر مینوں سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ جیسے ہی میں اپنی نشست پر آیا اس نے انجن اشارت کر دیا۔ میں نے راجا عمر دراز کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور اس نے جواباً ہاتھ ہلایا۔ اس کے ساتھ ہی پہلی کا پٹر ایک ہلکے سے جھٹکے سے اوپر اٹھ گیا۔ اس کے پڑوں سے نکلنے والی طوفانی ہواؤں سے آس پاس پڑی برف اڑ رہی تھی۔ ذرا سی دیر میں ہم اتنی بلندی پر چلے گئے کہ محل کی عمارتیں کھلونوں جیسی نظر آنے لگی تھیں۔ میں نے کمپن فرائز سے پہلی کا پٹر کے بارے میں پوچھا۔

”یہ اتنی آسانی سے کیسے اشارت ہو گیا؟“

”آسانی سے نہیں ہوتا ہے جناب میں نے انجن کو

ایک برسرے گرمائش دی تب کہیں جا کر یہ اشارت ہونے کے قابل ہوا۔“ اس نے جواب دیا۔ ہم ہیڈ فون اور مائک کی مدد سے بات کر رہے تھے کیونکہ دوسری صورت میں انجن کا شور اتنا تھا کہ خود ہمیں اپنی کئی بات سنائی نہ دیتی۔ کمپن فرائز کنٹرول والوں سے موسم اور دوسری رپورٹ لینے لگا۔ چند منٹ میں ہم راجا عمر دراز کی وادی سے دور نکل آئے تھے۔ اب کاغان کے پہاڑوں پر اڑ رہے تھے۔ چالیس منٹ بعد ہم اونچے پہاڑ عبور کرتے ہوئے مارگلہ کے پہاڑی سلسلے کے اوپر آ گئے تھے اور کوئی پون گھنٹے بعد پہلی کا پٹر ایئر فیلڈ پر اتر گیا جہاں سے اس نے کل پرواز کی تھی۔ عبداللہ گاڑی سمیت موجود تھا۔ میں نیچے اتر آؤں اس نے آگے آ کر ہاتھ ملایا۔

”سب ٹھیک رہا؟“

”تقریباً“ میں نے جواب دیا تو وہ کھٹک گیا۔ اس نے جیب کی طرف اشارہ کیا۔

”چلیں باقی باتیں راستے میں ہوں گی۔“

عبداللہ اپنے ساتھ دو مسلح ساتھی لایا تھا۔ اس نے جن کر ایچے لڑاکا افراد کو شامل کرنے کا سلسلہ جاری رکھا تھا اور اب ان کی تعداد کوئی ایک درجن ہو چکی تھی۔ عبداللہ ان کو اچھی طرح پرکھ چکا تھا اور ان کا پس منظر بھی جانتا تھا یعنی اسے یہ خطرہ نہیں تھا کہ ان میں سے کوئی وقت پڑنے پر دھوکا دے جائے گا۔ اس نے ان کا انداز پرکھا۔ وہ گرم جوشی سے ملے تھے اور عبداللہ بھی لگے اس میں اس کے سامنے بات کرنے کے لیے اس نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔ راستہ خاموشی سے کٹا اور ہم آدھے گھنٹے میں عبداللہ والی کوٹھی پہنچ گئے تھے۔ سعدیہ اور مونا کو میری آمد کی اطلاع مل گئی تھی اور وہ لان میں موجود تھیں۔ جیب سے اترتے ہی انہوں نے گھیر لیا۔ مونا نے مجھے دیکھ کر سکون کا سانس لیا۔

”شکر ہے تم کسی ہنگامے کے بغیر لوٹ آئے۔“

میں۔۔۔ اسے بتائیں سکتا تھا کہ وہاں میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔ ایک تو واقعہ ایسا تھا کہ خواتین کو بتانا معیوب لگ رہا تھا اور دوسرے وہ اس بات کو لے کر میرا دماغ کھاتیں۔ عبداللہ ہمیں چھوڑ کر اندر چلا گیا تھا۔ مونا اور سعدیہ یہاں خوش تھیں یا خوشی پوز کر رہی تھیں۔ بیو کے بارے میں پتا چلا کہ گزشتہ رات اسے بدھشی کی وجہ سے اُلتیاں آئی تھیں اور اب ڈاکٹر نے اسے دو دن تک ہلکی غذا کھانے کو کہا تھا۔ بیو بہاری سے

”سویرا تم جانتی ہو میں کن حالات سے گزر رہا ہوں۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو ایک مہینے کے لیے بھی تم سے دور نہ جاتا۔“

”میں جانتی ہوں، میں آپ سے شکوہ نہیں کر رہی۔۔۔ صرف اپنی کیفیت بتا رہی ہوں۔ میرے پاس سب کچھ ہے بس ایک آپ نہیں۔۔۔ تو لگ رہا ہے کچھ بھی نہیں ہے۔“

”ایک دن میں بھی ہوں گا۔“ میں نے اسے تسلی دی اور پھر شرارت سے کہا۔ ”اس دن کا تو مجھے بھی شدت سے انتظار ہے۔“

وہ چپ ہو گئی پھر اس نے کہا۔ ”شہباز کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم سب کچھ چھوڑ کر کہیں دور چلیں جائیں۔“

”ایسا ممکن نہیں۔۔۔ کیونکہ صرف میں اور تم جاسکتے ہیں باقی سب تو نہیں ہوں گے اور میرے دشمن ان کو نہیں چھوڑیں گے۔ اب میں مزید کسی پیارے کا نقصان نہیں اٹھا سکتا۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”اچھا میں فون بند کر رہی ہوں ماں جی آواز دے رہی ہیں، خدا حافظ۔“

”خدا حافظ۔“ میں نے کہا تو اس نے کال کاٹ دی۔ میں لان میں نکل آیا تھا۔ سویرا سے بات کر کے میں خوش ہونے

کے بجائے کسی قدر اداس ہو گیا تھا۔ میری جدوجہد کا دائرہ پھیل جا رہا تھا اور اس کے سمنے کے فی الحال کوئی آچار نظر نہیں

آ رہے تھے۔ مرشد اور اس جیسے دشمن میری جان چھوڑتے تو میں اور میرے ساتھی نارٹل زندگی کی طرف جاسکتے تھے۔ ایسا

صرف ایک صورت میں ممکن نظر آ رہا تھا کہ میرے دشمن یہ دنیا چھوڑ دیں، اس سے پہلے وہ دشمنی ترک کرنے پر آمادہ نظر نہیں

آتے تھے۔ اچانک میتو نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔

”شوٹی بھائی کیا سوچتا ہے؟“

میں چونکا۔ ”کچھ نہیں یا رُس دل اداس ہو رہا تھا۔“

”ہم جانتا ہے آپ ایسا آدی نہیں جیسی زندگی گزار رہا ہے، یہ کمینہ دشمن ہے جو آپ کو بچ کر ادھر لایا ہے لیکن ہم کو یقین ہے اوپر والا آپ کے ساتھ اچھا کرے گا کیونکہ آپ خود

دوروں کے ساتھ اچھا کرتا ہے۔“

میں لان میں رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”بس یہی یقین مجھے سنبھالے ہوئے ہے ورنہ بہت پہلے کہیں بھاگ چکا ہوتا یا دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال چکا ہوتا۔“

”ایسا آپ کسی صورت نہیں کر سکتا ہے۔“ میتو نے اتنے یقین سے کہا کہ میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ میرے ساتھی مجھ پر اتنا یقین کرتے تھے شاید اتنا یقین میں خود بھی نہیں کرتا

”جی جی یہ دھڑکا تو لگا رہتا تھا کہ نہ جانے کب کس بات سے منع کر دیا جائے۔ اب یہ خدشہ نہیں ہے۔“

میں نے گل میں پیش آنے والا واقعہ سنایا تو میتو اور عبداللہ متحیر ہو گئے تھے۔ میتو نے کہا۔ ”آپ کا دشمن ہر جگہ ہے آپ کو ایسے اکیلے نہیں جانا چاہیے تھا۔“

”میں نے سوچا نہیں تھا کہ راجا صاحب کے محل میں مجھے اس قسم کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑے گا اس لیے میں بے دھڑک اکیلا چلا گیا اور مزے کی بات تھی میرے پاس کوئی ہتھیار بھی نہیں تھا۔“

”آپ آئندہ احتیاط کیجئے گا۔“ عبداللہ نے مشورہ دیا۔ ”ہر حال میں مسلح رہا کریں۔“

”خاندان کا آدمی کیسا ہے؟“

”ٹھیک ہے اس کا زخم بھی بہتر ہو رہا ہے۔“

”میرا خیال ہے اسے بھی دوسرے ٹھکانے پر منتقل کر دیا جائے اور اس کے بعد فتح خان سے بات کی جائے۔ اس جگہ کو جتنا کم اہتمام کیا جائے اتنا بہتر ہوگا۔“

”جیسے آپ کی مرضی، ویسے سیکورٹی بہت مضبوط کر دی ہے۔“

”بات سیکورٹی کی نہیں بلکہ اس جگہ کو خفیہ رکھنے کی ہے۔“ میں نے کہا اور وسیم کا نمبر ملایا۔ میں نے اس سے کہا

کہ ہم کچھ دیر میں آ رہے ہیں اور ایک عدد قیدی اور لارہے ہیں۔ وسیم ہنسا۔

”چشمہ روشن دل ماشاؤ۔“

”برخوردار تہاری اردو تو اچھی تھی اب فارسی بھی بہتر ہوتی جا رہی ہے۔“ میں بھی ہنسا۔ ”سفیر ہے تو اس سے بات

کرانا، ایک سنی خیر خبر ہے لیکن وہ میں آ کر بہ زبان قلم خود دوں گا۔“

سفیر سے بات کر کے میں نے موبائل بند کر دیا اور ابھی جیب میں رکھ رہا تھا کہ تیل جی۔ سویرا کا نمبر دیکھ کر میرا دل

دھڑک اٹھا تھا۔ میں ان دونوں سے معذرت کرتا ہوا اٹھ کر باہر آیا اور کال ریسیو کی۔ ”ہیلو۔“

”السلام وعلیکم۔“ سویرا کی آواز آئی۔ ”کیسے ہیں آپ؟“

”میں ٹھیک ہوں تم ٹھیک ہو، حویلی میں سب خیریت ہے؟“

”ہاں حویلی میں سب ٹھیک ہے، لیکن میں آپ کے بغیر ٹھک نہیں ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

”صاحب ہے کھانے کو ٹھیک مل جاتا ہے۔ ایاز وہیں سے تینوں وقت کھانے آتا ہے۔ چائے کافی ہم خود بنا لیتے ہیں۔“

”یہ اچھا کر رہے ہو۔ سفیر اور تم دونوں کم سے کم نکلو بلکہ جب تک ضرورت نہ ہو اندر ہی رہا کرو۔“

”میں سمجھتا ہوں جناب دشمن ہماری صورتوں سے واقف ہے جبکہ ایاز کو کوئی نہیں جانتا۔“

فتح خان سے بات کیے ہوئے چوبیس گھنٹے ہونے کو آئے تھے۔ وسیم سے بات کر کے میں نے وہی ہم لگائی جس سے فتح خان کو کال کی تھی۔ اس کا نمبر موجود تھا۔ میں نے کال

ملائی اور اس نے فوراً ریسیو کی۔ ”شہباز خان۔“ اس نے بلا تہدید کہا۔ ”ہم تیار ہے تم شہلا کا تصویر لو اور میرا آدی میرے حوالے کر دو۔“

”گڈ اب میں تمہیں بتاؤں گا کہ تمہیں تصویریں کہاں بھیجی ہیں، جب تصویریں مجھے مل جائیں گی اور شہلا ان کی تصدیق کروے گی تو میں تمہارے آدی کو چھوڑ دوں گا۔“

”کہاں بھیجی ہیں؟“ اس نے بے تابی سے پوچھا۔ ”یو لو تو میں ابھی بھیج دے۔“

”میرا صبر فتح خان اتنی جلدی نہیں، میں ایک گھنٹے بعد بتاؤں گا۔“ میں نے کہا اور کال کاٹ کر ہم موبائل سے نکال

لی۔ اپنی ہم لگا کر میں نے عبداللہ کو کال کی اور اسے میتو کے کمرے میں آنے کو کہا۔ وہ دو منٹ بعد آ گیا تھا۔ میں نے

پہلے اسے فتح خان سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا۔ عبداللہ غور سے سن رہا تھا۔ میری بات سن کر اس نے

پوچھا۔

”فتح خان سے تصویریں لینی ہیں؟“

”بالکل اور اس کے لیے کوئی فول پروف پلان سوچ لو، فتح خان وہی کرے گا جو میں کہوں گا لیکن وہ درمیان میں

اپنی کوئی شرارت بھی شامل کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس کی یہ کوشش ناکام بنانی ہے۔“

”میں سمجھ گیا۔“ عبداللہ بولا۔ ”اچھا راجا صاحب کے محل میں کیا ہوا تھا؟“

”کیا تمہیں وہاں سے کوئی ہدایت ملی ہے؟“

عبداللہ نے سر ہلایا۔ ”جی۔۔۔ مجھے، میرے تمام آدمیوں اور یہاں راجا صاحب کے تمام وسائل آپ کے ماتحت کرنے کا حکم آیا ہے۔“

میں مسکرایا۔ ”حالانکہ تم پہلے بھی مکمل طور پر میرے ساتھ تھے۔“

زیادہ ہلکی غذا کھانے کا سوچ کر بستر پر پڑا تھا۔ مونا اور سعد یہ نے سچ کچھ کوٹھی میں چکن کا چارج سنبھال لیا تھا اور اب کوٹھی کا

کلک منیران کا مددگار تھا۔ سعد یہ نے مجھ سے کھانے کا پوچھا۔ میں ناشتا اچھا خاصا کر کے آیا تھا اور ابھی کھانے کا موڈ نہیں

تھا میں نے کہا کہ کچھ ہلکا بھلکا بنا لو۔

”چائیز رائس بنا لیتی ہوں۔“ سعد یہ نے کہا۔ ”میتو بھی کھالے گا، اسے ڈاکٹر نے کوئی سخت چیز کھانے سے منع کیا ہے۔“

اگرچہ چائیز کھانے مجھے زیادہ پسند نہیں ہیں لیکن میں نے اعتراض نہیں کیا اور اندر کا رخ کرتے ہوئے کہا۔۔۔

بیتو بستر پر لیٹا ہوائی وی دیکھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ اٹھا۔ ”شوٹی بھائی آپ کب آیا؟“

”ابھی کچھ دیر پہلے آیا ہوں تم سناؤ کیا ہو رہا ہے۔ سنا ہے پیٹ خراب کر لیا ہے اپنا؟“

بیتو نے بڑا سامنے بنایا۔ ”یہ ڈاکٹر لوگ پاگل ہے ہم کو دوسو ٹن اور تین اٹلی آیا اور دونوں کے لیے کھانا بند کر دیا۔“

”بند نہیں کیا پر ہیزی کھانے کو بولا ہے۔“

”ایک ہی بات ہے شوٹی، آپ جانتا ہے یہ کھانا میں نہیں کھا سکتا۔ صبح ناشتے میں دلیہ آیا تھا میں نے نہیں کھایا۔“

”تو کیا کل سے فاقہ چل رہا ہے؟“

اس نے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔ ”قسم سے پیٹ میں بہت سارا چوبادوڑتا ہے۔“

میں نے مسکراتے ہوئے موبائل فون نکالا اور وسیم کا نمبر ملایا۔ اس نے کال ریسیو کی اور سلام دعا کے بعد

بولا۔ ”سنا ہے آپ واپس آ گئے ہیں؟“

”ہاں تم سناؤ خاتون کا کیا حال ہے؟“

”ٹھیک ہے لیکن ایک بار شو کرنے لگی تھی تو اس کا منہ بند کرنا پڑا۔ ہم نے کچھ فحش بھی کی ہے، اس کا رزلٹ آپ کو آنے پر بتاؤں گا۔ عبداللہ دوسری گاڑی پہنچا گیا ہے اس میں

سچ کچھ ٹریپ تھا لیکن اب گاڑی کھینچ رہے۔“

”فتح خان بہت بڑا حرا مزادہ ہے اس پر بالکل اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔۔۔ باقی کہاں ہیں؟“

”ایاز کھانا لینے گیا ہے۔ سعد یہ اور مونا اصرار کر رہے تھے کہ وہ روز کوٹھی سے بنا کر کھانا بھیج دیا کریں گے لیکن مجھے مناسب نہیں لگا۔ اس میں رسک ہے یہاں پاس ہی ایک اچھا

تھا۔

”ہاں میں ایسا نہیں کروں گا۔ کیونکہ میں اکیلا نہیں ہوں مجھ پر تم جیسے بہت سارے ساتھیوں کی ذمہ داری بھی ہے۔“

”ہم آپ کا ساتھی ہے ذمہ داری نہیں ہے۔“
”نہیں یار ذمہ داری تو ہوتی ہے کیونکہ یہ تم لوگوں کی جنگ نہیں ہے لیکن پھر بھی تم سب میرا ساتھ دے رہے ہو۔“
”ہمارا جنگ کیسے نہیں ہے۔“ بیوہ خفا ہو گیا۔ ”اُدھر جو انڈین فوج سے آپ لڑا تو کیا وہ آپ کا جنگ تھا؟“
”وہ تو مجبوری تھی، اگر میں نہ لڑتا تو تمہارے لوگوں کے ساتھ میں بھی مارا جاتا۔“

”تو ادھر ہمارے ساتھ بھی مجبوری ہے۔“ بیوہ نے مزید خفا ہو کر کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ میں نے اسے آواز دی لیکن وہ رکا نہیں تھا اس سے ظاہر تھا وہ بہت زیادہ ناراض اور دکھی ہو گیا ہے۔ کچھ دیر بعد موٹا جا رہا نہ انداز میں آتی دکھائی دی۔ لگتا تھا بیوہ سیدھا اپنی دیدیوں کے پاس پہنچا تھا اور شکایت لگاتی تھی۔ حسب توقع موٹا نہ آتے ہی کہا۔ ”تم نے بیوہ سے کیا کہا ہے وہ رونے والا ہو رہا ہے؟“

”رونا تو اسے کسی اور بات پر آ رہا ہے ہاں بہانا اس نے یہ بنایا ہے۔“ میں نے فس کر کہا۔ ”ابھی کتنے اور چرچے کی بات کرو سب بھول جائے گا۔“
موٹا سنجیدہ ہوئی۔ ”نہیں شوہن تم نے بہت غلط بات کی ہے، ہم تمہارے ساتھی ہیں تمہاری ذمہ داری نہیں۔“

میں بھی سنجیدہ ہو گیا تھا ”میں جانتا ہوں اور میں نے ان معنوں میں کہا بھی نہیں ہے۔ لیکن تم سب مجھے باس مانتے ہو اور میرے حکم کی تعمیل کرتے ہو اس لحاظ سے ذمہ داری بھی میری بنتی ہے۔ میں نے اس سے کب انکار کیا کہ تم سب ساتھی نہیں ہو۔ تم لوگ میرے ساتھ ہو تب ہی تو میں دشمن کے سامنے کھڑا ہوں، ورنہ اکیلا آدمی کب تک کھڑا رہ سکتا ہے۔“
”ٹھیک ہے میں یہ بات سمجھتی ہوں دوسرے بھی سمجھتے ہیں لیکن بیوہ بچہ ہے۔“

”تو جا کر اس بچے کو سمجھاؤ نا۔“ میں نے کہا اور موضوع بدل دیا۔ ”کھانا بن گیا ہے تو لگا دو ابھی مجھے جانا ہے۔“

”کہاں؟“

”وسیم اور سفیر کے پاس، یہاں جو قیدی ہے اسے بھی لے جاتا ہے۔“

”بس دس منٹ میں۔“ موٹا نے کہا اور چلی گئی۔ میں نے بہتر سمجھا کہ ایک چھوٹا سا شور لے لوں۔ میرے کچھ کپڑے یہاں بھی موجود تھے۔ ان میں سے ایک لباس منتخب کیا اور جب کھانے کی میز پر پہنچا تو وہاں بیوہ چپک رہا تھا کیونکہ چائیز کے ساتھ سعدیہ نے اس کے لیے چکن کارن سوپ بھی بنایا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

”شوہن بھائی اب مزہ آئے گا۔“
”لیکن زیادہ مت لینا۔“ میں نے اسے خبردار کیا۔ ”ایسا نہ ہو کہ پھر ڈاکٹر پابندی لگا دے۔“

”ڈاکٹر گیا رکھ میں۔“ بیوہ نے چکن کارن سوپ پر حملہ کرتے ہوئے کہا تو سب فس دیے تھے۔ خوشگوار ماحول میں کھانا کھایا گیا اور کچھ دیر پہلے والی کشیدگی اب نظر نہیں آ رہی تھی لیکن ساتھ ہی میں نے محسوس کیا کہ اپنے مجازی خداؤں سے دور ہو کر موٹا اور سعدیہ اداس تھیں۔ خاص طور سے سعدیہ مر جھاتی ہوئی تھی۔ میں اس کی کیفیت کسی حد تک سمجھ رہا تھا۔ اس کا وسیم سے صرف نکاح ہوا تھا اور ابھی تک ان میں ازدواجی تعلق قائم نہیں ہوا تھا۔ سعدیہ پہلے بھی شادی شدہ رہ چکی تھی۔ جب اس نے نکاح سے شادی کی تھی لیکن نکاح بہت تھوڑی زندگی لے کر آیا تھا۔ اس کے بعد سعدیہ پھر اکیلی ہوئی تھی اور اب تک اکیلی تھی۔ میرے خیال میں یہ درست نہیں تھا۔ اگر وہ کنواری ہوتی تو شاید اس صورت حال سے سمجھوتا کر لیتی، لیکن وہ شادی کے تجربے سے گزر چکی تھی اور جو عورت ایک بار شادی کے تجربے سے گزر جاتی ہے اس کے لیے صبر کرنا مشکل ہوتا ہے۔ سعدیہ ایک بڑی آزمائش سے گزر رہی تھی۔ میں نے اسی وقت ایک فیصلہ کیا۔ لیکن اس کا اعلان کرنے سے پہلے میں وسیم سے بات کرنا چاہتا تھا۔

عبداللہ کچھ دیر سے کھانے میں شامل ہوا اور جلدی اٹھ گیا۔ اسے فتح خان کے آدمی کو قید خانے سے نکالنا تھا۔ احتیاط کے طور پر اسے بے ہوش کر دیا گیا تھا۔ اسے عبداللہ کی سیاہ شیشوں والی جیب میں منتقل کیا گیا۔ بیوہ بھی ساتھ جانا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے روک دیا۔ ”ابھی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے وہاں آرام کرنے کی جگہ نہیں ہے اور نہ ہی اس پاس ڈاکٹر ملے گا جیپٹ ہو جاؤ پھر وہاں آنا۔“

میں نے عبداللہ سے کہا کہ وہ صرف ایک مسلح آدمی ساتھ لے زیادہ آدمی لے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

آدھے گھنٹے بعد ہم مکان پر تھے۔ وسیم اور سفیر کچھ پکانے کی کوشش کر رہے تھے۔ کیونکہ وہ باہر کا کھانا کھا کر تنگ

آگئے تھے۔ وہ بوتلوں کا شوق سے کھا لیتے تھے لیکن کسی بوتل میں جا کر، یہاں منگو کر کھانے میں انہیں مزہ نہیں آ رہا تھا۔ ایاز نے پہلے ہی ان کے ہاتھ کا بنا کھانے سے انکار کر دیا تھا اور اس وقت سچ کرنے کہیں گیا ہوا تھا۔ عبداللہ نے ایک عدد ٹفنن ان کے حوالے کیا جس میں چائیز رائس اور سوپ تھا۔ دونوں خوش ہو گئے تھے۔ سفیر نے کہا۔

”دیکھا میری بیوی کو میرا کتنا خیال ہے؟“
”دیکھا ہے میں نے وہی میں۔“ وسیم نے سر ہلایا۔ ”دو دو دن گھر میں کھانا نہیں بنتا تھا۔“
سفیر کھسیا گیا۔ ”وہ الگ بات ہے لیکن ابھی تو بھیجا ہے۔“

”ہو ہی نہیں سکتا۔“ وسیم نے دھمکی کیا۔ ”یہ سعدیہ نے بھیجا ہے۔“
عبداللہ ہنسا۔ ”یہ میں خود لایا ہوں کیونکہ وہ تو کھاپی کر سونے چلی گئی تھیں۔“

اس بار دونوں کھسیا گئے۔ بہر حال چائیز رائس اور چکن کارن سوپ سے انصاف کرنے میں انہوں نے کوئی کوتاہی نہیں کی تھی۔ عبداللہ مکان کا معائنہ کرنے لگا۔ مجھے معلوم نہیں تھا وہ اپنے ساتھ کچھ آلات بھی لے آیا تھا۔ پہلے اس نے فتح خان کے آدمی کو شہلا کے کمرے میں منتقل کیا۔ وہ اسے دیکھ کر ڈر گئی تھی۔ پھر مجھے دیکھا تو غصے سے پھٹ پڑی تھی۔ ”کہاں چلے گئے تھے، تم مجھے ان لوگوں پر چھوڑ کر انہوں نے مجھ پر تشدد کیا تھا؟“

میں نے اس کی بات نظر انداز کی۔ ”کام سے کہا تھا ویسے میری فتح خان سے بات ہوئی ہے وہ اپنے اس آدمی کے عوض تمہاری تصویریں دینے پر آمادہ ہو گیا ہے۔“

”سچ۔“ وہ خوش ہو گئی لیکن پھر خوف زدہ نظروں سے بے ہوش آدمی کی طرف دیکھا۔ ”یہ بھی کم ورنہ نہیں ہے، اسے میرے ساتھ کیوں رکھا ہے؟“

”تم فکر مت کرو یہ بے ہوش ہے اور بندھا ہوا ہے۔ اسے کھولیں گے نہیں۔ اسی حالت میں کہیں ڈال دیں گے۔“ میں نے کہا۔

”آپ کہیں تو اسے دوسرے کمرے میں منتقل کر دیتے ہیں۔“ عبداللہ نے کہا۔

”ہاں پلیز ایسا کرو ورنہ اسے ہوش آ گیا تو یہ مجھے مار دے گا۔“ شہلا جلدی سے بولی۔ وسیم نے اسے دوسرا لباس لا دیا تھا۔ کیونکہ ساڑی میں وہ سردی سے محفوظ نہیں تھی۔ اب وہ

جینز اور یورے بازو اور ہائی ٹیک گرم جرسی میں ملبوس تھی۔ یہ اور بات تھی کہ اس لباس میں بھی اس کی حشر سامانیاں نمایاں تھیں۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی جو کچھ بھی پہنیں ان پر چٹا ہے۔ عبداللہ نے فتح خان کے آدمی کے ہاتھ اور پاؤں باندھ دیے تھے۔ شہلا کو پہلے ہی سچ دیا جا چکا تھا۔ عبداللہ اب مکان کے سامنے والے حصے میں ایک چھوٹا سا کیمرا فٹ کر رہا تھا۔ یہ کیمرا ایک سیکنڈ میں ایک تصویر لیتا تھا اور یہ تصویر یا ویڈیو ایک چھوٹے سے مخصوص مانیٹر پر دیکھی جاسکتی تھی۔ عبداللہ مانیٹر بھی لایا تھا اور اب اسے لگا کر کیمرے کی آزمائش کر رہا تھا۔ میں گیٹ کے پلر والی لائٹ کے ساتھ کیمرا اس طرح لگا گیا تھا کہ وہ گلی سے نظر نہیں آتا تھا لیکن پوری گلی اور اس پاس کے سارے علاقے کو کور کرتا تھا۔ اس کی آزمائش مکمل کر کے عبداللہ نے ایسا ہی ایک کیمرا مکان کے عقب والے چھوٹے سے گھر میں لگایا۔ اسے اوپر سے فوٹو کی گرل لگا کر بند کر دیا گیا تھا اور یہاں سے کوئی اندر نہیں گھس سکتا تھا جب تک کہ وہ گرل نہ کاٹ دے۔ دونوں کیمرے ایک ہی مانیٹر پر دیکھے جاسکتے تھے اور ساتھ میں ایک چھوٹا سا بکس تھا جو چوبیس گھنٹے کی ویڈیو کی ریکارڈنگ بھی کر سکتا تھا اور اسے کسی وقت بھی دیکھا جاسکتا تھا۔ عبداللہ وقتی سا آواز بھی لایا تھا جو ایک وقت دھماکہ خیز ماوے، کسی بھی نوعیت کے ریڈیائی سنگٹل کو پکڑ سکتا تھا۔

”اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے لیکن وہ میں ابھی لایا نہیں ہوں۔“ عبداللہ نے کہا۔ ”لیکن کچھ خاص اسلحہ ہے۔“

اس نے ایک چھوٹا سا بریف کیس نکالا اور اسے کھولا تو اس میں ایک عام..... لیکن موٹی نال والا پستول تھا۔ اس کے پیچھے چمپر بھی اسی طرح موٹا سا تھا۔ پستول کے ساتھ فولاد کی بنی دواغ کیسی اور تقریباً آدھا انچ موٹی گولیوں کا سیٹ بھی تھا۔ ان کی تعداد دو درجن کے لگ بھگ تھی۔ میں نے ان کو چھوٹا چاہا تو عبداللہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”نہیں جناب ان کو ایسے چھوٹا ٹھیک نہیں۔“

میں رک گیا۔ ”کیوں؟“

عبداللہ نے ایک الیکٹرانک تھرما میٹر نکالا اور اس کی سوئی ایک بلٹ سے لگائی اور اس کی اسکرین پر بلٹ کا درجہ حرارت آنے لگا۔ ہم دنگ رہ گئے تھے بلٹ کا درجہ حرارت منفی سو کے قریب تھا۔ عبداللہ نے تھرما میٹر واپس رکھ دیا اور بریف کیس بند کر دیا۔ ”یہ ہائی کیمریس ہائیڈروجن گیس کے بلٹ ہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ ایک بلٹ میں کوئی دس مکعب میٹر



”یعنی تم تصویریں واپس کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہو؟“

”ہاں تصویریں ایک بند لفافے میں میرے ہاتھ میں ہیں۔“ اس نے مکاری سے کہا۔ ”بولو کہاں پہنچانا ہیں۔“

میں نے اسے پوسٹ آفس کے بارے میں بتایا۔

”اس میں پوسٹ بکس نمبر دو سو بارہ میں یہ لفافہ ڈال دو۔ مجھے مل جائے گا۔“

”پوسٹ بکس۔“ اس کے لہجے میں مایوسی آگئی۔ ”اس طرح تو دیر ہو جائے گی۔“

”کوئی دیر نہیں ہوگی۔ زیادہ سے زیادہ کل دو پہر تک تمہارا آدمی آزاد ہو جائے گا اور تمہارے پاس پہنچ جائے گا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ آج شام پانچ بجے سے پہلے یہ لفافہ اس پوسٹ بکس میں پہنچ جائے۔“

”ٹھیک ہے پہنچ جائے گا۔“ فتح خان نے سر آہ بھری۔

”شہباز خان میں نے کسی کے سامنے خود کو اتنا مجبور نہیں پایا۔ تم نے دیکھا تم نے مجھے مرشد کے حوالے کیا اور میں اس کے پاس سے نکل آیا۔ اگر تم میرے ساتھ شامل ہو جاؤ تو.....“

”شام پانچ بجے تک۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”ورنہ ذیل قسم ہو جائے گی۔“ بات مکمل کرتے ہی میں نے کال کاٹ کر ہم نکال لی اور عبداللہ کی طرف دیکھا۔ ”اگر آج شام پانچ بجے تک دو سو بارہ میں کوئی لفافہ آ جاتا ہے تو اسے کب وہاں سے نکالا جاسکتا ہے؟“

”ویسے تو وہ کل صبح ہی نکل سکتا ہے لیکن میرے آدمی نے پوری سیٹنگ کر لی ہے، ایک ملازم جس کے پاس آفس کی چابیاں ہوتی ہیں وہ رات کو چیکے سے آفس کھول کر بکس نمبر دو سو بارہ سے لفافہ نکال کر میرے آدمی کو دے دے گا۔“

”وہ پوسٹ آفس کا ملازم ہے اتنی آسانی سے کیسے مان گیا؟“

عبداللہ ہنسا۔ ”اس کا باپ بھی مانتا۔ اس کام کا کچھ معاوضہ اسے پیشی ادا کیا جا چکا ہے۔“

”تو یہ بات ہے۔“

”اور یہ اچھا ہوگا۔“ سفیر ہنسا۔ ”کل اس گدھے کے آدمی انتظار کریں گے کہ کون آتا ہے بکس نمبر دو سو بارہ کھولنے۔“

”فتح خان کو گدھا مت سمجھو۔ وہ بہت چالاک ہے جو بات ہم سوچ سکتے ہیں وہ بھی سوچ سکتا ہے اور جو ہم کر سکتے

گیس کو کھریس کر کے بند کیا گیا ہے۔ اسے بیرونی درجہ حرارت سے بچانا ہوتا ہے ورنہ یہ اسٹیل کا خصوصی بلٹ بھی اسے قید نہیں رکھ سکے گا۔ یہ خاص بریف کیس اسے باہر کے درجہ حرارت سے بچاتا ہے۔ یہ مخصوص پستول ایک بلٹ لوڈ کر کے فائر کر سکتا ہے۔ اس کی ریخ تقریباً سو میٹر سے یہ اپنے ہدف پر پھٹ کر بحیرہ جتنی بڑی اور مضبوط گاڑی کو مکمل طور پر تباہ کر سکتا ہے۔“

”یہ تو بہت ہائی ٹیک ہتھیار ہے۔“ وسیم نے حیرت سے کہا۔

”ہاں اور بہت مہنگا بھی ہے یوں سمجھ لیں کہ اس بریف کیس کی قیمت ایک ملین ڈالر تو ہے۔ لیکن ایک افغان اسلحے کے ڈیلر سے بہت سستا مل گیا کیونکہ اس کے پاس اور کوئی خریدار نہیں تھا۔ یہ اصل میں روس کی ایجاد ہے اس وجہ سے مارکیٹ میں دستیاب بھی ہے۔“

عبداللہ نے بریف کیس وسیم کے حوالے کر دیا۔ میں نے پوچھا۔ ”اگر اس کے بلٹ کو مہلی فضا میں رکھ دیا جائے تو کیا ہوگا؟“

”آج کل کے موسم میں یہ تین سے چار منٹ میں پھٹ جائے گا کیونکہ اس کا درجہ حرارت بڑھ جائے گا اور جب یہ درجہ حرارت مٹی پچاس ڈگری سینٹی گریڈ سے نیچے آئے گا تو بلٹ خود بخود پھٹ جائے گا۔ فائر کرنے کی صورت میں یہ اپنے ہدف سے ٹکرا کر پھٹے گا۔“

”یہ کام کی چیز ہے شاید مٹی راکٹ لائچر ہے۔“

”تقریباً اتنی ہی تباہی پھیلاتا ہے۔“ عبداللہ نے سر ہلایا۔

میں نے سر آہ بھری۔ ”انسان نے بھی تباہی کے لیے کیا کیا چیزیں بنائی ہیں۔“

”یہ درست ہے جناب۔“ عبداللہ نے سر ہلایا اور بولا۔ ”فتح خان سے تصویریں لینے کا طریقہ سوچ لیا ہے۔ میرے ایک آدمی نے اسلام آباد کے ایک پوسٹ آفس میں ایک پوسٹ بکس لے لیا ہے۔ اس کا نمبر دو سو بارہ ہے۔ آپ فتح خان سے کہیں کہ وہ شام پانچ سے پہلے اس پوسٹ آفس کے بکس میں تصویریں ڈال دے۔“

میں نے گھڑی دیکھی۔ تین بج رہے تھے۔ گویا ابھی دو گھنٹے باقی تھے۔ میں نے ہم بدل کر فتح خان کا نمبر ملایا۔ اس نے کال ریسیو کی اور بولا۔ ”شہباز خان میں تمہاری کال کا انتظار کر رہا تھا۔“

ایں وہ بھی کر سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "عبداللہ تمہارے آدمی پورے انتظامات کے ساتھ جائیں اور دوہری نگرانی رکھو۔ یہ دیکھو کہ کوئی تمہارے آدمی کی نگرانی تو نہیں کر رہا ہے۔"

"میں سمجھ گیا، میں ایسا ہی کروں گا۔"

کچھ دیر بعد عبداللہ رخصت ہو گیا۔ اسے پوسٹ بکس کے لیے بھی انتظامات کرنے تھے۔ پوسٹ آفس کا ملازم عبداللہ کے آدمی کو مطلع کرے گا جیسے ہی کوئی شخص پوسٹ بکس دو سو بارہ میں کوئی چیز ڈالے گا۔ وسیم نے ایک بار پھر فتح خان کے آدمی کو دیکھا وہ ابھی تک بے ہوش تھا۔ ہم بیڈروم والے کمرے میں آ گئے۔ سفیر اور وسیم مونا اور سعدیہ کی کیفیت جاننے کے لیے بے چین تھے۔ میں نے کہا۔ "یار ہم ان عورتوں کے ساتھ ظلم کر رہے ہیں۔ وہ زندہ گوشت پوسٹ کی بنی ہوئی ہیں اور وہ اپنے شوہروں کا ساتھ چاہتی ہیں خاص طور سے میں سعدیہ کے لیے فکر مند ہوں۔"

"سعدیہ کے لیے کیوں؟" وسیم نے پوچھا۔

میں نے گہری سانس لی۔ "یار وہ لڑکی نہیں عورت ہے۔ پہلے بھی ایک بار شادی کے تجربے سے گزر چکی ہے اور اب اس طرح صرف نکاح کر کے اسے رکھنا اس کے ساتھ ظلم ہے۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا۔ اگر وہ لڑکی ہوتی تو نا آشنا ہوتی اور صبر کرتی لیکن کوئی انسان جان لینے کے بعد صبر نہیں کر سکتا۔ نکاح کے بعد وہ خود پر جبر کر رہی ہے اور یہ جبر اسے رفتہ رفتہ ہسٹریا کی طرف لے جائے گا۔"

"یہ سب تو میں نے بھی سوچا ہے۔" وسیم نے اعتراف کیا۔

"لیکن تم نے عمل نہیں کیا۔" میں نے علامت سے کہا۔ "تم نے اسے کیوں چھوڑ رکھا۔ آخر مونا اور سفیر بھی تو میاں بیوی کی زندگی بسر کرتے آئے ہیں۔"

سفیر کے دانت نکل آئے۔ "شوہنی ٹھیک کہہ رہا ہے تم سے کل سے مونا مجھے بہت یاد آ رہی ہے۔"

"لیکن شہباز صاحب جیسی زندگی ہم بسر کر رہے ہیں، اس میں گھر گشت کی گنجائش کہاں ہے۔"

"دیکھو یا راللہ نے انسان کو کچھ حاجات دی ہیں اور یہ ہر حال میں انسان کو پوری کرنی پڑتی ہیں۔ شادی بھی ایک ایسی ہی حاجت ہے۔ جیسے انسان میدان جنگ میں بھی کھانا پینا اور سونا نہیں چھوڑتا، اسی طرح اسے بیوی کی ضرورت ہوتی ہے اور بیوی کو اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہنگامی حالات میں یہ اسی طرح پوری کرنے چاہیے جیسے ہم لوگ

جہاں موقع ملے کھا لیتے ہیں اور جب موقع ملتا ہے سو لیتے ہیں۔"

"یار میں بھی اسے یہی سمجھا رہا ہوں۔" سفیر بولا۔ "لیکن یہ سمجھتا ہے کہ میں اس کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلانا چاہتا ہوں۔"

"یہ غلط بھی نہیں ہے میں تمہیں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔" وسیم نے اسے گھورا۔ "کل سے تڑپ رہے ہو جیسے پانچویں کب سے بیوی کو نہیں دیکھا۔"

"بھائی اپنی تیری طرح برہمچاری نہیں بن سکتے۔" سفیر نے شانے اچکانے۔ میں نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"تو طے ہے آج شام وسیم کا ویسہ ہے۔"

وسیم پریشان ہو گیا۔ "اتنی جلدی؟"

"ہاں بھائی ہنگامی حالات کے کام ایسے ہی ہوتے ہیں اب تمہارا باقاعدہ ویسہ کرنے کا موقع تو نہیں ہے۔"

"میں مونا کو بتاتا ہوں وہ سعدیہ کو تیار کر دے گی۔"

سفیر بولا اور وسیم کے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے کال ملائی۔ "اے مونا آج سعدیہ اور وسیم کی رخصتی ہے۔ نہیں بابا

میرا دماغ خراب نہیں ہے۔ شادی کے بعد تم نے چھوڑا

کہاں ہے۔ میں بکواس نہیں عرض کر رہا ہوں۔ ہمارے

سرپرست اعلیٰ، اعلیٰ حضرت جناب شہباز ملک المعروف

لنڈورے بابا نے فیصلہ صادر کر دیا ہے، تم سعدیہ کو تیار

کرو۔ نہیں نہیں باہر جا کر شاپنگ کرنے کی گنجائش نہیں

ہے۔ موقع سے فائدہ اٹھانے کی نہیں ہو رہی ہے جو کرنا ہے

گھر میں کرو۔"

میں نے وسیم کی طرف دیکھا۔ "بس بھائی تیار ہو جاؤ

بیویاں یہی سلوک کرتی ہیں ہر مرد آزاد کے ساتھ جو ایک بار

ان کے دام میں آجائے۔"

وسیم کی آنکھیں مسکرانے لگی تھیں۔ "تب تو آپ

میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔ ویسے یہ تقریب کل تک

کے لیے نہیں ٹالی جاسکتی۔۔۔۔۔ آج تصویروں والا کام نمٹانا

ہے۔"

"وہ عبداللہ کے آدمی کر لیں گے۔" میں نے کہا۔ "یہ

والا ٹیک کام آج ہو جانا چاہیے۔"

"بس بیٹا اس خوشی میں کافی بلا دے۔" سفیر نے وسیم

کے شانے پر ہاتھ مارا۔ "فقیر دعا کریں گے اللہ تیری سہاگ

رات کامیاب کرے۔"

"تم سخت بے ہودہ آدمی ہو۔" وسیم خفگی سے بولا اور

کھڑا ہو گیا۔

سفیر ہنسا۔ "بیٹے کل تک تو بھی ہو جائے گا۔"

وسیم کے جانے کے بعد میں نے پوچھا۔ "شہلا نے

کچھ بتایا؟"

"میں نے اور ایاز نے کچھ تفتیش کی تھی۔ اس نے بس

ایک ہی نام بتایا ہے۔ کسی لیاقت انصاری کا وہ اسی بینک میں

ملازم ہے اور شاید سکورنی وہی دیکھتا ہے۔"

"شہلا کا لیاقت سے کیا تعلق ہے؟"

"وہی جو فتح خان سے ہے فرق صرف اتنا ہے کہ فتح

خان نے اسے بلیک میل کر کے حاصل کیا اور شہلا نے لیاقت

کے سامنے خود کو چارے کے طور پر ڈالا اور پھٹی نے منہ مار

دیا۔"

"اگر لیاقت کا کام نکل گیا ہے تو وہ اب کیوں شہلا کے

کام آئے گا؟"

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم لیکن شہلا کا دعویٰ ہے کہ وہ

اس کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

وسیم کافی بنا کر لے آیا۔ ذرا سی دیر میں اس کی سفیر سے

خفگی ختم ہو گئی اور دونوں پھر نئی مذاق کرنے لگے۔ اچانک

شہلا کے چلانے کی آواز آئی۔ میں نے کہا۔ "شاید فتح خان

کے آدمی کو ہوش آ گیا ہے۔ ذرا جا کر دیکھو کیا مسئلہ ہے کہیں وہ

اسے مارنے کی کوشش تو نہیں کر رہا۔"

"بھائی ہم کل سے اس عورت کو بھگت رہے ہیں اب تو

ہی جا کر دیکھ۔" سفیر نے انکار کر دیا اور وسیم بھی اٹھنے کے موڈ

میں نہیں تھا اس لیے مجھے ہی اٹھنا پڑا تھا۔ شہلا کمرے کے

ایک کونے میں دبکی ہوئی چلا رہی تھی حالانکہ فتح خان کا

نوجوان ساتھی فرش پر بے بسی سے بندھا پڑا تھا اور کسی طور شہلا

کے لیے خطرہ نہیں تھا البتہ وہ ہوش میں آ گیا تھا۔ میں نے شہلا

کی طرف دیکھا۔ "کیا بات ہے کیوں چلا رہی ہو؟"

"ہلیز اسے کہیں اور لے جاؤ۔" وہ لرزرتے لہجے میں

بولی۔ "یہ مجھے مار دے گا۔"

"یہ تمہیں کس طرح مار سکتا ہے اس کے ہاتھ پاؤں

بندھے ہیں۔" میں نے شہلا کو سمجھانے کی کوشش کی تو وہ چیخ

اٹھی تھی۔

"میں کچھ نہیں جانتی اسے یہاں سے لے جاؤ ورنہ

میں چنچنی رہوں گی۔"

فتح خان کا ساتھی مسکرانے لگا تھا۔ اس نے کہا۔ "یہ ہم

سے ڈر رہا ہے۔"

میں نے شہلا کی طرف دیکھا اور اس کا خوف کسی قدر

میری سمجھ میں آنے لگا تھا۔ میں فتح خان کے ساتھی کے پاس

بیٹھ گیا اور اس کے بال پکڑ کر اس کی گردن پیچھے کی طرف

گھٹی۔ اس کی آنکھیں باہر نکل آئی تھیں کیونکہ اس کا سانس

رک گیا تھا میں نے ایک جھٹکا دے کر پوچھا۔ "یہ تم سے کیوں

ڈر رہی ہے؟"

"ہم.... ہم بتاتا ہے۔" اس نے بہ مشکل

کہا۔ میں نے گرفت کم کی تو وہ جلدی جلدی سانس لینے لگا اور

پھر بولا۔ "یہ ہم سے ڈر رہا ہے کہ ہم اس کے ساتھ پھر وہی نہ

کرے جو اس کی گوتھی میں کیا تھا۔"

میں نے شہلا کی طرف دیکھا اس کا چہرہ ذلت کے

احساس سے سیاہ ہو گیا تھا۔ وہ جو بات چھپانا چاہ رہی تھی وہ

سامنے آ گئی تھی۔ حالانکہ وہ عزت دار عورت نہیں تھی لیکن پھر

بھی کسی عورت کے لیے اس سے بڑھ کر ذلت کیا ہوگی کہ ایک

مرد طاقت کے کل پر اسے بے آبرو کر دے۔ فتح خان اور اس

کے ساتھیوں نے شہلا کے ساتھ یہی کیا تھا۔ اس نے مجھے یہ

بات نہیں بتائی تھی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ صرف فتح خان ذلت دار

تھا لیکن اس کے ساتھی بھی شہلا کو بستی گزگا سمجھ چکے تھے۔ میں

نے فتح خان کے ساتھی کا سر پوری قوت سے زمین پر

مارا۔ پوری قوت سے یوں مارنا بڑا کہ فرش پر قالین اور اس

کے نیچے انڈر لے تھا اس لیے وہ اتنی آسانی سے بے ہوش

نہیں ہوتا۔ بہر حال یہ وار کافی ثابت ہوا اور ایک کراہ کے

ساتھ وہ بے ہوش ہو گیا۔ اگر اتنی قوت سے میں اس کا سر پکے

قرش سے ٹکراتا تو اس کے سر کے کئی ٹکڑے ہو جاتے اور اس

میں جمع سارا گند بہہ جاتا۔ میں کھڑا ہو گیا اور شہلا سے کہا۔

"امید ہے اب تم سکون سے بیٹھو گی، یہ تین چار گھنٹے

سے پہلے ہوش میں نہیں آئے گا۔"

وہ چپ رہی اور میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ سفیر اور

وسیم باہر موجود تھے اور سب سن اور سمجھ چکے تھے۔ لیکن

انہوں نے بھی اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی۔ پانچ بج چکے

تھے۔ میں نے عبداللہ سے رابطہ کیا۔ "کوئی پروگریس؟"

"ابھی تک پوسٹ آفس کے ملازم کی کال نہیں آئی۔"

"کہیں وہ ڈبل کر اس نہ کر جائے۔"

"امید تو نہیں ہے، وہ دوسری پارٹی اور دوسری پارٹی

اس سے ناواقف ہے۔" عبداللہ نے کہا اور بولا۔ "ایک

منٹ جناب دوسرے موبائل پر کال آرہی ہے۔" مجھے ہولڈ

کے سامنے مروں۔“ اس نے جذباتی ہو کر کہا۔
 ”اللہ تمہیں لمبی عمر اور ہمت دے۔“
 ”پلیز ہمارے پاس وقت کم ہے اور ان پر ابھی بہت کام کرنا ہے۔“ بیوی پارلروالی بولی۔
 ”ٹھیک ہے آپ اپنا کام کریں۔“ میں نے سعدیہ کا سر تھپایا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ بیٹو والے کمرے میں دیم کی تیاری جاری تھی۔ عبداللہ نے اندازے سے اس کے ناپ کے مطابق کئی سوٹ منگوا لیے تھے اور اب وہ پیمن پیمن کران کو چیک کر رہا تھا۔ یہ سب تھری جین سوٹ تھے کیونکہ ناپ کی شیروانی اور کرتا شلوار ملنا ممکن نہیں تھا۔ جوتے موزے اور ٹائیوں کا سیٹ الگ تھا۔ اسے تیار ہوتا دیکھ کر میں باہر آیا تو کوشی کے لان میں ٹیٹ کا سامان اتر رہا تھا اور سفیر اس کام کی نگرانی کر رہا تھا۔ یہ کام بھی عبداللہ کا تھا۔ میں نے اسے کال کی تو وہ پوسٹ آفس کے پاس موجود تھا۔ وہ اپنے دو آدمیوں کے ساتھ خود گمرانی کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔
 ”آفس بند ہو چکا ہے اور آس پاس بھی دیرانی ہے کوئی مشکوک فرد نظر نہیں آ رہا ہے۔“
 ”تب اس شخص کو بلا لو جس کے پاس چابیاں ہیں اور لفافہ نکال لو۔“
 ”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کیونکہ جتنی احتیاط سے معاملہ کر سکتے تھے وہ کر لیا ہے اور اب تک کوئی مشکوک فرد نظر نہیں آیا ہے جو اس جگہ کی نگرانی کر رہا ہو۔“
 ”تمہارے ساتھ کتنے آدمی ہیں؟“
 ”تین اور ہیں ان میں سے ایک وہ ہے جس نے پوسٹ بکس نمبر لیا تھا۔ ہم پوری طرح تیار ہیں۔“ اس نے کہا۔ تیار ہونے کا مطلب تھا کہ وہ اسلحے سے پوری طرح مسلح تھے اور ہر قسم کی صورت حال سے نمٹ سکتے تھے۔ میں نے کہا۔
 ”ٹھیک ہے یہ کام نساؤ اور واپس آ جاؤ۔“
 ٹیٹ اور سامان لانے والے اپنا کام کر رہے تھے۔ ابھی سینک میں خاصا وقت تھا۔ سب مصروف تھے اور میں فارغ تھا اس لیے اندر کنٹرول روم والے حصے میں آیا جہاں کمپیوٹر اور انٹر میٹ کی سہولت بھی تھی۔ یہاں کئی کمپیوٹر تھے اور عبداللہ کا ایک آدمی نگرانی کر رہا تھا۔ میں نے کچن میں کام کرنے والے منیر کو کال کر کے کافی لانے کو کہا اور اپنا ای میل اکاؤنٹ کھولنے لگا۔ میری توقع کے عین مطابق اس میں ایمن شاکی کئی میلز تھیں اور ایک آج صبح ہی آئی تھی۔ ان سب

”لیکن شہ بادلے کو گود میں بٹھانا ہوتا ہے یہ تمہیں گود میں کس طرح بٹھائے گا؟“ میں نے شرارت سے کہا۔
 ”اسے چھوڑو ہم گود میں نہیں بیٹھے گا۔“ بیٹو نے دیم کا بازو پکڑا۔ ”وسیم بھائی میرے ساتھ آؤ۔ عبداللہ بھائی نے تمہارے لیے سوٹ منگوائے ہیں ابھی چیک کرنا ہے کون سا تم کو پورا آئے گا۔“
 دیم نے بے چارگی سے مجھے دیکھا اور اس کے ساتھ چلا گیا۔ سفیر پہلے ہی اپنی بیگم کے پیچھے جا چکا تھا۔ ایاز کا سامان اور کپڑے یہیں موجود تھے وہ بھی تیار ہونے چلا گیا اور میں نے سعدیہ کے کمرے کا رخ کیا لیکن وہ وہاں نہیں تھی۔ عبداللہ کے دو آدمی کمرے کو حلقہ عروسی میں بدلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ سعدیہ بیٹو کے کمرے میں تھی اور بیوی پارلروالیاں اسے تیار کر رہی تھیں۔ میں اندر آیا تو اس نے جلدی سے پاس رکھا دوپٹا اوڑھ لیا کیونکہ وہ ویکس کر رہی تھی اور سیلوئس شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ اسے تیار کرنے والیاں براہم ہو گئیں۔ ایک بولی۔
 ”آپ اندر کیوں آئے؟“
 ”یہ آسکتے ہیں یہ میرے بھائی ہیں۔“ سعدیہ نے جلدی سے کہا۔
 ”ہاں میں اس کا بھائی ہوں۔“ میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ”آج میری بہن دلہن بننے والی ہے۔“
 سعدیہ شرمائی تھی پھر اس نے کہا۔ ”مونا نے جب بتایا تو میں کبھی کہہ نہ سکتی کہ وہ مذاق کر رہی ہے۔“
 ”مجھے افسوس ہے کہ ہم اس طرح جلدی میں یہ شادی کر رہے ہیں ورنہ سوچا تو یہ تھا کہ تمہیں دھوم دھام سے دیم کے ساتھ کسی دوسرے گھر میں رخصت کریں گے۔“
 ”جی نہیں۔“ اس نے جلدی سے کہا۔ ”میں نے کہیں نہیں جانا ہے آپ سب کے ساتھ رہنا ہے۔“
 ”تو ہم تمہیں کہاں بھیج رہے ہیں؟“
 ”ایک دم سعدیہ اداس ہو گئی اور اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ ”شوہن آپ جانتے ہیں میرا آپ کے سوا کوئی نہیں ہے۔ وسیم سے میرا قانونی رشتہ ہے لیکن آپ سے میرا دل کا رشتہ ہے۔ آپ کبھی مجھے مت چھوڑ دے گا۔“
 ”بہ شرط زندگی... نہیں چھوڑوں گا۔“ میں نے اسے یقین دلایا۔
 ”اللہ آپ کو لمبی عمر دے اور جب میں مروں تو آپ

سارے دروازے اور مین گیٹ لاک کر دیا۔ جب ہم کوشی پہنچے تو وہاں باقاعدہ شادی کا سماں پیدا ہو گیا تھا۔ سعدیہ کو تیار کیا جا رہا تھا۔ مونا نے اپنی واقف کار ایک بیوی پارلروالی بولی تھی اور اسی طرح ایک بوتیک کی مالک اس کی دوست تھی مونا کے کہنے پر وہ عروسی ملبوسات اور ایک فنگ کرنے والے کو بھی ساتھ لے آئی تھی۔ میں اور سب حیران رہ گئے۔
 ”یہ کیا چکر ہے؟“ میں نے مونا سے پوچھا۔
 ”شادی کا چکر ہے آپ نے ہی تو کہا تھا کہ آج وسیم اور سعدیہ کی شادی کرنی ہے۔“ وہ معصومیت سے بولی۔
 ”لیکن یہ اتنے لوگوں کو بلا نے کی کیا ضرورت تھی؟“ میں نے دانت پیس کر کہا۔ ”ہم یہاں چھپنے آئے ہیں یا سارے زمانے کو بتانے کے؟“
 ”اتنے لوگ کہاں ہیں، دو بیوی پارلروالیاں ہیں اور دو بوتیک کے لوگ ہیں۔“ اس نے برامان کر کہا۔ ”اس سے زیادہ تو عبداللہ نے بلوائے ہیں کھانے کے ساتھ آئیں گے کیٹرنگ والے۔“
 میں نے سر پر ہاتھ مارا۔ ”یہ عبداللہ بھی دیوانہ ہو رہا ہے۔“
 وسیم بھی پریشان ہو گیا تھا اس نے مجھ سے کہا۔ ”شہباز صاحب یہ ٹھیک نہیں ہو رہا ہے۔ اگر ہمارے دشمن اس کو کوشی کے بارے میں شک رکھتے ہیں تو آج کے بعد ان کو یقین ہو جائے گا۔“
 ایاز خوش تھا اس نے کہا۔ ”جناب اس طرح پھینکی تقریب کا مزہ بھی نہیں آتا اور جہاں تک خطرے کی بات ہے تو وہ ہمیشہ ہمارے آس پاس ہوتے ہیں۔“
 اتنے میں اندر سے بیٹو نکل کر وسیم سے لپٹ گیا۔ ”وسیم بھائی بدھائی ہو آپ دلہا بننے والا ہے۔“
 ”مجھے تو لگ رہا ہے میں بدھو بننے والا ہوں۔“ وہ بھٹا کر بولا۔
 ”ریلیکس بار۔“ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔
 مجھے ایاز کی بات اچھی لگی تھی کہ ہمیں بہت زیادہ غفیس ہونے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ خطرے ہمیشہ ہمارے آس پاس رہتے ہیں۔ ”جو ہوتا تھا وہ ہو گیا ہے اب انجوائے کرو۔“
 ”یہ تو ہم بھی کہتا ہے۔“ بیٹو بولا۔ ”وسیم بھائی آپ کا وہ ہم ہے جو ہر شادی میں دلہا کے ساتھ ہوتا ہے۔“
 ”شہ بالا۔“ ایاز نے کہا۔ ”لیکن وہ تو بچہ ہوتا ہے۔“
 ”تو ہم کون سا بڑا ہے آپ ہی تو کہتا ہے ہم ابھی بچہ

کرا کے وہ کال سننے لگا۔ ایک منٹ بعد واپس آیا۔ ”شہباز صاحب کام ہو گیا ہے۔ ایک آدمی کچھ دیر پہلے لفافہ پوسٹ آفس میں دے گیا ہے۔“
 ”گڈ اب آدمی سے کہو کہ مستقل پوسٹ آفس کے بندے سے رابطہ میں رہے۔ دوسرے آدمی بھیجے؟“
 ”وہ روانہ ہو رہے ہیں کیونکہ انہوں نے چھپ کر کام کرنا ہے اس لیے گیٹ آپ کر کے روانہ ہوں گے۔ ایک فقیر بنے گا اور ایک غبارے بیچنے والا۔“
 ”ٹھیک ہے لیکن ان کو سچ اور پوری طرح ہوشیار ہونا چاہیے۔“ خان اور اس کے ساتھی سفاک بھیڑ لیے ہیں۔
 ”میرے ساتھی بھی کم نہیں ہیں جناب۔“ اس نے اعتماد سے کہا۔
 ”میں جانتا ہوں تمہارے تربیت کے لحاظ سے فتح خان کے آدمیوں سے اچھے ہیں لیکن ان میں ایک کمی ہے وہ کسی کو بے دریغ قتل نہیں کر سکتے، فتح خان کے آدمی یہ کام کرتے ہیں۔ اس لیے اپنے آدمیوں کو پوری طرح ہوشیار رہنے کا کہو۔ کسی بھی ہنگامی صورت میں وہ دشمن کو رعایت نہ دیں اور شوٹ ٹوکل کی پالیسی پر عمل کریں۔“
 ”ٹھیک جناب۔“ عبداللہ نے کہا۔ میں نے اسے وسیم کے ویسے کے بارے میں بتایا تو وہ خوش ہو گیا۔ کال ختم کر کے میں نے سفیر اور وسیم کو صورت حال سے آگاہ کیا اور بولا۔ ”سورج ڈوسٹے ہی ہمیں یہاں سے عبداللہ والی کوشی کی طرف روانہ ہونا ہے۔“
 ”ان دونوں کا کیا ہوگا؟“
 ”یہ یہاں بندھے رہیں گے۔ رات کو میں اور بیٹو یہاں آ جائیں گے۔ ایاز بھی ہوگا لیکن یہ ہے کہاں؟“
 ”گاڑیوں کا کچھ سامان چاہیے تھا وہ لینے گیا ہے چھ بجے تک آ جائے گا۔“
 ”ٹھیک ہے ہم اس کے آتے ہی روانہ ہو جائیں گے۔“
 ایاز چھ بجے سے پہلے آ گیا۔ وہ اپنی جیب میں تھا اسے وسیم کے ویسے کے بارے میں پتا چلا تو وہ بھی خوش نظر آنے لگا۔ میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا اور سفیر اور وسیم منی بھیج دیں آگئے۔ یہاں پر یہ دو گاڑیاں تھیں باقی دو گاڑیاں اور بانیک عبداللہ کی کوشی پر تھی۔ روانہ ہونے سے پہلے ایک نظر شہلا اور فتح خان کے ساتھی کو دیکھا۔ شہلا کو بتایا نہیں کہ ہم یہاں سے جا رہے ہیں ورنہ وہ ابھی سے واویلا مچانا شروع کر دیتی۔

”مجھ پر جس وائرس کا تجربہ کیا گیا تھا وہ خاص طور سے اتنا طاقتور بنایا گیا ہے کہ انسان صرف تین دن میں مر جاتا ہے اور اس کا کوئی علاج نہیں ہے، اسے خاص طور سے حیاتیاتی ہتھیاروں کے لیے بنایا جا رہا ہے۔“

”شکر ہے تمہیں کچھ نہیں ہوا۔“

”بس اللہ کو بچانا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”کیا تم مجھے ڈیوڈ شا کا کوئی رابطہ کا نمبر دے سکتی ہو؟“

”میرے پاس اس کا پرسنل نمبر نہیں ہے لیکن اس کی رہائش گاہ کا نمبر دے سکتی ہوں۔ تم ایک منٹ ہولڈ کرو جب میں نمبر دہرائوں تو لکھ لینا۔“ ایمن نے کہا اور شاید دوسرے فون سے آپریٹر کو کال کی اور اس سے ڈیوڈ شا کی رہائش گاہ کا فون نمبر مانگا۔ آپریٹر اسے نوٹ کرانے لگا اور وہ بلند آواز سے کہہ رہی تھی جسے میں نے اپنے پاس نوٹ کر لیا۔ وہ فون بند کر کے واپس موبائل پر آئی۔ ”تمہیں نمبر کا کیا کرنا ہے؟“

”اسے اطلاع دینی ہے کہ ہم میں جو معاہدہ ہوا تھا اب میں اس کا پابند نہیں ہوں۔“

ایمن فکر مند ہو گئی تھی۔ ”شہباز اس سے جو ذیل بھی کرو بہت سوچ سمجھ کر کرنا، وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔“

”میں جانتا ہوں۔“ میں نے کہا اور پھر اسے یاد دلایا۔ ”لیکن کیا تم نے سوچا ہے کہ تم برٹ شا کی تلاش کی کوشش کر رہی ہو تو ڈیوڈ شا کا کیا رد عمل ہوگا۔ وہ برٹ شا کی جاگیر اور خطاب پر قابض ہے۔ کیا وہ اس سے دست بردار ہونے کو تیار ہو جائے گا؟“

ایمن کچھ دیر چپ رہی پھر اس نے کہا۔ ”نہیں وہ کسی صورت یہ بات برداشت نہیں کرے گا۔ لیکن میرا خیال ہے اسے خبر نہیں ہوگی۔“

”یہ تمہاری غلط فہمی ہے یہاں اس کے ایجنٹوں کی کمی نہیں ہے اور وہ سرکاری اداروں میں بھی ہیں وہ اسے فوراً خبر کریں گے۔ بلکہ میں نے دیکھا ہے یہاں اس کا اتنا اثر و رسوخ ہے کہ وہ کیس کو کھلنے ہی نہیں دے گا اور فارن آفس کی جانب سے تمہیں اطلاع ملے گی کہ دوبارہ تفتیش کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا ہے۔“

”مجھے اس کا خیال آیا تھا اس لیے میں نے خود پاکستان آنے کا فیصلہ کیا ہے۔“

”ممکن ہے اس کا کوئی فائدہ ہو لیکن سچ کہوں تو مجھے تمہاری ذات کے لیے بھی خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ تم ایک سفید فام ہو اور یہاں کسی سفید فام کو نشانہ بنا کر الزام کچھ

سے لگے ہوئے ہیں اور ان کی انکوائری نہیں ہوتی ہے لیکن کیونکہ برٹ شا کا تعلق ہمارے آقاؤں کے آقاؤں سے ہے اس لیے میرا خیال ہے تفتیش ضرور ہوگی تو مس ایمن شا و یلکم نو پاکستان۔“

وہ ہنسی۔ ”ابھی تو میں نہیں آئی ہوں۔“

”لیکن میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے۔“

”شوہن تم مجھے یاد کرتے ہو؟“ اس کا لہجہ ذرا دھمک ہو گیا۔

”ہاں تم کوئی بھولنے والی چیز نہیں ہو۔ جیسے تمہارے انکل ڈیوڈ کو میں بھی نہیں بھول سکتا۔“

”مجھے اس سے کیوں ملتا ہے ہو۔“ وہ ناراض ہو گئی۔ ”مجھے نفرت ہے اس شخص سے جو بد قسمتی سے میرا انکل بھی ہے۔“

”اس نے چند دن پہلے مجھے مردانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔“ میں نے کہا اور ایمن کو ڈیوڈ شا سے کہے جانے والی معاہدے کا بتایا جو اب باقی نہیں رہا تھا کیونکہ مرشد نے اس کی دجیاں کھیر دی تھیں جب کہ ڈیوڈ شا ابھی پاکستان میں تھا۔ ایمن حیران رہ گئی۔ اس نے کہا۔

”میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ ڈیوڈ جیسا مغرور اور سفاک آدمی کسی کے آگے اتنا جھک سکتا ہے۔ آخر وہ تمہارے لیے اتنا بے یقین کیوں ہے؟“

”میں یقین سے نہیں کہہ سکتا شاید وہ مجھے کہیں استعمال کرنا چاہتا ہے۔“ میں نے اداوی کا ذکر کرنے سے گریز کیا۔

ایمن نے خود اداوی کا ذکر نکال لیا۔ ”ڈیوڈ شا کسی سفر سے واپس آیا تھا کہیں وہ اسی وادی کی طرف تو نہیں گیا تھا؟“

”ممکن ہے مجھے اس بارے میں علم نہیں ہے البتہ یہ معلوم ہوا ہے کہ ڈیوڈ شا پاکستان میں باپو لو جیکل دین پر کام کر رہا ہے فری لانسر ہے۔“

”وہ اسی قسم کا آدمی ہے۔ لیکن تمہیں کیسے پتا چلا؟“

”میں خود یہاں اس کے لوکل ایجنٹ کا نشانہ بنا اور مرتے مرتے بچا۔ اس نے مجھے ایولا وائرس لگا دیا تھا میرے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی اور وہ مر گئی لیکن میری زندگی تھی اس لیے بچ گیا۔“

”ایولا وائرس۔“ اس کی آواز میں خوف آ گیا تھا۔ ”یہ تو بہت خطرناک وائرس ہے، افریقا میں اس نے اس کا شکار ہونے والے افراد کو بہت اذیت سے مرتے دیکھا ہے۔“

”سوری اگر تمہیں برا لگا ہے۔“ اس نے دھیمے انداز میں کہا۔

”اٹس اوکے۔“ میں نے بات ختم کی اور موضوع بدل دیا۔ ”تم کیا کر رہی ہو آج کل؟“

”ابھی افریقا کے پتے صحرا سے آئی ہوں اور کل کینیڈا کے ایک برف زار کی طرف روانگی ہے لیکن اصل خبر یہ ہے میں دو ہفتے بعد پاکستان میں ہوں گی۔“

”یہاں کوئی خاص مقصد؟“

”ہاں ڈیوڈ کے بارے میں ایک کلیڈ ملا ہے۔ میں نے فارن آفس کے توسط سے کیس ری اوپن کرنے کو کہا ہے۔“

”کیسا کلیڈ؟“

”مجھے ڈیوڈ کا خط ملا ہے۔ اگرچہ بہت چھوٹا سا اور بغیر نام کے ہے لیکن مجھے یقین ہے یہ ڈیوڈ کا خط ہی ہے اور اسے پاکستان کے علاقے سوات سے پوسٹ کیا گیا ہے۔“

برٹ شا اسی علاقے میں فتح خان کی قید میں تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے خط لکھنے کا موقع کس نے دیا۔ فتح خان سے تو اس حماقت کی امید نہیں تھی ممکن ہے برٹ شا کے نگران کو اس پر ترس آ گیا ہو۔ مجھے یاد تھا کہ وہ ذہنی طور پر پسماندہ شخص تھا جسے فتح خان نے برٹ شا کی نگرانی پر لگا رکھا تھا۔ اپنی ذہنی پسماندگی کے باوجود وہ شخص اس قابل تھا کہ برٹ شا کی نگرانی کر سکتا تھا بھی اسے فتح خان نے اس کام پر لگایا تھا۔ میں نے ایمن سے پوچھا۔ ”کیا بینڈ رائٹنگ برٹ شا کی ہے؟“

”یہ خاکی کاغذ پر شاید کوئلے کی مدد سے لکھا گیا ہے تم رائٹنگ کا اندازہ کر سکتے ہو پھر بھی میں نے یہاں تحریر کے کئی باہرین کو دکھایا ہے اور ان کی متفقہ رائے ہے کہ بعض الفاظ یقینی طور پر ڈیوڈ کے انداز میں لکھے گئے ہیں۔“

”کیا صرف ایک مبہم خط کی بنیاد پر حکومت پاکستان ایک برسوں پرانے کیس کو ری اوپن کرے گی؟“

”میں نے یہاں فارن آفس کو تو قائل کر لیا ہے اور اس کی جانب سے درخواست پاکستان کے فارن آفس کو چلی گئی ہے۔ میرا خیال ہے حکومت پاکستان بھی انکار نہیں کرے گی۔“

”ہاں، غلاموں میں انکار کی جرات بھی کہاں ہوتی ہے۔“ میں نے جی سے کہا۔ ”یہاں ہزاروں کیس برسوں

میں ایک ہی سوال تھا کہ میں کہاں ہوں اور اس سے رابطہ کیوں نہیں کر رہا ہوں؟ اس نے اپنے کئی فون نمبر بھی دیے تھے۔ ایک گھر کا تھا، ایک دفتر کا اور اس کا ذاتی موبائل نمبر تھا۔ جتنی دیر میں میل چیک کی سیر کافی لے آیا۔ اس کی سروس کو نیک اور لا جواب ہوتی تھی۔

”شکر یہ یار۔“

”ویلکم سر۔“ اس نے شائستگی سے کہا۔ وہ کافی کے ساتھ کچھ کوکیز بھی لے آیا تھا۔ لیکن مجھے صرف کافی کی طلب تھی۔ سیر کے جانے کے بعد میں نے موبائل سے ایمن کا ذاتی موبائل نمبر ملایا۔ شاید پاکستان کا نمبر دیکھ کر اس نے فوراً کال ریسیو کی تھی کیونکہ دوسری تیل نہیں بجی تھی۔

”ہیلو کون ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”تم پہچان سکتی ہو۔“

”شہباز۔“ وہ چپک کر بولی۔ ”کہاں تھے تم، میں تمہیں ای میل کر کے تھک گئی ہوں۔“

”ابھی چپک کی ہیں اور تمہیں کال کر رہا ہوں۔“

”بس جب ای میل دیکھتے ہو تو میرا خیال آتا ہے۔“ اس نے شکوہ کیا۔ میں شرمندہ ہو گیا کیونکہ وہ سچ کہہ رہی تھی۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن یہاں تو یہ حال ہے کہ اپنا خیال بھی بہت کم آتا ہے۔“

”حالانکہ اب تمہارا خیال رکھنے والی آگئی ہے۔“ اس نے طنز کیا۔

”کیا مطلب؟“

”میرا اشارہ سویرا کی طرف ہے اب وہ تم سے شادی کرنے کے لیے آزاد ہے۔“

”یہ سب تمہیں کس نے بتایا؟“ میرا لہجہ سرد ہو گیا تھا۔

”میں صحافی ہوں اگرچہ شعبہ الگ ہے لیکن ہوں تو صحافی اپنے مطلب کی خبر نکال سکتی ہوں۔“

”ایمن تم میری جاسوسی کرتی رہی ہو۔“

”اگر کرتی بھی رہی ہوں تو میں تمہاری دشمن تو نہیں ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”تم جانتے ہو میرے دل میں تمہارا کیا مقام ہے۔“

”اگر تمہارے دل میں میرا کوئی مقام ہوتا تو تم مجھ سے اس طرح بات نہ کرتیں۔“ میں نے آہستہ سے کہا اگرچہ عبداللہ کا آدمی دور بیٹھا تھا اور مجھے امید تھی کہ اس تک میری آواز نہیں جائے گی۔



پاکیزہ
نومبر 2011ء
محبت خیر کی رنگینیاں

عمیرہ احمد..... عکس
عکس و عکس پہلے سلسلہ زندگی کے
پوشیدہ پہلوؤں کی کھوج و جستجو کا سفر

شیریں حیدر
شیشوں کا مسیحا کونسی نہیں
مسائل حیات متعلق مختلف زاویہ
نظر کو اجاگر کرتا ایک پرتاثر ناول

عالیہ بخاری..... خوشبو کا سفر
محبت اور جنگ میں سب کچھ جانتے سمجھنے والے
دیوانوں کا ماز..... سلسلہ وار ناول اختتامی مراحل میں

راحت ونا..... ایک تھی نیناں
انسانی ذہن کی نفسیاتی الجھنوں کی کیفیات اور
احساسات کے گرد گھومتا سلسلہ وار ناول

سدرۃ المنتہی
کا دلکش و خوب صورت جذبول میں ڈھلانا ولٹ
لبنی عروج قرۃ العین رائے، رفاقت جاوید
شمیم فضل خالق، محیہ عدنان
اور دیگر مصنفات کی دلچسپ اور یادگار تحریریں
آپ کی آواز رسالت سے مستقل سلسلہ

کیا آپ نے اس ماہ کا ایگزیکٹو نمبر نہیں اگمال ہے!

پہلے تیار ہو کر آگیا تھا۔ اس کے پاس تھری جیس سوٹ نہیں تھا
اس لیے اس نے پینٹ شرٹ کے ساتھ کوٹ نما جیکٹ لے لی
تھی اور اس میں اچھا لگ رہا تھا۔ اس میں ہوا کی آمد و رفت
کی گنجائش نہیں تھی اس لیے سردی کا اثر بھی کم تھا۔ دلہا اور دلہن
کے لیے خوب صورت چھوٹا سا ساج بنایا گیا تھا جس پر چار عدد
صوف نما کرسیاں رکھی تھیں۔ نیچے بھی صوف نما کرسیاں رکھی تھیں
لیکن یہ ساج والی کرسیوں سے مختلف تھیں اور ایک لمبی میز کے
دونوں طرف رکھی تھیں۔ رات کے نو بجنے والے تھے اور ابھی
تک عبداللہ اور اس کے ساتھی نہیں آئے تھے۔ میں اسے کال
کرنے والا تھا کہ وہ آگیا۔ اس کی سیاہ شیشوں والی جیب اندر
آئی تھی۔ وہ اتر کر سیدھا میرے پاس آیا اس کی مسکراہٹ بتا
رہی تھی کہ اسے کامیابی ہوئی ہے۔ اس نے جیب سے لفافہ
 نکال کر میرے حوالے کیا اور بولا۔ ”آپ کو شادی کا ارنج
منٹ کیسا لگا؟“

”شاندار۔“ میں نے کہا۔ ”میں تو حیران ہوا تھا تم نے
اتنی جلدی سب کر لیا۔“
”اور پوری رازداری سے۔“ وہ بولا۔ ”مونا بی بی نے
جن خواتین کو بلایا ہے وہ بھی نہیں جانتیں کہ وہ کہاں آئی ہیں
ان کو ایک بندوین میں لایا گیا تھا اور اسی طرح واپس لے
جائیں گے۔“
”گڈ۔۔۔ بس میں اسی چیز سے پریشان تھا کیونکہ یہ
سب مونا کی واقف کاری ہیں۔“

”جی مجھے معلوم ہے اور میں نے اسی لحاظ سے
بندوبست کیا ہے۔ وسم اور باقی کہاں ہیں؟“
”میرا خیال ہے تیار ہو رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔
”میں بھی چیخ کر کے آتا ہوں۔“

”میں ذرا انتظامات دیکھ لوں۔“ عبداللہ بولا اور اپنے
آدمیوں کی طرف چلا گیا۔ میں اندر آیا جہاں وسم تیار تھا اور
سعدیہ تیاری سے گزر رہی تھی۔ وسم نے مجھ سے کہا۔ ”یہ کیا
جناں میں آدھے گھنٹے میں تیار ہو گیا اور ابھی دلہن آدمی بھی
تیار نہیں ہوئی ہے۔“

”بس بھائی باقی زندگی میں بھی ایسا ہی ہوگا۔“ میں
نے کہا اور اپنے لیے ایک سوٹ نکالا۔ یہ سوٹ دیکھ کر مجھے
زرین یاد آئی کیونکہ اسی نے پسند کر کے یہ سوٹ لیا تھا اور مجھے
پہننے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ میں نے اسے منیر کو پرپس کرنے
کے لیے دیا اور خود ہاتھ روم میں گھس گیا۔ نہا کر آیا تو سوٹ
استری ہو کر آگیا تھا۔ بیو بھی سوٹ پہن کر آئیے کے سامنے

دی۔ میری خوش قسمتی کہ میرے ساتھی مجھے تلاش کرتے آ گئے
ورنہ میں اس وقت کسی نامعلوم قبر میں پڑا ہوتا۔“
”مارشل کا کہنا ہے تمہارے ساتھیوں نے دھوکا کیا اور
حملہ کر کے مارشل کے آدمیوں کو قتل کر دیا، جب وہ تمہیں ان
کے حوالے کرنے گیا تھا۔“

”ہمیں ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی جبکہ میں
ویسے ہی آزاد ہو رہا تھا اور دوسرے جب مارشل کے آدمی
مارے گئے تو وہ کیسے بچ گیا؟“

ڈیوڈ شا پچھ دیر کے لیے چپ ہوا تھا پھر اس نے
کہا۔ ”تم دونوں کی باتوں میں مکمل تضاد ہے اب میں کس کی
بات مانوں۔“

”میں نے تمہیں بات کلیئر کرنے کے لیے نہیں بلکہ یہ
بتانے کے لیے کال کی ہے کہ اب ہمارا معاہدہ ختم ہے۔ تم
اپنے دیے عہد کے مطابق مرشد کو پناہ ڈال کر نہیں رکھ سکتے اس
لیے میں بھی اس معاہدے سے آزاد ہوں۔“ میں نے واضح
کرتے ہوئے کہا اور پھر ذرا جیسے لہجے میں بولا۔ ”ویسے مجھے
بڑی مایوسی ہوگی اگر مارشل جیسی سطح کے لوگ بھی تمہیں
بے وقوف بنا جائیں۔“

”مجھے کوئی بے وقوف نہیں بنا سکتا ہے لیکن تمہارے
پاس کیا ثبوت ہے کہ مارشل نے تمہیں مرشد کے حوالے
کرنے کی کوشش کی تھی اور تم اپنی عقل مندی سے کام لے کر
بچ نکلے؟“ اس کا انداز استہزا سے تھا۔

”یہ سوال تو تمہیں مارشل سے پوچھنا چاہیے تھا۔ تمہارا
تخواہ داروہ ہے میں نہیں..... لیکن اگر تمہاری ذاتی عقل
اس معاملے میں کام نہیں کر رہی ہے تو مارشل کے موبائل نمبری
اس دن اور وقت کی کالز چیک کرالو جو میرے آدمی کے نمبر پر
کی گئیں تھیں۔ تمہارا اتنا اثر و رسوخ تو ہے پاکستان میں کہ
موبائل کال لوکیشن نکلوا لو۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ ہم
کو فوری طور پر موبائل سے الگ کر دیا اور ساتھ ہی اسے توڑ کر
ڈسٹ بن میں پھینک دیا کیونکہ فتح خان یا مرشد کی بات
دوسری تھی لیکن ڈیوڈ شا اس معاملے میں خطرناک آدمی تھا اس
کے لیے بالکل ممکن تھا کہ وہ انگلیف میں ہوتے ہوئے یہاں
میرے موبائل کی لوکیشن کا سراغ لگوا لے۔ مجھے اس کا تجربہ
بھی ہو چکا تھا۔

مجھے ایمین اور پھر اس کے چچا سے بات کرتے ہوئے
خاصی دیر ہو گئی تھی، باہر یقیناً بہت کچھ ہو چکا تھا۔ میں اٹھ کر
باہر آیا تو لان میں بالکل بیک ٹینٹ لگ گیا تھا۔ ایاز سب سے
پہلے آگیا تھا۔

”میرے ساتھیوں نے اچھا نہیں کیا۔“
”اچھا تمہارے آدمی مارشل نے نہیں کیا، ابھی تم
پاکستان کی فضاؤں میں تھے اور اس نے تمہارے کیے
معاہدے کی دھجیاں اڑاتے ہوئے مرشد سے میرا سودا کر
لیا۔ اس نے مجھے مرشد کے حوالے کرنے کی کوشش کی اور راز
کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے دونوں آدمیوں کو بھی گولی مار

مخصوص کردہ نہیں پر لگاتا بہت آسان ہے۔ یہ کیس بھی بعد میں
بے نام و نشان رہ جائیں گے۔“
”میں جانتی ہوں اس کے باوجود میں ڈیوڈ کی تلاش
کے لیے پاکستان ضرور آؤں گی۔“ اس کا لہجہ ٹھوس اور فیصلہ
کن تھا۔

میں نے گہری سانس لی۔ ”ٹھیک ہے لیکن وعدہ کرو کہ
تم اپنی حفاظت پر پوری توجہ دو گی۔“
”شہباز تمہیں میری حفاظت کی پروا ہے؟“ اس نے
آہستہ سے کہا۔

”ہاں ہے۔“
وہ کھل اٹھی تھی۔ کم سے کم اس کی آواز سے ایسا ہی لگ
رہا تھا۔ ”تب میں ضرور اپنی حفاظت کروں گی، آئی لو یو۔“
اس نے ایک پر شور چکار کے ساتھ کہا اور فون بند کر دیا۔ میں
نے موبائل رکھ کر سر سہلایا۔ ایمین شا کے سر سے میرا سودا نکلا
نہیں تھا اور وہ ست روی سے صحیح لیکن میری جانب پیش قدمی
کر رہی تھی یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں سویرا سے محبت کرتا
ہوں اور اس کے سوا کسی کا نہیں ہو سکتا۔ میں کسی اور کا نہیں ہو
سکتا ہوں۔ اگر ایمین مجھ سے مخصوص مغربی طرز کی محبت چاہتی
ہے تو یہ بھی میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ اسے میری ذات سے
سوائے مایوسی کے اور کچھ نہیں ملے گا۔ بہر حال یہ اس کی
چوٹ تھی میری نہیں اس لیے انجام بھی اسے برداشت کرنا تھا
مجھے نہیں۔ میں نے کاغذ پر لکھا ڈیوڈ شا کے گھر کا نمبر دیکھا اور
موبائل میں وہ ہم ڈالی جسے میں نے صرف دشمنوں سے بات
کرنے کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ نمبر ملانے پر دوسری تیل پر
شاید ڈیوڈ شا کے بلکرنے کا ریسپیو کی۔

”شاہاؤس ہوا زدیئر۔“
”مجھے ڈیوڈ شا سے بات کرنی ہے۔“ میں نے کہا۔
”یورنیم پلیز سر؟“

”شہباز ملک۔“ میں نے کہا تو اس نے ایک منٹ
ہولڈ کرنے کو کہا۔ ایک منٹ بعد ڈیوڈ شا لائن پر تھا۔ اس نے
آتے ہی کہا۔

”شہباز ملک تم نے اچھا نہیں کیا۔“
”اچھا تمہارے آدمی مارشل نے نہیں کیا، ابھی تم
پاکستان کی فضاؤں میں تھے اور اس نے تمہارے کیے
معاہدے کی دھجیاں اڑاتے ہوئے مرشد سے میرا سودا کر
لیا۔ اس نے مجھے مرشد کے حوالے کرنے کی کوشش کی اور راز
کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے دونوں آدمیوں کو بھی گولی مار

باقریلی داستان گو

داستان گوئی میں میر باقر علی نے خصوصی شہرت حاصل کی تھی، انہیں یہ فن اپنے تھیال سے ملا تھا۔ ان کے تانا میرا میر علی اور ماموں میر کاظم علی کا حلق دہلی دربار سے تھا۔ یہ دونوں مانے ہوئے داستان گو تھے۔ 1850ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام میر حسین علی تھا۔ کم عمری میں والد کے انتقال کے بعد تھیال میں پرورش پائی اور غالباً تانا ماموں کے ساتھ داستان گوئی کی محفلوں میں شرکت سے بچپن ہی سے داستان گوئی سے رغبت پیدا ہو گئی ہوگی اور انکی رغبت ہوئی کہ اس فن میں امام کا درجہ پایا۔ 18 مارچ 1928ء کو دہلی میں انتقال ہوا۔

شاہد احمد دہلوی نے ان کی داستان گوئی کی محفل کا نقشہ یوں کھینچا ہے: ”اعلیٰ اعلیٰ چاندنیوں کے فرش بچھ جاتے، میر صاحب کے لیے ایک چھوٹا سا تخت بچھا دیا جاتا، اس پر قالین اور گاکوئیں ہوتا۔ سامنے گاکوئیں سے لگ کر بیٹھ جاتے، پان اور حقہ کا دور چلتا رہتا۔ گریوں میں شربت اور چاڑوں میں چائے سے تواضع کی جاتی۔ یہ صاحب تخت پر براجمان ہوتے۔ کٹورے یا گلاس میں پانی منگواتے، جیب سے چاندی کی ڈبیا اور چاندی کی چھوٹی سی پیالی نکالتے، ڈبیا میں سے افیون کی گولی نکالتے، اسے دوائی میں لپیٹتے، پیالی میں تھوڑا سا پانی ڈال کر اسے گلاس میں گھولتے رہتے اور دوستوں سے باتیں کرتے رہتے۔ جب ساری افیون کھل کر پانی میں آ جاتی تو رووائی آگال دان میں چھینک دیتے اور گھولنے کی گولی لگا لیتے۔ اس کے بعد چائے کا ایک گھونٹ پیتے، فرماتے ”چائے کی خولی یہ ہے کہ لب بند، لب ریز اور لب سوز ہو“ پھر داستان شروع کر دیتے۔“

داستان کس اسلوب میں بیان ہوتی، اس کی جھلک

ملاحظہ ہوا۔

”امیر امیر اسید، اچھی جوانی، آئینہ سپاہیت، چیتے کی سی کمر برس پلندہ کا با کہ سولہ کا سن جوانی کی رائیں مرادوں کے دن کاسی جوڑا پہنے، جام شرابہ گفنام ہاتھ میں لیے، مخمور بادہ نشاط، پیچھے دو خواتین پشتہ راں ہاتھوں میں، سامنے کچھ گائیں، ستارہ تہرہ، ڈانولک کے ساتھ دھیمے دھیمے سڑوں سے چھوٹے چھوٹے دھن اور بھاگ کے خیال گاری ہیں جوئی نگہ شاہزادے کی ان جادو ادا پر پڑی، مرغ دل تیرنگہ ناز کا شکار ہوا۔“

اقتباس: اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ از ڈاکٹر سلیم اختر تلاش: انٹرنیٹ جیل صدیقی

چلتی رہی تھی۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ اب دیر ہو گئی ہے۔ ابھی مجھے، بیٹو اور ایاز کو واپس جانا تھا۔ میں نے آہستہ سے سفیر سے کہا۔

”آج تو بھی یہیں رکے گا۔“

”بالکل نہیں میں تیرے ساتھ جاؤں گا۔“

”نکو اس نہ کر مونا آج اکیلی ہوگی تو اس کے پاس رکے گا۔ آخر وہ تیری بیوی ہے۔“

سفیر ہچکچایا لیکن جب میں نے زور دیا تو مان گیا تھا۔ رات کے بارہ بج رہے تھے اور میں سفر بھی کرنا تھا۔ میں کھڑا ہوا تو سب ہی کھڑے ہو گئے۔ اس بار سفیر نے وسیم کو روکنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ خود اسے بھی یہیں رہنا تھا اور وہ مونا کے پاس جانے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا اس پر بیٹو نے اس کا مذاق اڑایا۔ عبد اللہ واپس آ گیا تھا اس نے ہمارے ساتھ چلنے کو کہا۔

”وہ نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ بیٹو اور ایاز میرے ساتھ ہیں۔ تم آج سارا دن بہت مصروف رہے ہو آرام کرو“ میں نے کہا۔

گاڑیاں اب سب یہیں آ گئی تھیں۔ میں نے عبد اللہ سے کہا کہ ہماری اضافی گاڑیاں کہیں رکھوا دے تاکہ جب ضرورت پڑے ہم وہاں سے حاصل کر لیں۔ اس نے کہا کہ بندوبست ہو جائے گا۔ میں چاہ رہا تھا کہ ابھی ہم صرف دو گاڑیاں رکھیں چار زیادہ تھیں اور ان کو سنبھالنا بھی مشکل کام تھا۔ ایاز کی جیب تو لازمی تھی اس کے علاوہ میں نے مٹی بھر دی۔ یہ چھوٹی گاڑی تھی اور اسے استعمال کرنا آسان تھا۔ انٹرنیشنل کے بعد اس کی رفتار اور پک اپ بھی بہتر ہو گیا تھا۔ ایاز اپنی جیب لے کر نکلا اور میں اور بیٹو پیچھے رہ گئے۔ سردی تو غضب کی تھی۔ ساتھ ہی دھند بھی شروع ہو گئی اور جب ہم باہر نکلے تو دھند کی وجہ سے تین گز سے آگے دیکھنا دشوار ہو رہا تھا۔ میں نے ہیڈ لائٹس پوری طرح روشن کر دی تھیں۔ اس کے باوجود راستہ دیکھنے میں مشکل ہو رہی تھی اور ہماری رفتار کم تھی۔

ہم اسلام آباد کی حدود سے نکلے تو دھند میں کسی قدر کمی آئی تھی۔ اصل میں اسلام آباد میں سفیدے کے درخت بہت زیادہ ہیں اور یہ ہوا میں کھپ چھوڑتے ہیں جس سے دھند کی شدت میں اضافہ ہوتا ہے۔ کھلی جگہ پر دھند کم تھی۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ ایاز کی جیب کی رفتار تیز ہو گئی۔ میں سمجھ نہیں سکا تھا کیونکہ وہ مجھ سے کوئی پچاس گز آگے تھا۔ میں نے

ڈیجیٹل کیمرے سے تصویریں لے رہا تھا۔ عبد اللہ بھی تیار ہو کر آ گیا تھا اور اس وقت باقاعدہ چمک رہا تھا۔ عام طور سے میں نے اسے اپنی ذات سے لاپرواہ پایا تھا۔ وہ شاید ہفتے میں ایک ہی بار شیو ہوتا کر فارغ ہو جاتا تھا اور اس کے بال بھی نکھرے رہتے تھے لیکن اس وقت شیوئی تھی اور بال سلیقے سے بنائے گئے تھے۔ تھری بیس سوٹ میں وہ اسٹارٹ لگ رہا تھا۔ ویسے کی مناسبت سے سب نے ہی تھری بیس سوٹ پہنے تھے۔ چھ سات گھنٹے پہلے میں نے صرف بات کی تھی اور جو سوچا تھا وہ عملی طور پر سامنے تھا۔ ویڈیو اور فوٹویشن کے بعد دعا کی گئی۔ سب نے وسیم کو گلے لگا کر اور دبا کر مبارک باد دی۔ اس کے بعد دلہا دلہن کو سلامیاں دینے کی باری آئی اور تقریباً سب نے نوٹوں والے لفافے انہیں بکڑائے جدید کہ ایاز نے بھی لفافے میں رقم دی۔ مجھے خیال ہی نہیں آیا تھا۔ جب میں اسٹاپ پر آیا تو میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر جتنی رقم تھی وہ سعدیہ کے پرس میں ڈال دی۔ وہ ہنسی۔

”یہ کیا طریقہ ہے؟“

”یہ محبت کا طریقہ ہے جو لفافوں کا محتاج نہیں ہوتا۔“

”شانی میں آپ کی شکر گزار ہوں میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ آپ کے توسط سے مجھے اتنے اچھے لوگ ملیں گے۔“

”یہ تمہارا مقدر ہے گڑیا۔“ میں نے کہا اور اسٹاپ سے نیچے آ گیا۔

”مجھے تو کچھ نہیں دیا۔“ مونا نے سرگوشی کی۔ ”میری اور سفیر کی شادی بھی تو ہوئی ہے۔“

”تو اب لے لینا۔“ میں نے کہا۔ ”ویسے دیا تو ہے ایک کاٹھ کا آلو۔“

مونا ہنسی اور سفیر نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ سلامیوں اور اسٹاپ کے سیشن کے فوراً بعد کھانا لگا دیا گیا۔ اپنا کام مکمل کر کے مونا کی بیوی پارلر اور بوتیک کی فرینڈز بھی تقریب میں شامل ہو گئی تھیں۔ کھانے کے بعد عبد اللہ ان کو واپسی کے لیے ساتھ لے گیا۔ مونا اپنی فرینڈز کو چھوڑ کر آئی اور پھر اس نے رخصتی کا اعلان کر دیا۔ سعدیہ کو وہ اندر لے گئی تھی جبکہ وسیم کو ہم نے روک لیا۔ سفیر نے اس کا بازو پکڑا۔ ”بیٹے اتنی جلدی بھی کیا ہے ذرا ہمارے ساتھ تو گپ شپ کر لو۔“

”جلدی تو نہیں ہے۔“ وسیم جھینپ کر بولا۔ وہ اٹھتے اٹھتے بیٹھ گیا۔ کچھ دیر اس کے ساتھ ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ

ٹائی باندھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اس سے ٹائی لی۔ ”برخوردار ایسے نہیں باندھتے۔۔۔۔۔ میں تمہیں طریقہ بتاتا ہوں۔“

میں نے عملی طور پر اسے ٹائی باندھنا سکھائی اور بیٹو سیکھ گیا اس نے پھر ٹائی کھول کر درست طریقے سے باندھی اور خوش ہو کر بولا۔ ”شوہن بھائی ہم کو آگیا ہے۔“

”شاباش اب یہاں سے نکلو مجھے بھی سوٹ پہننا ہے۔“

مجھے صرف تولیہ میں ملبوس دیکھ کر بیٹو ہنسا اور کمرے سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے بھی سوٹ پہنا تھا۔ تیار ہو کر میں باہر آیا تو ایک ڈی جے بھی آ گیا تھا اور اپنے آلات سے دہی آواز میں موسیقی کھیر رہا تھا۔ وسیم اسٹاپ پر آ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر خوشی چمک رہی تھی۔ میں نے سفیر سے پوچھا۔ ”دلہن اور مونا کہاں ہیں؟“

”اندر ہیں۔۔۔ ابھی تیاری میں کچھ وقت ہے۔“

میں وسیم کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور اسے مطلع کیا۔ ”میں سعدیہ کی طرف سے ہوں۔“

وہ مسکرایا۔ ”یعنی آپ سالے کا رول پلے کر رہے ہیں۔“

”اب تک تو یہی رول پلے کرتے آئے ہیں۔“ میں نے سر آہ بھری۔

”آپ فکر نہ کریں میں سویرا کا بھائی بن جاؤں گا۔“

اس نے خلوص سے کہا۔ میں نے سوچا وہ وقت کب آئے گا جب میں اسی طرح دلہا بن کر سویرا کو لینے جاؤں گا۔ بلکہ لینے کیا جاؤں گا۔ وہ اسی حویلی میں ہے جہاں اسے ساری عمر رہنا ہے۔ آدھے گھنٹے بعد سعدیہ دلہن بن کر غضب ڈھانی آ گئی تھی اگرچہ مونا کی تیاری بھی کم نہیں تھی اور اسے دیکھ کر سفیر جذباتی ہو گیا تھا لیکن سعدیہ نے تو سب کو دنگ رہ جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ گوئڈن رنگ کے شرارے میں وہ خود بھی سنہری گڑیا لگ رہی تھی۔ میچنگ کی جیولری نے مزید کام کیا تھا۔ وسیم ایک ننگ اسے دیکھے جا رہا تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

”یہ بیوٹی پارلر والے بھی کیا غضب ڈھاتے ہیں۔ سویرا کو سوانیزے پر پہنچا دیے ہیں۔“

”درست فرمایا آپ نے۔“ اس نے سر آہ بھری۔

مونا سعدیہ کا لباس سنبھالتی اسے اسٹاپ تک لائی تھی۔ عبد اللہ کا ایک آدی چھوٹا ویڈیو کیمرہ لے آیا تھا۔ سفیر

بھی رفتار تیز کی جیٹو اٹھ رہا تھا وہ چونکا۔ ”کیا ہوا شوہی بھائی رفتار کیوں بڑھا دی؟“

”پتا نہیں ایاز نے رفتار بڑھا دی ہے۔“ میں نے تشویش سے کہا۔ ایاز کوئی کام بلا وجہ کرنے والا نہیں ہے کوئی نہ کوئی وجہ تھی جو اس نے رفتار بڑھا دی تھی۔ میں نے موبائل سے اسے کال کی۔ ”ایاز اسپید کیوں بڑھا دی ہے؟“ ”جناب میں آپ کو کال کرنے والا تھا۔“ اس نے کہا۔ ”مجھ سے آگے ایک گاڑی جا رہی ہے۔ یہ دائیں طرف سے ایک سڑک سے لگی تھی اور جب میری جیب کے پاس سے گزری تو اس میں سے کسی لڑکی کی بیٹھیلی سنی تھی۔“ ”تمہارا مطلب ہے اس گاڑی میں کسی لڑکی یا عورت کو اغوا کر کے لے جایا جا رہا ہے؟“

”میرا یہی خیال ہے جناب۔“ اس نے کہا۔ ”میری جیب اور گاڑی دونوں کے بیٹھے مکمل طور پر بند ہیں اس کے باوجود لڑکی کی بیٹھیلی صاف سنائی دیں۔“ میں سوچ میں پڑ گیا۔ اگر کوئی مجبور لڑکی کچھ درندوں کے ہاتھ لگ گئی تھی تو اس کا امکان تھا کہ اس کے ساتھ آگے اچھا نہیں ہوگا۔ آبرو تو جانے کی اس کا امکان بھی ہے کہ اسے جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑیں اور یہ ہمارے سامنے ہو رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ایاز کی آواز آتی۔ ”شہباز صاحب بتائیں کیا کرنا ہے؟“

”تمہارا کیا خیال ہے؟“ ”میں ان کو روکنا چاہوں گا۔“ اس نے بلا تامل کہا۔ ”اوکے ہم تمہارے ساتھ ہیں۔“ میں نے بھی فوری فیصلہ کیا۔ ”کرنا کیا ہے؟“ ”میں ٹکڑ مار کر گاڑی کو روکنے جا رہا ہوں۔“ ایاز نے کہا۔ وہ گاڑی روکیں گے تو انہیں پینڈر زاپ کر کے صورت حال معلوم کر لیں گے۔ اس کے بعد دیکھیں گے کیا کرنا ہے۔ ”ٹھیک ہے تم ٹکڑ مار کر آگے رکنا اور میں ان کے پیچھے رکوں گا۔“

ایاز کی جیب کے سامنے والے حصے میں بڑی مضبوط قسم کی فولادی گرل تھی۔ اس لیے ایاز نے بے لگری سے جیب کی رفتار تیز کی اور عقب سے گاڑی کو ٹکڑ ماری۔ ستائے اور رات کے وقت دھماکے کی آواز صاف سنائی دی۔ اگلی گاڑی لہرائی اور سڑک سے اتر گئی۔ ایاز نے جیب کچھ آگے روکی اور میں نے اپنی جیب کچھ پیچھے روک دی۔ میں اور بیٹو اپنے

پستول سنبھالتے ہوئے نیچے اترے۔ تو ضرب کھانے والی گاڑی سے تین افراد نکل آئے تھے۔ وہ بد معاشوں کے انداز میں وزنی گالیاں دیتے اور بڑکیں مارتے ہوئے ایاز کی جیب کی طرف لپک رہے تھے۔ ان میں سے سب سے آگے والا جیسے ہی جیب کے دروازے تک پہنچا اور اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو دروازہ طوفانی رفتار سے کھلا اور اس کے منہ پر لگا۔ وہ بلبل کر پیچھے جا گرا۔ یہاں اسٹریٹ لائٹس کی روشنی تھی اس لیے کسی قدر نظر آ رہا تھا میں نے سب سے پیچھے والے کو ایک عدد پستول نکالتے دیکھا اور تیزی سے آگے بڑھ کر اپنا پستول اس کے سر پر رکھ دیا۔

”بس کا کے اب حرکت مت کرنا۔“ میں نے کہتے ہوئے اس کا پستول اچک لیا۔ درمیان والا پہلے ہی پوز۔۔۔ ہو گیا۔ کیونکہ ایاز ایک شات گن کے ساتھ نیچے اتر آیا تھا۔ منہ پر دروازہ کھانے والا اٹھ گیا تھا اور ہمیں دانستوں تک سچ دیکھ کر ان کی ہکواں اور بڑکیں رک گئی تھیں۔ وہ بالکل شرافت کے موڈ میں آگئے تھے۔ میں نے پستول نکالنے والے سے پوچھا۔ ”یہ کیا چکر ہے۔“ ”کیسا چکر؟“ اس نے انجان بننے کی کوشش کی تو میں نے اس کے سر پر پستول کا دستہ مارا اور اسے سچ معنوں میں چکر آگئے۔

”یہ کیا کر رہے ہو؟“ منہ پر دروازہ کھانے والا بولا۔ ”ایک تو ٹکڑ مار کر گاڑی کا بیڑا غرق کر دیا اور اوپر سے ہمیں مار بھی رہے ہو۔“

”یہ تو اشارت ہے۔“ بیٹو بولا وہ گاڑی کا محاسبہ کر رہا تھا اس کی سیاہ شیشوں کے اندر کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ”ابھی اور مارے گا۔“

چکرانے والا اب سنبھل گیا تھا وہ تقریباً چالیس برس کا چہرے سے بد معاش نظر آنے والا تو مند آدمی تھا باقی دو اس سے کم عمر سے لیکن ان کے چہروں کی خباثت اس سے کسی طرح کم نہیں لگ رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ”تم کیا چاہتے ہو؟“

”گاڑی میں اور کون ہے؟“ ”کوئی نہیں ہے۔“ اس نے جواب دیا تو میں نے پھر دستہ اس کے سر پر آزمایا۔ اس بار وہ گر پڑا تھا۔ میں نے دوسرے سے یہی سوال کیا۔

”جی میری عورت ہے۔“ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ ان کی ساری بد معاشی ہوا ہو گئی تھی اور انہوں نے

محسوس کر لیا تھا کہ ہم ان سے بڑے بد معاش تھے۔ ”تمہاری عورت کیا گاڑی میں بیٹھ کر اسی طرح چلاتی ہے؟“ میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔ ”اب کیوں خاموش ہے؟“

اس کے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا لیکن منہ پر دروازہ کھانے والا کسی قدر تیز لہجے میں بولا۔ ”یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے۔“

”اچھا ابھی دیکھتے ہیں تمہارے ذاتی معاملے کو۔“ ایاز نے کہا اور آگے بڑھ کر کار کا عقبی دروازہ کھولا۔ منہ کی کھانے والا ”اوئے... اوئے“ کرتا ایاز کی طرف لپکا تھا لیکن جیسے ہی وہ ایاز کے پاس پہنچا اس نے اچانک لات اس کے سینے پر ماری اور وہ الٹ کر پیچھے جا گرا۔ وہ سخت تھا وہ سینہ پکڑ کر زمین پر لوٹ پوٹ ہوئے لگا۔ بیٹو نے ایاز کے وار کی داد دی۔ ایاز اندر جھانک رہا تھا پھر اس نے مجھے اطلاع دی۔ ”جناب ایک لڑکی ہے لیکن بے ہوش لگتی ہے۔“

”ان پر نظر رکھو۔“ میں نے ان تینوں کی طرف اشارہ کیا اور کار کی عقبی حصے میں دیکھا۔ لڑکی دوسری طرف دروازے سے کئی بے ہوش پڑی تھی۔ کم سے کم اس کا ڈھیلا پن یہی بتا رہا تھا۔ وہ نقوش سے نوجوان اور خوب صورت لگ رہی تھی۔ نیلی ویلورٹ کا سادہ سوٹ پہن رکھا تھا اور اوپر سوئیٹر تھا۔ اس کے لائٹ براؤن بال بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے آگے ہو کر اس کا منہ سونگھا اور کلور فارم کی بوتل نے تصدیق کر دی اسے بے ہوش کیا گیا تھا۔ میں واپس آیا اور مار سے بچنے والے سے پوچھا۔ ”لڑکی بے ہوش ہے۔“ ”اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ بد معاش قسم کے لوگ تھے اور ہم ایک چلتی شاہراہ کے کنارے کھڑے ہو کر ان سے نہیں نمٹ سکتے تھے۔ میں نے ان کی تلاشی لینے کو کہا۔ بیٹو نے سر پر ضرب کھانے والے کے پاس سے کلور فارم کی شیشی برآمد کی اور ٹھیک آدمی کے پاس سے ایک عدد چاقو نکالا تھا۔ میں نے ایاز سے کہا۔ ”یہاں سے چلو ان سے کہیں اور ذرا سلی سے بات کرتے ہیں یہاں کوئی بھی آ سکتا ہے۔“ ”میرا بھی یہی خیال ہے۔“

ان کی گاڑی وہیں چھوڑ کر ہم نے انہیں اور بے ہوش لڑکی کو اپنی گاڑیوں میں منتقل کیا۔ لڑکی کو ایاز کی جیب کے عقبی حصے میں ڈال دیا اور منہ پر دروازہ کھانے والا اس کے

ساتھ بیٹھ گیا جبکہ باقی دو میں سے ایک میرے ساتھ بیٹھا اور دوسرا بیٹو کے ساتھ پیچھے تھا اس طرح ہم ان پر پوری طرح نظر رکھ سکتے تھے۔ یہ تو نے تھا کہ انہیں مکان پر نہیں لے جانا ہے۔ اس کے بجائے ہمیں آس پاس کوئی جگہ تلاش کرنی تھی جہاں ان سے سکون سے بات کر سکتے اور جچ و پکار پر کوئی دخل در معقولات نہ کرتا۔ کچھ دور جا کر سڑک سے ذرا دور ایک کچا احاطہ نظر آیا جس کی دیوار گچی تھی اور اس کا مطلب تھا یہ غیر آباد تھا۔ ایاز نے اسے دیکھا اور جیب اس کی طرف گھمادی۔ میں نے اس کی بیرونی کی۔ دونوں گاڑیوں کی روشنیوں میں احاطہ ویرانی ہی لگ رہی تھی اور آس پاس دور تک زمین پر کابھی لگا پانی کھڑا تھا۔ شاید اس علاقے میں بارش کے پانی کی نکاسی کا انتظام نہیں تھا جس کی وجہ سے یہ زمین بے کار تھی۔ اس جگہ کو دیکھ کر میرے برابر میں بیٹھا بڑی عمر والا خوف زدہ ہو گیا۔

”یہاں کیوں آئے ہو؟“ ”سوال مت کرو... یہ کام ہمیں کرنا ہے، نیچے اترو۔“ میں نے پستول کا رخ اس کی طرف کیا تو وہ شرافت سے نیچے اتر گیا۔ باقی بھی نیچے اتر آئے۔ میں نے لڑکی کی بیٹھیلی دیکھی۔ وہ ایک کھٹنے سے پہلے ہوش میں آنے والی نہیں تھی۔ بیٹو کو اس کے پاس چھوڑ کر میں اور ایاز انہیں احاطے میں لے آئے۔ میں نے کہا۔ ”شروع ہو جاؤ، یہ لڑکی کون ہے اور تم اسے کیوں اغوا کر کے لے جا رہے تھے؟“ میں نے کہا اور اپنے پستول پر سالٹس لگانے لگا۔ ان کی حالت خراب تھی لیکن اعلیٰ قسم کی اولیٰ تھی۔

”ہم لڑکی کو اغوا کر کے نہیں لے جا رہے ہیں۔“ میں نے احتیاط سے گولی چلائی جو اس کے کان کے پاس سے گزر گئی، وہ اچھل پڑا تھا میں نے گرج کر کہا۔ ”تو کیا تمہاری بیٹی ہے؟“ ”میں سچ کہہ رہا ہوں۔“ اس نے کہا۔ میں نے دوسری گولی چلائی جو اس کے بازو کو چھوئی گزر گئی۔ اس نے کراہ کر بازو تھام لیا۔ ”مجھے عورتوں پر ظلم کرنے والے لوگوں سے نفرت ہے اور انہیں اذیت سے مار کر مجھے خوشی ہوتی ہے۔ اگلی بار گولی تمہارے جسم میں اترے گی لیکن تم اتنی جلدی مرو گے نہیں۔“ ”تم کیا کہتے ہو؟“ ایاز نے منہ پر دروازہ کھانے والے سے پوچھا۔ اس کی ناک اور ہونٹ سوج گئے تھے۔ وہ بولا۔

ہے تم چلی جاؤ لیکن اتنی رات اور تاریکی میں تم کہاں جاؤ گی؟ تمہیں راستے معلوم ہیں۔ کوئی کنوئیں ہے۔ کیا تمہیں استاد فانا جیسا کوئی اور نہیں ملے گا؟

میری بات سن کر وہ تذبذب میں پڑ گئی تھی۔ میرا لہجہ ان بد معاشوں سے بالکل مختلف تھا۔ وہ پڑھی لکھی اور ذہین تھی اور اسے انسانوں کی پہچان تھی اس لیے دیر سے سہی لیکن اسے احساس ہونے لگا کہ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ پھر میں نے اسے اپنی گاڑی میں بیٹھے جبرے اور عالم دکھائے۔ اسے کسی قدر یقین آ گیا تھا۔ میں نے نرمی سے کہا۔ ”تم ہم پر بھروسہ کرو اور میرا خیال ہے تمہارا گھر اب زیادہ دور نہیں ہے۔“

گھر کے ذکر پر اسے باپ یاد آ گیا اور وہ تڑپ مچی تھی۔ ”انہوں نے بابا کو سر پر کچھ مارا تھا پھر مجھے کچھ سونگھایا اور میں بے ہوش ہو گئی۔ پتا نہیں بابا کا کیا حال ہو گا؟“

”تمہارے بابا ٹھیک ہوں گے۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”ہم تمہارے ہی گھر جا رہے ہیں۔“ وہ ایاز کے ساتھ بیٹھنے پر بڑی مشکل سے آمادہ ہوئی تھی۔ ہمارے شریفانہ رویے نے اسے قائل کر دیا تھا۔ ہم آگے روانہ ہوئے اور کوئی تین منٹ بعد اس بستی کے پاس تھے جہاں شاہین کا گھر تھا۔ یہ بھی آبادی تو نہیں تھی لیکن غریبوں کی آبادی، گلیاں کچی تھیں اور مکان معمولی درجے کے تھے۔ ریاض عباسی کا مکان بڑے رقبے پر تھا۔ اندر تین کمرے تھے لیکن محض بڑا سا تھاجس میں بہت سارے بچوں پودے لگے تھے۔ کمروں کی چھتیں ٹین کی تھیں جن پر ٹیلیں چڑھائی ہوئی تھیں۔ یہ سب صحن میں داخل ہوتے ہی نظر آ گیا تھا۔

ہم نے گاڑیاں دروازے کے سامنے روکی تھیں اور وہاں ہر طرف ستانا تھا۔ لوگ سردی کی وجہ سے گھروں میں دیکے سو رہے تھے اور کسی بڑی کنوئیں پتا چلا تھا کہ اس گھر پر کیا قیامت گزرتی ہے۔ اندر داخل ہونے والا دروازہ کھلا تھا۔ ہم اندر داخل ہوئے تو شاہین کمروں کی طرف لپکی۔ ہم جبرے اور عالم کو بھی لے آئے تھے۔ میں نے ایاز اور بیٹو کو اشارہ کیا کہ ان پر نظر رکھیں اور خود اندر آیا۔ شاہین پہلے کمرے میں چھپی گئی اور پھر اس کے رونے کی آواز آئی تھی۔ میں کمرے میں داخل ہوا اور رک گیا وسط میں دری پر ایک سفید داڑھی اور بالوں والے بوڑھے کی لاش پڑی تھی۔ کم سے کم اس کی کھلی آنکھوں سے یہی لگ رہا تھا اور اس کے سر سے بننے والا خون فرش پر جم گیا تھا۔ شاہین اس سے لپٹی رو رہی تھی۔ آہٹ

لینے کے لیے وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ریاض عباسی کے گھر پہنچا اور دیوار پھلانگ کر وہ اندر گھس گئے۔ انہوں نے ریاض عباسی کو بے بس کر کے باندھ دیا اور شاہین کو بے ہوش کر کے اٹھا لائے۔ لیکن راستے میں اسے ہوش آ گیا اور اس نے چیخیں ماریں۔ اب یہ اتفاق تھا کہ ایاز نے اس کی چیخیں سن لیں۔ معاملہ اُلٹ گیا اور استاد فانا کے دل میں گلی آگ دوسرے طریقے سے سرد ہوئی تھی۔ ایاز کی جیب کی لکر سے پہلے وہ اسے دوبارہ کلوروفارم سٹگھائے تھے۔

”تم نے دیکھا بعض اوقات آدمی کو لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔“ میں نے جبرے سے کہا۔ ”اب دعا کرو کہ یہ معاملہ خوش اسلوبی سے طے ہو جائے ورنہ تم دونوں کو بھی استاد کے پاس بھیجنا پڑے گا۔“

”خدا کی قسم... مجھے میری ماں کی قسم میں کبھی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھوں گا۔“ جبرے نے کہا۔ ”میں تو اس بستی میں ہی نہیں جاؤں گا۔“ عالم بولا۔

میرے موبائل نے بیل دی۔ ایاز کال کر رہا تھا۔ میں نے کال ریسیو کی۔ ”کیا ہوا؟“

”لڑکی کو ہوش آ رہا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”کہیں یہ شور نہ کر دے۔“

”کسی مناسب جگہ رک جاؤ اسے بات کر کے اور سمجھا کر آگے بڑھتے ہیں۔“

یہ تین روڑ تھا اس لیے ایاز نے ایک ذیلی سڑک پر جیب موڑی اور کچھ آگے اس کے ویران حصے میں روک دی۔ جب میں اتر کر اس کے پاس پہنچا تو وہ شاہین کا ہاتھ پکڑ کر اسے فرار سے روک رہا تھا اور ساتھ ہی سمجھانے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ وہ ابھی تک کلوروفارم کے اثر میں تھی اور ہلکی سی آواز نکالتے ہوئے مزاحمت کر رہی تھی مجھے پاس دیکھ کر وہ مزید خوف زدہ ہو گئی۔

”بی بی آرام سے آرام سے۔“ میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ”ہم نے تمہیں ان بد معاشوں سے چھڑا لیا ہے اور تمہیں تمہارے گھر پہنچانے جا رہے ہیں۔“

”تم... تم ان کے ساٹھی ہو۔“ وہ لڑکھڑاتے لہجے میں بولی۔

”اگر تمہیں یقین نہیں آ رہا تو آ کر دیکھو وہ ہماری قید میں ہیں۔“

لیکن وہ کچھ سننے کے لیے تیار نہیں تھی اس کی ایک ہی رٹ تھی کہ اسے جانے دیا جائے۔ آخر میں نے کہا۔ ”ٹھیک

سے مجھے دیکھتا رہا اور پھر منہ کے بل گر گیا۔ گرنے سے پہلے اس کی روح نفس غصری سے پرواز کر گئی تھی۔ اس کے ساٹھی دم بہ خود رہ گئے تھے اور پھر وہ تھر تھر کانپنے اور جان بخشی کی التجائیں کرنے لگے۔ ایاز بھی حیران ہوا تھا۔ اسے مجھ سے اتنے شدید رد عمل کی توقع نہیں تھی۔ میں نے پوچھا۔

”اس لڑکی کا گھر کہاں ہے؟“

منہ کی کھانے والے نے کہا۔ ”پنڈی میں ایک چھوٹی سی بستی ہے۔“

”مکمل پتا بتاؤ۔“ میں نے درشت لہجے میں کہا۔

”وہ تو مجھے بھی نہیں معلوم ہے۔ میں مکان دکھا سکتا ہوں۔“

ایاز نے میری طرف دیکھا۔ ”کیا اس لڑکی کو گھر پہنچانا ہے؟“

”ظاہر ہے ہم اسے یوں تو نہیں چھوڑ سکتے اور ویسے بھی جب میں کسی معاملے میں دخل دیتا ہوں تو اسے انجام تک پہنچاتا ہوں۔“

”اس کا کیا کرنا ہے؟“ ایاز نے استاد کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔

”یہیں پڑے رہنے دو۔ ممکن ہے کل تک کوئی دیکھ لے ورنہ چیلوں اور گدھوں کا بھلا ہو جائے گا۔“ میں نے بے پروائی سے کہا۔ استاد کے بارے میں یہ سن کر اس کے چیلوں کی حالت مزید خراب ہو گئی اور انہیں یقین آنے لگا کہ ہم انہیں بھی نہیں چھوڑیں گے۔ وہ منت سماجت کرتے میری جیب میں آئے۔ جبرامیرے ساتھ بیٹھا تھا اور دوسرا بیٹو کے ساتھ پیچھے بیٹھا تھا۔ میں نے راستے میں جبرے سے انٹرویو جاری رکھا تھا۔ اس سے جو صورت حال سامنے آئی وہ کچھ یوں تھی کہ آں جہانی استاد فرحان عرف فانا راو پنڈی کا ایک درمیانے درجے کا بد معاش تھا اور یہ دونوں یعنی جبرہ اور عالم اس کے دست راست تھے یعنی اس کے تمام مجرمانہ کاموں میں برابر کے شریک رہتے تھے۔

یہ لڑکی شاہین ایک نجی اسکول میں ٹیچر ہے اور اس کا باپ ریاض عباسی ایک سرکاری اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہے۔ استاد فانا نے کہیں شاہین کو دیکھ لیا اور وہ اسے پسند آ گئی تب سے وہ اس کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ دو دن پہلے سرعام روکنے پر شاہین نے اسے تھپڑ مار دیا تھا۔ تب سے استاد فانا کے دل میں آگ لگی تھی اور یہ آگ ایک ہی صورت میں سرد ہو سکتی تھی جب وہ شاہین سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لیتا۔ بدلہ

سے مجھے کچھ نہیں معلوم۔“

”چھوڑو ان بے چاروں کو کچھ نہیں معلوم انہیں زیادہ تکلیف دینے کی ضرورت نہیں ہے گولی مار کر چھوڑ جاتے ہیں کل کوئی نہ کوئی لاش دیکھ لے گا۔“ میں نے پستول بلند کیا تھا کروٹ پھوٹ سے محفوظ رکھیں چلانے لگا۔

”خدا کے لیے مجھے مت مارو میں بتاتا ہوں۔ ہاں ہم اس لڑکی کو اغوا کر کے لے جا رہے تھے؟“

”کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ استاد کو پسند آ گئی تھی لیکن مانتی نہیں تھی، ایک اسکول میں ٹیچر ہے اور اس کا باپ بھی ہیڈ ماسٹر ہے۔“

میں افسوس سے سانس لے کر رہ گیا۔ ہمارے معاشرے میں اب ٹیچر کی یہ عزت افزائی ہی باقی رہ گئی تھی کہ عورت ٹیچر کو براہ راست بے آبرو کیا جائے اور اس کے ٹیچر باپ کو کسی کومنڈ دکھانے کے قابل نہ چھوڑا جائے۔

”استاد کون ہے؟“ میں نے پوچھا تو بڑی عمر والا غرایا۔

”جبرے زبان بند رکھ۔“

”ہاں جبرہ اپنی زبان بند رکھے گا لیکن تم یولو گے۔“

میں نے کہا اور اچانک لات مار کر اسے نیچے گرا دیا۔ دوسرے کے پاس سے برآمد ہونے والا چاقو میرے پاس تھا۔ میں نے اس کی گردن پر گھٹنا رکھا اور چاقو سے اس کی گھر پر کٹ لگایا۔ اس نے آزاد ہونے کی کوشش کی لیکن میرے بوجھ تلے تڑپ کر رہ گیا تھا۔ میں نے سوال کیا۔ ”استاد کون ہے؟“

اس نے چیخ کر گالی دی تھی۔ وہ جس طرح مزاحمت کر رہا تھا مجھے لگا وہی استاد ہے لیکن یہ بات میں اس کی زبان سے کھلوانا چاہتا تھا۔ میں نے اس کے بازو اور پھر اس کے پیروں پر کٹ لگائے۔ وہ گاڑی تلے آنے والے کتے کی طرح چیخ و پکار کرنے لگا۔ مگر ابھی تک اس نے مزاحمت ترک نہیں کی تھی۔ البتہ جب میں نے اسے ایک کان سے محروم کیا تو اس نے بھون بھون کر کے روتے ہوئے اقرار کر لیا کہ وہی استاد ہے۔ میں نے اسے چھوڑ دیا اور افسوس سے کہا۔

”ایک بے بس لڑکی کو اغوا کرنے والے کو اتنا ہی کم ہمت اور بزدل ہونا چاہیے۔ تم اقرار کرتے ہو کہ تم اس لڑکی کو بے آبرو کرنے کے لیے اغوا کر کے لے جا رہے تھے؟“

”ہاں۔“ اس نے روتے ہوئے جواب دیا کیونکہ اس نے سوچا ہی نہیں تھا میں اسے شوٹ کر سکتا ہوں اس لیے جب میں نے عین دل کے مقام پر گولی ماری تو وہ چند لمحے بے یقینی

سن کر اس نے سر اٹھایا اور میری طرف دیکھ کر گلو کیر لہجے میں بولی۔

”ظالموں نے میرے بابا کو مار دیا۔“

میں نے پاس بیٹھ کر بوڑھے کی نبض دیکھی۔ نبض رکی تھی اور ہاتھ بالکل سرد تھا۔ اسے مرے ہوئے خاصی دیر ہو چکی تھی۔ شاید سر پر لگنے والی ضرب جان لیوا ثابت ہوئی تھی یا ہونے والی ذلت کے احساس نے اس کی جان لے لی تھی۔ وجہ کچھ بھی تھی۔ اصل بات یہ تھی کہ اس ملک میں زور آوروں نے ایک اور غریب گھر اچھاڑ دیا تھا۔ شاہین باپ کی لاش کے سینے سے سر نکالنے رو رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ”مجھے افسوس ہے، لیکن ہم یہاں نہیں رک سکتے ہیں کیا تمہارا کوئی جاننے والا ہے جسے اطلاع دی جاسکے؟“

اس نے انکار کیا۔ ”نہیں یہاں ہمارا کوئی نہیں ہے، ہم آزاد کشمیر کے رہنے والے ہیں لیکن وہاں بھی بابا کے دور کے رشتے دار ہیں۔“

”مٹھے والے تو ہیں تم ان کو پتا سکتی ہو۔“

”مٹھے والے۔“ اس کا لہجہ سخت ہو گیا۔ ”یہ تو اس وقت نہیں آئے جب یہ بد معاش ہمارے گھر میں گھسے تھے اور میں چلائی تھی۔ سب سن کر بھی اپنے گھروں میں بیٹھے رہے تھے۔“ یہ ہمارے معاشرے کا ایک اور المیہ ہے، ہم کسی کے ساتھ زیادتی ہوتے دیکھتے ہیں اور چپ رہتے ہیں۔ جب ہم چپ ہوتے ہیں تو یہ کبھی نہیں سوچتے کہ کل کو ہماری باری بھی آسکتی ہے اور اس وقت دوسرا کوئی نہیں بولے گا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس مظلوم لڑکی اور اس کے باپ کا کیا جائے۔ عقل کا تقاضا یہ تھا کہ فوری روانگی اختیار کی جائے اس سے پہلے کہ اہل محلہ اور پولیس آئے اور ہماری روانگی کے راستے بند ہو جائیں، لیکن میں اسے یوں چھوڑ کر بھی نہیں جانا چاہتا تھا۔ ابھی میں سوچ رہا تھا اس کا کیا کرنا ہے کہ ایاز تیزی سے اندر آیا۔ اس کا انداز بتانے کے لیے کافی تھا کہ کوئی خطرہ ہے۔ میں خود شاہین سے ذرا دور چلا گیا۔ ایاز نے ایک نظر شاہین اور اس کے باپ کی لاش دیکھی اور میرے کان میں سرگوشی کی۔

”جناب باہر کم سے کم چار افراد ہیں اور وہ شاید مکان کو گھیر چکے ہیں ان کا انداز خطرناک ہے۔“

”دو کے پاس ہتھیار ہیں باقی دو کا نہیں پتا لیکن ان کا انداز ایسا ہی ہے، ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔“

میں اس کے ساتھ باہر آیا جہاں بیٹے ان دونوں کو چنڈر اپ کرائے کھڑا تھا۔ انہوں نے بھی جان لیا تھا کیونکہ ان کے ہونٹوں پر اب مسکراہٹ تھی۔ میں نے پہلے سامنے سے دیکھا۔ نزدیکی بجلی کے کھمبے کے ساتھ ایک کھوکھا دکان کی آڑ میں موجود سہا یا عقب سے آتی روشنی کی وجہ سے صاف نظر آ رہا تھا۔ ایک اور گلی کے کونے پر موجود تھا۔ اس کے ہاتھ میں شلٹ... گن تھی۔ ایاز بولا۔ ”ایسے ہی دو پیچھے بھی ہیں۔“

”ہمیں نکلنا ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”جوراستے میں آئے اسے آڑ دو۔“

جیرا نے کسی قدر بلند آواز سے کہا۔ ”ہمیں جانے دو کہیں ایسا نہ ہوتم خود بھی پھنس جاؤ۔“

”ہمارے ساتھی یہاں موجود ہیں۔“ عالم بھی بولا۔ میں اس کے پاس آیا اور اچانک گھٹنا اس کے زیر ناف مارا۔ وہ کراہ کر جھکا۔

”تمہارے ساتھیوں کو الہام ہوا ہے کہ ہم یہاں موجود ہیں۔“

”ہاں حادثے کے بعد استاد نے ان کو کال کر دی تھی۔“ جیرا نے انکشاف کیا۔

”تم اب بتا رہے ہو گتا ہے تم نے استاد کے انعام سے سبق نہیں سیکھا۔“ میں نے کہا اور پھر اس کے پیٹ میں گھٹنا مارا وہ سیدھا ہورہا تھا کہ کراہ کر پھر جھک گیا۔ میں نے سوچا اور ایاز کو ایک طرف لے جا کر دھیمی آواز میں اپنا پلان بتایا۔ وہ منتظر رہا پھر اس نے سر ہلایا۔

”میں سمجھ گیا جناب۔“

”بیٹو کو بھی سمجھا دو ہمیں کیا کرنا ہے۔“ میں نے اسے ہدایت کی۔ یہ لوگ شاید اس بستی میں داخل ہوتے ہی ہمارے پیچھے لگ گئے تھے اور اب اس مکان کو گھیر چکے تھے۔ ممکن ہے یہ معمولی درجے کے اچکے ہوں لیکن یہ سچ تھے۔ ہمارا یہاں سے نکلنا آسان نہیں تھا۔ میں اندر آیا اور باپ کی لاش کے پاس بیٹھی شاہین سے کہا۔

”سنو استاد قانا کے آدمی باہر آگئے ہیں، وہ مسلح ہیں اور ان کے ارادے ٹھیک نہیں ہیں ہم یہاں سے جا رہے ہیں۔ تمہیں فیصلہ کرنا ہے ہمارے ساتھ چلوگی یا یہیں روکوگی۔“

اس کا رنگ اڑ گیا تھا۔ ”وہ لوگ پھر آگئے ہیں؟“

”ہاں ممکن ہے تمہیں اکیلا پا کر کوئی نقصان پہنچائیں یا ساتھ لے جائیں۔ اگر تم ہمارے ساتھ چلتی ہو تو ہم بعد میں تمہیں جہاں کو بھی وہاں پہنچا دیں گے۔ اگر رکنا چاہو تو

تمہاری مرضی ہے لیکن یہاں خطرہ ہے۔ مجھے یقین ہے استاد قانا کے بارے میں جان کر اس کے ساتھی اس کا بدلہ بھی تم سے لیں گے۔“

وہ مزید ہم گئی تھی۔ ”مجھ سے کیوں؟“

میں اسے کیا بتانا اس کا اصل جرم تو خوب صورت اور کمزور ہونا تھا اور زور آور اپنی مطلب براری کے لیے جواز ایجاد کر لیتے ہیں میں اسے یہ سب نہیں بتا سکتا اس لیے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو استاد قانا اپنی حماقت سے مارا گیا ہے اور شاید وہ اس کا بدلہ لینے آئے ہیں۔“

یہ سن کر اس کا رہا سہا رنگ بھی اڑ گیا تھا اور اس نے گھبرا کر کہا۔ ”میں یہاں نہیں رہوں گی۔“

”تب فوراً چلو۔“

”لیکن بابا۔۔۔“

”ان کے لیے اب دعا ہی کی جاسکتی ہے۔ یہاں سے نکلتے ہی ہم پولیس کو کال کریں گے اور وہ خود انہیں اسپتال پہنچا دے گی۔“ میں نے کہا۔ ”تم نے اپنی کوئی اہم چیز لی لی ہے تو تمہارے پاس پانچ منٹ ہیں۔“

میں باہر آیا تو بیٹو اور ایاز جیرا سے اور عالم کے منہ ان کے اپنے کپڑے بھاڑ کر بند کر چکے تھے۔ ان کے ہاتھ بھی عقب میں باندھ دیے تھے۔ میں نے جیرا سے کہا۔ ”آج تمہیں پتا چلے گا کہ بد معاشی کیا ہوتی ہے۔“

ایاز مجھے ایک طرف لے گیا اور بولا۔ ”میں سوچ رہا ہوں پیچھے موجود ایک بندے کو ناکارہ کر دوں تاکہ وہ آگے مدد کو نہ آ سکے۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے اور دوسرے تم جب تک پیچھے والے کو نمنا کر سامنے آؤ گے ہمیں نکلنے میں دیر ہو جائے گی۔“ میں نے اس کی تجویز مسترد کر دی۔ ”لڑکی بھی ہمارے ساتھ جا رہی ہے ورنہ بعد میں آنے والے اسے نہیں چھوڑیں گے۔“

ایاز بولا۔ ”میرا بھی یہی خیال ہے۔“

شاہین پانچ منٹ سے بھی پہلے نکل آئی اس نے جوتے پہن لیے تھے اور اوپر چادر بھی لے لی تھی اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا پنڈ کیری نظر آ رہا تھا۔ میں نے اسے کہا۔ ”میرے ساتھ رہنا یہاں ابھی ہنگامہ ہوگا۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ بولی اس نے تیزی سے خود پر قابو پا لیا تھا۔ میں دروازے کی طرف آیا۔ میرے اشارے پر ایاز نے مین سوچ بند کر دیا اور مکان اور اس کے آس پاس تاریکی

چھا گئی۔ میں نے گیٹ ذرا سا کھولا اور پستول باہر نکال کر گلی کے کونے پر موجود شخص کا نشانہ لیا۔ وہ کوئی تیس گز دور تھا اور اس پستول کی ریخ پچاس ساٹھ گز تو تھی۔ سائنکس کی وجہ سے حد کم ہوئی تھی لیکن یہ ابھی کافی تھی۔ گولی چلتے ہی اس نے ہاتھ اٹھا کر دل خراش چیخ ماری۔ اس کی چیخ نے کھوکھے تلے دیکے آدمی کو پریشان کر دیا اور وہ چیخ چیخ کر اپنے ساتھیوں کو آواز دینے لگا۔ میں نے اشارہ کیا تو بیٹو اور ایاز جیرا سے اور عالم کو دھکیلتے ہوئے دروازے تک لائے اور ان کو باہر دھکا دیا۔

وہ جانا نہیں چاہتے تھے کیونکہ ہمارا منصوبہ کچھ گئے تھے مگر مجبور تھے۔ ان کے پیچھے ہم نکلے۔ کھوکھے کے پیچھے دیکے آدمی نے حرکت محسوس کرتے ہی اوپر تلے کسی پستول یا ریوالتور سے فائر کیا اور آگے ہونے کی وجہ سے عالم نشانہ بنا اس نے ناک سے کرب ناک آواز نکالی اور گرنے لگا تھا کہ ایاز نے اسے ڈھال بنالیا اور اپنی جیب تک لے گیا۔ دروازہ کھول کر اس نے عالم کو ایک طرف پھینکا اور بیٹو سمیت اندر گھس گیا۔ میں نے جیرا کو اپنی ڈھال بنا رکھا تھا۔ مکان کے دائیں طرف سے نمودار ہونے والے نے آتے ہی ری پیٹر سے فائر کیا اور اس کا ہولناک دھماکا گونجا۔ جیرا نے جھٹکا کھایا اور لڑنے کے کل گر تھا۔ اس کے گرتے ہی میں نے ری پیٹر والے کو لگا تار تین گولیاں ماریں کیونکہ وہ ری پیٹر دوبارہ لوڈ کر رہا تھا اور اسے فائر کا موقع دینا وفات پانے کے برابر تھا۔ ری پیٹر کی گولی نہایت مہلک ہوتی ہے۔ ہاتھ اور پردوں کے علاوہ کچھ بھی لگے تو جان لیوا ثابت ہوتی ہے۔ ری پیٹر والے نے کرب زدہ آواز نکالی اور لڑکھڑا کر دیواری آڑ میں چلا گیا۔ شاہین میرے عقب میں کھڑی کانپ رہی تھی ایسی کٹل وغارت گری اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور پیچھے کی طرف بھاگا۔

ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر پہلے اسے اندر دھکیلا۔ کیونکہ دوسری طرف کھوکھے والا موجود تھا اور ہم پر فائرنگ کر رہا تھا پھر بیٹو کے فائر نے اسے خاموش کرادیا۔ ایاز کی جیب اشارت بھی تھی ہی ہم پیچھے و میں آئے اس نے جیب آگے بڑھا دی میں نے بھی گاڑی اشارت کرتے ہی پوری ریس دی تھی اور پیچھے و چھلانگ لگا کر آگے بڑھی اور بے قابو ہو کر ایک درخت سے ٹکراتے پڑی۔ شاہین نے متوقع حادثے کا سوچ کر چیخ پہلے مار دی تھی۔ لیکن خبریت

رہی اور جیب و رخت کے برابر سے نکل گئی تھی۔ گاڑیاں آگے بڑھیں تو مکان کے عقب سے ایک رانگل برادر نکلا اور ہم پر دھڑا دھڑ گولیاں چلانے لگا۔ ایک گولی مجھ پر لگی جس سے میں سوراخ کرتی گزر گئی۔

”نیچے ہو جاؤ۔“ میں نے چلا کر کہا اور ایکسی لیٹر پورا دبا دیا۔ ایاز پہلے ہی گلی سے نکل گیا تھا میں نے موڑ کاٹا تو ہم محفوظ ہو گئے تھے۔ میں نے موبائل نکال کر ایاز کو کال کی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ ”جلد از جلد نکلو، اگر کہیں پولیس نکلے گا جئے تو راستہ الگ کر لینا اور کوشش کرنا پولیس سے تصادم کی نوبت نہ آئے۔ لیکن پکڑائی کسی صورت نہیں دینی ہے۔“

”ٹھیک ہے جناب۔“ ایاز نے کہا۔ میں نے موبائل بند کر کے رفتار بڑھا دی تھی۔ شاہین سیدھی ہو کر بیٹھ گئی تھی اور کسی قدر خوف زدہ نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی کیونکہ اس نے پولیس کے بارے میں میری ہدایت سن لی تھی۔ اس نے سبے لمحے میں کہا۔

”تم لوگ کون ہو؟“

”ہم کوئی بھی ہوں لیکن تمہارے لیے کوئی خطرہ نہیں ہیں کیونکہ ہم عورت کی عزت کرنا جانتے ہیں۔“ میں نے نرمی سے کہا۔

”کہاں جا رہے ہو؟“

”ابھی ہم اپنے ایک ٹھکانے پر جا رہے ہیں۔ وہاں تم کو کچھ دیر رکنا ہوگا حالات دیکھ کر پھر تم جہاں کہو گی تم کو پہنچا دیں گے۔“ میں نے کہا اور مین روڈ پر آتے ہی گاڑی کو فرسٹ گیسٹر میں ڈال دیا۔ ایاز کی جیب خاصی آگے جا چکی تھی۔ اس کی جیبی سرخ روشنیاں بھی اب نظر نہیں آ رہی تھیں۔ لیکن وہ اسی راستے پر تھا۔ میں نے شاہین سے پوچھا۔

”اس شہر میں تمہارا کوئی جاننے والا ہے؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہاں ہمارا کوئی قریبی رشتہ دار نہیں ہے۔ سب میرے پورے ہیں۔ وہاں بابا کی کچھ زمین بھی ہے جسے پتے پر دیا ہے۔“

”کوئی ایسا نہیں ہے جو ہمیں سنبھال سکے۔“

اس نے سوچا اور پھر جھپکاتے ہوئے بولی۔ ”شاید اس اسکول کی پرنسپل میری مدد کرے جہاں میں پڑھاتی ہوں۔ وہ میرا بہت خیال کرتی ہے۔“

اس کے ساتھ جو ہو چکا تھا اور کل تک اس گھرانے کے بارے میں جو کہانیاں مشہور ہونی تھیں ان کو تیر نظر رکھتے

ہوئے مجھے امید نہیں تھی کہ مذکورہ اسکول کی پرنسپل شاہین کی کوئی مدد کرے گی بلکہ وہ تو شاید اسے ملازمت سے فارغ کر دے گی۔ ہستی سے نکلنے تک ہمیں ایسے کوئی آثار نظر نہیں آئے تھے کہ پولیس اس طرف جا رہی ہے لیکن وہاں جتنی دھواں دھار فارتنگ ہوئی تھی۔ جیرے اور عالم کی اپنے ساتھیوں کے ہاتھوں ہلاکت ہوئی تھی۔ ان میں سے کم سے کم دو ہمارے ہاتھوں مارے گئے تھے اور کم سے کم ایک زخمی تھا۔ یعنی وہاں پولیس کی آمد لازمی تھی اب اسے ریاض عباسی کے بارے میں مطلع کرنا ضروری نہیں تھا۔ ”تم کہاں تک پڑھی ہوئی ہو؟“

”بی ایس سی کیا ہے۔“ وہ بے دلی سے بولی۔ ”بابا میری شادی کرنا چاہتے تھے لیکن غریب لڑکیوں کے لیے رشتے کہاں ہیں؟ جو آتا وہ ہمارا گھر دیکھ کر چلا جاتا۔ بابا پریشان تھے کہ ان کے بعد میرا کیا ہوگا؟ وہ دل کے مریض تھے دو بار ہارٹ ایک ہو چکا ہے ڈاکٹر نے کہا تھا کہ تیسری بار ہوا تو وہ بچیں گے نہیں۔“ وہ بول رہی تھی اور مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ وہ ایک خاص ذہنی کیفیت میں تھی۔ وہ یہ ظاہر حواس میں ہوتے ہوئے بھی حواسوں میں نہیں تھی۔ اس کے اندر ایک گہرے بندھ گئی تھی اور وہ بول کر اسے کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ”کبھی بابا کی پریشانی دیکھ کر دل چاہتا کہ خود کشتی کر لوں۔“

”تمہیں اتنا کم حوصلہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس معاشرے میں بے شمار عورتیں اور لڑکیاں اکیلی ہیں اور وہ خود کشی کر زندگی گزار رہی ہیں۔“

”میں جانتی ہوں لیکن مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں ہے۔ میں اکیلی نہیں رہ سکتی۔ یہ بات بابا بھی جانتے تھے۔“

”تمہارے بابا اپنا علاقہ چھوڑ کر یہاں کیوں آئے؟“

”ایک تو ان کی نوکری یہاں تھی دوسرے انہوں نے امی سے پسند کی شادی کی تھی اور ان کی خاطر اپنی بچپن کی سنگیت کو چھوڑ دیا تھا اس پر پوری برادری نے ان کا بازیکاٹ کر دیا تھا۔ کوئی ہم سے نہیں ملتا تھا۔ بابا بھی کسی سے نہیں ملتے تھے۔ لیکن انہوں نے جس کی خاطر سب کو چھوڑ دیا تھا وہ ان کو بچ راستے میں چھوڑ گئی۔ امی کا اس وقت انتقال ہو گیا جب میں صرف گیارہ برس کی تھی۔ ان کا اپنڈکس پھٹ گیا تھا۔“

”اوہ۔“ میں نے افسوس کیا۔

”اب اللہ نے بابا کو بھی لے لیا۔“ اس نے بے بسی سے کہا۔ ”میرا کیا ہوگا؟“

”اللہ انسان کے لیے سب سے اچھا کرنے والا

ہے۔ دیکھا جائے تو تمہاری زندگی میں دکھ زیادہ ہیں لیکن اس سے آگے تمہارے لیے کون سی خوشیاں رکھی ہیں یہ تم یا کوئی نہیں جانتا۔“

وہ کھڑکی سے باہر دھند میں گزرتی اسٹریٹ لائٹس کو دیکھ رہی تھی۔ ”پتا نہیں مجھے تو لگتا ہے کہ میری زندگی میں خوشی تو ایک طرف رہی کوئی آسانی بھی نہیں ہے۔“

”خوشیاں اور آسانیاں تلاش کرنے سے ملتی ہیں۔ یہ نوڈل کر آپ کے پاس نہیں آتی ہیں۔“

وہ چپ ہو گئی تھی۔ شاید وہ میری بات سے متفق نہیں تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے پوچھا۔ ”آپ پولیس کا سامنا نہیں کرنا چاہتے۔۔۔ اس کی کوئی وجہ ہے؟“

”اس کی کئی وجوہات ہیں لیکن ان میں سے کوئی وجہ وہ نہیں ہے جو تم سوچ رہی ہو۔ ہمارا جرائم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”آپ غلط سمجھ رہے ہیں میں آپ کے بارے میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی ہوں۔“ اس نے جلدی سے صفائی پیش کی۔ ”میں بہت کم باتوں پر دل سے یقین کرتی ہوں لیکن آپ لوگوں کے بارے میں اتنی سی دیر میں ایک بات پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ آپ لوگ مجرم نہیں ہو سکتے ہیں۔“

”اس یقین کا شکر یہ، کیونکہ تمہارا اور ہمارا ساتھ مختصر ہے اس لیے تمہارا ہمارے مسائل کے بارے میں جاننا ہے کار ہے۔“ میں نے جیب کا رخ اس کالونی کی سڑک کی طرف موڑ دیا جہاں ہمارا مکان تھا۔ ایاز آگے تھا اور وہ آگے اب تک مکان پر پہنچ گیا ہوگا۔

میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا جیب وہاں موجود تھی۔ بیوہ باہر کھڑا تھا اور ایاز دروازہ کھول کر اندر جا چکا تھا۔ میں نے ”بجیر“ چھوٹی سی پارکنگ میں کھڑی کر دی اور شاہین کی طرف دیکھا۔ ”یہ ہمارا ٹھکانا ہے گھر نہیں ہے اس لیے اسے دیکھ کر حیران مت ہونا۔“

ایاز نے روشنیاں جلا دی تھیں۔ شاہین کو لے کر میں بیڈروم والے حصے میں آیا کیونکہ یہاں بیٹر تھا اور سردی کی وجہ سے مکان ڈیپ فریزر بنا ہوا تھا۔ ایاز نے بیٹر آن کیا اور چائے بنانے چلا گیا۔ بیوہ تھک گیا تھا اس لیے ایک بستر پر دراز ہو گیا۔ میں نے شاہین سے کہا۔ ”تم یہاں آرام سے بیٹھو اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا جھجک کہنا۔“

وہ ایک طرف دیوار سے ٹک کر بیٹھ گئی۔ عبد اللہ نے

مجھے تصویروں والا لفافہ دے دیا تھا لیکن ابھی تک مجھے دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ میں اٹھ کر باہر آیا اور تصویروں والا لفافہ نکالا۔ یہ ٹیپ سے بند کیا گیا تھا اور شاید عبد اللہ نے بھی اسے نہیں کھولا تھا۔ میں نے اسے کھولا۔ اندر کوئی درجن بھر تصاویر تھیں اور ہر تصویر انسانیت کے نام پر دھبا تھی۔ اس میں موجود مرد کا چہرہ بالکل واضح نہیں تھا لیکن شہلا کا چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ یہ تصاویر شہلا کے ساتھی مرد نے جان بوجھ کر بنوائی تھیں۔ اس نے خود کو چھپاتے ہوئے صرف شہلا کو نمایاں کیا تھا اور تصاویر یقیناً بلیک مائلنگ کے لیے تیار کی گئی تھیں۔ میں تصویروں دیکھ کر لفافے میں رکھ رہا تھا کہ ایاز چائے بنا کر لاؤنج میں لے آیا اس نے مجھے نگہ کیا۔ اس کی حرارت اچھی لگی تھی۔ میں نے چائے پیتے ہوئے کہا۔ ”لڑکی سے کھانے کے بارے میں پوچھ لینا۔“

ایاز جھجکا پھر اس نے پوچھا۔ ”یہ رات کہاں سوئے گی؟“

”اسی کمرے میں سو جائے گی آج ہم لاؤنج میں گزارا کر لیں گے۔“ میں نے کہا۔ ”اسے شہلا والے کمرے میں نہیں رکھ سکتے۔“

”فتح خان کے آدمی کا کیا کرتا ہے؟“ ایاز نے اگلا سوال کیا۔

”میں سوچ رہا ہوں اسے صبح سورج طلوع ہونے سے پہلے کہیں اٹواتے ہیں اور فتح خان کو مطلع کرتے ہیں لیکن پہلے اٹھنا تو مل کر دے کہ فتح خان کے پاس اس کی کبھی تصویر نہیں لیا۔“

”آپ اس سے پوچھ لیں۔“ ایاز نے شہلا کے کمرے کی طرف دیکھا۔ ”ویسے یہ اتنے سکون سے کیسے بیٹھی ہے اسے پتا تو مل گیا ہوگا کہ ہم مکان میں آ گئے ہیں۔“

”ممکن ہے وہ سو گئی ہو۔“ میں نے کہا۔

”آپ بھول رہے ہیں اسے رات کا کھانا بھی نہیں دیا ہے۔“ ایاز نے یاد دلایا تو میں نے سر پر ہاتھ مارا۔

”یہ تو بالکل ذہن سے نکل گیا۔“

”کل کی ڈبل روٹی رکھی ہے آپ کہیں تو چائے کے ساتھ وہ لاؤں۔“

”بالکل بلکہ فتح خان کے آدمی کے لیے بھی لے آؤ۔“

کتنا ہی ذہیل سی ہے تو وہ بھی انسان اور اسے بھی بھوک پیاس لگتی ہوگی۔“

ایاز بکن کی طرف چلا گیا۔ میں بندروں میں آیا۔ شاہین ایک طرف دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی اور اس کے چہرے پر آنسو چمک رہے تھے۔ میں نے کہا۔ ”تمہارا دکھ تو وقت ہی گم کر سکے گا لیکن انسان کے ساتھ حاجتیں لگی رہتی ہیں۔ تم کچھ کھا لو اور پھر سو جاؤ۔“

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے تب چائے لے لو اور اگر ضرورت محسوس کرو تو نیند کی دوا لے لیٹا۔ بہتر ہوگا تم سو جاؤ۔“ میں نے کہتے ہوئے بیٹو کو بلایا۔ ”برخوردار اٹھ جاؤ اور بستر اور کھل بھی باہر لاؤ۔ آج لاؤنچ میں سونا ہے۔“

”لاؤنچ میں۔“ بیٹو نے فریاد کی۔ ”اُدھر سردی بہت ہوگا۔“

”کچھ نہیں ہوتا یا رب یا دیکھیں ہے برفانی پہاڑوں میں ہم نے کیسی راتیں گزاری ہیں۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔

”وہ وقت تھا گزرا لیکن اب اُدھر ذرا سا سردی بھی بہت لگتا ہے۔“ بیٹو نے کہا اور اٹھ کر بادل نا خواستہ کھل بستر اور نیچے سیٹا شروع کر دیے۔ اس نے شاہین کے لیے ایک کھل ایک گدا اور ایک تکیہ چھوڑ دیا تھا۔ میں نے شاہین سے کہا۔ ”تم یہاں آرام سے سو سکتی ہو۔ واش روم یہ برابر میں ہے اور اگر تم چاہو تو اندر سے دروازہ بند بھی کر سکتی ہو۔“

اس دوران ایاز اس کے لیے چائے اور بسکٹ لے آیا تھا۔ اس نے ٹرے واپس چھوڑ دی اور مجھ سے کہا۔

”ان کے لیے چائے اور ڈبل روٹی تیار کر دی ہے۔“

میں باہر آیا تو ٹرے قالین پر رکھی تھی اسے لے کر میں شہلا والے کمرے کی طرف آیا، اب مجھے بھی تشویش ہونے لگی تھی کہ آخر اندر اتنی خاموشی کیوں تھی۔ شام کو شہلا کسی صورت فتح خان کے اس آدمی کے ساتھ رہنے کو تیار نہیں تھی۔ اس نے شور کرنا شروع کر دیا تھا مگر اب خاموش تھی۔ میں نے باہر سے دروازہ کھولا اور اندر آیا۔ فتح خان کا آدمی دیوار کی طرف منہ کر کے سو رہا تھا اس کے ہاتھ پاؤں ویسے ہی بندھے ہوئے تھے۔ شہلا اپنے کھل میں دیوار سے ٹیک لگائے لگائے بیٹھی خلاؤں میں گھور رہی تھی میں نے ٹرے اس کے سامنے رکھے اور پھر تصویروں والا لفافہ اس کی گود میں ڈال دیا۔ وہ چونکی۔ ”یہ کیا ہے؟“

”تمہارے کفوٹ ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں دیکھ کر شرمندہ ہوا ہوں۔ اب ان کو دیکھو اور اگر یہ تصویریں پوری ہیں تو ان کو اپنے ہاتھ سے ضائع کر دو۔ میں

ان کے بدلے فتح خان کے اس ساتھی کو چھوڑنے کے لیے لے ہوں۔“

شہلا کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا اس نے کانپتے ہاتھوں سے لفافہ اٹھایا اور اس میں سے تصویریں نکالیں۔ میں نے دوسری طرف رخ کر لیا تاکہ وہ آرام سے تصویریں دیکھ لے۔ ایک منٹ بعد اس نے کہا۔ ”تصویروں ساری ہیں۔“

”گڈ۔“ میں نے لائبرٹس اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”اب انہیں آگ لگا کر فلیش میں بہا دو۔“

وہ خاموشی سے واش روم میں چلی گئی۔ چند منٹ بعد وہ واپس آئی۔ میں نے محسوس کیا کہ اپنی تصویریں پا کر بھی اس کے چہرے پر پریشانی تھی۔

”کیا بات ہے کیا ان تصویروں میں کچھ کم ہیں؟“

”نہیں تصویریں تو تمام ہیں۔“ اس نے ہچکچا کر کہا۔

”میں تمہاری بات سن کر پریشان ہوئی ہوں۔“

”کون سی بات؟“

”یہی کہ تم نے فتح خان کے ساتھی کے بدلے یہ تصویریں لی ہیں۔“

”تو اس میں پریشانی کی کون سی بات ہے؟“

وہ پھر ہچکچائی۔ ”پریشانی کی بات ہے۔“

میں نے غور سے اسے دیکھا۔ ”شہلا کیا بات ہے کھل کر کہو۔“

اس نے فتح خان کے آدمی کی طرف دیکھا اور تھوک نکل کر بولی۔ ”تم اسے واپس نہیں کر سکو گے۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے کہا اور پھر نوجوان کی طرف جھپٹا۔ وہ کروٹ کے کھل لیٹا ہوا تھا میں نے اسے سیدھا کیا تو اس کا سیاہ چہرہ اور منہ سے نکلی زبان بتا رہی تھی کہ وہ کب کام چکا ہے۔ اس کی گردن پر انگلیوں کے نشانات تھے۔ یہ کام شہلا ہی کر سکتی تھی۔ نوجوان تو منہ تھا لیکن بندھی حالت میں وہ اتنا بے بس تھا کہ ایک عورت نے آرام سے اس کا گلا گھونٹ دیا اور وہ مزاحمت بھی نہیں کر سکا تھا۔ اسے مرے یقیناً کی گھنٹے گزر چکے تھے۔ میں نے شہلا کی طرف دیکھا۔ ”یہ تم نے کیا کیا؟“

”یہ ہوش میں آنے کے بعد بکواس کیے جا رہا تھا۔“ وہ کسی قدر تیز لہجے میں بولی۔ ”غلیظ زبان استعمال کر رہا تھا میں کب تک برداشت کرتی۔“

”میرے خدا اب میں فتح خان سے کیا معاہدہ کر طرح پورا کر دوں گا؟“

”تم اس سے معاہدہ پورا کرنے کے پابند نہیں ہو مجھے نہیں ہے اگر ایسی صورت حال فتح خان کے ساتھ پیش آتی تو وہ بھی تم سے کیا معاہدہ پورا نہیں کرتا۔“

میرا موڈ سخت خراب ہو گیا تھا۔ میں نے غرا کر کہا۔ ”بکواس بند کرو، فتح خان اور مجھ میں کیا فرق ہے تم اچھی طرح جانتی ہو، تم مجھے اس کی سطح پر لانے کی کوشش کر رہی ہو؟“

”سوری لیکن اب کیا ہو سکتا ہے۔“ وہ لاپرواہی سے بولی۔

”اب یہ ہو سکتا ہے کہ میں اس کے بدلے تمہیں فتح خان کے حوالے کر دوں اور اپنی زبان پوری کروں۔“

شہلا سہم گئی تھی۔ ”تم ایسا نہیں کرو گے وہ درندہ ہے۔ اس کے حوالے کرنے سے بہتر ہے تم مجھے اپنے ہاتھ سے مار دو۔“

”شاید میں یہی کروں۔“ میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا اور پھر باہر آ گیا۔ ایاز اور بیٹو لاؤنچ میں تھے اور یقیناً انہوں نے سب سن لیا تھا۔

”یہ اس نے بڑا کیا۔“ ایاز نے کہا۔

بیٹو نے منہ بنایا۔ ”ہم تو کہتا ہے شہلا بھائی اسے فتح خان کو دے دو ہم خود چینگ لاکر سے اپنی چیز لے لے گا۔“

”نہیں اسے فتح خان کو دینے کا مطلب ہے کہ اس کے ہاتھ ایک مہرہ اور آجائے۔ ابھی تو اس لاش سے ہڈیاں کا حاصل کرتا ہے۔“ میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ شاہین والے کمرے کا دروازہ بند تھا لیکن اس گھر کی اندرونی ساخت ایسی تھی کہ ایک جگہ ہونے والی گفتگو با آسانی دوسری جگہ سنی جا سکتی تھی۔ ایاز نے غور کیا۔

”یہ مسئلہ نہیں ہے اسے کہیں نہ کہیں تو ڈالنا تھا زندہ نہ کسی لاش سہی۔“

”بس تو تیار ہو جاؤ۔“ میں نے کہا۔ ”لاش جیب میں منتقل کرو، ہم اسے کہیں پھینک کر آتے ہیں۔“

”آپ کا جانا ضروری نہیں ہے۔“ ایاز نے کہا۔ ”میں اور بیٹو یہ کام آسانی سے کر لیں گے۔ ویسے بھی کسی کا یہاں ہونا ضروری ہے۔“ اس نے شاہین کے کمرے کی طرف دیکھا۔ میں اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ اگرچہ شاہین ایک مظلوم لڑکی تھی جسے ہم اس کے اغوا کنندگان سے چھڑا کر لائے تھے لیکن اس پر مکمل اعتماد کرنا بھی درست نہیں تھا۔ اس کی نگرانی کے لیے کسی نہ کسی کو یہاں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے سر ہلایا۔

”ٹھیک ہے تم دونوں جاؤ لیکن کسی ایسی جگہ چھوڑنا جہاں تمہیں کوئی نہ دیکھے اور اس جگہ کا پتہ فتح خان کو بتایا۔“

”ٹھیک ہے۔“ ایاز نے کہا پھر اسے کوئی خیال آیا۔ ”یہاں سے کوئی تین میل آگے جی لی روڈ پر ایک پل ایس او پیروں پل ہے اس کے پیچھے چھوٹا سا بیلہ ہے میرا خیال ہے وہاں ڈال دیتے ہیں۔ زیادہ وقت نہیں لگے گا ہم پون گھنٹے میں لوٹ آئیں گے۔“

”یہ مناسب رہے گا۔“

میری رضا مندی پاتے ہی وہ کمرے ہو گئے۔ پہلے انہوں نے شہلا والے کمرے سے فتح خان کے آدمی کی لاش نکالی اور اسے ایک چادر میں لپیٹ دیا۔ پھر اسے اٹھا کر باہر ایاز کی جیب کے پیچھے حصے میں ڈال دیا اور وہ روانہ ہو گئے۔ میں دروازے بند کر کے اندر آیا اور کیمروں کا سسٹم آن کر دیا۔ ان کیمروں میں رات کو دیکھنے والا نظام بھی تھا۔ پھر میں شہلا کے کمرے میں آیا تو وہ حیرت سے چائے اور ڈبل روٹی کھا رہی تھی اس کے انداز سے بالکل نہیں لگ رہا تھا کہ اس نے چند گھنٹے پہلے ایک آدمی کو گلا گھونٹ کر ہلاک کیا ہے۔ ویسے اس کی سفاکی کا نمونہ میں نے اسی وقت دیکھ لیا تھا جب اس نے پروفیسر اور اس کے ساتھیوں کو شوٹ کیا تھا۔ لیکن کسی کو اپنے ہاتھ سے گانا کر مارنا ایک الگ چیز ہے اور وہ کام کر کے بھی نہ سکون لگی۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ ”اسے کہاں لے گا؟“

”میرے ساتھی لے گئے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”تم نے اچھا نہیں کیا۔“

”تم فتح خان کا زیادہ تم مت کرو۔“ وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ ”وہ شخص اسی قابل ہے۔ موقع ملے پر وہ کسی دوسرے کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتا ہے۔“

میں نے موضوع بدل دیا۔ ”اسے مار دو گولی یہ بتاؤ کہ لیاقت انصاری سے تمہارا کیا تعلق ہے؟“

اس نے منہ بنایا۔ ”تمہارے ساتھی بھی کم درندے نہیں ہیں۔ انہوں نے مجھ پر تشدد کیا تھا۔“

”مجھے معلوم ہے اور انہوں نے ٹھیک کیا، تم اسی قابل ہو۔ شرافت کی زبان کہاں بھتی ہو؟ تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا، کیا مجھ سے بھی اپنے ساتھیوں والا سلوک چاہتی ہو؟“

بادل نا خواستہ اس نے کہا۔ ”لیاقت اصل میں اس

201

ماہنامہ سرگزشت

نومبر 2011

200

ماہنامہ سرگزشت

بیت بازی

قارئین

(سعید احمد چاند، کراچی کا جواب)

نوشین ملک..... ناروے
نا آشنائے درد کہ دنیا کہیں جے
ہے کارگاہ شیشہ گراں دیکھتے چلو
نواکت علی تزلزلش..... کراچی

نہند کرنے کا سوچے ہم بھی
خواب کچھ مہربان ہوتے تو
سعید احسن..... کھوئی

نادم ہے وفا چپ ہے لب دیدہ تر چل
کام عشق میں آیا نہ کوئی اپنا ہنر چل
(عقیل الرحمن، کھاناں کا جواب)

آفتاب عباسی..... لاڑکانہ
ترے نزدیک آکر سوچتا ہوں
میں زندہ تھا کہ اب زندہ ہوا ہوں
وزیر محمد خان..... بٹل جزارہ

تمہارے بعد خدا جانے کیا ہوا دل کو
کسی سے رابطہ برحمانہ کا حوصلہ نہ رہا
(جاوید آرمیں، حیدرآباد کا جواب)

ناصر وفا..... حیدرآباد
راہ میں چھوڑ گیا ساتھ جو اپنا ساتھ
یہ ستم اس کو زمانے نے سکھایا
عشرت علی..... کاموگی

رابطہ ان سے بہر حال قائم رہا
لاکھ دشمن لگاتے بجاتے رہے
اطہر علی..... دینہ جہلم

روح کے گھماؤ کون دیکھے گا
سب کی آنکھوں میں بس رہا ہے جم
انجم انصاری..... حیدرآباد

رات بھی لازم ہے وجود ہستی میں
صبح کا سنورنا بھی زندگی کا حاصل ہے
(نوشین ناز، کراچی کا جواب)

سعید احمد چاند..... کراچی
اتنا قریب آؤ کہ جی بھر کے دیکھ لیں
شاید کہ پھر ملیں تو یہ ذوق نظر نہ ہو

آفتاب علی قاضی..... جہلم
اپنے بس میں رہے گی کیا آدمی
اپنے بل پر شجر رہے گا کیا

نغمہ عباس..... ہالہ نند
ان ستارہ نزاہ آنکھوں میں
اپنے ہی رست جگے سے لگتے ہیں
اتر جی ملی جی..... کراچی
ایک بھولی ہوئی کہانی کو
موز بجر سے لیا دیا جائے
ممتاز الدین..... لاہور

اتر رہے ہیں تواتر سے خواب آنکھوں میں
سمجھ رہا ہوں کوئی امتحان ہے یہ بھی
نازش بحر..... کراچی

ان کا چہرہ مرا نام سن کر
اور بھی کچھ حسیں بن گیا
(ملک جاوید محمد خان سرکانی، جھجھ کا جواب)

قاری احسن ملک..... منڈی بہاؤ الدین
گارفاطہ جعفری..... چنیوٹ

یہ وقت ہی تو ہے وہ بلا کا ستم ظریف
سورج کو بھی جو رات کے قدموں ڈال دے
ظہیر حسن..... صادق آباد

یہ کیسی تاج پوشی ہے، یہ کیسی جامہ زیبی ہے
کہ اب پوشاک سے بھی تن کی عریانی نہیں جانی
انور علی..... کراچی

یہ مرا دل تو ایک سمندر ہے
کون سمجھے گا اس کی تھاہ کا حال
(مہوش رضا، حب بلوچستان کا جواب)

سمیل آرمیں..... حب
وقت نے کیسی فصیلیں کھینچ دی ہیں دریاں
لوگ تھا ہیں مگر احساس تہائی نہیں
منظہر حسن..... حیدرآباد

وہی دست جنوں کی شکل میں بچھی گریباں تک
وہی دیوانگی جو تیرے دیوانوں کے ہاتھ آئی

مخصوص تھا اور وہاں سوائے قالین کے اور کچھ نہیں تھا۔
..... مانیٹر کے پاس بیٹھ گیا۔ دیوار سے ٹیک لگائی اور تھوڑی دیر
بعد ایک نظر مانیٹر کو بھی دیکھ لیتا تھا۔ ایاز اور بیت کو گھسنے ہوئے
میں منٹ ہونے کو آئے تھے۔ ایک بار میں نے مانیٹر کی
طرف دیکھا تو مکان سے کچھ دور ایک ڈبل کیمین ٹویٹا دکھائی
دی۔ اس سے دو افراد اترے تھے۔ چلے سے وہ فتح خان کے
گاؤں کے لگ رہے تھے۔ میں چونکا ہوا گیا۔ اگرچہ ضروری
نہیں تھا کہ ان کا ہم سے کوئی تعلق لگتا لیکن ہوشیار ہونے میں
کوئی حرج نہیں تھا۔

میں نے سوچا اور پھر اٹھ کر باہر آیا اور جب تک کہ
سیڑھیوں سے چھت پر آ گیا۔ وہاں تاریکی تھی اور مکان کے
آس پاس روشنی تھی اس لیے میں دوسروں کو دیکھ سکتا تھا لیکن
مجھے دیکھ لیے جانے کا امکان بہت کم تھا۔ میں نے منڈیر سے
جھانک کر دیکھا۔ ٹویٹا ڈبل کیمین مکان سے کوئی سو فٹ دور
موجود تھی اور اس میں سے اترنے والوں میں سے ایک بچھلی
نشت سے کچھ اُتارنے کی کوشش کر رہے تھے اور دوسرا ہاتھ
میں عجیب سا کپڑا لیے کھڑا تھا۔ میں نے غور کیا تو مجھے محسوس
ہوا کہ وہ شاید بلاؤز تھا جو خواتین ساڑی کے ساتھ پہنتی ہیں۔
لیکن اس آدمی کے پاس اس کا کیا کام تھا۔ دوسرا ابھی تک
بچھلی سیٹ سے کسی کو کھینچ کر اُتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر
وہ کامیاب رہا اور اس نے ایک عدد کتا نیچے اتارا۔ کتا دیکھنے
میں اچھی نسل کا لگ رہا تھا لیکن شاید اس سردی میں باہر آنے
کو تیار نہیں تھا۔ اسے اُتارنے والا اسے گالیاں دے رہا
تھا۔ اس کی ہلکی سی آواز مجھ تک آرہی تھی۔

”خانہ خراب کا بچہ کام کرو۔ کہیں کا۔۔۔“
پھر دوسرے آدمی نے بلاؤز کتے کے منہ کے سامنے کر
دیا اور اسے سوکھنے پر مجبور کرنے لگا کیونکہ کتا منہ پیچھے ہٹا رہا
تھا اور وہ بار بار بلاؤز اس کے سامنے کر رہا تھا۔ میں سمجھنے کی
کوشش کر رہا تھا کہ یہ کیا چکر ہے؟ کتاب پر سکون تھا اور اس
نے اپنے منہ کے آگے بلاؤز قبول کر لیا تھا۔ پھر اس آدمی نے
بلاؤز ہٹا لیا اور اسے گاڑی کے اندر ڈال دیا۔ دوسرا کتے کی
پشت تھپک رہا تھا جیسے اسے کام کے لیے آیا ہو۔ پھر
اچانک ہی کتے نے منہ اوپر کر کے جیسے ہوا سوکھی اور مکان کی
طرف رخ کر کے بھونکن شروع کر دیا۔ میرے چودہ لمبی
روشن ہو گئے تھے۔ اس کتے کو مکان سے کسی کی بول رہی
تھی۔ لیکن کس کی؟

جاری ہے

بینک کا سیکورٹی سپروائزر ہے۔“
”تم نے اس سے رابطہ کس طرح کیا؟“
”میں اس سے ایک تہائی کی ماری عورت بن کر ملی، وہ
عاش آدمی ہے اس لیے اسے راتے پر لانے میں دیر نہیں
لگی۔“ وہ پوری بے باکی سے بولی۔ ”اب وہ میرے پیچھے
کتے کی طرح ڈوم ہلانے کو تیار رہتا ہے۔“
”اگر ایسا ہی ہے تو تم نے اس کی مدد سے لاکر کیوں
نہیں کھلوایا؟“

”میں اسے یہ نہیں بتا سکتی، اس طرح تو میں ہمیشہ کے
لیے اس کے چنگل میں پھنس جاؤں گی اور میں ہر بار کسی سے
چھٹکارا پانے کے لیے قتل بھی نہیں کر سکتی۔“
”حالانکہ قتل کرنا تو تمہارے لیے بہت آسان ہو گیا
ہے، ابھی تم نے ایک شخص کو گلا دبا کر ہلاک کیا ہے۔ یہ کام
تو دل گردہ رکھنے والے مرد حضرات بھی نہیں کر سکتے
ہیں۔“ میں نے طنز کیا تو اس نے بڑا سمانہ بنایا۔

”میں نے اس پر بہت محنت کی ہے اور بڑی چالاکی
سے اس سے معلومات حاصل کی ہیں۔“
”کیا وہ لاکر تک رسائی میں تمہاری مدد کو تیار ہے؟“
”نہیں لیکن میں نے اس سے بینک کی سیکورٹی کی تمام
تفصیلات حاصل کر لی ہیں اور ان کی مدد سے ایک پلان بھی بنا
لیا ہے۔“

”پلان کیا ہے؟“
”یہ میں تمہیں یا کسی کو نہیں بتا سکتی چاہے تم لوگ میری
یونٹیاں کیوں نہ اُڑا دو۔“ لفظ یونٹیاں ادا کرتے ہوئے اس کا
لہجہ لذت آمیز ہو گیا تھا میں نے دل میں لاجول پڑھی۔ وہ
سخت حرافہ تھی اور اسی لائق تھی کہ اسے فتح خان جیسے مرد
میں نے درشت لہجہ میں کہا۔

”ایسا مت کہو شہلا اگر میں تمہاری توقع کے مطابق فتح
خان کی سطح پر اُتر آیا تو تم سے کچھ بھی دس منٹ میں اُگلا سکتا
ہوں اور اس کے لیے مجھے تمہاری یونٹیاں اُڑانے کی ضرورت
بھی نہیں ہے۔ لیکن میں حتی الامکان عورت پر ہاتھ اٹھانے
سے گریز کرتا ہوں۔“

وہ مسکرانے لگی۔ اس نے چائے اور ڈبل روٹی ختم کر
دی تھی۔ میں نے ٹرے اٹھائی اور باہر نکل آیا۔ شاہین کے
کمرے کا دروازہ بند تھا اب پتا نہیں یہ اندر سے لاک بھی تھا یا
نہیں، میں نے چیک کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کیمروں کی
مانیٹرنگ کا سسٹم اس کمرے میں تھا جو ڈرائنگ روم کے لیے



ہر خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام ہے۔

نام:

پتا:

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی □ سائنس □ پاکیزہ □ سرگزشت □ بھجوا دیا جائے
کسی ایک پر ☒ کیجیے۔

کوپن کے ہمراہ اپنے جوابات مورخہ 30 نومبر 2011، تک علمی آزمائش 75 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں۔

اگر آپ کو

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

ماہنامہ سائنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

کے حصول میں دقت پیش آرہی ہے یا آپ کو اپنے
علاقے کے بک اسٹال سے کوئی شکایت ہے اور
آپ کے علاقے میں بروقت پرچہ نہیں پہنچ رہا تو

شکایت فیکس کریں

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

شمر عباس 0301-2454188

بدالدین کرولیشن مینجر 35802552-35386783-35804200

فیکس نمبر 35802551

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 III پکینیشن ڈسٹری بیوٹنگ اتھارٹی میں کوئی روز کراچی

فون: 35895313 فیکس: 35802551

مقابلہ بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی
تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ "بیت بازی"
شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر
کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر
ارسال کر سکتے ہیں۔

نام:

پتا:

محترم! متحرّمہ..... کے شعر کے جواب میں
شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شامل اشاعت کر لیں
(شعرا لگ کاغذ پر ہے) **36**

مقابلہ بیت بازی

پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی، 74200

زرافشاں فرحت..... میر پور خاص
اک ترے انتظار سے پہلے
جس کیسا عجیب گھر میں تھا
اسا توحید..... کھونکی
اگر حد سے بڑھے گی یہ فحوشی
تو ہم بھی چٹنا چٹایا کریں گے
فرحت حیات..... حیدر آباد
اس شخص کے چہرے کی اداسی کو تو دیکھو
لگتا ہے کہ مدت سے وہ رویا ہی نہیں ہے
قاری سلوت جاہ..... فیصل آباد

اپنی مٹی میں ہوا کرتی ہے ماں کی خوشبو
دیکھنا خوب سمجھ سوچ کے ہجرت کرنا
(علی رضا خان، ساہیوال کا جواب)
راجا قتب نواز..... ساہیوال
اس دنیا میں اور بھی غم تھے بیٹھے بیٹھے درد بھرے
غم حیرا ہی چاہا پایا بھول ہوئی شرمندہ ہوں
آصف شاہ..... میر پور کشمیر
اسے بھولنے کا جو آئے خیال
وہ بے ساختہ یاد آجائے ہے
واحیلہ..... فیصل آباد
اڑتی ہے ایک خاک سی حد نگاہ تک
تم کیا گئے کہ رونق دیوار و در گئے
احسان علی..... سرگودھا
آج کوئی پتھروں کے مول بھی لیتا نہیں
ورنہ محسن ہم بھی کل تک بے بہا ہیروں میں تھے
(نصرت شاہین، لاہور کا جواب)
عقیل الرحمن..... کھاناں
مجھے معلوم ہے انجام رودادِ محبت کا
مگر کچھ اور تھوڑی دیر سہی رانگاں کر لوں
☆☆☆

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ
سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس
اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے
جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

شگفتہ ملک..... راولپنڈی
وعدوں کو وفا کرنا عادت ہی نہیں اس کی
مت راہ میں تو اس کی اسے دیدہ تر رہنا
(ناصرہ خورشید، ایبٹ آباد کا جواب)
اکبر بیک..... جرنی
تمام عمر جسے ہم نے زندگی سمجھا
ملاں یہ ہے کہ اس نے بھی اجنبی سمجھا
(راجا قتب نواز، ساہیوال کا جواب)
ملک فدا حسین..... شیخوپورہ
گھر وندا ہمارا بچپن ہے
اگر نظر دیکھ تو لیا ہوتا
کاشف حسن..... دینہ
یہ کوئی اور ہے اے عکس دریا
میں اپنے عکس کو پہچانتا ہوں
صفدر عباس..... لڈن وہاڑی
یہ یاد دل جس جگہ سایہ کریں گے
وہاں ہم دھوپ لے جایا کریں گے
شہاب الدین..... اوکاڑہ
یاد آتے ہیں وہ بچپن کے زمانے کتنے
ان دنوں تھے یہی دن رات سہانے کتنے
(محمد سعید قاسمی، ڈلوال کا جواب)
پرویز مشہدی..... کراچی
نہ جانے شور بچپنی یہ نامراد ہوا
کہاں سے آگئی آواز پاکے رستے میں
خالد حسن خالد..... وہاڑی
نیند آرام کر رہی ہے ابھی
حیری پلکوں کے ساتہان میں کیا
جہانزیب فاروقی..... لاہور
نیند آتی ہے مگر خواب نہیں آتے ہیں
مجھ سے ملنے مرے احباب نہیں آتے ہیں

(نزهت امین، حیدر آباد کا جواب)

مہوش سلیم..... ملتان
اس شہر میں کیا خاک شناسا کوئی ڈھونڈے
لوگوں کے بدن پر کوئی چہرہ ہی نہیں ہے

علمی آزمائش 75

انارہ

ماہنامہ سرگزشت نامتو و انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنشن ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری "یک مٹی سرگزشت" کے عنوان تلے مندرجہ انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیں کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 نومبر 2011 تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

21 اپریل 1926ء کو لندن میں پیدا ہوئی۔ ڈیوک اور ڈچس آف یارک کی پہلی بیٹی تھی۔ بچپن 145 کا ڈلی لندن میں گزرا۔ مس میرین کرافورڈ سے تعلیم حاصل کی۔ اکتوبر 1940ء میں جب چودہ سال کی تھی، پہلی بار ریڈیو پروگرام میں حصہ لیا۔ 1942ء میں گرینیڈیرز گارڈز کا کرنل مقرر ہوئی۔ 1947ء میں لیفٹیننٹ مونٹ بیٹن سے شادی اور 20 نومبر 1947ء کو شادی ہوئی۔ 2 جون 1953ء کو بہت سے ممالک کے سیاہ و سفید کی مالک قرار دی گئی۔

علمی آزمائش 73 کا جواب

21 مئی 1023ھ بمطابق یکم اپریل 1614ء کو جہاں آرا بیگم کی ولادت ہوئی۔ خواجگان چشت سے عقیدت رکھتی تھیں۔ مغل شہنشاہ شاہجہاں کی بڑی بیٹی تھیں۔ دور سالی "مولس الارواح اور صاحبیہ" کی مصنفہ کہلائیں۔ یہ دونوں کتابیں اب کتب خانہ احمد آباد اور کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہیں۔ آخر رمضان 1092ھ بمطابق 6 ستمبر 1681ء کو اس جہاں فانی سے کوچ کر گئیں۔

انعام یافتگان

1۔ انعام اللہ خان، مظفر گڑھ۔ 2۔ سلطان خان، کوئٹہ۔ 3۔ شہلا پروین، واہڑی

4۔ نصرت مغل، پاراچنار۔ 5۔ فیروز الدین، میرپور

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے: عمار اسلام الدین شیخ، امیر الاسلام، سنجیدہ احمد، جاوید اقبال، نعمت مرزا، طاق حبیب، محمد فیضان،

زبیر ملک، من خان اچکزئی، امیر الدین، اطہر حسین، نوید احسن، اختر عباس، فرید احسن، آفتاب منصور، عمار اسلام محمد، عمار زبیر چوہدری، تانیہ احسن، جمیل عثمانی، زبیر اختر، نوید احسن مرزا، زبیر احسن، فرمودہ فاطمہ، سعید احمد چاند، سبط علی سید، مرتضیٰ رضوی، پیکر دونوی۔ لاہور سے: شوکت ملک، احسان خان، شاور علی، ثناء اللہ بخاری، انوار علی شاہ، صاحب جان، چوہدری اشفاق، شاہینہ بٹول، نوشین اختر، امجد خان، بہادر خان اچکزئی، اختر کوکب بقیس، احسان احسن، شازیہ اکرام، کلیم وٹو مہوش جان، شاہ انوار شاہ، کوکب جمیل، احتشام لاہور۔ اسلام آباد سے: ثمنہ عزیز، مہناز عرفان، شہزاد علی، عظیم زیدی، اکبر حیات خان، شبیر خان توری، بخش امین غزل، فرحت احسان، زیب النساء، ثناء اللہ بخاری، اکبر خان، نیاز احمد، صالح عبداللہ۔ راولپنڈی سے: فیض محمد، نعمان علی، اختر علی اختر، محمد سمیل، حلیم اللہ خان، مظفر ڈیال، سید لطافت حسین، نواز احسن، سلیم اللہ، بی بی اسلام شیخ، اختر علی صدیقی، عرفان اللہ قادری، نورین زرین، نگار بانو، ایمین غزل، نورین نوری، یاسمین اختر ناز، چوہدری ممتاز الدین، نوید اسلم، ارہاب حسن خان، کائنات بٹول، شاہینہ شیخ، ثمنہ عزیز، افراتیم، سلیم اللہ خان۔ ملتان سے: افتخار حسین، شہناز تسلیم، کلثوم ترین، دلاور خان، انعم جہاں، اکرام حسین شیخ، زاہد علی، سبط حسن گردیزی، بنت زینب انصاری، نعمت خان، دغواز خان، درویش شاہ۔ جلیک آباد سے: احمد یار خان، فیصل بابر، نصیر الدین، ثمنہ جونجو، اسلم مشتاق، قائم علی۔ رحیم یار خان سے: شبیر حسین شیرازی، ناز سلطانی، نصرت اسماعیل، فرحت زینب، امتیاز احمد، کاشان لاشاری، فاطمہ فرحت، اسماعیل اچانک، گل باز خان، کیف سرمدی، زیب النساء، عمار یاسر۔ سرگودھا سے: نواز احسن، شفیق حسن۔ وہاڑی سے: محمد عمران الحق (پورے والا) انگ سے: صاحب جان، جاوید خانزادہ۔ چکوال سے: عارف احمد، انعام الحق۔ کمالیہ سے: نصرت علی، ذیشان احمد۔ بہاولنگر سے: افتخار احمد، عارف سیال، رضیہ ممتاز۔ بہاولپور سے: نعمانہ فرحت، وحسی احسن، زبیر احمد، نصرت جاوید خان۔ میان والی سے: فہیم اختر، شمیم اختر، عباس جعفری، حبیب حسن خان، حکیم سید محمد رضا شاہ۔ ٹنڈو جان محمد سے: کمال احسن، شریف باری۔ ڈیرا غازی خان سے: تانیہ احسن، اطہر حسین، شیخ تہدق، شوکت حسن۔ ڈیرا اسماعیل خان سے: عائشہ فرحت، نصیر خان، حضرت شاہ، محمد عمار۔ حیدر آباد سے: خرم عباسی، ثار جمالی، فرحان مرتضیٰ، ناصر حسین فرحت، نعمان اشرف، ممتاز انصاری، اسلم جونجو، ناصر بند، کوکب قریشی، اکبر علی لاکھو، ممتاز الدین قادری، بیگم شمیم النساء، ذیشان اختر عطاری، نعمان علی جونجو، عرفان حسین، فیصل مغل، ثمنہ الد ڈیو، زبیر مروت، شاہد جمیل۔ پشاور سے: درود خان، سعید الدین، سلطان شاہ، سمندر خان، ارباز خان، نعمت گل حسن زئی۔ گھوگلی سے: بابا خان ڈرائیور، ناصر حسین، عارف سیال۔ اوکاڑہ سے: اشعر احمد، صاحب جان، نعمت خان لودھی، صالح الدین، زرین الاسلام، پروین فرحت، حافظ فیروز الدین۔ واہ کینٹ سے: سلیم الدین احمد۔ نوشہرہ سے: خالد خان۔ بدین سے: الدیو، ناز، کل، خاقان خان چوکیدار۔ ساہیوال سے: عباس سید، نغمہ علی شامزئی، اطہر حسین، ذوالفقار علی اسدی۔ میرپور خاص سے: شریف شاہ، ناصر خان، نصرت علی، صفیہ علی، مظاہر علی سعید۔ چارسدہ سے: نصرت علی خان، جمیل خان۔ جہلم سے: زید سرسوی، بنیامن سچ، اطہر الدین لاٹ۔ کوہاٹ سے: نظیر شاہ، طلحہ خان، صفدر اچکزئی، سعید آفریدی، گل زمان خان۔ قصور سے: ملک فیروز، مظہر علی، ندیم شوکت۔ خوشاب سے: احمد علی جان، حباب خان، سلطان شاہ، آصف خانزادہ، رفیع محمد مستری۔ صادق آباد سے: مومن خان، تسلیم نیانی، پرویز اختر، سلمان علی، نعمت فیروز شاہ۔ مظفر گڑھ سے: ہیبت خان حسن زئی، اکبر علی عابدی، ذیشان انصاری، نصرت خان میتھل، فرہاد بیت۔ شکر گڑھ سے: شگفتہ اسلام، مہوش فرحت، شہلا فرحت، سبط علی، نوید احسن۔ لیہ سے: حسن خان، شوکت علی۔ من آباد سے: اصغر عباس۔ خیرپور سے: فرخندہ تاثیر، محسن زیدی، احمد دین جونجو۔ کاسوگی سے: نصرت حسن۔ سمندری سے: ارباز خان، کاشان، محمد طفیل تغذی۔ کجرات سے: افتخار دیوان۔ خان پور سے: سلیم خان، ابرار سعید، طارق رحمن۔ نارووال سے: شبیر زیدی۔ روہڑی سے: زرینہ بزنجو۔ جیچہ وطنی سے: شاہد بزداری۔ پسرور سے: اسد شانی۔ کچھ بلوچستان سے: اسعد رند۔ شرف پور سے: نعمت خانپوری۔ منڈی بہاؤ الدین سے: ثمنہ خان۔ لالہ موسیٰ سے: زاہدہ ملک۔ بکھر سے: آصف شہزاد۔ سیالکوٹ سے: نوید شہزاد خواجہ۔ ننکانہ صاحب سے: فرانسس جیمز (مارٹن پور) ہری پور ہزارہ سے: خورشید احمد (کھلاٹ ٹاؤن شپ)

مملاک غیر سے: شاہد طاہر محمود چوہدری (یو ایس اے) اکبر بیگ (جرمنی) کلیم اللہ (المن، یو اے ای) زینب خورشید سلطان (انڈیا، کینیڈا) اصغر علی (پانچسر، یو کے) فرحت جمیل، ثنا فاخر (دہلی، یو اے ای) ارتضیٰ حسین، مطلق (اومان)

Scan & PDF

FIAZ AHMED

Friends Korner.com

ڈائری

راوی: ندیم خاں
جناب ایڈیٹر صاحب!
السلام علیکم

روانہ کردہ کہانی حرف بہ حرف سچی ہے مگر میں نے اسے دلچسپ بنانے کے لیے مزاحیہ انداز میں لکھی ہے۔ امید ہے ذائقہ بدلنے کے لیے ہی سہی اسے شامل کر لیں گے۔ ایک بہت پیچیدہ روداد کو میں نے ہلکی پھلکی کہانی بنایا ہے جو خود میں ایک تجربہ ہے۔
منظر امام
(کراچی)

”تو پھر سن، میں نے دعا مانگی ہے کہ مجھے میری موت کا وقت بتا دیا جائے۔ اور مجھے یقین ہے کہ میری دعا قبول ہو گئی ہے۔“

ندیم کو اس دن کے لیے بہت لمبا انتظار کرنا پڑا تھا تقریباً چھ مہینے اور بالآخر لاغر صدیقی جب بالکل ہی لاغر ہو کر بستر پر لیٹ گئے تو ندیم کو بلا کر پوچھا۔ ”بیٹا اب میرا آخر وقت آچکا ہے۔ اب میں زندہ نہیں رہوں گا اسی لیے میں نے سوچا ہے کہ تیری دولت تیرے حوالے کر دی جائے۔“

ندیم کو یاد تھا کہ بچپنی میں اس کا باپ بھڑک اٹھا تھا۔ اسی لیے اس نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔ ”نہیں ابا، ایسا غضب مت کرو، مجھے تمہاری دولت کی نہیں بلکہ تمہاری ضرورت ہے۔“

”زیادہ مکاری مت کر، میرے بچے کے نیچے سے چابیوں کا گچھا نکال لے اور وہ جو دالان میں لوہے کا صندوق بڑا ہے وہ کھول۔ اس کے اندر کپڑے کا ایک تھیلا ہے اس میں کچھ کاغذات رکھے ہیں وہ اٹھا کر لے آ۔“

ندیم نے لاغر کے بچے کے نیچے سے چابیوں کا گچھا نکالا اور دالان کی طرف دوڑ لگا دی۔ کچھ دیر بعد وہ کپڑے کا

ندیم کا باپ لاغر صدیقی اب اور بھی زیادہ لاغر ہو گیا تھا۔

وہ ایک شاعر تھا۔ اس کے باوجود اس نے اپنا تخلص لاغر رکھا ہوا تھا جب تک اس کی صحت ٹھیک تھی وہ لاغر رہا اور جیسے ہی صحت جواب دینے لگی اس کی لاغری ختم ہو گئی تھی۔

اس کے پورے جسم پر ورم آ گیا تھا، اس بے پناہ ورم کی وجہ سے اس کی دونوں آنکھیں تک پوشیدہ ہو گئی تھیں۔ لاغر صدیقی ہمیشہ ندیم سے کہا کرتا۔ ”بیٹا تو ایک خوش قسمت لڑکا ہے۔“

”وہ کیوں ابا؟“
”مجھے نہیں معلوم کہ تیرے باپ نے تیرے لیے کیسی دولت خفیہ طور پر رکھی ہوئی ہے اور میں یہ اس وقت تیرے حوالے کروں گا جب میری موت کا وقت قریب آئے گا۔“
”لیکن ابا، یہ کیسے معلوم ہوگا کہ وقت قریب آ گیا ہے، اگر اچانک ہی چل بے تو کیا ہوگا؟“

”بیٹا پہلی بات تو یہ ہے کہ تجھے باپ کی موت کا ذکر سن کر کچھ افسوس کا اظہار کرنا تھا۔ اس کے بجائے تو میرے چل بسنے کی بات کر رہا ہے۔“

”ابا! میں نے تو احتیاطاً ایک بات پوچھ لی تھی۔“

آہ! حمید اختر

بزرگ صحافی، ادیب، دانشور اور انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان کے سیکریٹری جنرل حمید اختر بھی ہم میں نہ رہے۔ غشایہ کے انتقال کے اگلے ہی روز یہ بھی داغ مفارقت دے گئے۔ گویا ادب کے دو ستون دو دن میں گر گئے۔ صدر، وزیر اعظم، نواز شریف، شہباز شریف، عمران خان، چوہدری شجاعت اور دیگر سیاسی رہنماؤں، ادیبوں، شاعروں اور اہل قلم نے ان کی وفات پر گہرے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے اسے ترقی پسند ادب کے لیے بہت بڑا نقصان قرار دیا ہے۔ افسانہ نگار انتظار حسین نے کہا کہ ان کی وفات سے اردو ادب کو بہت بڑا نقصان پہنچا ہے، انجمن کے صوبائی سیکریٹری عابد حسین عابد نے کہا کہ ان کی کمنٹ ترقی پسندی کے نام پر انتشار پھیلانے والوں کے لیے مشعل راہ بھی، سلیہ ہانگی نے کہا کہ حمید اختر صاحب جہاں علم و ادب کی بڑی شخصیت تھے، وہیں ان کا مزاج بھی بہت اعلیٰ تھا۔ وہ اکثر محفلوں میں ہو جانے والی تلخ کلامی کو ختم کرنے کے لیے ایسی بات کر دیتے کہ ماحول منتوں میں تبدیل ہو جاتا۔ اصغر ندیم سید نے کہا کہ حمید اختر نے اپنے نظریات کی خاطر مالی قربانیاں بھی دیں اور جیل بھی کائی۔ بھارت کے معروف شاعر و نقاد نگار گلزار نے کہا کہ حمید اختر کا تعلق ترقی پسند تحریک سے رہا اور انہوں نے اس تحریک کی کامیابی کے لیے جو کاوشیں کیں ان کو سلام پیش کرتا ہوں، ان کی تحریر کردہ کتابوں اور یادداشتوں کے ذریعے ان سے گہرا تعلق رہا، جب بھی میری شانہ اعظمی سے ملاقات ہوئی اور ہم ماضی کے جھروکوں میں جھانکتے تو عموماً حمید اختر کی بات ضرور کرتے، ایک آدھ مرتبہ میرے دوستوں نے ان سے فون پر میری بات بھی کر دائی۔ وہ بہت خوش مزاج شخص تھے۔ شاعر و نقاد نگار جاوید اختر نے کہا کہ حمید اختر میرے والد جاں نثار اختر کے دوستوں میں سے تھے، ان کے ساتھ جتنے لمحے بہت اچھے رہے، ان کی کتابیں اور یادداشتیں ایک اہم ورثہ ہیں۔

”تم ہی تو آواز دے رہی تھیں۔“ سنگدل محبوب۔
”میں قبرستان کے گیٹ سے پلٹ کر آیا ہوں۔“
”لیکن تم تو سنگدل محبوب نہیں ہو۔“
”تو پھر کون ہے وہ سنگدل محبوب؟“ ندیم نے جھٹاکر پوچھا۔

”ہائے وہ تو کوئی اور ہے۔“ لڑکی نے کہا۔ ”اسی کے لیے تو میں قبرستان میں آ کر وظیفہ پڑھ رہی ہوں۔ تم کہاں سے ٹپک پڑے؟“
”کمال کی لڑکی ہو۔“ ندیم حیرت سے بولا۔ ”کیا ضروری ہے کہ تمہارے وظیفے سے سنگدل محبوب تمہارا ہو جائے۔ آخر کس نے بتایا ہے یہ وظیفہ؟“
”املی والے بابا نے۔“ لڑکی نے بتایا۔ ”وہ ہر وقت املی کھاتے رہتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ سنگدل محبوب اس وظیفے سے موم ہو کر قدموں پر جھٹک جائے گا۔ میں ان کو تیس ہزار روپے بھی دے چکی ہوں۔“

”تم مجھے اگر پندرہ ہزار روپے دو تو میں تمہارے سنگدل محبوب کو تمہارے قدموں پر جھٹکا سکتا ہوں۔“
”کیا تم بھی کوئی بابا ہو؟“

”بابا نہیں بابے ہوں۔ تم مجھے اپنے سنگدل محبوب کا نام اور پتا بتاؤ میں اسے تمہاری محبت کا قائل کر دوں گا۔ اسے یقین دلاؤں گا کہ تم اس سے بے پناہ پیار کرتی ہو کیونکہ میں بہت اچھی گفتگو کر لیتا ہوں۔ میرے مرحوم باپ نے کم از کم بولنا تو سکھا ہی دیا ہے۔“

”اجنبی مسافر۔ نہ جانے کیوں تم پر یقین کرنے کو دل چاہنے لگا ہے۔“ لڑکی نے کہا۔ ”میں لعنت بھیجتی ہوں املی والے بابا پر، پندرہ ہزار روپے تمہیں دے دوں گی لیکن تم کسی طرح اسے میری محبت پر مجبور کر دو۔“
”چلو میرے ساتھ۔“

دونوں قبرستان سے باہر آئے تو لڑکی نے سامنے کھڑی ہوئی ایک گاڑی کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔
”کیا یہ گاڑی تمہاری ہے؟“ ندیم نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں۔“ لڑکی نے جواب دیا۔ ”تم اتنے حیران کیوں ہو رہے ہو؟“
”میں یہ سوچ رہا ہوں کہ تم پیسے والی معلوم ہوتی ہو، پڑھی لکھی ہو، جوان اور خوبصورت ہو، پھر ان چکروں میں کیسے سے پڑ گئیں۔“

صدیقی واقعی بہت بڑے شاعر تھے۔
”ساغر صدیقی نہیں جناب لاغر صدیقی۔ میرے والد لاغر صدیقی۔“

”میاں یہ ساری غزلیں ساغر صدیقی کی ہیں۔“
پبلشر نے کہا۔ ”تمہرو۔ میں تمہیں ان کا چھپا ہوا مجموعہ دکھاتا ہوں۔ تم کو خود چلا جائے گا۔“

اس نے ایک فلیٹ سے ساغر صدیقی کا مجموعہ نکال کر ندیم کے سامنے رکھ دیا۔ ”یہ لو خود دیکھ لو۔“

اب ندیم نے جب دونوں کا موازنہ کیا تو اس کے پودہ طبع روشن ہو گئے۔ ”یہ کیسے ہو گیا جناب؟“

”یہ اس طرح ہوا کہ تمہارے والد مرحوم ایک چور شاعر تھے۔“ پبلشر نے کہا۔ ”انہوں نے اپنا کھس لاغراس لیے رکھا تھا کہ ساغر کا ہم قافیہ ہے۔“
”تو اب میں کیا کروں؟“

”کچھ نہیں کرو۔ یہ ڈائری اٹھاؤ اور گھر چلے جاؤ۔“

ندیم نے دل ہی دل میں اپنے ابا کو برا بھلا کہتے ہوئے ڈائری اٹھائی اور پبلشر کے کہنے کے مطابق گھر تو نہیں آیا سیدھے قبرستان اپنے باپ کی قبر پر پہنچ گیا۔ اسے دیکھتے ہی پانی کا چھڑکاؤ کرنے والے دوڑتے ہوئے آگئے تھے۔
”صاحب جی پانی ڈال دیں۔ پوری قبر سوکھ رہی ہے۔“
”ارے سوکھنے دو۔“ ندیم جھٹاکر بولا۔ ”مجھے نہیں چاہیے پانی۔“

لڑکے اس کی جھڑکیاں کھا کر واپس چلے گئے۔

ندیم نے قبر سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”ابا۔ یہ تم نے میرے ساتھ کیسا گھپلا کر دیا۔ زندگی بھر شاعری کرتے رہے اور وہ بھی چوری کی۔ تم نے تو مجھے شرمندہ کر کے رکھ دیا۔ میں تمہاری چوری کی یہ بیاض تمہاری قبر پر رکھ کر جا رہا ہوں۔ فرشتوں سے کہو، وہ تمہیں شاعری سنایا کریں گے۔“

اس نے وہ ڈائری لاغر صدیقی کی قبر پر رکھی اور واپس ہولیا۔

اس وقت کسی آواز نے اس کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔
”سنگدل محبوب دیکھ میری طرف۔“

اس نے مڑ کر دیکھا ایک خوبصورت جوان لڑکی اس سے کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی تھی۔ ”سنگدل محبوب تجھے میرے پاس آنا ہوگا ورنہ میں تجھے جین نہیں لینے دوں گی۔“
وہ اس لڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ لڑکی نے چونک کر پوچھا۔ ”کون ہو تم۔ میرے پاس کیوں آئے ہو؟“

ایک تھملا لیے واپس آیا۔ ”یہ لو ابا، یہ لے آیا اس میں شاید کسی پر اپنی کے کاغذات ہیں۔“

”نہیں بیٹا اس سے بھی بڑی دولت ہے۔“ لاغر نے کہا۔ ”تو یہ کاغذات نکال۔“

اس تھیلے میں ایک موٹی سی ڈائری تھی۔ ”ابا یہ تو ایک ڈائری ہے۔“

”ہاں اس میں میری دولت ہے۔“ لاغر نے کہا۔ ”یہ میری شاعری کا وہ دیوان ہے جو کبھی شائع نہ ہو سکا۔“

”ابا تمہاری ایسی دولت کو لے کر میں کیا کروں گا۔ چانوں گا۔“ ندیم بھڑک اٹھا۔

”بیٹے تو نہیں جانتا۔“ لاغر دیر سے بولا۔ ”اس بیاض کو لے کر کسی بھی پبلشر کے پاس چلا جا، وہ تجھے ہاتھوں ہاتھ لے گا اور منہ مانگی قیمت دے گا۔“

”اگر ایسا ہے تو پھر تم مجھے واقعی بہت کچھ دے کر جا رہے ہو۔“

”بس بیٹا تو خوش رہ اور اپنی زندگی گزار۔“ لاغر صدیقی نے کہا۔ ”میں تو اب چلا۔ خدا حافظ۔“

دسواں کے بعد سب نے مزید مدد کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ”جوان اور بچے کئے آدمی ہو کب تک باپ کی لاش کا بہانا بنا کر کھاتے رہو گے کوئی کام دیکھو۔“

ندیم بہتا کر رہ گیا۔ ”ایسی بھی کیا ہے مروتی۔“ اس نے اپنے رشتے داروں سے کہا۔ ”کم از کم پہلی برسی تک تو ساتھ دیں۔“

”کیا پاگل ہو گئے ہو۔ ہم نے کیا تمہارا سال بھر کا ٹھیکا لے رکھا ہے خود کچھ کرو۔“

ایک ایک کر کے سارے رشتے دار روانہ ہو گئے۔ یہ غنیمت تھا کہ دو کروڑ کا وہ چھوٹا سا مکان اس کے باپ لاغر صدیقی کا تھا ورنہ اسے وہاں سے بھی نکال دیا جاتا۔

رشتے داروں کے جانے کے بعد اسے اپنے باپ کی بیاض کا خیال آ گیا۔ باپ نے کہا تھا کہ کوئی بھی پبلشر اسے ہاتھوں ہاتھ لے گا۔ اس نے احتیاط سے اس ڈائری کو ایک بیگ میں رکھا اور ایک مشہور پبلشر کے پاس پہنچ گیا۔

”جناب پہلے آپ یہ بیاض دیکھ لیں اس کے بعد آپ سے معاملات طے ہوں گے۔“ ندیم نے ڈائری پکڑا دی تھی۔

پبلشر نے ڈائری دیکھنی شروع کر دی۔ ”واہ کیا بات ہے۔ کیا خوبصورت شعر ہے، اسے کہتے ہیں شاعری۔ ساغر

اہمیت ہو یا نہ ہو لیکن میرے لیے بہت بڑی بات ہے۔“
”تو پھر کیا کروں میں؟“

”اسے سمجھاؤ۔ اسے یقین دلاؤ کہ میرے لیے اس کی کتنی اہمیت ہے۔ اس کی ہمدردی حاصل کرو میرے لیے۔ اس کے دوست بن جاؤ پھر وہ شاید تمہاری بات مان لے۔ پلیز“ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

”ایک بات بتاؤ تم یہ نیک کام خود کیوں نہیں کر لیتیں؟“ ندیم نے پوچھا۔

”کیسے کروں۔ وہ تو میری صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔“ ندیم نے کہا۔ ”مجھے دیکھ کر کھڑا جاتا ہے۔“

”اور تم اس کے لیے اپنی جان دے رہی ہو۔“

”پھر وہی بات۔ خدا جانے تم محبت کے جذبے کی شدت سے واقف کیوں نہیں ہو؟“ لڑکی نے کہا۔ ”تم اسے میرا پاگل پن سمجھ لو لیکن میرا کام ضرور کرو دو پلیز۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔“

اب اس نے واقعی ہاتھ جوڑ لیے تھے۔ ندیم اپنا سر پیٹ کر رہ گیا۔

لڑکی کے جانے کے بعد معین کاٹے اور دوسرے دوستوں نے اس کے گھر دھوا بول دیا۔ ”یار یہ گاڑی والی لڑکی تیرے پاس کیوں آئی ہے؟“

”مجھے سے محبت کرتی ہے۔“ ندیم نے بتایا۔ اس وقت اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ کم بخت محبت تو کسی اور سے کرتی تھی۔ ندیم تو دونوں کے درمیان بروکری کر رہا تھا لیکن وہ یہ بات دوستوں سے نہیں کہہ سکتا تھا۔

وہ ایک بار پھر جم جم گیا۔ اس بار روشن نے مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کیا۔ ”کیوں ابھی اب کیا رپورٹ لے کر آئے ہو۔“

”یار وہ لڑکی تمہارے لیے واقعی پاگل ہو رہی ہے۔“ ندیم نے کہا۔

”تو پھر میں کیا کر سکتا ہوں؟“ روشن بہت بے رخی سے بولا۔

”تم اس سے مل لو۔ اس سے بے رخی مت برتو۔“

ندیم نے کہا۔ پھر اسے محبت کے موضوع پر چند جملے یاد آ گئے۔ یہ جملے اس نے اپنے باپ لاغر صدیقی کی پرانی والی ڈائری میں پڑھے تھے۔

”دیکھو اس قوم کے ہر مند فوجیوں محبت ایک عظیم دولت ہے، یہ پرندہ ہے، سمندر ہے، بادبان ہے، ساحل

ہوں۔“

”اور وہ کون ہے؟“ روشن نے پوچھا۔

”ندیم کا نام ہے اس کا۔“ ندیم نے بتایا۔

”ندیم۔“ روشن کی آنکھیں پھٹی رہ گئی تھیں۔ ”کون ندیم؟“

”وہ ایک خوبصورت لڑکی ہے اور شاید تم دونوں کی ملاقات کسی پارٹی میں ہوئی تھی۔“

”اوہ ہاں یاد آ گیا۔ دراصل دن بھر میں اتنی لڑکیاں ملتی ہیں، اب کس کس کو یاد رکھا جائے۔“

”لیکن یہ ندیم تم سے بہت محبت کرتی ہے۔ تم اسی سے اندازہ لگا لو کہ وہ تمہارے لیے قبرستانوں میں جا جا کر کوٹیفے پڑھتی ہے۔“ ندیم نے بتایا۔

”یہ سب مکاری ہے۔“ روشن مسکراتے ہوئے بولا۔

”تم ایک بار اور اس سے ملو اور میری طرف سے یہ پیغام پہنچا دو کہ وہ ڈرامے نہ کیا کرے۔ روشن کو کسی محبت و محبت کی ضرورت نہیں ہے۔“

”جانتے ہو وہ تمہیں کس نام سے پکارتی ہے۔ وہ تمہیں سنگدل محبوب کہتی ہے اور تم واقعی ایک سنگ دل انسان ہو۔“

”ایک بات بتاؤ۔ کیا تمہیں اس سے ہمدردی ہے؟“

”بہت زیادہ حالانکہ میں اسے زیادہ نہیں جانتا۔ ایک ہی ملاقات ہوئی ہے لیکن تمہارے لیے اس کی سنجیدگی دیکھ کر مجھے اس پر افسوس ہونے لگا ہے۔“

”تم ایک بار اور اس سے ملو اور جب زیادہ افسوس ہو تو آ کر بتانا۔“

”وہ رپورٹ لینے کے لیے میرے پاس آئے گی۔“

ندیم نے کہا۔ ”اور میں اسے بتا دوں گا کہ وہ کس کے چکر میں پڑی ہے، روشن انتہائی بے مروت اور سخت دل انسان ہے۔“

لیکن جب ندیم نے اس لڑکی سے یہ کہا کہ وہ روشن کا خیال ترک کر دے تو اس نے رونا دھونا شروع کر دیا۔

”تمہیں ایسا مت کہو میں مر جاؤں گی اس کے بغیر، تمہیں یہ اندازہ نہیں کہ میں اس سے کتنی محبت کرتی ہوں۔ ذرا خود سوچو کیا مجھ جیسی کوئی خوبصورت اور ماڈرن لڑکی کسی بابا وغیرہ کے چکر میں پڑ سکتی ہے۔“

”تمہیں اسی لیے تو حیران ہوں۔“

”بس اس سے میری محبت کی شدت کا اندازہ کر لو۔“

فریح نے کہا۔ ”پتا نہیں تمہارے نزدیک اس جذبے کی کوئی

”تم سنگ دل محبوب کی بات کر رہے ہو۔“

”نہیں میں عشق کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ وہ تو انسان کی مجبوری ہے۔ میں اٹلی والے بابا کی بات کر رہا ہوں۔“

”تم نے وہ شعر سنا ہے۔“

”خدا کے لیے میرے سامنے شاعری کا نام نہ لو۔“

ندیم جلدی سے بولا۔ ”میں شاعری کا ڈسا ہوا انسان ہوں، شاعری نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا ہے۔ شاعری کے علاوہ تم دنیا بھر کی باتیں کر سکتی ہو۔“

”اچھا چلو گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ لیکن پیچھے بیٹھنا۔“

”وہ کیوں؟“

”میں غریبوں کو فری نہیں کرتی۔“

”اگر کوئی غریب ہمت کر کے خود ہی فری ہو جائے تو۔“

”وہ ایک الگ ایٹھ ہے لیکن تم کم از کم وہ غریب نہیں ہو سکتے۔“ لڑکی نے کہا۔ ”چلو پیچھے بیٹھو۔“

اور ندیم پیچھے بیٹھ گیا۔ اس نے گاڑی اشارت کر دی۔

”اب بتاؤ کہاں رہتے ہو تم؟“

”غریب آباد میں۔“

”وہ تو صورت ہی بتا رہی ہے۔“ اس نے کہا۔

ندیم بھٹا کر رہ گیا لیکن بول اس لیے نہیں رہا تھا کہ یہ لڑکی پندرہ ہزار کی آسامی تھی، کچھ دیر بعد غریب آباد آ گیا تھا۔

”بس سامنے پان والے کے پاس روک دینا۔“ ندیم نے بتایا۔

لڑکی نے گاڑی روک دی۔ ”اب بتاؤ کہاں ہے تمہارا گھر؟“

”وہ سامنے والا۔“ اس نے اپنے مکان کی طرف اشارہ کیا۔

”اوکے۔ اور اب میں تمہیں اپنے سنگدل محبوب کا نام اور بتاتی ہوں۔“ اس نے ڈیش بورڈ سے قلم اور کاغذ نکال کر لکھ کر ندیم کی طرف بڑھا دیا۔ ”یہ لو اس کا پورا نام اور پتا ہے۔“

”اور وہ پندرہ ہزار۔“

”وہ کام ہو جانے کے بعد۔“ اس نے کہا۔ ”البتہ ایڈوانس کے طور پر ایک ہزار روپے دے رہی ہوں۔“

”میں ایک ہزار لے کر کیا کروں گا؟“

”اچھا تو چلو بغیر ایڈوانس کے کام کر دو۔“

”نہیں رہنے دو کوشش کروں گا میں۔ اب تم اپنا نام تو بتاؤ۔“

”میرا نام فریح ہے میں نے اس کاغذ پر اپنے بھی particular لکھ دیے ہیں۔ تمہیں اس سے یہ کہنا ہے کہ یہ وہی لڑکی ہے جو ڈانس پارٹی میں ملی تھی۔“

”تو تم ڈانس پارٹیز میں بھی جاتی ہو۔“ ندیم نے پوچھا۔

”غریبوں جیسی باتیں نہ کرو۔“ لڑکی نے کہا۔ ”یہ آج کل کا فیشن ہے۔“

ندیم گاڑی سے نیچے اتر آیا۔ اس وقت اس کی گردن ذرا سی اکڑ گئی تھی کیونکہ ایک تو وہ گاڑی سے اتر تھا دوسری بات یہ تھی کہ ڈانس پارٹی ایک خوبصورت لڑکی تھی۔

وہ بیٹھ جاتا ہوا اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ اچانک معین کاٹے نے اس کا راستہ روک لیا۔ ”یار تو تو بہت زوروں پر جا رہا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”کون تھی وہ لڑکی؟“

”دوست تھی میری۔“ ندیم نے بے نیازی سے جواب دیا۔

”ابے کوئی گاڑی والی کب سے دوست ہو گئی۔“

”معین کاٹے۔ اس طرح کی درجنوں ہیں۔“ ندیم نے بتایا۔ ”بس اب میرا دماغ مت خراب کر۔ مجھے بہت کام ہیں۔“

گھر آ کر ندیم نے وہ کاغذ نکالا جس پر لڑکی نے اپنا نام اور سنگ دل محبوب کا نام اور پتا لکھا ہوا تھا۔ سنگ دل محبوب کا نام روشن تھا۔ اس کا اپنا ایک جمنائزیم تھا جہاں باڈی بلڈرٹاپ کے لوگ پائے جاتے تھے۔

ندیم کو ایک ذمے داری ملی تھی، ایک کام ملا تھا اور اسے یہ کام ہر حال میں کرنا تھا۔ دوسرے دن وہ اس جمنائزیم میں پہنچ گیا جس کے کاؤنٹر پر ایک باڈی بلڈرٹو جوان بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ندیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”نہیں بھائی۔ ہمارے یہاں پیاروں کو داخلہ نہیں دیا جاتا۔ جم کی ساکھ خراب ہوئی ہے۔“

”بھائی میں اپنی جان بنانے کے لیے نہیں آیا ہوں۔“

ندیم نے کہا۔ ”مجھے روشن صاحب سے ملنا ہے۔“

”روشن میرا ہی نام ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”کیا کام ہے مجھ سے؟“

”روشن بھائی۔ یہ میں اپنے لیے نہیں کہہ رہا کسی اور کے لیے کہہ رہا ہوں یعنی کسی اور کے بی ہاف پر محبت مانگ رہا

”جی۔“ ندیم اس گینڈے نما انسان کو دیکھ کر سٹپٹا گیا تھا۔ ”کیا کہا آپ نے؟“
”میں کہتا ہوں ایک پرندہ ایسا۔“ گینڈا اتنی زور سے دھاڑا کہ پورا کراگوں اٹھا تھا۔

اور اسی خوف کے عالم میں ندیم کو یاد آ گیا کہ اسے کیا کہنا تھا۔ ”جی ہاں ایک پرندہ ایسا جس کی دم پر پیکٹ۔“
”ٹھیک ہے۔“ گینڈا مسکرا دیا۔ ”لاؤ پیکٹ دو۔“
ندیم نے اپنے بیک سے پیکٹ نکال کر گینڈے کی طرف بڑھا دیا۔ پھر اس نے قریب کھڑے ہوئے ایک آدمی سے کہا ”جاؤ اسے مہمان خانے میں لے جاؤ۔“

مہمان خانے کا کمرہ بہت زبردست تھا۔ آرام دہ مسہری، بستر، قالین، ایک کونے میں ٹی وی ایک چھوٹا سا فرنیچر۔ وہ کمرہ کسی اچھے ہوٹل کے کمرے کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔

وہ بستر پر لیٹ کر سوچنے لگا حالات اسے کہاں سے کہاں لے آئے تھے۔ وہ اپنا بیگ لے کر روشن کے پاس پہنچا تھا روشن نے اس کے لیے ٹکٹ کا بندوبست کیا اور پیکٹ اس کے حوالے کرتے ہوئے بتایا۔ ”یہ پیکٹ تمہیں گلبرگ ٹاؤن کے شیر خان کے پاس پہنچانا ہے۔ شیر خان ایک خطرناک ٹائپ کا انسان ہے۔ تم اس کو دیکھ کر پریشان مت ہونا۔ وہ تم سے کہے گا ایک پرندہ ایسا پھر تم کہو گے۔“

”جس کی دم پر پیکٹ۔“ ندیم جلدی سے بولا۔
”نہیں یہ نہیں کہنا۔ تمہیں کہنا ہے کہ دم پر پیکٹ۔“
”یہ کیا بات ہوئی۔ پیکٹ میں تو کسی پیکٹ کا ذکر نہیں ہے۔“

”دیکھو بھائی اگر تم پہیلی کے چکر میں رہے تو شیر خان تمہیں جان سے مار دے گا اسی لیے تم سے جو کہا جا رہا ہے وہ کرو۔“

”بھائی اتنے گھماؤ پھراؤ کی کیا ضرورت ہے، میں سیدھے سیدھے پیکٹ جا کر دے دوں گا۔“

”نہیں کوڑوڑ ضروری ہے پہلے بھی ایک آدمی اسی طرح شیر خان کے پاس پہنچ گیا تھا اس نے پیکٹ میں بم رکھا ہوا تھا۔ شیر خان کی زندگی بھی کہ وہ بچ گیا اس کے بعد سے وہ بہت محتاط ہو گیا ہے۔“

تو اس طرح ندیم پیکٹ لے کر لاہور چلا آیا۔ روشن نے اس کام کے اسے دس ہزار بھی دیے تھے۔ اس وقت ندیم نے کہا تھا۔ ”دیکھو بھائی۔ اس وقت میں یہ کام اُس لڑکی کی

ہے، اس کی قدر کرو۔ یہ محبت فاتح عالم ہے، تم کسی سے ایک بار محبت کرو وہ تم سے دس بار محبت کرے گا۔ یہ وہ دولت ہے جو تقسیم کرنے سے ختم نہیں ہوتی بلکہ اس کا اسکوپ بڑھتا رہتا ہے اور ایک دن آسمان کی بلندیوں کو چھو لیتا ہے پھر خدا خود بندے سے پوچھے گا کہ بتا تیری رضا کیا ہے۔“

اس کا ٹیکہ جاری رہتا۔ اس وقت ایک شخص روشن کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ ”روشن بھائی میری مصروفیت نکل آئی ہے، میں لاہور نہیں جاسکتا۔“

”کیوں نہیں جاسکتے؟“
”میں نے کہا نا کہ میں مصروف ہو گیا ہوں۔ تم ایسا کرو وہ پیکٹ کو تیرے سر سے بھجوا دو۔“
”پاکل ہو گئے ہو۔ کوریئر سے بھجوانا ہوتا تو تم سے کیوں کہتا؟“

وہ آدمی چلا گیا۔ روشن کے چہرے سے اس کی پریشانی کا اظہار ہو رہا تھا۔ ”کیا مصیبت ہے۔ لعنت ہے ایسے لوگوں پر وقت پر کام نہیں آتے۔“

ندیم کو اس لڑکی کی وہ بات یاد آگئی۔ اس نے ندیم سے کہا تھا کہ وہ کسی طرح بھی ہواس کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اس سے دوستی کرے اور جب دوستی ہو جائے تو پھر مدد کی طرف راغب کرنے کی کوشش کرے۔ ندیم کے لیے یہ بہت اچھا موقع تھا۔ اس نے جلدی سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے روشن بھائی کیوں پریشان ہوئے؟“

”بھائی ایک پیکٹ لاہور پہنچانا تھا جس سے بات کی تھی اس کم بخت نے تمہارے سامنے انکار کر دیا۔“
”اگر کہو تو میں پہنچا دوں۔“

”کمال کے آدمی ہو یا۔ چلو یہی کام تمہیں دے دیا۔ صرف تمہاری چرب زبانی سے متاثر ہو کر۔“ روشن نے کہا۔
”اب تم تیار ہو کر آ جاؤ۔ تمہارے ٹکٹ کے لیے بھی جانا ہے جو بھی فلائٹ اس وقت مل جائے گی اسی میں روانہ کر دوں گا۔“

”لیکن پیکٹ مجھے کہاں اور کس کو دینا ہوگا؟“
”یہ سب بتا دیا جائے گا۔“ روشن نے کہا۔ ”اپنے ایک دو جوڑے کپڑے لے کر آ جاؤ۔ تمہیں دو تین دن وہاں رکنا بھی ہوگا۔“

☆☆☆

ایک پرندہ ایسا۔“ گینڈے نما آدمی نے ندیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ہمدردی میں کر رہا ہوں خدمت خلق سمجھ لو۔ اس کا معاوضہ نہیں لینا چاہتا۔“
”پیارے خدمت خلق بھی کرتے رہنا فی الحال تو یہ پیسے پکڑو۔“

”اب تم مجھے مجبور کر رہے ہو تو رکھ لیتا ہوں۔“ ندیم نے دس ہزار روپے جیب میں رکھ لیے تھے، لیکن تمہیں مدد سے محبت کرنی ہوگی۔ میں نے اس سے وعدہ کیا ہے۔“

”ہاں ہاں کرلوں گا محبت۔ تم پہلے اپنا کام تو کرو۔“
شیر خان جب اس کے سامنے آیا تو ندیم کو احساس ہوا کہ شیر خان تو دراصل گینڈا خان ہے لیکن شاید شیر سے بھی زیادہ خطرناک ہے اسی لیے وہ اس کے سامنے نزوں ہو گیا تھا۔

شیر خان کا ملازم اس کے لیے کھانا لے کر آ گیا تھا۔ کھانے میں بہت سی چیزیں تھیں۔ ندیم کو مزہ آ گیا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے وہ یہی سوچ رہا تھا کہ اس کی کہانی کہاں سے شروع ہوئی تھی۔

اس کے باپ کا انتقال۔ لاغر حدیقی کی ڈائری ساغر حدیقی کی لکھی۔ اس کا قبرستان جانا، قبرستان میں مدینہ کا ملنا۔ اس کے بعد اس کا پیکٹ لے کر کراچی سے لاہور آنا اور شیر خان جیسے خطرناک آدمی سے ملاقات۔

یہ کیسے واقعات تھے جن کے بارے میں ندیم نے سوچا بھی نہیں ہوگا۔ اسے پروگرام کے مطابق ایک دن لاہور میں رُکنا تھا اور دوسرے دن کی فلائٹ سے کراچی واپس چلے جانا تھا۔

کھانا کھا کر اسے نیند آگئی۔ سو کر اٹھا تو ملازم نے آکر اسے بتایا کہ شیر خان نے اسے یاد کیا ہے۔ وہ شیر خان جیسے خطرناک آدمی کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا پھر بھی اسے اس کے پاس جانا پڑا تھا۔

شیر خان اپنے کمرے میں کسی شیر ہی کی شان سے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ دو لڑکیاں بھی تھیں۔ بہت خوبصورت اور ماڈرن قسم کی جو ندیم کو بہت دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں۔

”خان صاحب۔ یہی ہے وہ بندہ۔“ ایک لڑکی نے پوچھا۔

”ہاں یہی ہے۔“
”لیکن یہ تو بہت ڈھیلا دکھائی دیتا ہے، ایسا کام یہ نہیں کر سکے گا۔“

”کر لے گا۔“ شیر خان نے کہا پھر ندیم کی طرف

دیکر کسی بھی کمپیوٹر انڈسٹری میں داخل ہو کر قیمتی معلومات ہی نہیں چراتے بلکہ ان میں تبدیلی بھی کر سکتے ہیں۔ اب ایک خطرناک بات سامنے آئی ہے کہ ہیکرز نئی آلات میں بھی مداخلت کر سکتے ہیں۔ ذیابیطس میں ہلا ایک سائنس دان نے یہ ثابت کیا کہ انسولین پیس کو دور سے کنٹرول کر کے بلڈ شوگر کی ریڈنگ تبدیل کی جاسکتی ہے۔ اس کا خطرناک نتیجہ یہ نکل سکتا ہے کہ مریض اس غلط ریڈنگ کی بنیاد پر بہت زیادہ یا بہت کم انسولین لے سکتے ہیں۔ بے ریڈنگف نے ہیکرز کی اس صلاحیت کو ثابت کرنے کے لیے تھی سی ریڈیوڈیوائس بنائی جو کسی انسولین پمپ پر حملہ کر سکتی ہے۔ یوں انسولین پمپ کو دور سے وائرلیس کنٹرول کیا جاسکتا ہے۔ لاس ویکس میں منعقدہ بلیک ہیٹ کمپیوٹر سکیورٹی کانفرنس میں اس نے یہ آلہ پیش کیا۔

مرسلہ: نذر محمد، لاڑکانہ

دیکھا۔ ”نوجوان۔ حالانکہ تمہیں نوجوان کہتے ہوئے بُرا لگ رہا ہے پھر بھی نوجوان کہہ رہا ہوں۔“
”بہت مہربانی ہے آپ کی۔“
”یہ بتاؤ تم یہاں میرے مہمان خانے میں کیا کر رہے ہو۔ کون ہو تم؟“

”جی“ ندیم بوکھلا گیا تھا۔ ”یہ آپ کیا پوچھ رہے ہیں۔ میں وہی ہوں جو آپ کے لیے پیکٹ لے کر آیا تھا اور آپ نے کہا تھا کہ ایک پرندہ ایسا۔ میں نے اس کا جواب دیا تھا جس کی دم پر پیکٹ۔“

”کیا مجھے کچھ سمجھ رہا ہے جو اس قسم کی باتیں پوچھوں گا۔“ شیر خان دھاڑا۔ ”اور یہ تم کس پیکٹ کی بات کر رہے ہو۔ تم تو میرے پاس کوئی پیکٹ نہیں لائے۔“

”کیا ہو گیا ہے سر آپ کو۔“ ندیم بدحواس ہو کر بولا۔
”میں کراچی سے پیکٹ لے کر آ تھا۔“

”اچھا۔ تو پھر مجھے یاد کیوں نہیں آ رہا؟“
”شیر صاحب۔“ ایک لڑکی نے اس سے کہا۔ ”دس دفعہ تاہنگی ہوں کہ آپ کا حافظہ کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ آپ اپنا علاج کروائیں لیکن آپ سنتے ہی نہیں ہیں۔“

”اچھا بھائی۔ ناراض نہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سچ ہی کہہ

رہا ہو۔

”مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ کسی دن آپ مجھے بھول جائیں گے۔“

”خیر۔ اب ایسا بھی اندھیر نہیں ہے۔“ شیر خان مسکرا کر بولا۔ ”ہاں اب مجھے سب یاد آ گیا ہے۔“ پھر اس نے ندیم کی طرف دیکھا۔ ”مجھے یاد آ گیا ہے کہ میں نے تمہیں اپنے پاس کیوں بلایا تھا۔ تم ان دونوں لڑکیوں کو دیکھ رہے ہو نا؟“

”جی جناب۔ دیکھ رہا ہوں۔“

”اور اب تمہیں لاہور سے ہانگ کا نگ جانا ہے۔“ شیر خان نے کہا۔

”چلیں مان لیا کہ مجھے ہانگ کا نگ جانا ہے لیکن اس سے ان دونوں لڑکیوں کا کیا اعلق؟“

”اس لیے کہ ان میں سے کسی ایک سے ابھی تمہاری شادی ہوگی اور تم دونوں میاں بیوی کی حیثیت سے ہانگ کا نگ جاؤ گے۔“

”جی۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“ ندیم بوکھلا گیا تھا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں کیوں شادی کروں؟“

”نیلوفر۔“ شیر خان نے برابر بیٹھی ہوئی لڑکی کو مخاطب کیا۔

”لیس باس۔“

”اس بے وقوف کو یہ بتا دو کہ جو میری بات نہ مانے اس کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔“

”دیکھیں جناب۔ میں ایک سیدھا سادا آدمی ہوں۔ میں تو اپنے باپ کی قبر پر گیا تھا۔ وہاں ایک لڑکی ملی۔ اس نے مجھے روشن کے پاس بھیج دیا۔ روشن نے مجھے ایک پکٹ دے کر آپ کے پاس بھیج دیا اور آپ زبردستی میری شادی کروا رہے ہیں۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔ آپ مجھے جانے دیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔“

”یہ بتاؤ کیا تمہاری شادی ہو چکی ہے؟“

”نہیں جناب۔ ابھی تک نہیں ہوئی۔“

”تو پھر شادی سے کیوں بھاگ رہے ہو؟“ شیر خان نے کہا۔

”ایک تو بغیر پیسا خرچ کیے تمہاری شادی ہو رہی ہے پھر تمہیں تفریح کے لیے ہانگ کا نگ بھیجا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ تمہیں عیش کرنے کے لیے اوپر سے دو لاکھ روپے بھی دیے جا رہے ہیں۔ اب اور کیا چاہیے؟“

”وہ تو ٹھیک ہے جناب لیکن یہ شادی میری سمجھ میں

نہیں آ رہی۔“

”شادی کے بعد شادی کچھ میں آ جائے گی۔ ہاں یا نہ میں بتاؤ۔ جلدی جواب دو۔ دونوں میں سے کون سی لڑکی اچھی لگ رہی ہے۔“

”جناب۔ کیا مجھے اتنا وقت دیں گے کہ میں اس لڑکی مدیحہ سے مشورہ کر لوں جس کی وجہ سے میں اس حال کو پہنچا ہوں۔“

”ہاں اپنے کمرے میں جا کر اسے فون کر سکتے ہو۔“

”ندیم کو اس کے کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ کمرے میں آتے ہی اس نے موبائل پر مدیحہ کا نمبر ملا یا۔“ مدیحہ۔ یہ تم نے مجھے کس مصیبت میں پھنسا دیا ہے۔“

”کیوں۔ اب کیا ہو گیا؟“

”تمہارے روشن نے پہلے تو مجھے ایک پکٹ دے کر لاہور بھیجا شیر خان کے پاس اور اب شیر خان زبردستی میری شادی کروا رہا ہے۔“

”ندیم کیا واقعی شیر خان نے تمہیں یہ آفر دی ہے۔“

”مدیحہ نے پوچھا۔“

”ہاں۔ بتاؤ رہا ہوں۔“

”تو بس۔ بغیر دیر کیے شادی کرلو۔ یہ سمجھو تمہاری لائف بن گئی۔“

”یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟“

”میں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ شیر خان اس سے پہلے بھی اسی طرح دو آدمیوں کی شادیاں کروا چکا ہے۔ شادی کے بعد اس نے دونوں کو ستر ستر لاکھ کے مکان خرید کر دے دیے۔ دونوں کو کاروبار سیٹ کروا دیا۔ اب دونوں مزے کی زندگی گزار رہے ہیں اور شیر خان کو دعائیں دیتے رہتے ہیں۔“

”لیکن کیوں۔ وہ ایسا کیوں کرتا ہے؟“

”یہ اس کا شوق ہے۔ وہ یتیم بے سہارا لڑکیوں کی پرورش کرتا ہے اور اسی طرح ان کی شادیاں کروا دیتا ہے۔ اب میں نے ساری بات تمہیں بتا دی ہے۔ تم خود سوچ لو۔“

”وہ میرا تو یہی مشورہ ہے کہ تم اس کی بات مان لو۔“

”ندیم نے موبائل بند کرنے کے ساتھ یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ یہ شادی ضرور کرے گا۔ دونوں لڑکیاں بھی بہت خوبصورت تھیں۔ پھر دولت بھی مل رہی تھی۔“

”اس نے اب تک اپنی زندگی میں کیا حاصل کیا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ سوائے اپنے باپ کی ڈائری کے جس

میں چوری کی غزلیں بھری ہوئی تھیں۔ ویسے بھی اس کا مستقبل تو کچھ بھی نہیں تھا۔ اگر اس بہانے حالات بہتر ہو رہے تو کیا بُرائی تھی۔“

اس نے دروازے کے باہر کھڑے ہوئے ملازم سے کہا۔ ”شیر صاحب کو بتا دو کہ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔“

اسے شیر خان کے سامنے پہنچا دیا گیا۔ اس وقت وہ اکیلا بیٹھا تھا۔

”جناب۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں شادی کروں گا۔“ ندیم نے کہا۔

”شادی؟“ شیر خان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”کیسی شادی؟ کس کی شادی؟“

”خان صاحب۔ آپ نے ابھی کچھ دیر پہلے مجھے شادی کی آفر کی تھی۔“ ندیم سٹ چلا کر بولا۔ ”آپ نے کہا تھا کہ میں ان دونوں لڑکیوں میں سے کسی کو پسند کر لوں۔“

”میرا کیا دماغ خراب ہے جو ایسی بات بولوں گا۔“

”شیر خان فرمایا۔“ اور میں نے کیا تمہارا غصہ کالے رکھا ہے۔ تم جس کام سے آئے ہو۔ وہ کرو اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ یہ تم نے شادی کا کیا چکر چلا دیا ہے۔“

”ندیم کے ارمان پر اس پر کمرہ گئی۔ شیر خان بھی اپنی نوعیت کا ایک ہی آدمی ملا تھا اس سے۔“ خان صاحب! اس نے آخری کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ پلیز۔ ان دونوں لڑکیوں سے تو پوچھ لیں۔ آپ نے ان کے سامنے شادی کی بات کی تھی۔“

”میرے پاس اتنا فالتو کام نہیں ہے کہ میں لڑکیوں سے پوچھتا پھر دوں۔“ شیر خان نے کہا۔

”خان صاحب آپ نے خود فرمایا تھا کہ آپ کی یادداشت خراب ہے۔ آپ بھول جاتے ہیں۔“

”کس نے کہا میں بھول جاتا ہوں؟ مجھے سب یاد رہتا ہے۔“ شیر خان نے کہا۔ ”تم کل صبح واپس کراچی چلے جاؤ۔ تمہارا ملک کفرم ہو گیا ہے اور انعام کے طور پر ہماری طرف سے بیس ہزار روپے لے جانا۔“

”تو پھر دے ہی دیں۔“ ندیم مریل آواز میں بولا۔

”ایسا نہ ہو کہ بعد میں وہ بھی بھول جائیں۔“

”وہ نہیں بھول سکتا۔ یہ تو بیس ہزار۔“ شیر خان نے بیس ہزار اس کے سامنے رکھ دیے۔ ”اور یہ ہے تمہارا ملک۔ کل صبح چلے جانا یہاں سے۔“

☆ ☆ ☆

مدیحہ اس کی کہانی سن کر بری طرح ہنسنے لگی تھی۔ ”چلو تمہاری زندگی کا ایک دلچسپ تجربہ ہو گیا۔“

”ارے لعنت بھیجوا ایسے تجربے پر۔ میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ اب میری لائف بدل جائے گی لیکن اس کم بخت نے تو آٹکھیں ہی پھیر لیں۔ صاف انکار کر گیا کہ اس نے ایسا کچھ بھی نہیں کہا تھا۔“

”شیر خان اسی قسم کا آدمی ہے۔“ مدیحہ نے کہا۔

”لیکن تمہارا کیا نقصان ہوا۔ تمہیں تو بیس ہزار اس کی طرف سے بھی مل گئے۔“

”مدیحہ۔ اس سے پہلے کہ میں پاگل ہو جاؤں۔ تم مجھے بتاؤ یہ سب کیا ہے؟“

”یہ ایک مجبور لڑکی کی کہانی ہے۔“ مدیحہ نے دھیرے سے کہا۔ ”اور وہ مجبور لڑکی میں ہوں۔ بہت سوچا کہ تم سے کام لیتی رہوں لیکن تمہاری شرافت اور معصومیت نے مجبور کر دیا ہے کہ تمہیں سب کچھ بتا دوں۔“

”کیا کوئی خطرناک صورت حال ہے؟“

”ہاں۔ بہت خطرناک۔ ندیم تم ایک بھولے بھالے انسان ہو۔ اس لئے میرے جال میں پھنس گئے۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ میں قبرستان وظیفہ پڑھنے کے لئے گئی تھی۔“

”قبرستان میں ہمارا اسٹور ہے۔“ مدیحہ نے بتایا۔

”اس اسٹور میں ہیروئن رکھی جاتی ہے۔ ہفتے میں ایک بار مجھے قبرستان جا کر پیکٹس بنانے پڑتے ہیں۔“

”میرے خدا! یہ تو تم بہت دل دہلا دینے والی باتیں کر رہی ہو۔“

”سنئے رہو کیونکہ اب میں بہت تھک چکی ہوں۔ خاص طور پر تمہیں دیکھ لینے اور تم سے مل لینے کے بعد میری یہ خواہش ہونے لگی ہے کہ میں بھی ایک سیدھی سادی زندگی گزاروں اس ملک کی لاکھوں دوسری لڑکیوں کی طرح۔ اسی لیے میں تمہیں یہ سب کچھ بتا رہی ہوں۔ ندیم جس وقت تم اپنے باپ کی قبر پر شکوہ کر رہے تھے۔ اس وقت میں نے تمہاری باتیں سن لی تھیں اور میں نے سمجھ لیا تھا کہ تم پریشان حال بھی ہو اور بے وقوف بھی ہو۔ اسی لیے میں نے وظیفہ اور سنگ دل محبوب کی کہانی سنا دی۔“

”لیکن کیوں؟“

”تم سے کام لینے کے لیے تاکہ تمہیں روشن کے پاس بھیجوں اور وہ تم کو اپنی مرضی سے استعمال کر سکے۔ ندیم یہ گروہ کراچی سے لاہور ہیروئن بھیجتا ہے لیکن پچھلے دنوں اس

نومبر 2011

نہیں آ رہی۔“

”شادی کے بعد شادی کچھ میں آ جائے گی۔ ہاں یا نہ میں بتاؤ۔ جلدی جواب دو۔ دونوں میں سے کون سی لڑکی اچھی لگ رہی ہے۔“

”جناب۔ کیا مجھے اتنا وقت دیں گے کہ میں اس لڑکی مدیحہ سے مشورہ کر لوں جس کی وجہ سے میں اس حال کو پہنچا ہوں۔“

”ہاں اپنے کمرے میں جا کر اسے فون کر سکتے ہو۔“

”ندیم کو اس کے کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ کمرے میں آتے ہی اس نے موبائل پر مدیحہ کا نمبر ملا یا۔“ مدیحہ۔ یہ تم نے مجھے کس مصیبت میں پھنسا دیا ہے۔“

”کیوں۔ اب کیا ہو گیا؟“

”تمہارے روشن نے پہلے تو مجھے ایک پکٹ دے کر لاہور بھیجا شیر خان کے پاس اور اب شیر خان زبردستی میری شادی کروا رہا ہے۔“

”ندیم کیا واقعی شیر خان نے تمہیں یہ آفر دی ہے۔“

”مدیحہ نے پوچھا۔“

”ہاں۔ بتاؤ رہا ہوں۔“

”تو بس۔ بغیر دیر کیے شادی کرلو۔ یہ سمجھو تمہاری لائف بن گئی۔“

”یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟“

”میں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ شیر خان اس سے پہلے بھی اسی طرح دو آدمیوں کی شادیاں کروا چکا ہے۔ شادی کے بعد اس نے دونوں کو ستر ستر لاکھ کے مکان خرید کر دے دیے۔ دونوں کو کاروبار سیٹ کروا دیا۔ اب دونوں مزے کی زندگی گزار رہے ہیں اور شیر خان کو دعائیں دیتے رہتے ہیں۔“

”لیکن کیوں۔ وہ ایسا کیوں کرتا ہے؟“

”یہ اس کا شوق ہے۔ وہ یتیم بے سہارا لڑکیوں کی پرورش کرتا ہے اور اسی طرح ان کی شادیاں کروا دیتا ہے۔ اب میں نے ساری بات تمہیں بتا دی ہے۔ تم خود سوچ لو۔“

”وہ میرا تو یہی مشورہ ہے کہ تم اس کی بات مان لو۔“

”ندیم نے موبائل بند کرنے کے ساتھ یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ یہ شادی ضرور کرے گا۔ دونوں لڑکیاں بھی بہت خوبصورت تھیں۔ پھر دولت بھی مل رہی تھی۔“

”اس نے اب تک اپنی زندگی میں کیا حاصل کیا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ سوائے اپنے باپ کی ڈائری کے جس

نومبر 2011

کے کارندے پکڑے جاتے ہیں۔ صرف اپنی بوکھاہٹ کی وجہ سے۔ کیونکہ انہیں یہ خیال رہتا تھا کہ وہ اپنے ساتھ ہیروئن لے جا رہے ہیں۔ یہ خیال ہی انہیں نروس کر دیتا تھا اور ایف آئی اے والے ان کی گھبراہٹ بھانپ لیتے تھے۔

”خدا کی پناہ! یعنی تم لوگوں نے مجھ سے ہیروئن بھجوا دی۔“

”ہاں۔ اور تم بڑے اطمینان سے پیکٹ لے کر نکل گئے کیونکہ ایک تو تم صورت سے کرمٹل دکھائی نہیں دیتے اور دوسری بات یہ تھی کہ تمہیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ کیا لے جا رہے ہو۔ اسی لیے تم اطمینان سے نکلتے چلے گئے۔“

”اب سمجھا۔ یعنی تم... لوگوں نے مجھے استعمال کر لیا۔“

”ہاں۔ تمہارے ساتھ ایسا ہی ہوا ہے۔“ مدیحہ نے کہا۔

”اور وہ شیر خان میری شادی کیوں کروا رہا تھا؟“

”وہ بھی اس سنگٹک کا چکر تھا۔ وہ تمہارے اور اس لڑکی کے ذریعے پاؤڈر کی ایک کھپ ہانگ کا ٹک بھجوانے والا تھا لیکن پروگرام میں تبدیلی ہو گئی جس کی وجہ سے اس نے تمہاری شادی کینسل کرادی اور جو ویسے بھی ایک نام نہاد شادی ہوتی۔“

”مدیحہ۔ تم نے بہت حیرت انگیز باتیں بتادی ہیں۔ یعنی میں ہیروئن کے چکر میں پھنس چکا ہوں۔“

”نہیں۔ تمہارا ابھی کچھ نہیں بگڑا۔“ مدیحہ نے کہا۔ ”تم ایک ہی بار گئے ہو۔ کسی کی نگاہوں میں بھی نہیں آئے اور گروہ نے بھی ابھی تمہیں شامل نہیں کیا۔۔۔۔۔ پھنسی ہوئی تو میں ہوں کہ لاکھ کوشش کے باوجود اس جنجال سے نکل نہیں سکوں گی۔“

”تم کس طرح ان لوگوں میں پھنس گئیں۔“

”یہ ایک لمبی کہانی ہے۔“ مدیحہ نے کہا۔ ”تم تو اب خود کو بچاؤ اور دور رہو مجھ سے۔ میں بھی اب تم سے نہیں ملوں گی۔ یہ اچھا ہے کہ تمہارے بارے میں سوائے میرے اور کوئی کچھ نہیں جانتا۔ میں یہ کہہ دوں گی کہ تم ہاتھ سے نکل گئے ہو۔ تم اب میرے چکر میں بھی نہیں آ رہے۔ بس تمہاری کہانی ختم ہو جائے گی۔“

”لیکن میری تو یہ خواہش ہے کہ تم بھی اس جنجال سے نکل آؤ۔“

”میرے لیے یہ بہت مشکل ہے۔“ مدیحہ نے کہا۔

”میرے خلاف ان کے پاس درجنوں ثبوت ہیں۔ میں اُن کے اشارے پر کام کرنے کے لئے مجبور ہوں۔“

”کوئی تو راستہ ہوگا۔“

”صرف ایک ہی راستہ ہے کہ میں یا تو اس ملک سے فرار ہو جاؤں یا مجھے موت آ جائے۔ اس کے علاوہ میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں۔۔۔۔۔“ مدیحہ نے کہا۔

”اب ایک بات یہ بتاؤ کہ یہ اچانک تمہیں نیک بن جانے کا خیال کیوں آ گیا؟“ مدیحہ نے پوچھا۔ ”زندگی جس طرح گزر رہی تھی اسی طرح گزرنی رہتیں۔ اتنا تو یقین ہے کہ تم نے میری محبت میں سرشار ہو کر یہ فیصلہ نہیں کیا ہوگا بلکہ بات کچھ اور ہوگی۔ میں وہ اصل بات جانتا چاہتا ہوں۔“

”اصل بات صرف یہ ہے کہ میں اس زندگی سے تھک چکی ہوں۔ ان کے چنگل سے نکلنا چاہتی ہوں اور مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

”میری مدد۔ میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟ میں تو خود ایک کمزور انسان ہوں۔ مجھے تو کوئی جانتا بھی نہیں ہے۔“

”بے وقوف ہو تم۔“ مدیحہ نے کہا۔ ”تمہارے والد بہت تعلقات والے آدمی تھے۔“

”تمہیں کیسے معلوم؟“

”اس ڈائری سے جو تم غصے میں اپنے والد کی قبر پر چھوڑ آئے تھے۔“ مدیحہ نے بتایا۔ ”وہ ڈائری میں نے اٹھالی تھی لیکن تمہیں نہیں بتایا تھا۔ شاید تم نے وہ پوری ڈائری نہیں پڑھی۔“

”نہیں۔ میں نے شروع کے چھ سات صفحات دیکھے تھے۔ ان میں غزلیں لکھی ہوئی تھیں۔“

”درمیان کے چند صفحات میں تمہارے والد کے کچھ دوستوں کے نام ہیں اور اُن سے دوستی کا حال بھی لکھا ہے۔ اُن میں سے ایک نام تو موجودہ آئی جی کا ہے۔“

”کیا کہا۔ آئی جی کا نام ہے۔“

”ہاں۔ وہ تمہارے والد کے گہرے دوست ہیں۔“

مدیحہ نے کہا۔ ”ڈائری کے مطابق دونوں میں اچھی خاصی بے تکلفی بھی تھی۔ پھر وہیں تمہیں ڈائری دکھائی ہوں۔ گاڑی میں رکھی ہوئی ہے۔“

مدیحہ اپنی گاڑی سے وہ ڈائری لے آئی تھی۔ اس میں واقعی ملک کے بڑے بڑے لوگوں کے نام لکھے ہوئے تھے اور یہ بھی تھا کہ لاغر صدیقی سے ان کی ایسی دوستی تھی۔ موجودہ آئی جی بھی اس فہرست میں تھے۔ لاغر صدیقی کی ڈائری یہ بتا رہی

تھی کہ آئی جی صاحب لاغر صدیقی کا بہت احترام بھی کرتے تھے۔

”ندیم۔ اب میں تمہارے ساتھ پوری طرح مکمل گئی ہوں۔ پہلے تو میں نے یہی سوچا تھا کہ تم کو اس گروہ کے ساتھ الجھائے رکھوں۔ تم ان کے آلہ کار بن کر مال ادھر سے ادھر لاتے لے جاتے رہو۔ لیکن اب جبکہ میں خود اس گروہ سے چھٹکارہ چاہتی ہوں تو میں نے تم کو تمہارے والد کی ڈائری کے بارے میں بھی بتا دیا ہے۔“

”میں نہیں جانتا کہ میرے والد اتنے زبردست تعلقات والے آدمی تھے۔“ ندیم نے جذباتی ہو کر کہا۔

”شاید اسی لیے تمہارے والد نے مرتے وقت اپنی ڈائری تمہارے حوالے کی ہوگی کہ تم اس کے بھید کو پاسکو لیکن تم نے ڈائری کو کھول کر ہی نہیں دیکھا۔“

”ہاں! یہ مجھ سے غلطی ہو گئی اور وہ بھی اس لیے کہ مجھے یہ دیکھ کر غصہ آنے لگا تھا کہ ابادراشت میں صرف ڈائری ہی چھوڑ گئے ہیں۔“

”اب تم آئی جی صاحب سے جا کر ملو۔“ مدیحہ نے کہا۔ ”بلکہ میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔“

☆☆☆

دونوں آئی جی کے سامنے بیٹھے ہوئے آئی جی کو دیکھ جا رہے تھے۔

”یہاں تک رسائی بڑی مشکلوں سے ہوئی تھی۔ نہ جانے کتنی ستارشیں کروانی پڑی تھیں۔ تب جا کر آئی جی نے صرف پانچ منٹ کا وقت دیا تھا۔“

دونوں آئی جی کے کمرے میں داخل ہوئے۔

”السلام علیکم انگل۔“ ندیم نے باپ کے دوست ہونے کے ناتے سے آئی جی کو انگل کہہ کر مخاطب کیا۔

”انگل۔“ آئی جی نے حیرت سے ندیم کی طرف دیکھا۔ ”کس کو انگل کہہ رہے ہو۔“

”آپ کو انگل۔ کیونکہ آپ میرے والد کے دوست ہیں۔“

”کیا نام ہے تمہارے فادر کا؟“

”لاغر صدیقی۔“ ندیم نے بتایا۔ ”پچھلے دنوں اُن کا انتقال ہو گیا ہے۔“

”کیا گواہ ہے۔ میں ایسے بے شک نام کے کسی آدمی کو نہیں جانتا۔“

”لاغر میرے ابا کا تخلص تھا۔“ ندیم نے ڈرتے

ڈرتے بتایا۔ آئی جی کی دھاڑ سن کر اس کے ہوش اڑ گئے تھے۔

”اصل نام بتاؤ اسے باپ کا۔“

”جی مجھے ان کا اصل نام نہیں معلوم۔“ ندیم نے کہا اور ڈائری آگے بڑھا دی۔ ”آپ یہ ڈائری دیکھ لیں والد صاحب نے اس میں آپ کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔“

آئی جی نے ڈائری پڑھی اور ایک طرف کھسکا دی۔

”جھوٹ لکھا ہے تمہارے باپ نے، میں نہیں جانتا تمہارے باپ کو تم مجھے دھوکا دینے آئے ہو ابھی اندر کروا دیتا ہوں۔“

”جناب رحم کریں میرے حال پر۔“ ندیم نے گڑگڑاتا شروع کر دیا۔ ”ایک تو ایسا باپ ملا اور پر سے مصیبتیں ٹوٹی جا رہی ہیں مجھ پر۔“

”سچ بتاؤ قصہ کیا ہے۔“ اس بار آئی جی کا لہجہ کچھ نرم تھا شاید اسے ندیم کی صورت دیکھ کر ترس آ گیا تھا۔

ندیم نے جلدی جلدی قبرستان سے لے کر اب تک کی ساری کہانی سنادی۔

”اوہ!“ ندیم کی کہانی سن کر آئی جی نے ایک گہری سانس لی۔ پھر مدیحہ کی طرف دیکھا۔ ”کیا یہ سچ بول رہا ہے؟“

”یس سر۔ بالکل سچ۔ میں جس گروہ سے تعلق رکھتی ہوں اس کو سنسٹر گروپ کہا جاتا ہے۔“ مدیحہ نے بتایا۔

”ہاں! میں یہ جانتا ہوں اس کے بارے میں۔“ آئی جی نے کہا۔ ”یہ لوگ بہت بڑے بڑے کاموں میں ملوث ہیں لیکن ان کا کوئی بندہ آج تک قابو میں نہیں آیا۔۔۔۔۔ اور جو آتے ہیں۔ ان کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ ان کے خلاف ہمارے پاس ثبوت کوئی نہیں ہے۔“

”ثبوت میں فراہم کر دو گی جناب۔“ مدیحہ نے کہا۔

”کیونکہ میں اندر کی ہوں۔ ان کے بے شمار راز جانتی ہوں۔“

”لڑکی اگر ایسا کر سکو تو یہ قانون کی بہت بڑی مدد ہو گی۔“

”سر لیکن میرا کیا بے گاہ؟“

”کچھ نہیں تمہیں وعدہ معاف گواہ بنا کر معاف کر دیا جائے گا۔“ آئی جی نے کہا۔ ”اور یہ میرا وعدہ ہے کہ تمہیں ایک باوقار زندگی گزارنے کا موقع دیا جائے گا۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو جناب۔“

”ندیم ثبوت فراہم کرنے میں تم میرا ساتھ دو گے۔“

مدیحہ نے کہا۔ ”میں تمہیں اس گروہ کے اندر شامل کروا سکتی ہوں۔ تم اور میں مل کر ان کے خلاف ثبوت حاصل کریں گے۔“

”اور اگر ضرورت پڑے تو پولیس تمہاری مدد کے لیے آجائے گی، آئی جی نے اپنا کارڈ ندیم کی طرف بڑھا دیا۔ یہ میرا خاص موبائل نمبر ہے، میں ہر ایک کو نہیں دیتا ہوں۔ میں ایس پی گل نواز کو تمہارے بارے میں کہہ دیتا ہوں تم ان سے جا کر مل لو۔ وہ تمہارے ساتھ کوآرڈینیٹ کریں گے۔“

”بہت شکریہ جناب!“ مدیحہ نے کہا۔
”شکریہ تو تمہارا ادا کرنا چاہیے کہ تم ہمارے ساتھ تعاون کر رہی ہو۔“

☆☆☆

گل نواز نے ان دونوں کو اپنے کمرے میں بلا لیا تھا۔ وہ ایک خزانہ قسم کا انسان تھا جس کے چہرے سے اس کے مزاج کی سختی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ ”ہوں۔“ اس نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے ہنکاری لی۔ ”تو تم دونوں شیر گروپ کو تباہ کرنے کے لیے نکلے ہو۔“

”جی جناب۔“ مدیحہ نے کہا ”کیونکہ اس گروہ نے پورے معاشرے کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔“
”تمہیں معلوم ہے کہ قانون بھی اس گروپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکا ہے۔“

”جانتی ہوں جناب۔ لیکن اس بار معاملہ کچھ اور ہوگا۔“ مدیحہ نے کہا ”کیونکہ میں گھری بھیدی ہوں ان کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہوں اور مزید ثبوت حاصل کرنے کی ہم پر ہوں۔“

”تو پھر ہم سے کیا چاہتی ہو؟“
”ہر قسم کا تعاون۔“ اس دفعہ ندیم نے کہا۔
”آئی جی صاحب کو کس طرح جانتے ہو؟“
”لاغر صدیقی کے حوالے سے۔“ مدیحہ نے بتایا۔

”اور یہ لاغر صدیقی کون ہیں؟“
”میرے ابا تھے۔ ان کا انتقال ہو چکا ہے ان کی ڈائری میں آئی جی صاحب کا نام لکھا ہوا تھا۔“
”اب سمجھا تمہارے ابا آئی جی صاحب کے دوست تھے۔“

”نہیں جناب آئی جی صاحب سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔“
”کیا بکواس ہے۔“ ایس پی اچانک دھاڑنے لگا۔

”نکل کر بتاؤ یہ کیا سلسلہ ہے۔“

”جناب، آپ دھاڑنا بند کریں تو میں کچھ بتاؤں۔“
”چلو اب نہیں دھاڑ رہا، اب بتاؤ۔“

”جناب میرے ابا نفسیاتی مریض تھے۔ ہر اعلیٰ عہدیدار اور مشہور لوگوں کے نام اپنی ڈائری میں نوٹ کر کے وہ ان کے بارے میں خواب دیکھا کرتے جیسے وہ ان کے پڑانے دوست ہوں، اس چکر میں انہوں نے خود ساغر صدیقی مرحوم کی شاعری کو بھی اپنی ڈائری میں لکھ رکھا تھا۔ میں پبلشر کے سامنے بھی شرمندہ ہو چکا ہوں۔“

”عجیب باپ تھا تمہارا۔“

”جی جناب بہت شرمندہ ہوں۔“

”تم بتاؤ۔“ ایس پی نے مدیحہ کی طرف دیکھا۔ ”تم اس گروہ کے بارے میں کیا کیا جانتی ہو؟“
”بہت کچھ جانتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ اس کے سرغنہ تک کیسے پہنچا جاسکتا ہے، کون کون سے کارندے کس کس شہر میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کی سپلائی کا سسٹم کیا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ یہ گروہ کہاں کہاں مال سپلائی کرتا ہے۔“

”اس کا مطلب ہوا کہ تمہارا اس گروہ میں لوٹ جانا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔“
”جی جناب۔ اس میں تو کوئی شک نہیں، لیکن مجھے اور بھی بہت کچھ چاہئے۔ اس لیے ایک بار پھر اپنی جان پر کھیل کر اس گروہ میں شامل ہو رہی ہوں اور ویسے بھی شامل ہی ہوں کیونکہ ان لوگوں کو نہیں معلوم کہ اب میرے خیالات کیا ہیں۔“

”گروہ کے کسی بڑے آدمی کو جانتی ہو؟“
”جی جناب۔ ڈائریکٹ شیر خان تک رسائی ہے میری۔“ مدیحہ نے بتایا۔
”اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم دونوں کو پروفیکشن کی ضرورت ہے۔“ ایس پی نے کہا۔

”نہیں جناب۔ اگر آپ کی طرف سے پروفیکشن ملی تو ہم نگاہوں میں آجائیں گے۔“ مدیحہ جلدی سے بولی۔
”کیونکہ وہ لوگ تو اب تک مجھے اپنا ہی سمجھ رہے ہیں۔“
”پھر بھی۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم دونوں محفوظ رہو۔ ویسے تم رہتی کہاں ہو؟“

”مدیحہ نے اپنا پتا بتا دیا تھا۔“
”نہیک ہے۔ اب تم دونوں ایک ساتھ رہنا۔ ایک

مکان میں۔ یہ زیادہ صحیح ہوگا۔ وہ یہ سمجھیں گے کہ تم نے اس نوجوان کو اپنی طرف کر لیا ہے اور اب اپنے ساتھ رکھنے لگی ہو۔ دوسری طرف ہمیں یہ آسانی ہو جائے گی کہ ہمارے خاص آدمی آسانی سے تم سے دور رہ کر تمہاری نگرانی کریں گے۔“

”سمجھ گئی جناب۔“ مدیحہ نے کہا۔ ”مجھے اس بات پر خوشی ہو رہی ہے کہ آپ نے ان معاملات میں اتنی دلچسپی لی ہے۔“

”دلچسپی تو ضروری ہے کیونکہ یہ معاملہ صرف تمہارا نہیں پوری قوم کا ہے۔“ ایس پی نے کہا۔ ”اب یہ بتاؤ تمہیں آئی جی صاحب کی طرف جاتے ہوئے یا یہاں آتے ہوئے دیکھا تو نہیں گیا۔“

”نہیں جناب۔ ہم نے اس بات کا خاص خیال رکھا تھا۔“ ندیم نے بتایا۔
”نہیک ہے۔ اب تم دونوں جاؤ۔“

دونوں ایس پی آفس سے باہر آ گئے۔ ”اب میں اپنے آپ کو بہت ہلکا محسوس کر رہی ہوں۔“ مدیحہ نے کہا۔
”گناہوں کا بوجھ برسوں سے تھا۔ شاید اب اتارنے کا موقع آ گیا ہے۔“

”مدیحہ یہ بتاؤ کیا تمہارے ساتھ کوئی نہیں رہتا۔“
”نہیں۔ میں اکیلی رہتی ہوں۔“ مدیحہ نے بتایا۔
”زندگی اسی انداز سے گزاری ہے۔ میں نہیں جانتی کہ میرے والدین کون تھے۔ کہاں تھے؟ جب ہوش آیا تو خود کو ایک اسپتال میں پایا۔ پھر ایک عورت مجھے اسپتال سے گھر لے آئی۔ اس نے میری پرورش کی۔ اس کے بعد شیر خان کے حوالے کر دیا۔“

”شیر خان کے؟“
”ہاں شیر خان کے۔ اس وقت میری عمر چودہ پندرہ سے زیادہ نہیں تھی۔ پھر شیر خان نے میری پرورش کی۔ اس نے میری تربیت کی۔ جرائم کے سارے داؤ پیچ سکھائے اور یہاں میرے لیے ایک مکان لے کر دے دیا۔ گاڑی دی۔ میرے اخراجات اٹھاتا رہا اور میں اس کے لیے کام کرتی رہی۔ پھر ایک حادثے نے میری سوچ بدل دی۔“
”اور وہ حادثہ کیا تھا؟“

”بہت پریشان کر دینے والا۔“ مدیحہ نے بتایا۔ ”میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ قبرستان میں گورکن ہمارا آدمی ہے اور وہ قبروں میں ہمارا اشاک رکھتا ہے۔ میں چپک کر کرنے کے

لیے جایا کرتی ہوں۔ ایک دن میں نے قبرستان کے گیٹ پر ایک نوجوان کو دیکھا۔ ہو سکتا ہے کہ کسی زمانے میں وہ بہت خوبصورت اور ہینڈسم رہا ہو۔ لیکن اس وقت وہ ڈھانچے کی طرح ہو رہا تھا۔ وہ ہیرن کا عادی نوجوان تھا۔ بہت دکھ ہوا اس کو دیکھ کر کہ میں جس کاروبار میں ملوث ہوں۔ وہ نوجوانوں کو اس حال تک پہنچا دیتا ہے۔ پھر میں نے یہ سوچ لیا کہ کسی طرح بھی ہو۔ میں اس گروہ کو چھوڑ دوں گی۔“

”اگر ایسا ہی ہے تو پھر اس کے بعد تم نے مجھے اس جال میں کیوں الجھانے کی کوشش کی؟“ ندیم نے پوچھا۔
”نہیں۔ یہ کہانی تم سے ملنے کے بعد کی ہے۔“ مدیحہ نے بتایا۔ ”تم پکٹ لے کر لاہور چلے گئے۔ اس دوران میں اس نوجوان سے ایک بار پھر میری ملاقات ہوئی۔ اس قبرستان کے گیٹ پر۔ اس بار اس کی حالت دیکھ کر میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس گروہ سے الگ ہو جاؤں گی۔ پھر تم لاہور سے واپس آ گئے۔ اس کے بعد کی صورت حال تمہارے سامنے ہے۔“

اس دوران میں مدیحہ کا اپارٹمنٹ آ گیا تھا۔ یہ شہر کے پوش علاقے کا ایک پوش اپارٹمنٹ تھا۔
”دیکھ لو۔ میں کتنے آرام سے رہتی ہوں۔“ مدیحہ نے کہا۔ ”دنیا کی ہر چیز میرے پاس۔ لیکن اب مجھے ان چیزوں سے وحشت ہونے لگی ہے۔ بار بار اس نوجوان کا چہرہ میرے تصور میں آ جاتا ہے اور میں سوچتی ہوں کہ نہ جانے اکبر جیسے اور کتنے ہوں گے۔ جو خود میری وجہ سے برباد ہوئے ہیں۔ کیونکہ میں بھی اس سسٹم کا ایک حصہ بنی رہی ہوں۔“

”مدیحہ تم بہت اچھی لڑکی ہو۔“ ندیم نے کہا۔
”یہ کیا بات ہوئی۔ اتنی دیر کے بعد احساس ہوا ہے۔“
”نہیں۔ احساس تو پہلے ہی دن ہو گیا تھا۔ اظہار اب کر رہا ہوں۔“

مدیحہ مسکرا دی۔ اتنی دیر کے بعد پہلی بار اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی تھی اور یہ مسکراہٹ ندیم کو بہت اچھی لگی تھی۔

☆☆☆

ایس پی مدیحہ کے گھر رات گئے آیا تھا۔
اور وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ دو مسلح افراد بھی تھے اور ان کے پیچھے شیر خان بھی تھا جس نے اپنے گینڈے جیسی جسامت سے پورے کمرے کو گھیر لیا تھا۔
مدیحہ اور ندیم ان لوگوں کو دیکھ کر سکتے میں رہ گئے

تھے۔

”بابا آپ۔“ مدیحہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔
 ”ہاں میں۔“ شیر خان غرایا۔ ”تجھ سے ایسی نمک حرامی کی توقع نہیں تھی۔ تو میرے خلاف کھڑی ہو گئی ہے۔ کیا میں نے اس دن کے لیے تیری پرورش کی تھی۔“
 ”بابا۔ اب مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہوتا۔“ مدیحہ نے کہا۔ ”میں اب اس زندگی سے دور جانا چاہتی ہوں۔“

”ہم نے تجھے اور تیرے اس بندے کے لیے ایسا ہی بندوبست کر دیا ہے۔“ شیر خان نے کہا۔ پھر ایس پی کی طرف دیکھا۔ ”گل نواز۔ کیا پلاننگ ہے تمہارے ذہن میں۔“
 ”ایس پی صاحب۔ کیا آپ ان لوگوں کے ساتھی ہیں۔“ ندیم نے حیرت سے پوچھا۔
 ”ہاں۔“ ایس پی مسکرا دیا۔ ”بے وقوف۔ اچھا ہوا جو آئی جی صاحب نے تم دونوں کو میرے پاس بھیج دیا۔ کسی اور کے پاس چلے جاتے تو اس سازش کا پتا نہیں چلتا اور ہمیں بہت نقصان ہو جاتا۔“

”اب میری سمجھ میں آ گیا کہ اس گروہ کے لوگ پکڑے کیوں نہیں جاتے۔“ مدیحہ نے کہا۔ ”اور قانون بے بس کیوں ہو جاتا ہے۔“
 ”بہت دیر میں سمجھی ہو تم۔“ شیر خان نے کہا۔ ”اگر گل نواز جیسے لوگ ہمارا ساتھ نہ دیں تو پھر ہمارا کام کیسے چلے۔“
 ”چلیں۔ اب مجھے کچھ نہیں کہنا۔“ مدیحہ دھیرے سے بولی۔ ”میں یہ جنگ ہار چکی ہوں۔“
 ”لیکن مجھے بہت کچھ کہنا ہے۔“ ندیم بول پڑا۔
 ”کیا کہنا ہے تمہیں؟“

”یہی کہ تم خدا کے قہر سے ڈرو۔ اس کے عذاب کو دعوت مت دو۔ اب اکی ڈائری میں لکھا ہے کہ بُرائی ہمیشہ رنگ لاتی ہے۔ تم نوجوان نسل کو برباد کر رہے ہو۔ نہ جانے کتنی بدعائیں تمہارے سر ہیں۔“
 ”لے جاؤ ان دونوں کو۔“ شیر خان نے حکم دیا۔
 ان کے ساتھ آنے والے دونوں آدمیوں نے پستول نکال لیے تھے۔
 ”مدیحہ۔ مجھے افسوس ہے کہ مجھے تمہیں راستے سے ہٹانے کا حکم دینا پڑ رہا ہے کیونکہ ہمارے یہاں جذبات اور رشتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔“
 ”میں جانتی ہوں بابا۔ اسی لئے مجھے تم سے کوئی شکوہ

نہیں ہے۔“

”تم کس طرح اپنا کام کرو گے۔“ شیر خان نے ایس پی سے پوچھا۔
 ”آپ فکر نہ کریں سر۔ ہمارے آدی ان دونوں کو کسی ویرانے میں لے جا کر گولی مار دیں گے اور یہ سمجھا جائے گا کہ چونکہ یہ لڑکی شیر گروپ سے باغی ہو گئی تھی۔ اسی لئے ان لوگوں نے اسے ٹھکانے لگا دیا۔“
 ”اور سچائی بھی تو یہی ہے۔“ شیر خان مسکرایا۔
 ”یس سر۔ سچائی بھی یہی ہے۔“
 ”لے چلو ان دونوں کو۔“

انہیں اپارٹمنٹ سے باہر لے جایا گیا جہاں ایک بند وین گیٹ کے باہر کھڑی تھی۔ مدیحہ نے ندیم کا ہاتھ تھام لیا۔
 ”سوری ندیم۔ میری وجہ سے تمہیں موت نصیب ہو رہی ہے۔ میں نے تم کو خواہ مخواہ ان معاملات میں انوالو کر لیا۔“
 ”کوئی بات نہیں۔“ ندیم نے مسکرائے کی کوشش کی۔
 ”میرے لیے اتنا ہی بہت ہے کہ تم جیسی ایک بہادر لڑکی کے ساتھ مر رہا ہوں۔“

”چلو گاڑی میں بیٹھو۔ جلدی۔“ ایک نے ان دونوں سے کہا۔
 ندیم نے اس موقع پر جدوجہد کی کوشش کی لیکن اسے اٹھا کر وین میں پھینک دیا گیا تھا۔
 اس کے بعد مدیحہ کو بھی اسی..... وین میں بٹھایا گیا تھا۔
 وین چل پڑی۔ وین کے شیشے تاریک تھے۔ انہیں اندازہ ہی نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کس طرف جا رہے ہیں اور وین کن راستوں سے گزر رہی ہے۔

ندیم اور مدیحہ نے ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ لیے۔ ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ صرف ایک جملے کے۔ اور وہ جملہ مدیحہ نے کہا تھا۔ ”ندیم۔ آئی لو یو۔ آئی لو یو۔“
 ”تمہارا شکر یہ۔“ ندیم دھیرے سے بولا۔ ”چلو آج یہ حسرت بھی ختم ہو گئی کہ کسی نے مجھ سے محبت نہیں کی۔“
 بالآخر وین ایک جھٹکے سے رک گئی۔
 ”چلو اتار دو دونوں کو۔“
 وین کا دروازہ کھلا اور ان دونوں کو اتار لیا گیا۔ تین آدمی تھے۔ ایک ڈرائیور اور وہ دونوں جو ساتھ آئے تھے۔
 ”یہ تو وہی قبرستان ہے۔“ ندیم نے مدیحہ سے کہا۔

”ہاں۔ یہ قبرستان ہے۔“ ان میں سے ایک بولا۔
 ”تمہارے مرنے کے لئے اس سے بہتر جگہ کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ چلو دیوار کے پاس جا کر کھڑے ہو جاؤ۔“
 ”نہیں۔“ ندیم غصے سے بولا۔ ”تم ہمیں اس طرح نہیں مار سکتے۔ ہم نے کیا قصور کیا ہے؟ حسرت ان ٹپوں پر ہے جو بن کھلے مر جھائے۔“
 ”ندیم یہ وقت..... شاعری کا نہیں ہے۔“ مدیحہ روتی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی۔ ”چلو۔ خدا سے اپنے اپنے گناہوں کی معافی مانگ لیں۔“
 ”لیکن میں نے تو ابھی گناہ انٹارٹ بھی نہیں کئے۔“

تمہاری بات اور ہے۔“
 ”چلو۔ کلمہ پڑھ لو۔“ پہلے والا چیخ کر بولا۔ ”آنکھیں بند کرو۔“
 اب کوئی راستہ نہیں تھا۔ موت ان کے سروں پر تھی۔ اس وقت ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ ندیم کے دل سے موت کا خوف نکل گیا تھا۔ وہ خوفزدہ نہیں تھا بلکہ اس کے ذہن پر فتوہ لگی اور بے حسی طاری تھی۔ شاید جو کچھ بھی ہو رہا ہے ٹھیک ہی ہے۔ انسان تو موت ہی کے لیے پیدا ہوا ہے۔ کبھی نہ کبھی تو اسے مرنا ہی تھا۔
 اس نے مدیحہ کا ہاتھ تھام لیا۔ ”چلو مدیحہ۔ آنکھیں بند کر کے کلمہ پڑھ لو۔“
 انہوں نے آنکھیں بند کیں۔ کلمہ پڑھا اور دو گولیوں کی آوازیں قبرستان کی خاموشی میں ہنگامہ بپا کر گئیں۔

☆☆☆

وہ مرے نہیں تھے زندہ تھے۔
 اور ان سے چند قدم کے فاصلے پر دو لاشیں تڑپ رہی تھیں۔ ان میں سے ایک وین کے ڈرائیور کی تھی اور دوسری لاش اس شخص کی تھی جو اب تک دونوں کو دھمکاتا آیا تھا جبکہ تیسرا ان دونوں کے پاس کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی ایک گن تھی اور اس نے گن سے ان دونوں کو شوٹ کر دیا تھا۔
 ندیم کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ جو پیش اس طرح بدل بھی سکتی ہے۔

”یہ۔ یہ سب کیا ہے؟“ مدیحہ نے تیسرے سے پوچھا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ اس وقت اس کی سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں۔
 ”جا جا۔ یہ تفصیل بتانے کا وقت نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔ ”فوراً کہیں چھپنے کا سوچو۔ ان دونوں شیطانوں نے

صرف ہم تینوں کو نہیں بھیجا..... بلکہ ہماری عمرانی کے لئے بھی آدی پیچھے لگائے ہیں۔“
 ”لیکن وہ لوگ تو دکھائی نہیں دے رہے۔“
 ”اس لئے کہ میں نے ان کی گاڑی میں خرابی کر دی تھی۔“ اس نے بتایا۔ ”لیکن وہ یہاں تک پہنچ ہی جائیں گے۔ اب یہاں سے چل دو ورنہ بُری طرح پھنس جائیں گے۔“
 اسی وقت کچھ فاصلے پر کسی گاڑی کی روشنی چمکنے لگی۔
 ”آگے وہ لوگ۔“ اس نے کہا۔

”آؤ میرے ساتھ۔ میرے پاس ایک ایسی جگہ ہے۔“ مدیحہ نے کہا۔ ”قبرستان کے اندر۔“
 وہ تینوں قبروں کو پھلانگتے۔ گرتے پڑتے ہوئے۔ ٹھوکریں کھاتے ایک طرف دوڑ پڑے۔ مدیحہ انہیں راستہ بتاتی جا رہی تھی۔ بالآخر وہ انہیں ایک کچی کوٹھری میں لے آئی جس کے دروازے پر جھاڑیاں لگی ہوئی تھیں۔
 ”اندر۔ اس کوٹھری میں گھس جاؤ۔ یہ اندر سے صاف ہے۔“ مدیحہ نے کہا۔ وہ تینوں جھاڑیوں کو ہٹاتے ہوئے اندر آ گئے تھے۔

اندھیری کوٹھری میں ان کی سانسوں کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تھا۔ قبرستان کا گیٹ بہت دور رہ گیا تھا۔ وہ تینوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ٹٹولتے ہوئے ایک دیوار کے پاس پہنچے اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔
 ”ہاں اب بتاؤ یہ سب کیا ہے؟ فکرت کرو۔ ہماری آواز..... باہر نہیں جائے گی۔“

”بی بی۔ کہانی وہی ہے۔ ضمیر کی۔“ اس نے کہا۔ ”میں خود پولیس کا ایک کانسٹیبل ہی ہوں لیکن ہر پولیس والا ایک جیسا نہیں ہوتا۔ ہم بھی اس سماج اسی معاشرے کا حصہ ہیں۔ ہم کہیں باہر سے نہیں آئے۔ خدا مجھے معاف کرے۔ میں گل نواز کے ناجائز کاموں میں اس کا ساتھ دیتا رہا ہوں لیکن مجبور تھا کیونکہ وہ میرا آفیسر ہے۔“
 ”تو کیا تم یہ جانتے تھے کہ گل نواز ہیروئن کی سرپرستی کرتا ہے۔“ مدیحہ نے پوچھا۔

”ہاں۔ میں جانتا بھی تھا اور غیر قانونی کام بھی کرتا تھا۔ کئی دفعہ مجرموں کو نکالنے میں میرا ہاتھ رہا ہے۔ آج بھی آرڈر ملا کہ تم دونوں کو ٹھکانے لگا دیا جائے لیکن تمہاری بہت دیکھ کر مجھے اپنے آپ سے شرم آنے لگی۔ تم نے سب کچھ ہونے کے باوجود اس خطرناک گروہ سے بغاوت کر لی جبکہ میں ان کا ساتھ دے رہا تھا۔ مجھے اپنے آپ سے شرمندگی



گر داب زندگی

مکرم ومحترم معراج رسول صاحب
السلام علیکم

میری زندگی میں ایسے کئی واقعات ہیں جن پر ایک کامیاب فلم بن سکتی ہے۔ بعض واقعات تو ایسے ہیں کہ ان پر فلمی کہانی کا دھوکا ہوتا ہے۔ اب میری شادی کے وقت جو حالات پیش آئے انہیں ہی دیکھ لیں۔ کیا یہ کسی فلمی کہانی جیسے واقعات نہیں ہیں؟ اگر یہ سب میرے ساتھ نہ ہوا ہوتا اور کسی اور کی زبانی سنتی تو یہی کہتی کہ کسی فلم سے اخذ کر کے سناریں بنیں۔ میں نے تمام واقعات لکھ تو دیے ہیں پھر بھی کسی رائٹر سے نوک پلک درست کرالیں گے۔ شمسہ فرخ (کراچی)

ہے۔ میں نے مسکرا کر کہا۔
اس دن گرمی کچھ زیادہ ہی تھی اس لیے روزہ بھی زیادہ محسوس ہو رہا تھا۔
لوگ عموماً رمضان شریف میں چڑے ہو جاتے ہیں، بات بات پر کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں۔ گویا روزہ رکھ کر انہوں نے دوسروں پر کوئی احسان کیا ہے۔
ہمارے گھر کا ماحول ایسا نہیں تھا۔ جب تک دادی جان

میں کالج سے واپس آئی تو امی بہت خوش نظر آ رہی تھیں۔ سیمائے دانت بھی نکلے پڑے تھے۔ میں نے اپنی کتابیں ایک طرف رکھتے ہوئے کہا ”امی! کیا عید کا چاند نظر آ گیا جو آپ اتنی خوش ہیں؟“
”ارے لڑکی کیا باؤلی ہوئی ہے، آج پندرہواں روزہ ہے۔ ابھی تو آدھا سینا باقی ہے۔“
”آپ دونوں خوش تو ایسی ہی نظر آ رہی ہیں جیسے کل عید

ہوئے گی۔ مجھے ان بچوں کا خیال آیا جنہیں ہم نے اس کام پر لگایا ہے۔ وہ لڑکیاں یاد آئیں جو ہیردن کی وجہ سے برباد ہوئی ہیں۔ پھر میں نے یہ سوچ لیا کہ کچھ بھی ہو۔ چاہے خود اپنی جان چلی جائے۔ چاہے ان دونوں کا خون کرنا پڑے۔ میں تم دونوں کو بچانے کی کوشش کروں گا۔“

”تم بہت بڑے آدمی ہو بھائی۔“ ندیم نے کہا۔ ”نام کیا ہے تمہارا؟“

”نصیب خان۔“ اس نے بتایا۔

”نصیب خان۔ تم یقین کرو کہ تم خوش نصیب ہو کیونکہ قدرت نے تمہیں نیکی کا بہت بڑا موقع دیا ہے۔ اس نے تمہارے سارے گناہ معاف کر دیے ہوں گے۔“

اس وقت اس کوٹھری میں ایک آواز گونج اٹھی۔ کسی کی سانسوں کی آواز جیسے کسی نے سانس لیا ہو۔

وہ تینوں خاموش ہو گئے تھے۔ سانس بے ترتیب تھیں۔ اکٹری اکٹری سی۔ ”شاید کوئی بیمار ہے۔“ ندیم نے کہا۔

”میرے پاس لائٹر ہے۔ میں جلا کر دیکھتا ہوں۔“ نصیب خان نے کہا۔

لائٹر کی زرد روشنی میں انہیں ایک شخص دکھائی دیا جو دیوار کے ساتھ فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے بال بے تحاشا بڑے ہوئے تھے۔ جسم پر لباس کی صورت میں چھتھرے جھول رہے تھے۔

”ارے۔ یہ تو۔ یہ تو وہی اکبر ہے۔“ مدیحہ نے کہا۔ ”میں نے جس کے بارے میں تمہیں بتایا تھا کہ اس کو دیکھ کر میرا ضمیر جاگا ہے۔“
”اب میں آپ کو یہ بتاؤں کہ یہ کون ہے؟ یہ ایس بی گل نواز کی اکلوتی اولاد ہے۔ بیٹا ہے اس کا۔“

”کیا۔“
”ہاں جی۔ اسی کو مکافات عمل کہتے ہیں۔ قدرت کا قانون ایسا ہی ہوتا ہے۔“

گل نواز پچنی پچنی آنکھوں سے فرش پر گرے ہوئے اکبر کو دیکھ رہا تھا۔

اس پر سکتے سا طاری ہو گیا تھا۔ مدیحہ اس سے کہہ رہی تھی۔ ”گل نواز صاحب۔ آپ کو ایسی دولت سے کیا فائدہ ملا۔ شیر خان کا ساتھ دے کر آپ نے کس کے لیے یہ سب جمع کیا تھا۔ اپنی اولاد کے لیے نا۔ دیکھ لیں۔ یہ آپ ہی کی اولاد

ہوئے گی۔ مجھے ان بچوں کا خیال آیا جنہیں ہم نے اس کام پر لگایا ہے۔ وہ لڑکیاں یاد آئیں جو ہیردن کی وجہ سے برباد ہوئی ہیں۔ پھر میں نے یہ سوچ لیا کہ کچھ بھی ہو۔ چاہے خود اپنی جان چلی جائے۔ چاہے ان دونوں کا خون کرنا پڑے۔ میں تم دونوں کو بچانے کی کوشش کروں گا۔“

”تم بہت بڑے آدمی ہو بھائی۔“ ندیم نے کہا۔ ”نام کیا ہے تمہارا؟“

”نصیب خان۔“ اس نے بتایا۔

”نصیب خان۔ تم یقین کرو کہ تم خوش نصیب ہو کیونکہ قدرت نے تمہیں نیکی کا بہت بڑا موقع دیا ہے۔ اس نے تمہارے سارے گناہ معاف کر دیے ہوں گے۔“

اس وقت اس کوٹھری میں ایک آواز گونج اٹھی۔ کسی کی سانسوں کی آواز جیسے کسی نے سانس لیا ہو۔

وہ تینوں خاموش ہو گئے تھے۔ سانس بے ترتیب تھیں۔ اکٹری اکٹری سی۔ ”شاید کوئی بیمار ہے۔“ ندیم نے کہا۔

”میرے پاس لائٹر ہے۔ میں جلا کر دیکھتا ہوں۔“ نصیب خان نے کہا۔

لائٹر کی زرد روشنی میں انہیں ایک شخص دکھائی دیا جو دیوار کے ساتھ فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے بال بے تحاشا بڑے ہوئے تھے۔ جسم پر لباس کی صورت میں چھتھرے جھول رہے تھے۔

”ارے۔ یہ تو۔ یہ تو وہی اکبر ہے۔“ مدیحہ نے کہا۔ ”میں نے جس کے بارے میں تمہیں بتایا تھا کہ اس کو دیکھ کر میرا ضمیر جاگا ہے۔“
”اب میں آپ کو یہ بتاؤں کہ یہ کون ہے؟ یہ ایس بی گل نواز کی اکلوتی اولاد ہے۔ بیٹا ہے اس کا۔“

”کیا۔“
”ہاں جی۔ اسی کو مکافات عمل کہتے ہیں۔ قدرت کا قانون ایسا ہی ہوتا ہے۔“

گل نواز پچنی پچنی آنکھوں سے فرش پر گرے ہوئے اکبر کو دیکھ رہا تھا۔

اس پر سکتے سا طاری ہو گیا تھا۔ مدیحہ اس سے کہہ رہی تھی۔ ”گل نواز صاحب۔ آپ کو ایسی دولت سے کیا فائدہ ملا۔ شیر خان کا ساتھ دے کر آپ نے کس کے لیے یہ سب جمع کیا تھا۔ اپنی اولاد کے لیے نا۔ دیکھ لیں۔ یہ آپ ہی کی اولاد

زندہ رہیں، وہ ہمیشہ یہی تلقین کرتی رہیں کہ بیٹی، روزہ تو اللہ اور بندے کے درمیان ایسی عبادت ہے جس کا علم بھی صرف اللہ اور اس کے بندے کو ہوتا ہے اور روزہ تو خالصتاً اللہ کے لیے رکھا جاتا ہے۔ دوسروں پر احسان جتانے یا ان سے لڑنے جھگڑنے کے لیے نہیں رکھا جاتا۔ اس میں انسان جتنے صبر و برداشت اور تحمل سے کام لے گا، اسے اس کا اتنا ہی اجر ملے گا۔

یہی باتیں بعد میں ابو نے بتائیں۔ یہی وجہ تھی کہ رمضان شریف میں ہمارے گھر کا ماحول بھی خراب نہیں ہوتا تھا۔

میری بات پر سہما پھر کھی کھی کر کے ہنسنے لگی۔ مجھے ایک دم غصہ آ گیا۔ میں نے بہت مشکل سے اپنے غصے پر قابو پایا اور ان سے کچھ بھی پوچھنا فضول سمجھ کر اپنے گھر سے میں چلی گئی۔

شام کو افطار بناتے وقت امی نے مسکرا کر کہا ”شمسہ! سہما کی عادت مذاق کی ہے، تم تو واقعی برا مان گئیں۔“

”امی! چلیے، اس کی عادت تو مذاق کرنے کی ہے لیکن آپ بھی تو اس کا ساتھ دے رہی تھیں۔“ میں نے قدرے برا مان کر کہا۔

”بیٹا! بات یہ ہے کہ عید کے فوراً بعد آصف کی بیٹی شائستہ کی شادی ہے۔“

”شائستہ باجی کی شادی ہے اور یہ خبر آپ مجھے اب دے رہی ہیں؟“ میں ایک دم خوش ہو گئی۔ اپنے تمام خالہ زاد اور ماموں زاد میں مجھے شائستہ باجی ہی سب سے اچھی لگتی تھیں۔

آصف ماموں کا چند برس پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ وہ امی کے اکلوتے بھائی تھے اس لیے امی کو ان کے بچوں سے بھی بہت محبت تھی۔ ان کے دو بیٹے رضوان اور عدنان تھے اور دو بیٹیاں شائستہ اور صفیہ! شائستہ باجی کے علاوہ سب کی شادیاں ہو چکی تھیں۔

رضوان بھائی تو آصف ماما کی زندگی ہی میں اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا گئے تھے لیکن پھر وہیں کے ہو رہے۔

ہاں انہوں نے ماما کا اتنا لحاظ رکھا کہ شادی پاکستان آ کر ہی کی۔ یہ اور بات ہے کہ نازیہ بھابی بھی امریکن گرین کارڈ ہولڈر تھیں اور وہ دونوں وہیں ایک دوسرے کو پسند کر بیٹھے تھے۔ نازیہ بھابی کے ایک چچا کراچی میں رہتے تھے۔ نازیہ بھابی کی شادی ان ہی کے گھر سے ہوئی تھی، پھر

رضوان بھائی ماما کو پہلا پھل لے کر اور مستقبل کے رنگین خواب دکھا کر دوبارہ امریکا چلے گئے۔

ان سے چھوٹے عدنان بھائی تھے۔ وہ نہایت وجیہہ، جامد ذہب اور بہت سلجھے ہوئے انسان تھے۔

جب وہ بھی انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا جانے لگے تو ماما نے صاف انکار کر دیا کہ میں اپنا ایک بیٹا کھوپٹکی ہوں، اب دوسرا بیٹا کھونا نہیں چاہتی۔

”امی! میں وہاں صرف تعلیم کے لیے جا رہا ہوں اور میں بھائی جان کی طرح نہیں ہوں کہ وہیں رہ جاؤں گا۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اپنی تعلیم مکمل ہوتے ہی پاکستان لوٹ آؤں گا۔ کیا آپ نہیں چاہتیں کہ میرا مستقبل سنور جائے؟“

پھر امی، ابو اور دوسرے لوگوں کے سمجھانے پر ماما نے یہ مشکل تمام راضی ہو گئیں۔

میں ان دنوں چھٹی کلاس میں پڑھتی تھی اور سہما چوتھی میں تھی۔ شائستہ باجی کے بعد عدنان بھائی اس گھر کے دوسرے فرد تھے جو مجھے اچھے لگتے تھے۔ وہ بہت ذہین اور حاضر جواب تھے۔ تھے تو وہ انجینئر لیکن انہیں اقبال، فیض، فراق، ناصر کاظمی، منیر نیازی اور احمد فراز کے علاوہ دیگر شاعروں کے بھی دیوان گویا حفظ تھے۔ ان کے پاس ہر موقع کے لحاظ سے ایک شعر ہوتا تھا۔

ہم لوگ ان دنوں گرمیوں کی چھٹیوں میں کراچی گئے ہوئے تھے جب ان کے جانے کا ہنگامہ کھڑا ہوا۔

خدا خدا کر کے ماما راضی ہو گئیں اور وہ بھی امریکا سدھارے۔ ان کے جانے کے بعد گھر کی رونق ہی جاتی رہی۔ صفیہ باجی کی بھی شادی ہو چکی تھی اور وہ بیاہ کر کینیڈا جا رہی تھیں۔

مجھے تو کبھی کبھی ماما پر بہت ترس آتا تھا۔ وہ بے چاری سوچتی ہی رہ گئیں کہ رضوان امریکا سے لوٹے گا تو اس کی شادی کر کے بنگلے کے اوپر والا پورشن اسے دے دوں گی بلکہ انہوں نے بالائی منزل کو اسی لیے بہت خوبصورت انداز میں سجائی لیا تھا۔ فرش پر بہترین ٹائلز تھے، بہت خوبصورت امریکن چکن تھا۔ ہاتھ روم بھی انہوں نے جدید طرز کے بنوائے تھے کہ رضوان یا اس کی دلہن کو پریشانی نہ ہو۔

رضوان بھائی آئے تو شادی کے بعد مشکل سے چند دن وہاں رہے، پھر واپس چلے گئے۔

لیکن عدنان بھائی قول کے سچے نکلے۔ تعلیم مکمل ہوتے

ہی وہ پاکستان لوٹ آئے۔

ماما نے ابھی دو سال پہلے ہی تو ان کی شادی کی تھی۔ نازیہ بھابی خاصی پُرکشش تھیں اور بہت بڑھی لمبی تھیں۔ بس ان کا رنگ تھوڑا سا سناٹا تھا لیکن ان کی شخصیت اتنی پُرکشش تھی کہ ہر دیکھنے والا ان کی تعریف کرتا تھا۔ ماما نے انہیں مکان کا وہی بالائی حصہ دے دیا جو انہوں نے بہت چاؤ سے اپنے بڑے بیٹے کے لیے بنایا تھا۔

زندگی میں پہلا موقع تھا جب مجھے رمضان شریف ختم ہونے کا شدت سے انتظار تھا کہ امی عید کے تیسرے ہی دن کراچی جانا چاہتی تھیں۔

انہوں نے رمضان ہی میں ساری تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ لیکن انسان جو کچھ چاہتا ہے، وہ ہوتا کب ہے؟

اس دن یا کسی اور روزہ تھا کہ امی کو اچانک چکر سا آیا اور وہ چکن میں گر پڑیں۔ ابو بھی گھر میں موجود نہیں تھے۔ میرے تو گویا ہاتھ پاؤں پھول گئے اور سہما بے طرح روٹنے لگی۔

پھر میں نے ہمت کی۔ سہما کی مدد سے امی کو اٹھا کر بیدروم میں لے گئی۔ اسے میں نے امی کے پاس چھوڑا اور خود ڈاکٹر صاحب کو بلا نے ان کے گھر کی طرف دوڑی۔

ڈاکٹر افضل ہمارے بنگلے سے کچھ ہی فاصلے پر رہتے تھے۔ افطار کا وقت قریب تھا اس لیے مجھے یقین تھا کہ وہ گھر پہنچ چکے ہوں گے۔ ابو سے ان کی اچھی خاصی شناسائی تھی۔

میں نے انہیں امی کی حالت کے بارے میں بتایا تو وہ اپنا بیگ اٹھا کر اسی وقت میرے ساتھ آ گئے۔ میں نے سہما کو ہدایت کر دی تھی کہ تم ابو کو فون کر دینا۔

ای اس وقت تک بے ہوش تھیں اور اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہی تھیں۔

ڈاکٹر صاحب امی کا چیک اپ کر رہے تھے کہ ابو بھی آ گئے۔

ڈاکٹر نے چیک اپ کرنے کے بعد کہا ”انہیں فوری طور پر اسپتال لے جانا پڑے گا۔“

”ڈاکٹر صاحب، پریشانی کی کوئی بات تو نہیں ہے؟“

”پریشان مت ہوں اور انہیں فوری طور پر اسپتال لے چلیں۔“

ابو نے امی کو اٹھا کر گاڑی کی عقبی نشست پر لٹایا، سہما امی کا سر اپنے زانو پر رکھ کر بیٹھ گئی۔ میں ابو کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا ”آپ لوگ چلیے، میں بھی پہنچ رہا ہوں۔“

جس طرح عطا الحق قاسمی کی یہ بڑی عظمت ہے کہ وہ ضیاء الحق کے بھائی ہیں اسی طرح ضیاء الحق قاسمی کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ عطا الحق قاسمی کے بڑے بھائی ہیں لیکن ان دونوں میں وہی فرق ہے جو لاہور اور کراچی میں ہے۔

کچھ لوگ مشاعروں کی جان ہوتے ہیں، یہ مشاعروں کے بھائی جان ہیں۔ عطا الحق قاسمی کہتے ہیں کہ ایک رات بھائی جان بھٹکے سوئے صبح اٹھے تو شعر پر شعر پڑھ رہے تھے، وہ دن اور آج کا دن

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی آپ جس گروپ فونو میں ہوں اسے دو دفعہ کھینچنا پڑتا ہے۔ جس سانی قدم و قدامت کی طرح آپ کا ادبی قد بھی دن و گنی اور رات چو گنی ترقی کر رہا ہے کیونکہ مشاعرے عام طور پر رات کو ہی ہوتے ہیں۔ عرصہ دراز سے طرافت نکال رہے ہیں، وہ بات قاعدگی سے بے قاعدگی کا شکار ہوا تو ایک ادبی خبرنگار سے کا اجرا کر دیا چنانچہ اب دونوں اس استقامت سے بے قاعدگی کا شکار ہیں کہ آپ کسی ایک گویا وہ بے قاعدہ نہیں کہہ سکتے۔

گھر سے باہر پینٹ کوٹ میں مقیم رہتے ہیں، گھر پہنچتے ہی دھوئی ہاتھ لیتے ہیں اور وہ بھی محض قوت ارادی کے زور پر بندھی رہتی ہے اور قوت ارادی اتنی مضبوط ہے کہ روز بھانا نہ سگریٹ ترک کرتے ہیں۔

اقتباس: طرافت از ضیاء الحق قاسمی
مرسلہ: نبیلہ گبول، کوٹری

ہوں۔“

”آپ فضول میں زحمت نہ کریں ڈاکٹر صاحب! آپ کا بھی روزہ ہوگا۔“

”اس میں زحمت کیسی بیگ صاحب! مجھے تو یوں بھی وہاں جانا ہے۔ آج میری ٹائٹ ڈیوٹی ہے۔“

ای کو فوراً امیر جنسی وارڈ سے آئی سی یو میں منتقل کر دیا گیا۔ ڈیوٹی ڈاکٹر نے بتایا کہ ان پر انجائنا کا خاصا شدید حملہ ہوا ہے۔ اگر مزید کچھ دیر گزر جائی، یہ حملہ ہارٹ ایکٹ میں بھی تبدیل ہو سکتا تھا۔

ہم لوگ باہر آ کر کوریڈور میں بیٹھ گئے اور امی کی صحت یابی کی باتیں مانگنے لگے۔ یہ سن کر مجھے قدرے اطمینان ہوا تھا کہ امی کی حالت خطرے سے باہر ہے۔

مغرب کی اذان ہوئی تو مجھے روزہ افطار کرنے کی فکر ہوئی۔

سیمانے ایک شاپرنگالا جس میں کھجوریں تھیں۔ وہ ان معاملات میں بہت سگڑھی۔ گھر کا کام کاج میں بھی وہی امی کے ساتھ لگی رہتی تھی۔ میں تو بچن کا رخ بھی بکھاری کرتی تھی۔

ہم نے کھجور کھا کر روزہ کھولا اور نماز پڑھ کر فارغ ہوئے ہی تھے کہ ڈاکٹر افضل پہنچ گئے۔ انہوں نے سب سے پہلے تو ڈیوٹی ڈاکٹر سے امی کی طبیعت کے بارے میں معلوم کیا، پھر خود بھی آئی سی یو میں جا کر امی کو دیکھا اور وہاں سے واپس آ کر اطمینان بھرے لہجے میں بولے ”ان کی حالت اب بہت بہتر ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ بروقت اسپتال پہنچ گئیں۔“

”آپ کا بہت بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب!“ میں نے کہا۔ ”اگر آپ نہ ہوتے تو انہیں فوری طبی امداد بھی نہیں مل سکتی تھی۔“

”ایک منٹ!“ ڈاکٹر صاحب نے مسکرا کر کہا اور وہاں سے چلے گئے۔

”ڈاکٹر افضل بہت مخلص انسان ہیں بیٹا! میری ان سے کوئی خاص دوستی نہیں ہے، بس مجھے دار ہونے کے ناتے شناسائی ہے۔ ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید اس وقت آنے سے انکار کر دیتا۔“

اسی وقت ڈاکٹر صاحب لوٹ آئے، ان کے ہاتھوں میں شاپر تھے۔

وہ ابو سے بولے ”آپ لوگ میرے کمرے میں آ جائیں۔“

ابو کے انکار پر وہ بہ صد اصرار ہمیں اپنے کمرے میں لے گئے۔

وہ..... ایک وارڈ بوائے کو بلا کر شاپر دیتے ہوئے بولے ”یہ کھانا پلیٹوں میں لے کر آؤ۔“ پھر وہ ابو سے کہنے لگے ”آپ لوگوں نے ابھی طرح افطار بھی نہیں کیا ہوگا۔ میں کچھ کھانے پینے کا سامان لایا ہوں، تکلف مت کیجئے گا بیک صاحب! اب آنی بالکل ٹھیک ہیں۔“

وہ اچھا خاصا کھانا لے آئے تھے۔ ابو نے کہا بھی کہ گھر

میں کھانا تیار ہے، آپ نے فضول میں زحمت کی۔“

”چلیے، کسی روز آپ کے گھر میں بھی کھانا کھالوں گا تو کیا آپ کو زحمت ہوگی؟“

کھانا کھانے کے بعد وہ کچھ دیر ہمارے ساتھ بیٹھے، پھر ہم سے بولے ”آپ لوگ فکر مند نہ ہوں اور گھر جا کر آرام کریں۔ ابھی کچھ دیر میں آنٹی کو آئی سی یو سے کمرے میں منتقل کر دیا جائے گا۔ آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔“

نرس نے آ کر بتایا کہ مریضہ کو روم نمبر سولہ میں منتقل کر دیا گیا ہے۔

وہ فوراً ہی اٹھ کر چلے گئے۔

ان کی واپسی چند منٹ بعد ہوئی۔ وہ مسکرا کر بولے۔

”اب آنٹی کی طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔ آپ لوگ ان سے مل سکتے ہیں لیکن ایک وقت میں ایک ہی فرد ان کے پاس جائے اور ان سے زیادہ باتیں مت کیجئے گا۔“

سیمانے بہت جلدی تھی۔ ابو نے کہا کہ جاؤ، پہلے تم ہی مل

آؤ۔

امی کی طبیعت اب بالکل ٹھیک تھی، بس چہرے پر نقابت کے آثار تھے۔

ای پرائیویٹ روم میں تھیں۔ ان کے ساتھ ایک فرد ضمیر سکتا تھا۔ ابوتے ہم لوگوں سے کہا کہ تم جاؤ، میں یہاں رہوں گا۔

”میرا تو خیال ہے کہ آپ بھی گھر جا کر آرام کریں۔“

ڈاکٹر افضل نے کہا ”میں یہاں موجود ہوں، آپ لوگ صبح آ جائیے گا۔“

سیمانے کی صورت میں بھی گھر جانے پر راضی نہیں تھی۔ اس کی ضد پر ابو نے اسے امی کے پاس چھوڑ دیا اور ہم گھر آ گئے۔

میں نے سیمانے کو تاکید کر دی تھی کہ خدا نخواستہ کوئی ایسی دس بات ہو تو ہمیں سیل فون پر فوراً اطلاع کر دے۔

صبح میں ابو کے ساتھ اسپتال پہنچ گئی۔ امی کی حالت مزید بہتر ہو گئی تھی۔

ڈاکٹر افضل نے بتایا کہ آنٹی اب بالکل ٹھیک ہیں۔ بس انہیں آرام کی ضرورت ہے اور انہیں ہر قسم کی فکروں اور پریشانیوں سے دور رکھیے گا۔ میں ابھی فوری طور پر انہیں یہاں سے ڈسچارج کر رہا ہوں۔“

امی گھر تو آ گئیں لیکن ہمارے سارے پروگرام ٹھپ ہو گئے۔ مجھے شائستہ باجی کی شادی میں شرکت نہ کرنے کا

بہت افسوس تھا۔

ہم نے عید پر بھی زیادہ خوشیاں نہیں منائیں۔

عید کے دن ابو نے کہا ”ناصرہ بیگم! تم کچھ دن بعد ہی بیمار پڑ جاتیں۔ ہم لوگ کم سے کم شائستہ کی شادی میں تو شریک ہو جاتے۔“

”میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔“ امی نے کہا ”میں تو اس شادی میں ضرور شرکت کروں گی۔“ وہ بچوں کی طرح بولیں۔

”تم ابھی سفر کے قابل نہیں ہو۔“ ابو نے کہا۔

”ارے واہ! میرے بھائی کے خاندان کی آخری خوشی ہے۔ میں تو اس شادی میں ضرور شرکت کروں گی۔“

”اچھا اگر ڈاکٹر صاحب نے اجازت دی تو تم ضرور شرکت کرنا۔“ ابو نے کہا۔

ڈاکٹر افضل اب ہم سے خاصا بے تکلف ہو گیا تھا اور وہ ہر دوسرے تیسرے دن امی کی خیریت معلوم کرنے آ جاتا تھا۔

مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی تھی کہ ڈاکٹر افضل اس دنیا میں بالکل تنہا تھا۔ بوجھ سی جس صورت کو میں نے اس کے گھر میں دیکھا تھا، وہ اس کی ماں نہیں بلکہ ملازمہ تھی۔ وہ صاف ستھری اور بااخلاق خاتون مجھے کسی بھی طرف سے ملازمہ نہیں لگتی تھی۔

”یار ڈاکٹر اب تم ہی فیصلہ کرو۔“ ابو نے کہا، وہ بھی ڈاکٹر افضل سے خاصے بے تکلف ہو گئے تھے۔

”کیسا فیصلہ انکل!“ افضل نے مسکرا کر پوچھا۔ وہ ابھی چند منٹ پہلے ہی آیا تھا۔

”دس تاریخ کو کراچی میں ایک شادی ہے۔ تمہاری آنٹی کی ضد ہے کہ وہ بھی اس میں شرکت کریں گی۔“

”نہیں آنٹی! ابھی آپ کی صحت ایسی نہیں ہے کہ آپ اسلام آباد سے کراچی تک کا سفر کریں۔ ہوائی جہاز سے بھی نہیں۔“

”لیکن بیٹا.....!“

”آنٹی! میں آپ کو سفر کرنے کی اجازت کسی بھی قیمت پر نہیں دوں گا۔“ ڈاکٹر افضل نے فیصلہ کن لہجے میں کہا ”ہاں اگر آپ کو اپنا اور اپنی فیملی کا خیال نہیں ہے تو شادی میں ضرور شرکت کریں۔“

”بیٹا! شائستہ میری سگی بہتی ہے۔ اگر.....“

”آنٹی! شمسہ اور سیمانے تو آپ کی بیٹیاں ہیں۔ آپ کو ان کا خیال نہیں ہے؟“ افضل نے منہ بنا کر کہا پھر کچھ توقف

ان کا خیال نہیں ہے؟“ افضل نے منہ بنا کر کہا پھر کچھ توقف

کے بعد کہنے لگا ”اس کا ایک ہی حل ہے۔ اس شادی میں شرکت اتنی ہی ضروری ہے تو انکل کے ساتھ سیمانے شمسہ میں سے کوئی ایک چلی جائے۔“

سیمانے تو فوراً انکار کر دیا۔ امی کے اصرار پر مجھے ہی کراچی جانے کے لیے راضی ہونا پڑا۔

میں نے سیمانے کو بہت سی ہدایات دیں، انہیں دوائیں اور کھانا وقت پر دینے کی تاکید کی اور ابو کے ساتھ کراچی روانہ ہو گئی۔

امی کو بھی علم تھا کہ امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ انہیں تو ہمارے آنے کی امید بھی نہیں تھی۔

وہ ہمیں دیکھ کر خوش ہو گئیں۔ خاص طور پر شائستہ باجی تو بہت زیادہ خوش ہوئیں۔

عدنان بھائی مجھے پہلے سے بھی زیادہ وچہرہ اور باوقار لگ رہے تھے۔ ماریہ بھائی بھی بالکل نہیں بدلی تھیں۔ وہ اسی رکشش اور سحر انگیز شخصیت کی مالک تھیں۔ انہیں دیکھ کر کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ دو بچوں کی ماں ہیں۔

شادی سے دو دن پہلے رضوان بھائی اور بھابی بھی بچوں سمیت امریکا سے آ گئے۔ رضوان بھائی اور عدنان بھائی کے کچھ دوست بھی اپنی بیویوں اور بچوں کے ساتھ لاہور، حیدر آباد اور فیصل آباد وغیرہ سے آئے تھے، پھر مامی کے کچھ دور و نزدیک کے رشتے دار تھے۔ ان کا وسیع و عریض گھر مہمانوں سے بھر گیا۔

مجھے ایسے ماحول میں ہمیشہ وحشت ہوتی ہے۔ خود سے زیادہ مجھے ابو کا خیال تھا۔ وہ بھی بے آرامی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ برسوں سے پرسکون زندگی گزار رہے تھے۔

انہیں تو ہمارا بلند آواز میں بولنا بھی برا لگتا تھا۔

اس وقت وہ جس کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے وہاں خاندان کے چار پانچ مرد اور بھی تھے۔

وہ لوگ آپس میں فحش بول رہے تھے، حالات حاضرہ پر بلند آواز میں تہرہ کر رہے تھے اور ایک دوسرے پر جملے کس کر قہقہہ لگا رہے تھے۔ یہ بالکل فطری تھا۔ شادی بیاہ کے گھروں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔

کراچی میں ابو کے ایک بہت اچھے دوست بھی مقیم تھے۔ وہ اس سے پہلے اسلام آباد ہی میں تھے اور ابو کے ڈپارٹمنٹ میں تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے کراچی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

میں نے ابو سے پوچھا ”ابو! آپ نے انکل جیل کو بھی

”بیٹا امیر اول بہت گھبرار رہا ہے۔“ ابو نے کہا پھر اگلے جیل سے بولے ”ڈرا مجھے بیڈ پر لٹا دو۔“ اگلے جیل نے ابو کو سہارا دے کر بیڈ پر لٹایا اور بولے۔

”میں ابھی ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔“ اگلے ڈاکٹر صاحب یہاں کیسے پہنچیں گے۔ انہیں تو گھر تلاش کرنے میں ہی وقت لگ جائے گا۔ ہم ابو کو اسپتال لے چلتے ہیں۔“

”ہاں، یہ مناسب ہے۔“ اگلے جیل نے کہا ”میں ڈرائیور کو بلاتا ہوں۔ ہم انہیں اسپتال لے جائیں گے۔“ اگلے جیل نے سیل فون پر ڈرائیور سے کہا کہ تم گاڑی پورچ میں لے آؤ اور اوپر آ کر بیگ صاحب کو نیچے لے چلو۔ ڈرائیور دو منٹ کے اندر اندر اوپر آ گیا۔

اس وقت تک ابو کی حالت مزید بگڑ چکی تھی۔ وہ اکھڑے اکھڑے سانس لے رہے تھے اور اپنا سینہ سہلارہے تھے۔

”ابو!“ میں نے روتے ہوئے کہا ”کیا آپ کو بہت تکلیف ہو رہی ہے؟“

”بیٹا! میرے سینے میں شدید درد ہو رہا ہے۔“ اگلے جیل اور ڈرائیور نے ابو کو گاڑی تک پہنچایا۔ میں ابو کے ساتھ کچلی نشست پر بیٹھ گئی اور ان کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ مجھے کچھ دن پہلے کا وہ منظر یاد آیا جب ہم امی کو اسی طرح اسپتال لے کر گئے تھے۔ میں دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہی تھی کہ یا اللہ پاک، میرے ابو کو کچھ نہ ہو، میری عمر بھی انہیں لگ جائے۔

”شمر بیٹی!“ ابو نے کراہتے ہوئے کہا ”بیٹا! میرے بعد تم ہی اپنی ماں اور بہن کا خیال رکھنا۔ وہ۔۔۔۔۔“

”ابو!“ میں نے خفگی سے کہا ”آپ ہمیں تو ہمیشہ مایوسی سے بچنے کی تلقین کرتے رہے، اب خود آپ ہی مایوسی کی باتیں کر رہے ہیں۔“ میں نے روتے ہوئے کہا۔

”میری باتیں فور سے سنو بیٹا!“ ابو نے قدرے سنبھل کر کہا ”میری بیمہ پالیسی تمہاری امی کے نام ہے۔ اس پالیسی کے کاغذات، پرائز بونڈز وغیرہ میرے لاکر میں موجود ہیں۔ میری پینشن اور گریجویٹی کا سارا کام۔۔۔۔۔“

جیل کر دے گا۔ پھر ان کی آواز سرگوشی میں تبدیل ہو گئی۔ میں نے ان کے منہ سے اپنا کان لگا دیا۔ وہ بہت دھیمی آواز میں کلمہ پڑھ رہے تھے۔

وہ دن بھی مصروفیت میں گزر گیا۔ وہ تو شکر ہے کہ لڑکے والے مہندی وغیرہ کی خرافات کے قائل نہیں تھے ورنہ دو دن کے اس ہنگامے میں مزید ٹھکن ہوتی۔ رات کو حسب وعدہ عدنان بھائی نے مجھے ابو کے پاس چھوڑ دیا۔

دوسرے دن برات آنا تھی۔ اگلے جیل نے طے کیا کہ ہم براہ راست شادی ہال میں پہنچ جائیں گے۔ ”نہیں جیل!“ ابو نے کہا ”میں شائستہ کے بزرگ کی حیثیت سے شادی میں شریک ہو رہا ہوں۔ میرا گھر کے دیگر افراد کے ساتھ رہنا بے حد ضروری ہے۔ ہم لوگ یہاں سے گھر ہی چلیں گے۔ پھر شادی ہال بھی تو وہاں سے نزدیک ہی ہے۔ یوں بھی شائستہ کا نکاح تو ایک گھنٹا پہلے گھر ہی میں ہو گا۔ یہ بھی ایک طرح سے اچھا ہی ہے۔ نکاح میں بھی بہت وقت لگتا ہے۔“

اگلے جیل کا ڈرائیور ہمیں لے کر مامی کے گھر پہنچا تو لڑکے والے بھی اسی وقت نکاح کے لیے آئے تھے۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر نکاح ہو گیا اور شائستہ ہانسی بیوٹی پارلر چلی گئیں۔ انہیں بیوٹی پارلر سے تیار ہو کر براہ راست شادی ہال میں آنا تھا۔

انہوں نے مجھ سے بھی ساتھ چلنے کو کہا لیکن ان کی ایک قرچی دوست پہلے ہی گاڑی میں بیٹھ چکی تھی، میں نے معذرت کر لی۔

تھوڑی دیر بعد وہ کوشن آئی جس میں مہمانوں کو شادی ہال جانا تھا۔ بیشتر مہمانوں کے پاس اپنی گاڑیاں تھیں۔

ہم لوگ اس وقت اوپر عدنان بھائی کے بیلر روم میں تھے۔ ماریہ بھائی اور نازیہ بھائی تیار ہو کر جا چکی تھیں۔ رضوان بھائی اور عدنان بھائی بھی مردانہ میں جا چکے تھے۔

میں بھی جلدی جلدی تیاری کر رہی تھی۔ میں تیار ہو کر آئی تو ابو اسی طرح آرام کرسی پر نیم دراز تھے جیسے میں چھوڑ کر گئی تھی۔

”ابو! آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئے؟“ میں نے پوچھا۔

”ابھی اٹھتا ہوں۔“ ابو نے کہا۔ ان کی آواز میں عجیب سی لرزش تھی۔

میں نے گھوم کر ابو کو دیکھا۔ ان کا چہرہ ہلکی سی طرح زرد تھا اور پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔

”ابو!“ میں نے چیخ کر کہا ”آپ ٹھیک تو ہیں؟“

عدنان بھائی نے کہا ”یار شمر! تم نے تو وہاں موجود لڑکیوں پر کوئی جادو کر دیا ہے۔ ہر لڑکی تمہیں پوچھ رہی تھی اور تو اور۔۔۔۔۔ مجھے تو خود بھرا پر اگھر تمہارے بغیر سونا سونا لگ رہا تھا۔“

”اب آپ کچھ زیادہ ہی ٹھکن پالش کر رہے ہیں۔ مجھ سے کوئی کام ہے تو اس کے بغیر بھی آپ کہہ سکتے ہیں۔“ ”میں تو تمہارا گائیکان کر حیران رہ گیا ہوں۔ میں مذاق نہیں کر رہا ہوں شمر! تم تو بہت اچھا گائی ہو، اپنا کوئی ویڈیو بھی بنا سکتی ہو۔“

”عدنان بھائی! صبح صبح میں ہی ہوں آپ کو بے وقوف بنانے کے لیے۔“

”میں سیریس ہوں شمر!“ عدنان بھائی نے کہا ”میرا ایک دوست پرائیویٹ پروڈکشن ہاؤس چلا رہا ہے۔ وہ ڈرامے، گانوں کی ویڈیو ایلم اور اشتہارات کے لیے فلمیں بناتا ہے۔ اگر تم کو تو میں اس سے بات کروں؟“

”عدنان بھائی پلیز!“ میں نے کہا ”آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ مجھے ابو اور امی سے اجازت نہیں ملے گی۔ ان سے اجازت مل بھی جائے تو میں خود بھی پسند نہیں کروں گی۔ شوقیگانے اور پروفیشنل میں بہت فرق ہوتا ہے عدنان بھائی!“

وہ مزید کچھ کہتے لیکن گھر آ گیا تھا اس لیے خاموش ہو گئے۔

ہر کوئی مجھ سے یہی سوال کر رہا تھا کہ تم رات کو اچانک کیوں چلی گئی تھیں؟

”رات شمر کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی تھی۔ مجھ سے کہنے لگی کہ ان بند کمروں میں میرا دم گھٹ رہا ہے۔ میں نے سوچا کہ اسے پھوپھا جان کے پاس چھوڑ دوں۔ وہاں کم سے کم اس کی نیند تو پوری ہو جائے گی۔“

”اور آپ کے مہمان؟“ ماریہ بھائی نے مشتبہ لہجہ میں پوچھا۔

”کون سے مہمان؟“ عدنان بھائی بولے ”یہاں تو اس وقت ہر شخص مہمان ہے۔“

”ارے وہی جنہیں آپ کل رات ریسیو کرنے لگے تھے؟“

”انہیں میں نے ہوٹل میں ٹھہرا دیا ہے۔ اب گھر میں تو اتنی گنجائش ہے نہیں۔ شمر کو وہاں چھوڑ کر میں اتر پورٹ ہی گیا تھا۔“

گی۔ یوں بھی اب وہاں سب سو ہی چکے ہوں گے۔ مامی اگر پوچھیں تو آپ انہیں یہ مت بتائیے گا کہ ابو کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ وہ فحشوں میں پریشان ہو جائیں گی۔“

”اب میں بھی گھر جا کر کیا کروں گا؟“ عدنان بھائی نے کہا ”سب مہمان تو یوں بھی سو گئے ہوں گے۔“

”نہیں بیٹا!“ ابو نے کہا ”شادی کا گھر ہے۔ ہزار طرح کے کام ہوتے ہیں۔ تمہارا وہاں موجود رہنا ضروری ہے۔“ عدنان بھائی تھوڑی دیر بیٹھ کر رخصت ہو گئے۔ ابو کی طبیعت اب خاصی بہتر تھی۔ بس ان کے چہرے پر کچھ نقاہت کے آثار تھے۔

پھر آہستہ آہستہ ان کی پلکیں بھی بوجھل ہونے لگیں اور وہ سو گئے۔

اگلے جیل بھی اس وقت وہیں موجود تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا ”شمر! اب تم بھی کچھ دیر آرام کر لو۔ یہاں تو کئی بیلر روم خالی ہیں۔ تم کہیں بھی سو جاؤ۔“

میں کمرے سے باہر آئی تو اگلے جیل نے کہا ”شمر بیٹی! میں تم سے کچھ چھپانا نہیں چاہتا۔ تمہارے ابو کو انجائیکا کا شدید حملہ ہوا تھا، ان کا بلڈ پریشر بہت بڑھ گیا تھا۔ اب تم ان کے کھانے پینے اور آرام کا بہت زیادہ خیال رکھنا۔“

ان کی بات سن کر میں لرز کر رہ گئی ”اگلے ابو ایسے اب تو پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔“

”اب پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے لیکن کوشش کرنا کہ وہ شادی کے موقع پر بھی وہاں زیادہ دیر نہ ٹھہریں۔ انہیں آرام کی شدید ضرورت ہے۔ ویسے ابھی شادی میں ایک دن باقی ہے۔ امید ہے کہ اس وقت تک ان کی طبیعت مزید بہتر ہو جائے گی۔“

دوسرے دن ناشتے کے فوراً بعد ہی عدنان بھائی آ گئے اور بولے ”امی نے تو میرا تعلق بند کر دیا ہے کہ شمر کو تم نے وہاں کیوں چھوڑا۔ وہ شادی کے ہنگاموں میں شرکت کرنے آئی ہے۔ تم اسے فوراً لے کر آؤ۔“

ابو نے بھی مجھ سے جانے کو کہا تو میں نے جواب دیا۔ ”ابو! میں رات کو پھر آ جاؤں گی۔ یوں بھی آپ کے بغیر وہاں میرا دل نہیں لگے گا۔“

”تم اس کی فکر مت کرو بیٹا!“ اگلے جیل نے کہا ”میں اس کے پاس ہوں۔ آخری بوا ہیں، میرا ڈرائیور ہے جو گھر کے دوسرے کام بھی کرتا ہے۔“

میں عدنان بھائی کے ساتھ لوٹ آئی۔ راستے میں

پھر اچانک وہ بے ہوش ہو گئے۔
 اسپتال پہنچ کر مجھ پر یہ بھیانک اور جان لیوا انکشاف
 ہوا کہ اب تو راستے ہی میں ہمیں چھوڑ گئے تھے۔
 ابو کے تو گاڑی میں تھے لیکن ان کی واپسی اسپتال کی
 ایسیولنس میں ہوئی۔
 انکل جمیل انہیں اپنے گھر لے گئے تھے۔
 میں اب تک بہت ضبط کرتی رہی تھی۔
 مگر پہنچ کر میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگی اور دیواروں
 سے سر ٹکرانے لگی۔ اگر انکل جمیل نہ ہوتے تو شاید میں بھی
 دیواروں سے سر ٹکرانے لگتی۔
 انہوں نے بے اختیار مجھے سینے سے لگا لیا۔ میں ان کے
 سینے میں منہ چھپائے بہت دیر تک روتی رہی اور وہ میری
 پشت تھپکتے رہے۔
 وہ مجھ سے بولے "دیکھو بیٹی! عدنان یا اس کی والدہ کو
 ابھی یہ اطلاع نہیں ملنا چاہیے۔ وہ شادی کا گھر ہے۔ تم بھی
 ہاتھ منہ دھو کر تیار ہو جاؤ اور شادی میں شرکت کرو۔"
 "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں انکل؟" میں نے کہا۔
 "میرے باپ کی میت میرے سامنے رکھی ہے اور آپ مجھ
 سے شادی میں جانے کے لیے کہہ رہے ہیں؟"
 "میں تو تمہیں بہت سمجھتا تھا شمسہ! انکل جمیل
 نے کہا "تم وہاں نہ لگیں تو جانتی ہو کیا ہوگا؟ عدنان ابھی خود
 یہاں پہنچ جائے گا۔"
 "لیکن انکل..... ابو.....!"
 "میں تمہارے ابو کے پاس ہوں بیٹا!" انہوں نے
 بھرائی ہوئی آواز میں کہا "یوں بھی..... اب..... اسے کسی
 کی مدد کی..... ضرورت نہیں رہی۔" ان کی آنکھوں سے
 آنسو بہنے لگے۔
 "انکل! مجھے صبر کی تلقین کرتے کرتے آپ خود بھی
 رونے لگے۔" میرے آنسو ایک مرتبہ پھر بہنے لگے۔
 "تمہارے باپ سے پچھتائیں سال پرانا ساتھ ہے
 بیٹا! انکل نے کہا "دیکھو، مجھے چھوڑ کر کس آرام سے
 چلا گیا۔"
 انکل نے زبردستی مجھے شادی میں بھیجا کہ صرف تم اپنا
 چہرہ دکھا کر لوٹ آنا۔ وہ لوگ تمہارے ابو کے بارے میں
 پوچھیں تو یہی کہنا کہ ان کی حالت اچانک بگڑ گئی تھی اس لیے
 انہیں اسپتال میں داخل کر دیا ہے۔
 میں نے اس شادی میں شرکت کیسے کی؟ یہ میرا دل ہی

جانتا ہے۔ مجھے تو خود پر حیرت ہوتی ہے کہ میں نے اپنی
 چیخوں اور آنسوؤں کو ضبط کیسے کیا؟
 آخری بوا کو ابو کے پاس چھوڑ کر انکل جمیل بھی میرے
 ساتھ ہی آگئے تھے۔ وہ بھی میری طرف سے بہت فکر مند
 تھے۔
 میں کھوئی کھوئی سی ایک گوشے میں بیٹھی ہوئی تھی اور مجھے
 لگ رہا تھا کہ سب کچھ خواب کے سے عالم میں ہو رہا ہو۔
 خدا خدا کر کے شائستہ باجی کی رخصتی ہوئی۔
 ان کے جاتے ہی میرے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ
 گئے اور میں زور زور سے رونے لگی۔
 ماما نے مجھے تسلی دی۔ وہ یہ سمجھ رہی تھیں کہ مجھے شائستہ
 باجی کے جانے کا غم ہے۔
 عدنان بھائی نے بھی مجھے تسلی دی اور بولے "شمسہ!
 پھوپھا جان کی طبیعت اب کیسی ہے؟"
 ان کا یہ پوچھنا تھا کہ میری طبیعت کھل گئی۔ میں ان کے
 سینے سے لگ کر اتار روئی کہ غم حال ہو گئی۔
 انکل جمیل نے انہیں بتا دیا کہ بیک صاحب کا انتقال تو
 برات آنے سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ میں نے یہ خبر اس لیے
 چھپائی کہ شادی کے گھر میں غم کی یہ خبر سنا مجھے اچھا نہیں لگ
 رہا تھا۔
 ماما بھی بری طرح رونے لگیں اور بولیں "عدنان!
 بھائی صاحب کو یہاں لے آؤ۔"
 "اس کی کیا ضرورت ہے بھائی! انکل جمیل نے کہا۔
 "شمسہ! انہیں اسلام آباد لے جانا چاہتی ہے۔ میں نے کل کی
 فلائٹ سے ان کی روانگی کا بندوبست کر دیا ہے۔"
 اسی وقت ماما، عدنان اور رضوان بھائی اور دونوں
 بھابھیاں میرے ساتھ انکل جمیل کے گھر پہنچ گئے۔
 "شمسہ! تم نے پھوپھی جان کو اطلاع دے دی ہے؟"
 عدنان بھائی نے کہا۔
 "نہیں عدنان بھائی! میری ہمت نہیں ہوئی۔"
 "انہیں وہی طور پر تیار تو کرنا ہوگا شمسہ! وہ خود بھی دل
 کی مرہضہ ہیں، اچانک اتنا بڑا صدمہ برداشت نہیں کر سکیں
 گی۔"
 "پھر میں ایسا کرتی ہوں کہ ڈاکٹر افضل صاحب کو
 اطلاع دے دیتی ہوں۔ وہ امی کو وہی طور پر تیار کر لیں
 گے۔" میں نے کہا۔
 "یہ ڈاکٹر افضل کون ہیں؟" ماما نے پوچھا۔

"ماما، یہ ہمارے فیملی ڈاکٹر ہیں۔"
 میں نے سیل فون پر ڈاکٹر افضل کا نمبر ملایا۔ دوسری
 طرف سے اس کی جیسکتی ہوئی آواز آئی "اوہ شمسہ صاحبہ!
 بڑی جلدی خیال آ گیا ہم لوگوں کا۔ یہ بتاؤ شادی کیسی رہی؟
 خوب انجوائے کیا؟"
 "ڈاکٹر صاحب!..... وہ..... میں....."
 "کیا بات ہے شمسہ! افضل اچانک سنجیدہ ہو گیا "تم
 روری ہو یا تمہیں فلو ہو گیا ہے؟"
 "ڈاکٹر صاحب!..... ابو اب اس دنیا میں نہیں
 رہے۔"
 "وہاں! وہ چیخ کر بولا "تمہارا مطلب ہے کہ....."
 "ہاں، میرا یہی مطلب ہے۔" میں نے کہا "آج
 دوپہر ابو کو دل کا شدید دورہ پڑا تھا۔ انہوں نے تو ہمیں
 اسپتال تک پہنچنے کی مہلت بھی نہیں دی۔" یہ کہہ کر میں بری
 طرح سسکتی لگی۔
 "شمسہ پلیز! ڈاکٹر افضل نے کہا "تم تو ایک سمجھدار
 اور بہادر لڑکی ہو۔ تم ہی آنسو بھائی رہو گی تو سہا اور آنٹی کو
 کون سنبھالے گا۔ میں آنٹی کو وہی طور پر اس صدمے کے
 لیے تیار کرنا ہوں۔ تم اسلام آباد کب تک پہنچ رہی ہو؟"
 "ہم کل کی فلائٹ سے آرہے ہیں۔" میں نے کہا اور
 فون کا سلسلہ منقطع کرنے کے بعد ایک مرتبہ پھر بری طرح
 سسکتی لگی۔
 "شمسہ! عدنان بھائی نے میرے سر پر ہاتھ رکھا۔
 "حوصلہ رکھو پلیز! ابھی تو اسلام آباد جا کر تمہیں ایک کڑی
 آزمائش سے گزرنا ہے۔ پھوپھا اور سہا کو سنبھالنا ہے۔"
 بے ہوش میں اسلام آباد یوں پہنچی جیسے ابو کی موت کی ذمے دار
 میں ہی ہوں۔ ڈاکٹر افضل وہیں موجود تھا۔ اس نے امی کو
 غالباً بتا دیا تھا۔ وہ مجھ سے لپٹ کر چیخ کر رونے لگیں۔ سہا
 بھی غم سے غم حال تھی۔ امی کی حالت تو ایسی بگڑی کہ وہ.....
 ہوش ہو گئیں۔ ڈاکٹر افضل کو انہیں انکشن دینا پڑا۔
 اس موقع پر اگر ماما، عدنان بھائی اور ڈاکٹر افضل نہ
 ہوتے تو شاید ہم تینوں یہ صدمہ برداشت نہ کر سکتے۔
 رضوان بھائی کو واپس امریکا جانے کی تیاری کرنا تھی
 اس لیے وہ نہیں آئے تھے، ماما یہ بھابی بچوں کی وجہ سے نہیں
 آئی تھیں کیونکہ ان کے اسکول کھلے ہوئے تھے۔
 مجھے عدنان بھائی بالکل اپنے سگے بھائیوں کی طرح لگ
 رہے تھے۔ ان کی بھی دو چار بہت اہم میٹنگز تھیں لیکن انہوں

نے وہ سب منسوخ کر دی تھیں۔ میں نے انہیں فون پر کسی
 سے یہ کہتے سنا تھا کہ مجھے اس ملازمت سے زیادہ اپنی پھوپھی
 عزیز ہیں۔ میرے گھر میں موت ہو گئی ہے سر اور آپ مجھے
 آفس آنے کو کہہ رہے ہیں۔ میں نے تو بہن کی شادی میں بھی
 چھٹی نہیں کی۔" یہ کہہ کر انہوں نے فون بند کر دیا۔
 پھر سب کچھ ڈاکٹر افضل، عدنان بھائی، انکل جمیل اور
 محلے کے لوگوں نے کیا۔
 ابو کے سوگم کے بعد ماما اور عدنان بھائی بھی واپس
 چلے گئے تو گھر ایک دم سونا سونا ہو گیا۔ انکل جمیل البتہ ابھی
 اسلام آباد ہی میں تھے اور ابو کی پینشن اور انشورنس کی رقم کے
 لیے بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ وہ تو غنیمت ہے کہ انکل کے
 بیٹے بہت اچھی پوسٹ پر تھے اس لیے کہیں رکاوٹ پیش نہیں
 آئی اور ہفتوں کا کام دنوں میں ہو گیا۔ اس کام سے فارغ
 ہو کر وہ کراچی چلے گئے اور جاتے جاتے امی سے کہہ گئے کہ
 بھابی، کسی وقت بھی میری مدد کی ضرورت پڑے تو آپ بلا
 جھجک مجھے بتا دیجئے گا۔ ہم دونوں دو چار سال کے دوست
 نہیں بلکہ لگ بھگ نصف صدی کے دوست تھے۔
 ان کے جانے کے بعد گھر مزید سونا ہو گیا۔ امی کی
 طبیعت اب قدرے بہتر تھی۔
 میں ناشتا کرنے کے بعد چائے لے کر ان کے پاس
 جا بیٹھی۔ سہا اس وقت کچن میں مصروف تھی۔ امی نے مجھ
 سے کہا "شمسہ! مجھے تم سے ایک بہت ضروری بات کرنا ہے۔"
 میں نے حیرت سے کہا "مجھ سے.....؟"
 "ہاں، تم سے! امی نے کہا "کیا میں تم سے کوئی مشورہ
 نہیں کر سکتی؟"
 "جی امی! میں نے کہا "کہیں!"
 "ڈاکٹر افضل سہا سے شادی کرنا چاہتا ہے۔" امی نے
 کہا۔
 میں اچھل پڑی۔ میں نے بھی اکثر محسوس کیا تھا کہ ڈاکٹر
 افضل کی نظریں گھر میں داخل ہوتے ہی سہا پر ٹپک جاتی
 تھیں۔ اس کی نظروں میں سہا کے لیے پسندیدگی ہوتی تھی۔
 "امی! کیا یہ بات آپ سے افضل نے کہی ہے؟"
 "نہیں، یہ بات مجھے سہا نے بتائی ہے۔" امی نے کہا۔
 مجھے سہا پر غصہ بھی آیا کہ وہ ڈاکٹر کی محبت میں گرفتار
 ہے اور اس نے مجھے ہوا تک نہیں لگتے دی۔
 "ڈاکٹر افضل کا کیا خیال ہے؟"
 "میں نے ابھی تک اس سے بات نہیں کی ہے۔" امی

نے کہا۔

”تو پھر پہلے ڈاکٹر افضل کی طرف سے پہل ہونے دیں۔ اس کے بعد ہی اس مسئلے پر غور کیجئے گا۔“

ڈاکٹر افضل میں کوئی برائی نہیں تھی۔ وہ خاصا سلجھا ہوا اور ہمدرد انسان تھا، قبول صورت تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ سیمائے پسند کرتی تھی۔

اس نے اسی رات امی سے کہا ”آئی! آج میں آپ سے بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”تو اب تک آپ نے جو باتیں کی ہیں، وہ غیر ضروری تھیں؟“ میں نے کہا۔

سیمائے وہاں سے فوراً اٹھ کر چلی گئی۔ میں سمجھ گئی کہ وہ ”ضروری بات“ کیا ہو سکتی ہے؟

ڈاکٹر افضل نے میرے مذاق میں کہے ہوئے جملے کو نظر انداز کر دیا اور بولا ”آئی! میرا کوئی بزرگ تو ہے نہیں ورنہ یہ بات میرے بجائے وہی کرتا۔ میں..... سیمائے..... شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

امی نے کہا ”بیٹا، تم مجھے کچھ سوچنے کا اور مشورہ کرنے کا موقع تو دو۔ سیمائے کی بھائی، بھائی عدنان اور جمیل بھائی ہی اس کا فیصلہ کریں گے۔“

”مجھے کوئی جلدی نہیں ہے آئی!“ ڈاکٹر افضل نے نظریں جھکا کر کہا ”بس جولائی تک اس کا فیصلہ کر لیجئے گا کیونکہ میں جولائی کے وسط میں اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن چلا جاؤں گا۔ میری خواہش ہے کہ میں تمہارا ہاں نہ جاؤں۔“

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بولا ”اب مجھے اجازت دیجئے۔“

”ارے ڈاکٹر صاحب! کھانا تو کھالیں۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”آج اصل میں میرے ایک پرانے دوست نے کچھ دوستوں کی دعوت کی ہے۔“ وہ امی کو سلام کر کے چلا گیا۔

اس کے جانے کے فوراً بعد سیمائے کمرے میں داخل ہوئی۔ میں جانتی تھی کہ وہ دروازے سے لگی ہماری اور ڈاکٹر کی باتیں سن رہی ہوگی۔

ای نماز پڑھنے کے لیے اٹھ گئیں۔ میں نے سیمائے سے کہا۔ ”اچھا، تو تم نے چپکے چپکے یہ کھل دیا اور مجھے کانوں کان خبر بھی نہ ہونے دی۔“

”شمر باجی..... وہ..... دراصل..... میں..... افضل کو..... پسند تو کرتی تھی لیکن..... ان کی طرف سے مجھے کوئی ایسا تاثر نہیں مل رہا تھا کہ..... وہ بھی..... پھر پرسوں اچانک

ہی انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ..... مجھ سے شادی کرو گی؟ میں نے کہا کہ یہ بات آپ امی اور شمر باجی سے کریں۔ وہ پہلے میری رضامندی چاہتے تھے۔ میں نے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ میں نے کوئی بری بات تو نہیں کی شمر باجی؟“ وہ معصومیت سے بولی۔

”نہیں سیمائے! تم نے بہت اچھا کیا، مجھے تم پر فخر ہے۔“ دوسرے ہی دن امی نے انکل جمیل اور عدنان بھائی کو فون کر دیا۔

عدنان بھائی نے کہا ”لڑکا تو اچھا ہے، میری اس سے بہت مختصر ملاقات رہی ہے۔ یہ ظاہر شریف اور خاندانی معلوم ہوتا ہے۔ اس کے باوجود آپ پہلے اچھی طرح چھان بین کر لیں۔“

اس کے برعکس انکل جمیل خود ہی اسلام آباد پہنچ گئے۔ افضل ایسٹ آباد کے کسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ انکل جمیل نے دو دن کے اندر اندر اس کے بارے میں سب کچھ معلوم کر لیا۔

ایسٹ آباد میں اس کی ایک مربع کے قریب زمین بھی تھی۔ وہ خاندانی لڑکا تھا۔ انکل جمیل نے اس کے کالج اور اسکول کے ساتھیوں سے بھی اس کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ پھر اپنا فیصلہ سنایا کہ بھائی! لڑکا بہت اچھے گھرانے کا ہے، شریف اور سلجھا ہوا ہے۔ آپ اسے کل رات کے کھانے پر بلا لیں تاکہ میں اس سے کچھ تفصیلی باتیں کر سکوں۔ آخر بیٹی کے رشتے کا سوال ہے۔

انکل جمیل اسلام آباد میں اپنے بیٹے کے پاس ہی ٹھہرتے تھے۔ وہ دوسرے دن رات کو آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔

ڈاکٹر افضل آیا تو میں نے اس سے کہا ”ڈاکٹر صاحب! آپ کا کیس زبردست ہے لیکن آپ فکرمست کریں، کل اس کا حتمی فیصلہ ہو جائے گا۔ انکل جمیل کل آپ کا تفصیلی انٹرویو کریں گے۔ کل ڈر آپ ہمارے ساتھ کیجئے گا۔“

”گویا فاسل اتھارٹی انکل جمیل ہیں؟“ ڈاکٹر افضل مسکرا دیا۔

”جی ہاں۔“ میں نے بھی ہنس کر کہا ”پاپا کے بعد وہ ہمارے بزرگ ہیں۔ عدنان بھائی نے بھی یہ فیصلہ انکل جمیل پر چھوڑ دیا ہے۔“ پھر میں نے اڑاؤ مذاق کہا ”کل ڈرا ایملے کپڑے پہن کر اور انٹرویو کی تیاری کر کے آئیے گا۔“

”اس کی تو آپ فکر ہی نہ کریں۔“

دوسرے دن کھانے کے بعد انکل جمیل اور ڈاکٹر افضل اراٹنگ روم میں بیٹھے دیر تک باتیں کرتے رہے پھر جیسا کہ مجھے امید تھی، انکل جمیل نے ڈاکٹر افضل کے حق میں فیصلہ اے دیا۔

شادی کا فیصلہ ہوتے ہی امی میں گویا ایک نئی توانائی بھر گئی۔ سیمائے کا چہرہ پھول کی طرح کھل اٹھا اور شادی کی تیاریاں زور شور سے شروع ہو گئیں۔

میں اس وقت تک بی اے کرنے کے بعد یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے چکی تھی۔

پھر وہ دن بھی آیا جب سیمائے کربیا دیس سدھار گئی۔ اس کا بنگلہ نزدیک ہی تھا اس لیے وہ اکثر دن میں آ جاتی تھی۔

پھر معلوم ہوا کہ افضل نے اپنی تمام زمین اور بنگلہ فروخت کر دیا ہے اور لندن جانے کی تیاری کر رہا ہے۔

”افضل!“ میں نے ایک دن پوچھا ”کیا تم ہمیشہ کے لیے لندن جا رہے ہو؟“

”نہیں شمر باجی!“ افضل نے کہا ”میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد واپس آ جاؤں گا۔“ پھر وہ ہنس کر بولا۔

”زمین تو میں نے اس لیے فروخت کر دی کہ میری غیر موجودگی میں کوئی بھی اس پر قبضہ کر سکتا تھا۔ بنگلے کی دیکھ بھال کو بھی ایک آدمی چاہیے تھا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ میں لندن سے واپسی پر اس سے بھی اچھا بنگلہ اور گاڑی خرید لوں گا۔“

وہ اسی قسم کی تسلیاں اور دلا سے دے کر لندن چلا گیا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے سیمائے معنوں میں آج ہم سے وداع ہو رہی ہے۔ شادی کے بعد تو وہ تقریباً روز ہی آ جاتی تھی۔

اب میں مزید تنہا ہو گئی۔ میں پوری توجہ تعلیم پر دینے لگی۔ میں کیمسٹری میں ایم ایس سی کر رہی تھی۔ اس کا مشورہ مجھے انکل جمیل نے بھی دیا تھا اور افضل نے بھی۔

سیمائے روزانہ وہاں سے فون کرتی تھی اور ہم سے گھنٹوں باتیں کرتی تھی۔ عدنان بھائی اس دوران میں لندن کا ایک چکر بھی لگا آئے تھے اور انہوں نے بتایا تھا کہ سیمائے بہت خوش ہے۔

میں نے کیمسٹری میں ایم ایس سی کی ڈگری نمایاں پوزیشن کے ساتھ حاصل کر لی۔

فوراً ہی مجھے یونیورسٹی سے لیکچررشپ کی آفر ہوئی۔ میں نے انکل جمیل سے مشورہ کرنے کے بعد یہ آفر قبول کر لی اور

یونیورسٹی میں پڑھانے لگی۔

انکل جمیل تو مہینے میں اسلام آباد کے دو تین پکڑ لگا لیتے تھے۔ ہر بار وہ حسرت بھرے انداز میں اپنی تنہائی کا بیان ضرور کرتے تھے۔ مہینے، دو مہینے میں ایک دفعہ عدنان بھائی بھی آ جاتے تھے۔ امی ہر بار ان سے کہتی تھیں کہ اکیلے کیوں آئے ہو؟ ماریہ اور بچوں کو کیوں نہیں لاتے؟“

وہ ہمیشہ یہی جواب دیتے تھے کہ میں آفس کے کام سے اسلام آباد آیا ہوں۔ جب بھی موقع ملا امی، ماریہ اور بچوں کو ضرور اسلام آباد لاؤں گا۔“

ایک دن عدنان بھائی آئے تو انہوں نے بتایا ”اس مرتبہ میرا قیام اسلام آباد میں کچھ طویل ہوگا، آپ لوگوں کو زحمت ہوگی اس لیے میں نے اس دفعہ ہوٹل میں ٹھہرنے کا ارادہ کیا ہے۔“

امی اس پر ناراض ہو گئیں کہ اپنا گھر ہوتے ہوئے تم یہ کیسی غیروں والی باتیں کر رہے ہو؟ امی کا غصہ دیکھ کر انہیں مانتے ہی بنی۔

وہ چار پانچ بجے تک اپنے کام سے فارغ ہو جاتے تھے، پھر وہ مجھے لے کر گھومنے پھرنے نکل جاتے۔

اس دوران میں انکل جمیل اسلام آباد آ گئے۔ میں عدنان بھائی کے ساتھ اس وقت لاٹک ڈرائیو سے لوٹی تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے انکل کو عدنان بھائی کے ساتھ میرا جانا ناگوار گزرا ہو۔ اس سے پہلے بھی میں نے کچھ ایسا ہی محسوس کیا تھا کہ انہیں عدنان بھائی کے ساتھ میرا ہونا پسند نہیں ہے۔

عدنان بھائی اپنے کمرے میں گئے تو انکل نے اپنی ناگواری کا اظہار بھی کر دیا۔ ”بھائی! مجھے شمر کا عدنان کے ساتھ یوں گھومنا اچھا نہیں لگا۔“

”ارے بھائی صاحب! عدنان تو اسے اپنی بہن سمجھتا ہے اور شمر بھی اسے بھائیوں سے بڑھ کر چاہتی ہے۔“

”ممکن ہے ایسا ہی ہو، آپ مجھے دقیقاً تو یہی کہہ لیں لیکن مجھے یہ سب بالکل پسند نہیں آیا۔“

اس دن پہلی دفعہ مجھے انکل پر غصہ آیا۔ یہ تو ایک طرح سے وہ میرے کردار پر بھی شبہ کر رہے تھے اور عدنان بھائی سنتے تو انہیں کتنا صدمہ ہوتا۔

امی نے ان سے زیادہ بحث نہیں کی۔ انکل جمیل نے جاتے ہوئے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور بولے ”بیٹا! میں آج رات کی فلائٹ سے جا رہا ہوں لیکن میری نصیحت یاد رکھنا۔“

میں جانتی تھی کہ ان کی نصیحت کیا ہے لیکن زندگی میں پہلی دفعہ میں نے ان کی ”نصیحت“ پر کان نہ دھرا۔ ندائی نے اس کا کوئی نوٹس لیا۔

دوسرے دن اچانک عدنان بھائی نے مری جانے کا پروگرام بنالیا۔ انہوں نے امی سے بھی چلنے کو کہا لیکن امی نے انکار کر دیا۔

”ہم دونوں مری کے لیے روانہ ہو گئے۔

راستے میں انہوں نے ہنس کر کہا ”شمس! کاش تم آٹھ دس سال پہلے پیدا ہو گئی ہوتیں۔“

میں نے چونک کر انہیں دیکھا اور بولی ”عدنان بھائی! میں کچھ بھی نہیں۔“

”بھئی، اگر تم دس برس پہلے پیدا ہو جاتیں تو میری زندگی جہنم تو نہ بنتی۔“

”میں اب بھی نہیں سمجھی۔ میرا چند سال پہلے پیدا نہ ہونے سے آپ کی زندگی جہنم کیسے بن گئی؟“

”میں تو تمہیں بہت سمجھ دار اور عقل مند سمجھتا تھا۔“

عدنان بھائی ہنس کر بولے۔

”وہ تو میں ہوں۔“ میں بھی ہنسی ”لیکن اگر آپ بات صاف صاف کریں تو میں اپنی ذہانت کے جوہر دکھاؤں۔“

”بھئی صاف بات تو یہ ہے کہ اس وقت ماریہ کی جگہ تم ہوتیں۔“

میں بری طرح اچھل پڑی ”عدنان بھائی! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ ہوش میں تو ہیں۔“ میں نے ناگواری سے کہا ”مجھے آپ کا یہ مذاق واقعی پسند نہیں آیا۔“

”یہ مذاق نہیں ہے شئی!“ انہوں نے اچانک مجھے شمر سے شئی کر دیا۔ ”میرے دل کی آواز ہے۔“

”گاڑی روکیے عدنان بھائی!“ میں نے سخت لہجے میں کہا ”میں آپ سے چودہ پندرہ سال چھوٹی ہوں۔ آپ کو اپنا بھائی سمجھتی ہوں۔ آپ کو ایسی باتیں کرتے شرم نہیں آتی۔“

”شئی! میں تو اسی دن دل ہار بیٹھا تھا جب تمہیں شائستہ کی شادی میں گاتے سنا تھا۔ اس سے پہلے تو میں نے تم پر توجہ نہیں دی تھی۔ اس دن مجھے اندازہ ہوا کہ تم تو بہت خوبصورت خوش اندام ہو۔۔۔۔۔ اس پر تمہاری سُر ملی آواز۔۔۔۔۔!“

”عدنان بھائی! گاڑی روکیں ورنہ میں پھلانگ لگا دوں گی۔“ میں نے چیخ کر کہا۔

”لگا سکتی ہو تو لگا دو۔“ انہوں نے کہا ”ویسے یہ سوچ لینا کہ پھر پھوپھو بالکل تمہارا جائیں گی۔ وہ تو جیتے جی مر جائیں

گی۔“

اس وقت تک وہ اپنی کمپنی کے گیٹ ہاؤس تک پہنچ چکے تھے۔ وہ کالچ بالکل الگ تھلک تھا۔ اس تک پہنچنے کا راستہ بھی بہت چکر دار تھا۔

اچانک ہی بارش شروع ہو گئی۔

وہاں موجود چوکیدار اور اس کی بیٹی کو دیکھ کر مجھے کچھ ڈھارس بندھی۔ چوکیدار نے مجھے بتایا کہ یہاں اس موسم میں بارش کئی روز تک ہوتی رہتی ہے۔

میں بھی یہ بات جانتی تھی۔

میں کچھ دیر پورچ میں کھڑی بارش میں بھیکتی رہی پھر عدنان نے مجھ سے کہا ”شمس! اندر آ جاؤ ورنہ بیمار پڑ جاؤ گی۔“

”میری بیماری کی فکر چھوڑیں۔“ میں نے کہا ”آپ ابھی اور اسی وقت واپس چلیں۔“

”پاکل ہو گئی ہو؟“ انہوں نے کہا ”اس وقت سڑک پر کڑی طلب ہے خود کشی کرنا۔ سڑک پر اتنی پھسلن ہو گئی کہ ہماری گاڑی کسی بھی وقت گہری کھائی میں جا کر گرے گی۔ ویسے تم فکر مت کرو۔ میں اتنا کمینہ اور گھٹیا نہیں ہوں کہ اس تنہائی سے کوئی ناجائز فائدہ اٹھاؤں گا۔“

”میں بھی اتنی کمزور نہیں ہوں عدنان صاحب!“ میں نے کہا ”کہ میں آپ سے ڈر جاؤں گی۔“ یہ کہہ کر میں کمرے میں داخل ہو گئی۔

ریسٹ ہاؤس کے چوکیدار نے گھر میں آتش دان روشن کر لیا تھا۔ میرے پاس وہی ایک جوڑا تھا۔ میں مری میں قیام کے ارادے سے تو آئی نہیں تھی۔

میں نے چوکیدار کی بیٹی سے اس کے کپڑے مانگے اور اپنے کپڑے نچوڑ کر آتش دان کے نزدیک ہی کر سی پر پھیلادے۔

تھوڑی دیر بعد عدنان کافی کے دوگ لے کر آیا۔ اس نے ایک گگ مجھے دیا اور آتش دان کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔

”آئی ایم سوری شمس! میں نے جذبات میں آ کر نہ جانے تم سے کیا کیا کہہ دیا۔ مجھے معاف کر دو۔ پلیز!“ وہ دیر تک بیٹھا معافی تملانی کرتا رہا، پھر اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں نے سیل فون پر امی کو بتا دیا تھا کہ یہاں شدید بارش ہو رہی ہے۔ میں آج نہیں آ سکوں گی۔ تین چار دفعہ کوشش کر کے بعد میں امی سے بات کر چکی تھی کیونکہ یہاں سٹیل نہیں آ رہے تھے۔

دوسرے دن مطلع بالکل صاف تھا۔ میں نے ناشتا بھی نہیں کیا اور عدنان سے کہا ”ابھی اور اسی وقت واپس چلو۔“

عدنان خاموشی سے اسٹیرنگ سیٹ پر بیٹھا اور ہمارا واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔

اسلام آباد پہنچ کر عدنان فوراً ہی کراچی کے لیے روانہ ہو گیا۔ میں بھی خاصی غڑھال اور چپ چپ تھی۔ مجھے اس بات کا شدید صدمہ تھا کہ جس شخص کو میں نے بھائیوں سے بڑھ کر چاہا، وہی ایسا گھٹیا نکلا۔

امی نے بھی مجھے کم صدمہ دیکھ کر پوچھا ”کیا بات ہے شمس! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”ای! اس میں شدید درد ہے۔ میں نے ابھی سردرد کی گولیاں لی ہیں، کچھ دیر سولیوں کی تو ٹھیک ہو جاؤں گی۔“ میں نے کہا۔

مجھے اپنے کے بعد بھی رہ رہ کر عدنان کے گھٹیا پن پر غصہ آرہا تھا۔ اچانک میرے اندر سے آواز آئی ”شمس! بیگم! عدنان اتنا بھی گھٹیا نہیں ہے ورنہ اگر وہ چاہتا تو اسے مری کے اس تنہا بچے میں من مانی کرنے سے کون روک سکتا تھا؟ اس نے نہ جانے کن جذبات کی رو میں بہہ کر وہ بات کہہ دی تھی اور اسے خود بھی اپنی کبی ہوئی بات کے گھٹیا پن کا احساس ہو گیا تھا۔ اس لیے تو اس نے تم سے معافی مانگی تھی۔ وہ بے چارہ نہ جانے کس ذہنی کیفیت میں تھا لیکن اس نے تمہاری عزت کو داغ دار نہیں کیا۔“

میں نے اس پہلو سے غور کیا تو مجھے عدنان اتنا برا نہیں لگا لیکن اس کے باوجود مجھے یہ افسوس تو تھا ہی کہ اسے مجھ سے ایسی بات کرنے کی جرأت بھی کیسے ہوئی۔

میں سب کچھ ذہن سے جھٹک کر پھر اپنے روزمرہ کے معمولات میں مصروف ہو گئی۔ انکل جمیل حسب معمول اسلام آباد کا چکر لگاتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے مجھے مری بھی لے جانا چاہا لیکن مجھے تو اب مری کے نام ہی سے خوف آنے لگا تھا، ویسے میں نے مصروفیت کا بہانہ بنا کر انکار کر دیا۔

انہی دنوں ہماری یونیورسٹی میں ایک نئی لیکچرر سعدیہ آئی۔ وہ تقریباً میری ہی ہم عمر تھی اور اس کی پسند بھی مجھ سے ملتی جلتی تھی۔ میں جلد ہی اس سے بے تکلف ہو گئی۔ وہ بہت پیاری اور خلص لڑکی تھی۔

ہم دونوں ایک دوسرے کے گھر بھی چلے جاتے تھے۔ وہ راو پینڈی میں رہتی تھی۔

میری طرح اس کے والد کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ اس

کے علاوہ صرف ایک بھائی تھا جو بیرون ملک چارٹرڈ اکاؤنٹنسی کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔

ایک دن سعدیہ آئی تو بہت خوش تھی۔ وہ آتے ہی مجھ سے بولی ”شمس! آج میرا بھائی فرخ واپس آ رہا ہے۔ تم کہتی تھیں تاکہ جو ایک دفعہ امریکا یا یورپ چلا جائے، مشکل ہی سے لوٹتا ہے۔ دیکھ لو، میرے بھائی نے تمہارا خیال غلط ثابت کر دیا۔“

ایک دن یونیورسٹی میں سعدیہ کے بھائی فرخ سے بھی ملاقات ہو گئی۔ وہ بھی سعدیہ کی طرح خوبصورت تھا، کشادہ پیشانی، روشن آنکھیں، سیاہ بھونرے کی طرح چمک دار بال اور دراز قد! مجھے وہ پہلی ہی نظر میں اچھا لگا۔

پھر ایک دن سعدیہ اپنی امی کے ساتھ ہمارے گھر آئی اور بولی ”آئی! آج میں آپ سے کچھ مانگنے آئی ہوں۔“

”ارے بیٹا! پورا گھر ہی تمہارا ہے۔“ امی نے مسکرا کر کہا ”غیروں کی طرح مانگو مت، بلکہ جو چیز اچھی لگے، لے جاؤ۔“

”آئی! وہ کوئی چیز نہیں بلکہ آپ کی بیٹی ہے۔ میں اسے اپنے بھائی فرخ کے لیے مانگنے آئی ہوں۔“

امی بھی فرخ کو ایک دوسرے دیکھ چکی تھیں اور اس کی شرافت اور دیانت سے بہت متاثر تھیں۔ اسے پاکستان آتے ہی ایک فرم میں بہت اچھی ملازمت مل گئی تھی۔ کمپنی کی طرف سے اسلام آباد میں بنگا بھی ملا تھا اور گاڑی بھی۔

امی نے میری توقع کے مطابق اسے بھی یہی جواب دیا کہ اس کا فیصلہ تو جمیل بھائی اور عدنان کریں گے۔

سعدیہ انکل جمیل سے تو واقف تھی لیکن میں نے اس کے سامنے کبھی عدنان کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ اس واقعے کے بعد سے میں نے عدنان کو اپنے پسندیدہ لوگوں کی فہرست سے خارج کر دیا تھا۔

”یہ عدنان کون ہے؟“ سعدیہ نے حیرانی سے کہا۔

”تمہیں شمس نے عدنان کے بارے میں نہیں بتایا؟“

بھی عدنان میرا بھانجا ہے۔ سعدیہ تو اسے بالکل بڑے بھائیوں کی طرح چاہتی ہے۔“

”یعنی تمہیں فیصلہ انکل جمیل اور عدنان بھائی کریں گے؟“

”ای! عدنان بھائی کے پاس اتنا وقت کہاں ہوگا۔ انکل جمیل کو اطلاع دے دیں۔“ میں نے ان لوگوں کے جانے کے بعد کہا۔

انگل جمیل نے یہ سنتے ہی کہا ”میں آج کل کاروباری وجہ سے بہت مصروف ہوں۔ تم ایسا کرو کہ فرخ کو کراچی بھیج دو۔“

اب فرخ بھی مجھ سے کچھ بے تکلف ہو گیا تھا۔ وہ ایک دفعہ سعدیہ کو لینے یونیورسٹی آیا تو بولا ”یار سعدیہ! لوگ تو اپنے کاموں کے لیے اسلام آباد کی طرف بھاگتے ہیں، مجھے کراچی جا کر انٹرویو دینا ہوگا۔“

”اور اس انٹرویو میں پاس ہونا بھی شرط ہے۔“ میں نے فرخ کو مخاطب کیے بغیر سعدیہ سے کہا۔

”ٹھیک ہے بھئی۔“ فرخ نے کہا ”ایک انٹرویو اور سہی۔“

انہی دنوں ہماری یونیورسٹی کی لڑکیوں اور کچھ لکچرز کا کراچی جانے کا پروگرام بن گیا۔

سعدیہ نے فرخ سے کہا کہ وہ بھی کراچی پہنچ جائے لیکن انگل جمیل کو ہماری آمد کے بارے میں نہ بتائے، سر پرانز رہے گا۔“

لیکن امی نے یہ سر پرانز رہنے ہی نہیں دیا۔ انہوں نے نہ صرف انگل جمیل کو فون کر کے ہماری آمد کے بارے میں بتا دیا بلکہ یہ بھی بتا دیا کہ فرخ بھی آپ سے ملاقات کے لیے آرہا ہے۔ اور تو اور انہوں نے عدنان کو بھی اطلاع دے دی۔

ہم لوگ کراچی پہنچے تو وہاں کراچی یونیورسٹی کے گریجویٹ ہاسٹل میں ہمارا قیام تھا۔

وہاں سے آنے والی ہر لڑکی کو سمندر دیکھنے کا شوق ہوتا ہے۔ ہم سہ پہر کے وقت سی سائڈ کی طرف چل دیے۔

میں تو خیر پہلے بھی بہت دفعہ کراچی آچکی تھی اس لیے لہروں کے شور سے جلد ہی بیزار ہو گئی۔ دوسری لڑکیاں اور لکچرز نہایت خوب انجوائے کر رہی تھیں۔

شام کا ہلکا ہلکا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ ہم اس وقت کلفٹن کے ساحل پر تھے۔ وہاں سے کچھ فاصلے پر ہماری کوسٹر کھڑی تھی۔ میں نے سعدیہ سے کہا ”میں بہت تھک گئی ہوں اس لیے بس میں جا کر بیٹھتی ہوں۔ تم لوگ بعد میں آ جانا۔“

میں یہ کہہ کر اپنی کوسٹر کی طرف بڑھی۔ اس کے سامنے ہی ایک ٹویٹا ہائی ایس کھڑی تھی۔ میں اس کے سامنے سے گزرنے لگی تو اچانک اس کا سلائڈنگ دروازہ کھلا اور دو آدمیوں نے انتہائی سرعت سے مجھے اندر کھینچ لیا اور فوراً ہی دروازہ بند ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی گاڑی حرکت میں آ گئی۔

میں نے چیخا چاہا تو ان میں سے ایک نے میرے منہ پر رومال رکھ دیا۔ اس کی تیز بو سے مجھے چکر سا آ گیا اور میں فوری طور پر ارد گرد سے بے خبر ہو گئی۔

میں نے کیمسٹری میں ایم ایس سی کیا تھا اس لیے مجھے معلوم تھا کہ انہوں نے مجھے کلوروفارم سنگھ دیا ہے۔ میری آنکھ کھلی تو میں اس وقت بھی گاڑی میں تھی۔ شاید کلوروفارم کی مقدار کم تھی یا پھر میں نے سانس روک لی تھی کہ اس کا اثر اتنی جلدی زائل ہو گیا تھا۔

میں نے کن آنکھوں سے گاڑی کا جائزہ لیا۔ میں گاڑی کی عقبی نشست پر بیٹھی تھی۔ مجھ سے آگے والی سیٹ پر دو بد معاش قسم کے آدمی بیٹھے تھے۔ جو آپس میں قس قس مذاق کر رہے تھے۔ میں نے ان پر یہ ظاہر نہیں کیا کہ میں ہوش میں آ گئی ہوں۔

تھوڑی دیر بعد گاڑی ایک بنگلے کے سامنے رکی۔ اس کے عین سامنے ایک شاوی ہال تھا۔ اس کے برابر میں پی ایس او کا پٹرول پمپ تھا۔

میں صرف اتنا ہی دیکھ سکی پھر بنگلے کا گیٹ کھل گیا اور گاڑی اندر داخل ہو گئی۔

ان میں سے ایک آدمی نے مجھے کندھے پر اٹھالیا اور بولا ”یار، یہ استاد بھی عجیب آدمی ہے۔ اس بنگلے سے چند منٹ کی دوری پر تھا نہ ہے۔ اگر.....“

”تیری جان کیوں نکلی جا رہی ہے۔“ دوسری آواز آئی۔ ”تھانے والوں کو کون بتائے گا کہ یہاں کوئی لڑکی موجود ہے۔ یہ تو سینٹ شیراز احمد کا بنگلا ہے۔ وہ ملک سے اکثر باہر رہتے ہیں۔ کسی پولیس والے کی کیا مجال کہ اس کا رخ بھی کر سکے۔“

ان لوگوں نے مجھے ایک آرام دہ بیڈ پر لٹا دیا۔ پھر اس آدمی کی آواز سنائی دی جو دوسرے آدمی کو لعنت ملا مت کر رہا تھا ”اس کے بیک کی تلاشی لے اور سیل فون نکال لے۔“ انہوں نے میرے بیک سے سیل فون نکال لیا۔

”کمرے میں موجود سیل فون سیٹ بھی نکال کر باہر لے جا۔“ وہی آواز پھر سنائی دی۔

پھر مجھے دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا، وہاں اب کوئی موجود نہیں تھا۔

میرے پاس دو سیل فون تھے۔ دوسرا انتہایت نفیس اور چھوٹا تھا اس لیے وہ سیل فون بی پرس کے اندرونی خانے میں رکھتی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں تھا کہ وہ پرس میں تھا یا میں

نے چلتے وقت اسے ہماری میں رکھ دیا تھا۔

میں نے دروازہ اندر سے بولٹ کیا اور اپنے پرس کی تمام چیزیں بیڈ پر الٹ دیں۔

پرس میں دوسرا سیل فون دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے مجھے دنیا جہاں کی دولت مل گئی ہو۔ اس کی میٹری پوری طرح چارج نہیں تھی لیکن اتنی تو بہر حال تھی کہ میں پولیس کو اطلاع دے سکتی۔

میں نے سیل فون پر ون فائیو کا نمبر ملا یا اور انہیں بتایا کہ مجھے کچھ لوگوں نے اغوا کر لیا ہے پھر میں نے انہیں اندازے سے وہ جگہ بتائی جہاں مجھے قید کیا گیا تھا۔ اسی وقت میرے سیل فون کی میٹری جواب دے گئی۔

اچانک باہر سے فائرنگ کی آواز آئی۔ پھر کوئی دوڑتا ہوا میرے کمرے تک آیا اور باہر سے کنڈی کھول دی۔ دروازہ اندر سے بھی بند تھا۔ آنے والا تیز لہجے میں بولا۔

”شمسہ! جلدی دروازہ کھولو۔“ وہ آواز سن کر میں پتھر اکر رہ گئی۔ وہ آواز عدنان کی تھی۔ گویا اسی نے مجھے اغوا کیا تھا۔ میں نے دروازہ نہ کھولنے کا ارادہ کر لیا۔

”شمسہ! جلدی کرو۔ وہ لوگ کسی بھی وقت واپس آ سکتے ہیں۔ ابھی تو صرف ایک آدمی تھا جسے میں نے زخمی کر دیا ہے۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”شمسہ..... اور دروازہ.....“ اس کی آواز گاڑی کے انجن کے شور میں دب گئی۔ پھر دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں آئیں اور فائرنگ ہونے لگی۔

اچانک مجھے عدنان کی کرب ناک چیخ سنائی دی۔ وہ کراہتے ہوئے بولا ”شمسہ! اب دروازہ مت..... کھولنا.....“

اب..... دروازہ..... اس کی آواز اچانک خاموش ہو گئی۔ فائرنگ بھی کچھ دیر میں رک گئی۔ پھر کوئی غرا کر بولا۔

”دروازہ کھولو لڑکی ورنہ ام دروازہ توڑ دے گا۔ ام لوگ کے پاس اتنا ٹیم نہیں ہے۔“ میں خاموش بیٹھی رہی۔ دروازہ خاصا مضبوط تھا۔ وہ فوری طور پر تو اسے توڑ نہیں سکتا تھا۔ پھر مجھے ایک امید یہ بھی تھی کہ ممکن ہے پولیس یہاں پہنچ ہی جائے۔ اب تو ان لوگوں نے فائرنگ کی آوازیں بھی سن لی ہوں گی۔ اچانک پھر مجھے ایک گاڑی کی آواز سنائی دی، پھر

خاموشی چھا گئی۔

کچھ دیر خاموشی کے بعد پھر وہاں فائرنگ شروع ہو گئی اور کوئی میگا فون پر چیخا ”تم لوگ چاروں طرف سے گھر چکے ہو، اس لیے خاموشی سے ہتھیار چھینک دو اور باہر نکل آؤ۔“ پھر وقت گزرتا رہا، شاید دس یا پندرہ منٹ بعد میرے دروازے کے باہر ہماری یونٹوں کی آوازیں سنائی دیں اور کوئی بولا ”دروازہ کھولو۔ میں پولیس انسپکٹر رانا نعیم ہوں۔ اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ہم نے تمام مہمان گرفتار کر لیے ہیں۔“

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ کھول دیا۔ میرے سامنے ہی پولیس کا ایک انسپکٹر کھڑا تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر کوئی آدمی خون میں لت پٹ پڑا تھا اور یہ مشکل سانس لے رہا تھا۔

ایک سپاہی نے کہا ”سرا یہ آدمی ابھی زندہ ہے، اسے اسپتال بھجوا دیں۔“

پولیس انسپکٹر اس شخص کی طرف متوجہ ہوا، اسی وقت میری نظر اس پر پڑی تو میرا دل اچھل کر گویا حلق میں آ گیا، وہ عدنان تھا۔

اس نے مجھے دیکھ کر بہ مشکل تمام کہا ”خدا..... کا..... لاکھ..... لاکھ شکر ہے..... شمسہ..... کہ..... تم.....“

”حوالدار!“ سب انسپکٹر نے کہا ”پہلے اس کا بیان لے لو، ایسولنس آنے تک ہم اس کا بیان تو لے ہی سکتے ہیں۔“

پھر جو کچھ اگلتے ہوئے کرب آمیز انداز میں عدنان نے بتایا، اس کا لب لباب یہ تھا کہ میں اپنے کسی کام سے اس طرف گیا تھا۔ وہاں میں نے اچانک شمسہ کو دیکھا۔ وہ اس وقت کوسٹر میں بیٹھنے کے لیے تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔

اچانک ہی اسے ایک ٹویٹا ہائی ایس میں کھینچ لیا گیا تو میں گھبرا گیا اور میں بھی اس گاڑی کے پیچھے روانہ ہو گیا۔

وہ گاڑی نارتھ ناظم آباد کے ایک بنگلے پر آ کر رکی۔ وہ بنگلا غیر آباد نہیں لگتا تھا۔ گیٹ پر کسی کے نام کی تختی بھی لگی تھی لیکن اس کے حروف کچھ مٹ سے گئے تھے اس لیے پڑھے نہیں جا رہے تھے۔

اسی وقت بنگلے سے وہ ٹویٹا ہائی ایس برآمد ہوئی اور ایک طرف روانہ ہو گئی۔ اس وقت یہ ظاہر دروازے پر صرف ایک مسلح چوکیدار تھا۔

ہو گئے۔ جیل سے نہیں بلکہ زندگی کی قید سے..... اب تو میں
یہی کہہ سکتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے۔

انہوں نے اچانک میرے ہاتھ پر جھپٹا مارا لیکن یو ایس ٹی ان کے ہاتھ میں نہیں آئی۔

میں ان کی اس بات پر خوش ہو گیا۔ گویا انہیں اس شادی

عدنان بھائی یہ بیان دے کر یوں ہانپنے لگے جیسے میلوں
مافقت دوڑتے ہوئے طے کی ہو۔

میکے لے وش

جناب مدیر اعلیٰ
سلام تہنیت

میں نے پہلی بار ایک کہانی لکھی ہے۔ اس کہانی کا ہر لفظ سچ ہے۔ صرف کہانیت پیدا کرنے کے لیے میں نے واقعات کو آگے پیچھے کیا ہے کیونکہ یہ ایک مشہور واقعہ ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اس کہانی میں شامل کرداروں اور شہر کے نام میں کسی سے مماثلت نہ آنے پائے۔ یہ کہانی شائع ہو جائے تو شاید امجد اور ارشد کی روح کو قرار آجائے۔

ضیا الرحمن صدیقی
(نوشہرہ)

کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس کے ہونہار اور معصوم بھائی کو جلی پولیس مقابلے میں مار دیا گیا تھا اور وہ بھی ڈاکو قرار دے کر۔ اس شام بھی وہ اپنی کتابیں لے کر ٹیوشن سینٹر گیا ہوا تھا۔ راستے میں ایک پولیس موہاں کھڑی ہوئی تھی۔ جس کا انچارج نواز شاہ نام کا ایک پولیس آفیسر تھا۔ ان لوگوں نے تلاشی لینے کے لیے امجد کو روک لیا اور شاید امجد سے کچھ بدتمیزی بھی کی۔

یہ باتیں اس سوچی سے معلوم ہوئی تھیں جو وہیں قریب میں بیٹھا کرتا تھا۔ اس المناک واقعے کے بعد ارشد نے خود وہاں جا کر اپنے طور پر نفیث کی تھی۔ تو اس سوچی نے اسے یہ باتیں بتائی تھیں لیکن پولیس کے خوف سے اس نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ کسی اور کے سامنے بیان نہیں دے گا۔

اس نے یہ بتایا کہ جب پولیس والے نے امجد سے بدتمیزی کی تو اس نے شاید کچھ کہا ہوگا۔ جس پر نواز شاہ نے

”واہ بقرط بھائی۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ میری سفارش کام آئے گی؟“
”کیوں نہیں کیونکہ بقرط تو میں ہوں لیکن غلطی سے گھر والے تمہیں بقرط سمجھتے ہیں۔“

”یہ بات تو ہے۔“ ارشد نے اپنی گردن اٹھالی۔
”پھر تو میں ضرور ہونے والی بھائی سے ملوں گا۔“
ناظم بہت اچھی لڑکی تھی۔ اس کے بھائی امجد کی طرح۔ سیدھی سادی اور پڑھا کو قسم کی۔ نہ جانے کس طرح ان دونوں کے دلوں میں پیار کا جذبہ جاگ اٹھا تھا۔

ارشد کو اپنے بھائی پر بہت پیار آیا کرتا۔ اسے یقین تھا کہ اس کا ہونہار بھائی اپنی منزل حاصل کر لے گا۔ وہ منزل جو بڑے بڑے سرکاری آفیسر کی ہوتی ہے۔ محبت بھری زندگی کی ہوتی ہے۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہو سکا۔

اس گھر پر ایک قیامت ٹوٹ پڑی۔ ایسی قیامت جس

”چاہئے۔“
”اور تمہاری منزل کیا ہے بقرط بھائی؟“

”مقابلے کے امتحان میں فرسٹ پوزیشن حاصل کرنا۔ تم دیکھ لینا کہ میں یہ کر کے دکھاؤں گا۔ کیونکہ میری تیاری بہت شاندار ہے۔“
”اور تم یہ چاہتے ہو بقرط بھائی کہ میں تمہارے نقش قدم پر چلوں۔“

”ہاں۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگے گا نا کہ میں تو کشتربنا ہوا ہوں اور میرا بھائی میرا ہی چہرہ اسی ہے۔“
”ارے جاؤ۔“ ارشد چڑ جاتا۔ ”میں بھی اپنی منزل حاصل کر کے رہوں گا۔“

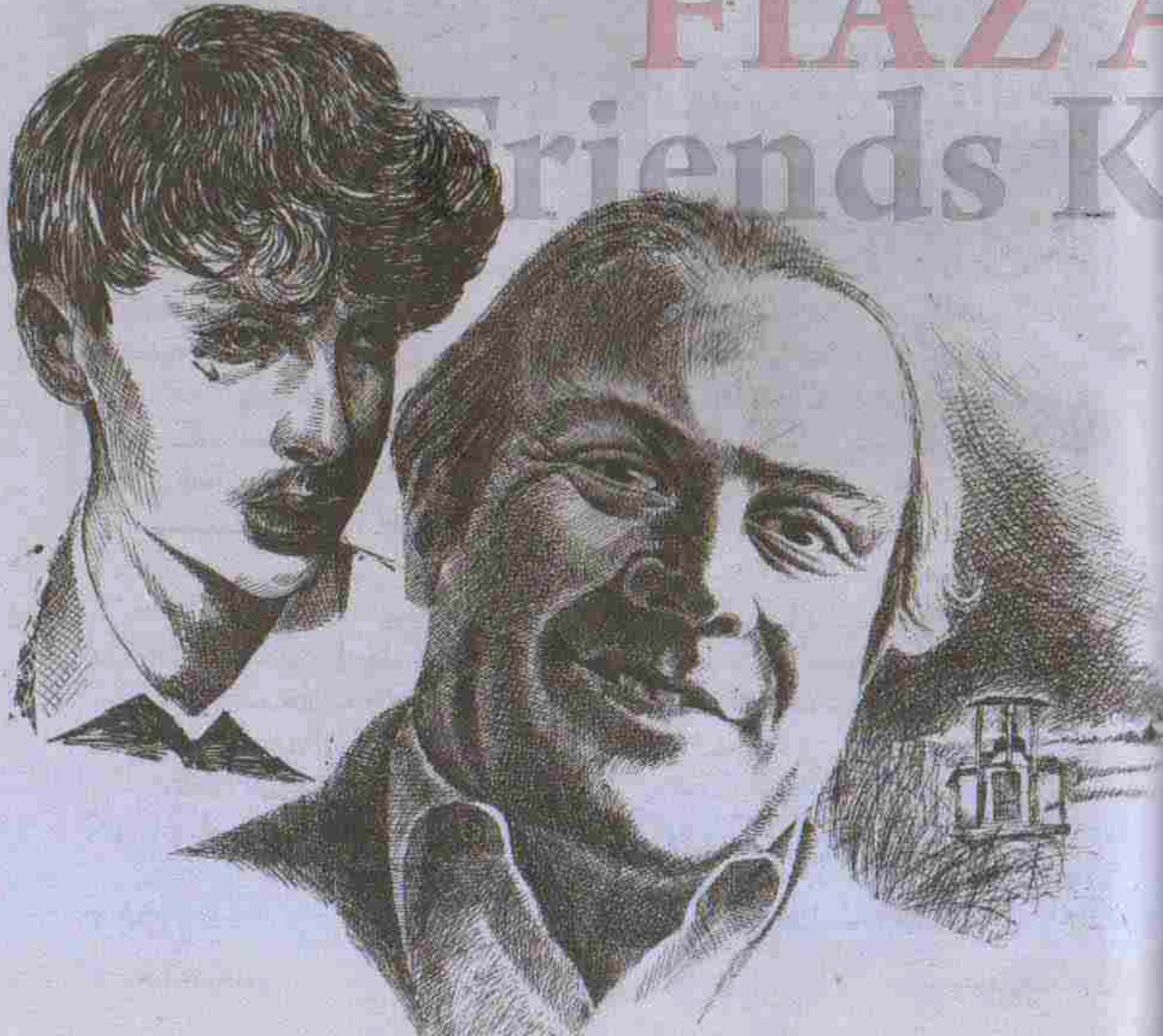
”یہ ابھی نہیں سوچا ہے بقرط بھائی۔ بس جس دن سوچ لیا سب سے پہلے تم ہی کو بتاؤں گا۔“
دونوں بھائیوں میں احترام کا رشتہ بھی تھا۔ پیار بھی تھا اور بے تکلفی بھی تھی۔ اس لیے امجد نے اپنے پیار کی داستان ارشد کو سنائی تھی۔ ”ارشد۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے یار۔ میری طرف دیکھتی رہتی ہے۔“

”ارے واہ۔“ ارشد نے تالیاں بجانے شروع کر دیں۔ ”میرے بقرط بھائی کو پیار ہو گیا۔ پیار ہو گیا۔“
”بکواس بند کرو۔“ امجد نے کہا۔ ”میں یہ چاہتا ہوں کہ تم بھی ایک نظر اسے دیکھ لو۔ پھر ماں اب اسے میری سفارش کر دینا۔“

اسے معلوم تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ موت۔ جو بلڈ کیسری صورت میں بہت تیزی سے اس کی طرف آرہی تھی۔ وہ جب اپنے ماں باپ کے اداس چہروں کو دیکھتا تو بیٹھ کر رہ جاتا۔ اس کا دل چاہتا کہ وہ چیخ چیخ کر اپنے خدا سے شکوہ کرے کہ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے۔ بد قسمتی کسی ایک فرد یا ایک گھر کو کیوں اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے؟
صرف تین مہینے پہلے اس کے گھر میں ایک ایسا سانحہ ہو چکا تھا جس نے اس گھر کی بنیادیں تک ہلا کر رکھ دی تھیں۔ اس کے والدین کی دو اولادیں تھیں۔ دو بیٹے۔ امجد اور ارشد۔

امجد بڑا تھا۔ بہت ہوشیار قسم کا نوجوان۔ جس نے اپنے آپ کو صرف تعلیم کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ ہر وقت کتابیں۔ اسی لیے اس کی آنکھوں پر ایک موٹی سی عینک لگ گئی تھی۔ گھر والے اسے بقرط کہہ کر چھیڑا کرتے۔ خاص طور پر ارشد۔ ”بقرط بھائی۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ ٹیوشن نے کٹش ٹل کا اصول دریافت کیا۔ لیکن اس دریافت سے پہلے لوگ کس طرح زمین پر کھڑے رہتے تھے۔“

امجد ز پر لب مسکراتا۔
دونوں بھائیوں میں بے انتہا محبت تھی۔ امجد بڑھائی کے معاملے میں کسی قسم کی رعایت کا قائل نہیں تھا۔ ”دیکھو ارشد۔ جو میری منزل ہے وہی تمہاری منزل ہونی



”بھائی کی موت نے مجھے اچانک بہت بڑا کر دیا ہے۔“

ارشاد ماں باپ کے سامنے تو خود پر جبر کئے رہتا۔ کبھی کبھی مسکرا بھی دیتا۔ بس بھی لیتا۔ زندگی کے معاملات میں دلچسپی بھی لینے لگا تھا لیکن تہائی امجد کی یادوں کو اس کے سامنے لے آتی۔ وہ چپکے چپکے اس سے باتیں کیا کرتا۔ ”بقراط بھائی۔ آخر تمہیں جانے کی اتنی کیا جلدی تھی۔ اس پولیس والے سے کہا تو ہوتا کہ دیکھو مجھے نہ مارو۔ مجھے ابھی پڑھنا ہے۔ ترقی کرنی ہے۔ اس ملک کی خدمت کرنی ہے اور ہاں۔ اسے یہ بھی بتاتے کہ تمہیں ابھی ابھی ایک اچھی لڑکی کی محبت ملی ہے۔ تم مجھے مارو گے تو وہ.... بے چاری تمہارا انتظار کرتی رہ جائے گی۔“

”یہ سب کہنا تھا نا بھائی۔ لیکن تم نے اس سے کہا ہی نہیں ہوگا۔ بس چپ چاپ گولی کھا کر مر گئے ہو گے۔ کیوں؟“

اس کا مر جانے والا بھائی ابھی تک اس کا دوست تھا۔ ارشد نے اپنے بقراط بھائی کی ساری کتابیں سنہال کر رکھی ہوئی تھیں۔ کسی کو ہاتھ بھی لگانے نہ دیتا تھا۔ مگر والے اب اس کی حالت.... دیکھ کر افسوس کیا کرتے تھے۔ پھر اس کی طبیعت خراب رہنے لگی۔

ممكن تھا کہ یہ خرابی بہت پہلے سے اس میں موجود ہو۔ لیکن اب اور زیادہ ہو گئی تھی۔ رنگ زرد ہو گیا تھا۔ کھانا ہضم نہیں ہوتا تھا۔ ان کے علاوہ اور بھی ایسی کئی علامات تھیں۔ جو صورت حال کو تشویش ناک ظاہر کر رہی تھیں۔

گھر والوں کا خیال تھا کہ بھائی کی موت کے صدے نے اس کی صحت خراب کر دی ہے۔ اسے ہر طرح سنبھالنے اور اس کا خیال رکھنے کی کوششیں ہونے لگیں لیکن اس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

پہلے اسے مقامی ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا اور جب اس کی سمجھ میں نہیں آ سکا تو اس نے ایک ماہر کے پاس بھیج دیا تھا۔ کئی طرح کے ٹیسٹ کے بعد اس کے گھر والوں کو یہ بتا دیا گیا کہ وہ بلڈ کیفر کا مریض ہے اور اس کی زندگی کے دن بہت کم رہ گئے ہیں۔

امجد کی موت نے اس گھر میں سناٹا مچا دیا تھا اور اب ارشد بھی جانے والا تھا۔

ارشاد سے یہ خبر چھپی نہیں رہ سکی تھی۔ کچھ دیر تک وہ سناٹے میں رہا تھا۔ پھر اس نے ہنسنا شروع کر دیا۔ ”اسے

اسے تھپڑ مار دیا تھا۔“

پھر کھانے کے بعد امجد نے احتجاج کیا تھا کیونکہ اس جیسے شریف قسم کے نوجوان طالب علم کی یہ توہین تھی کہ اس طرح سر عام بغیر کسی سبب کے اسے مارا جائے۔

اس پر نواز شاہ نے اس پر گولی چلا دی تھی اور وہ وہیں تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی نواز شاہ نے اپنے ایک ساتھی پولیس والے سے پستول لے کر دو گولیاں موبائل پر بھی مار دی تھیں تاکہ یہ ثابت کیا جاسکے کہ اس ڈاکو نے بھی پولیس والوں پر گولیاں چلائی تھیں اور خود مقابلے میں مارا گیا تھا۔

یہ خبر جب گھر پہنچی تو ایک کہرام مچا گیا تھا۔ یہ یقین کرنے والی بات ہی نہیں تھی کہ امجد جیسا شریف نوجوان ڈاکو بھی ہو سکتا ہے۔

پورا محلہ سراپا احتجاج بن گیا تھا۔ سب رو رہے تھے۔ امجد ایسا ہی لڑکا تھا۔ محلے کے نہ جانے کتنے لڑکوں کو اس نے معاذ خے کے بغیر تعلیم دی تھی۔ پورا محلہ اس کے حق میں گواہی دے رہا تھا۔

اس واقعے کی شہرت بھی ہو گئی تھی۔ اخبارات نے خوب شور مچایا تھا۔ چیمبرل والے وادیا کرتے رہے تھے لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔

پولیس والوں نے اپنے دو چار گواہ لاکر کھڑے کر دیے تھے۔ نواز شاہ کو صاف بچا لیا گیا تھا۔ صرف اتنا ہوا تھا کہ اس کا تادلہ کہیں اور کر دیا گیا تھا۔ بس اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوا تھا۔

ارشاد کے لیے تو یہ اتنا بڑا سانحہ تھا کہ اسے چپ لگ گئی تھی۔ اس کے بقراط بھائی کو اس سے چھین لیا گیا تھا۔ امجد نہ صرف اس کا بھائی تھا بلکہ اس کا دوست بھی تھا۔ وہ نالکہ کو دیکھا کرتا جس کی آنکھوں میں ہر وقت آنسو رہا کرتے تھے۔

وہ ارشد سے کہتی۔ ”ارشاد۔ ایک بات بتاؤ۔ کیا کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ محبت اس طرح اچانک پھٹ جائے۔“

”ہاں۔ میرے بھائی کے ساتھ ایسا ہی ہوا ہے۔“

ارشاد جواب دیتا۔ ”میرا بھائی فرشتہ تھا۔ اسی لیے خدا نے اسے بہت جلدی آسمان پر بلا لیا کیونکہ ایسے لوگوں کو زمین پر نہیں رہنا چاہیے۔“

”ارشاد۔ تم کیسی گہری باتیں کرنے لگے ہو۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔“

کہتے ہیں محبت۔ بقراط بھائی کے جانے کے بعد میرا دل نہیں لگ رہا تھا۔ اسی لیے بقراط بھائی نے مجھے اپنے پاس بلانے کی سفارش کی ہوگی۔“

گھر والوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی۔ صرف تیرہ یا چودہ برس۔ اس نے ابھی دیکھا ہی کیا تھا اور زندگی اس کی گرفت سے نکلنے والی تھی۔

نالکہ کو بھی یہ معلوم ہو گیا تھا۔ وہ ارشد کے پاس آ کر بہت دیر تک روتی رہی تھی۔ ”ارے۔ آپ کیوں رو رہی ہیں؟ یہ تو سب کے ساتھ ہوتا ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ میرے ساتھ ذرا جلدی ہو رہا ہے۔“

نالکہ ہمیشہ کی طرح اس سے یہ بھی نہیں کہہ سکی کہ ارشد تم بہت بڑی بڑی باتیں کرنے لگے ہو۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ وہ یہ نہیں کہہ سکی۔ وہ صرف روتی رہی تھی۔

ڈاکٹر نے اس کے گھر والوں سے کہا تھا کہ وہ اس کی خواہش پوری کرنے کی کوشش کریں۔ جہاں جانا چاہے جائے جو کھانا چاہے کھانے دیں۔

ارشاد کے ماموں زاد بھائی صابر حسین نے ارشد کو سیر تفریح کرانے کی ذمہ داری اپنے ذمے لے لی۔ ”ہاں۔ تو میرا بھائی کہاں کہاں جائے گا؟“

”ہر جگہ۔“ ارشد نے کہا۔ ”بھیا۔ میں نے آج تک چڑیا گھر نہیں دیکھا۔“

”ارے واہ۔ آج تک نہیں گئے۔“

”نہیں۔ آج تک نہیں گیا۔ ایک بار اسکول والے لے جا رہے تھے تو میں بیمار پڑ گیا تھا۔“

”تو چلو۔ آج چلتے ہیں۔“

ارشاد کو چڑیا گھر میں بہت اچھا لگا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں کبھی اتنے جانور نہیں دیکھے ہوں گے۔ وہ دونوں تفریح کرتے پھر رہے تھے کہ اچانک ارشد کو اپنا بقراط بھائی دکھائی دے گیا۔

اس کا وہ بقراط بھائی چڑیا گھر کے ہنگاموں سے الگ تھلک ایک بڑے درخت کے نیچے ایک موٹی سی کتاب لیے بیٹھا تھا۔ ہمیشہ کی طرح۔ یہی تو اس کی عادت تھی۔ ماحول سے بے نیاز ہو کر اپنی کتاب دیکھتے رہتا۔ وہ کہا کرتا تھا۔ ”چھوٹے بھائی۔ میں اپنی آج کی تفریح اپنے آنے والے کل کے لیے قربان کر رہا ہوں کیونکہ مجھے اپنا فوچر شاندار بنانا ہے۔“

اس وقت اس کا وہی بقراط بھائی ایک درخت کے نیچے

ایک موٹی سی کتاب لیے اپنا فوچر بنا رہا تھا۔ ارشد کو اس طرح کرتے ہوئے دیکھ کر صابر بھی اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

”صابر بھائی۔ یہ دیکھو میرے بقراط بھائی۔ یہ پوری دنیا سے چھپ کر یہاں آ کر بیٹھ گئے ہیں۔“

”نہیں ارشد۔ چلو آگے چلتے ہیں۔“ صابر نے کہا۔

”صابر بھائی۔ میں اپنے بقراط بھائی سے ملنا چاہتا ہوں۔“ ارشد ضد کرنے لگا تھا۔ ”نہ جانے کیوں اس کو دیکھ کر بہت اچھا لگ رہا تھا۔ بہت سکون مل رہا ہے مجھے۔“

”چلو۔ اگر تم اس سے ملنا ہی چاہتے ہو تو میں اس سے بات کروادوں گا۔“

”کیا آپ اسے جانتے ہیں صابر بھائی۔“

”نہیں بھائی۔ میں کیسے جان سکتا ہوں۔ میں تو تمہارے لیے کہہ رہا ہوں۔“

”میں اس سے خود ہی بات کر لوں گا۔“

ارشاد دوڑتا ہوا اس نوجوان کے پاس پہنچ گیا۔ اسے یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی تھی کہ وہ نوجوان اس کے بقراط بھائی کی طرح تو نہیں تھا۔ پھر بھی کسی حد تک اس کی طرح تھا۔ یہ بھی اپنے انداز سے ذہین دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے بھی صنگ لگا رکھی تھی اور پڑھتے وقت اس کے ہونٹوں پر ویسی ہی ہلکی مسکراہٹ تھی جیسی اس کے بقراط بھائی کے ہونٹوں پر ہوا کرتی تھی۔

ارشاد اس نوجوان کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے بڑے ادب سے اسے سلام کیا تھا۔ نوجوان سلام کا جواب دے کر حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

”کیا میں آپ کو بھائی کہہ سکتا ہوں؟“ ارشد نے اس کے پاس بیٹھ کر پوچھا۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔“ اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔ ”کیا نام ہے تمہارا؟“

”ارشاد۔ اور آپ کا کیا نام ہے؟“

”دانش۔“ اس نوجوان نے بتایا۔

”واہ۔ یہ بات ہوئی نا۔ دانش۔ یعنی عقل۔ سمجھداری۔ جیسے آپ ہیں ویسا ہی آپ کا نام بھی ہے۔“

اس نوجوان کو ارشد کی باتیں اچھی لگ رہی تھیں۔ اس طرح صابر حسین بھی ان کے قریب آ گیا تھا۔ ”صابر بھائی۔ یہ دانش صاحب ہیں۔“ ارشد نے تعارف کر دیا۔ ”میں نے کہا تھا کہ یہ بالکل میرے بقراط بھائی کی طرح ہیں۔“

”اور یہ بقراط بھائی کون ہیں؟“ دانش نے پوچھا۔

”میرے بھائی۔ میرے بڑے بھائی تھے۔“
”تھے سے کیا مطلب؟“

”وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔“ ارشد کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

”اوہ۔ افسوس ہوا سن کر۔“ دانش نے پیار سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”اب تم مجھ ہی کو اپنا بقرط بھائی سمجھو۔“

”تو پھر یہ وعدہ کریں کہ آپ مجھ سے ملتے رہیں گے۔“ ارشد نے کہا۔

”ہاں ہاں بھائی وعدہ۔ پکا وعدہ۔“
”پھر اپنا موبائل نمبر دے دیں۔ میں آپ کو فون کرتا رہوں گا۔“

دانش نے اسی وقت اپنا موبائل نمبر لکھ کر ارشد کو دے دیا تھا۔ جاتے ہوئے ارشد نے دانش کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ ”دانش بھائی۔ آپ کو میں بالکل اپنا بقرط بھائی سمجھنے لگا ہوں۔ میں ان سے جتنا پیار کرتا تھا۔ آپ سے بھی اتنا ہی پیار محسوس ہو رہا ہے۔“

”بالکل یہی حال میرا ہے میرے بھائی۔ تم بھی مجھے بہت اچھے لگے ہو۔ اب ہم ایک دوسرے سے ملتے رہیں گے اور میں تمہارے لیے تمہارا بقرط بھائی بن کر دکھائوں گا۔“
”تھینک یو۔“

گھر واپس آ کر اس نے سب کو یہ خبر سنا دی تھی کہ اسے بقرط بھائی مل گئے تھے اور بقرط بھائی نے بھی اس سے دوستی کر لی ہے اور یہ وعدہ کر لیا ہے کہ وہ اس کے پاس آتے رہیں گے۔

ڈاکٹر کو بھی یہ بات بتادی گئی تھی۔ ”یہ بہت اچھی بات ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میں یہ نہیں کہتا کہ اس قسم کی کوئی خوشی اس کی موت کو روک سکتی ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ زندگی کو جتنی بھی باقی رہ گئی کسی حد تک خوش گوار ضرور بنادے گی۔“

وعدے کے مطابق دانش ارشد سے ملنے آ گیا تھا۔ اس دن اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا حالانکہ اس دن اس کے اندر بہت توڑ پھوڑ ہو رہی تھی۔ بہت کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے باوجود اس نے دانش کو دیکھتے ہی اچھلتا شروع کر دیا تھا۔ گھر والوں کے منع کرنے کے باوجود وہ دانش کے لیے کیک لینے خود ہی چلا گیا تھا۔

”بیٹا۔ تم نے میرے ارشد کو ایک طرح کی زندگی دینی شروع کی ہے اس کے لیے میں تمہارا شکر یہ ادا کرتا ہوں۔“

”کیسی بات کرتے ہیں انکل۔ وہ میرے چھوٹے بھائی کی طرح ہے۔“ دانش نے کہا۔

”اسی لیے وہ تم سے پیار کرنے لگا ہے کہ تم اس کے مرحوم بھائی کی طرح ہو۔ اور شاید تمہیں یہ نہ معلوم ہو کہ خود ارشد بھی کچھ دنوں کے بعد مرحوم ہونے والا ہے۔“
”کیا۔“ دانش نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔
”میں نہیں سمجھا۔“

”بیٹا۔ ارشد کو بلڈ کینسر ہے اور ڈاکٹرز نے اس کی زندگی بہت کم بتائی ہے۔ کسی بھی لمحے موت اسے اپنے ساتھ لے جائے گی۔“

”او خدا! دانش نے اپنا سر تھام لیا تھا۔ ”اتنے پیارے بچے کا یہ انجام۔ ایسا مرض ہے اس کے ساتھ۔“
”ہاں بیٹا۔“

اس دوران ارشد ٹیکری سے کیک لے کر واپس آ گیا تھا۔ اسے دیکھ کر اس کی بیماری کے حوالے سے پھر کوئی بات نہیں کی گئی تھی۔

کچھ دیر بعد جب چائے کا سلسلہ ختم ہوا تو دانش نے ارشد کے والدین سے پوچھا۔ ”کیا میں اپنے چھوٹے بھائی کو اپنے ساتھ لے جا سکتا ہوں۔“

”کہاں بیٹا؟“
”یوں ہی سیر کرانے۔ سی دیو کی طرف۔ اگر آپ لوگوں کو مجھ پر بھروسہ ہو تو۔“

”بیٹا۔ ایسی کیا بات کر دی۔ یہ تمہارا بھائی ہے۔ جہاں بھی چاہے لے جاؤ اس کو۔“

دانش اپنے ساتھ اپنی ہائیک لے کر آیا تھا۔ دونوں بہت دیر تک سیر کرتے رہے تھے۔ پھر دانش نے ارشد کو اس کے گھر ڈراپ کر دیا تھا۔

”دانش بھائی۔ پھر کب ملیں گے؟“ ارشد نے رخصت کرتے ہوئے پوچھا۔

”کل۔“ دانش نے بتایا۔ ”میرے گھر والے بھی یہ سن کر بہت خوش ہیں کہ مجھے ایک چھوٹا بھائی مل گیا ہے۔“

”کیا۔ آپ کے بھائی بہن نہیں ہیں۔“
”نہیں۔ بد قسمتی یا خوش قسمتی سے میں اکیلا ہوں۔“
دانش نے بتایا۔ ”چلو گے نامیرے ساتھ؟“

”کیوں نہیں۔ اپنے بقرط بھائی کے گھر ضرور چلوں گا۔“
دوسری شام دانش اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

خوبصورت سا گھر تھا اس کا۔ اس نے ارشد کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا تھا۔

”اچھا بھائی۔ تم اب اطمینان سے یہاں بیٹھو۔ میرے ابو ابھی ڈیوٹی سے واپس آ کر نہا رہے ہیں۔ امی پڑوس میں گئی ہیں۔ وہ دونوں آج امیں تو پھر تم سے ملاقات ہوگی۔“
”او کے۔“

”میں جب تک تمہارے لیے ایک چیز لے کر آتا ہوں۔ میں نے سب ہی خرید لی تھی۔“
”وہ کیا ہے؟“

”تمہارا پسندیدہ چاکلیٹ کیک۔“ دانش نے بتایا۔
”ابھی لے کر آتا ہوں۔“

دانش کے جانے کے بعد ارشد نے ادھر ادھر لگا ہین دوڑائیں۔ بہت سیلفیے سے سجا ہوا ڈرائنگ روم تھا اور ایک دیوار پر فریم کی ہوئی تصویر بھی تھی۔

ارشد کو ایسا لگا جیسے اس کے جسم کا سارا خون اس کی کھوپڑی میں اتر آیا ہو۔ وہ اس پھرے کو ابھی طرح پہچانتا تھا۔ اخبار میں اس کی تصویریں بھی آپکی تھیں۔ ٹینس والوں نے دکھائی تھیں۔ یہ وہی پولیس آفیسر تھا۔ جس نے اس کے بقرط بھائی کو گولی ماری تھی۔

نواز شاہ نام تھا اس کا۔ اس کا نام اور اس کا چہرہ ارشد کے ذہن پر نقش ہو کر رہ گیا تھا۔

”اوہو۔ کیا میرے ابو تمہیں پسند آگئے ہیں کہ تم ان کی تصویر کو دیکھ جا رہے ہو۔“ دانش کی آواز آئی۔ وہ نہ جانے کب اس کے برابر میں آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ارشد کو اس کا احساس بھی نہیں ہو سکا تھا۔

”یہ۔ یہ تمہارے ابو ہیں؟“ ارشد نے پوچھا۔
”ہاں بھئی۔ لیکن تمہارا چہرہ کیوں زرد ہو رہا ہے۔ کیا ہو رہا ہے تمہیں؟“

”بقرط بھائی۔ میں۔ میں نہیں بیٹھ سکوں گا۔ میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔“ ارشد نے کہا۔ ”پلیز۔ آپ مجھے جلدی سے گھر پہنچا دیں۔“

”اچھا اچھا۔ پریشان نہ ہو۔ ابھی تم کو پہنچا دیتا ہوں۔“ دانش نے کیک کی پلیٹ میز پر رکھ دی تھی اور ارشد کو سہارا دیتا ہوا باہر لے آیا۔

اس نے ارشد کو ٹیکسی کے ذریعے اس کے گھر پہنچا دیا تھا۔

ارشد کی حالت دیکھ کر ایک بار پھر اس کے گھر میں رونا

دھونا شروع ہو گیا۔ پچھلے کچھ دنوں سے اس کی طبیعت سنبھلی ہوئی تھی۔ اس لیے انہیں اس کی طرف سے خوش فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں۔

لیکن اب وہ ایک بار پھر اس کے آس پاس موت کے سانے کو دیکھ رہے تھے۔ ارشد نے گھر آ کر کسی کو دانش کے باپ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے گھر والے اس کے بقرط بھائی سے بدگمان ہو جائیں۔ اس سے ملنا ختم کر دیا کیونکہ اس کا باپ ان کے بیٹے کا قاتل تھا اور ابھی تک اس کے خلاف کسی قسم کی کوئی کارروائی نہیں ہوئی تھی۔

اس کا چھوٹا سا ذہن بہت تیزی سے بہت کچھ سوچ رہا تھا۔ پھر اس نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ دانش کو بھی کچھ نہیں بتائے گا۔ وہ بہت اچھا ہے۔ خواہ خواہ وہ میرے سامنے شرمندہ ہوتا رہے گا۔

جو کچھ بھی ہوا۔ اس میں بے چارے دانش کا کیا قصور تھا۔ یہ سارا قصور تو اس کے باپ کا تھا۔

اس رات اس کی طبیعت اور بگڑ گئی۔ اسے فوری طور پر اسپتال میں داخل کر دیا گیا تھا۔ جہاں بلڈ ٹرانسفر کے مرحلے سے گزرنے کے بعد جتنی طور پر اس کی طبیعت کچھ بہتر ہو گئی تھی۔ لیکن کب تک؟

اس کے والدین کو ڈاکٹرز کو اور ارشد کو بھی یہ معلوم تھا کہ وہ اب زندہ نہیں رہے گا۔ موت کا فرشتہ اس کے سر ہانے آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ وہ ارشد کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔

اسی شام اسپتال میں اس کے پاس ایک مہربان چہرے والا شخص آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ارشد کے لیے پھول لے کر آیا تھا۔

”ارشد میاں تم تو مجھے نہیں جانتے ہو گے۔“ اس نے کہا۔ ”چلو۔ میں خود ہی اپنے بارے میں بتا دوں۔ میرا نام ظفر عالم ہے۔ میں ایک این جی او چلار ہا ہوں۔“

”اور یہ این جی او کیا ہوتا ہے؟“

”یہ ایک ادارہ ہوتا ہے۔ جو انسانی بھلائی کے لیے کام کرتا ہے۔“ ظفر عالم نے بتایا۔ ”اس کے مختلف شعبے ہوتے ہیں۔ کوئی قیدیوں کے لیے کام کرتا ہے۔ کوئی آوارہ بچوں اور بھکاریوں کے لیے کام کرتا ہے۔ کوئی کینسر کے مریضوں کے لیے کام کرتا ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ جس کو جہاں خدمت کا موقع ملتا ہے وہ خدمت کر رہا ہے۔“

”اور آپ کا ادارہ کیا کرتا ہے انکل؟“

”بیٹے۔ ہمارا ادارہ تم جیسے بچوں کی سب سے بڑی خواہش پوری کرنے کی کوشش کرتا ہے۔“

”اچھا۔“ ارشد کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ”کوئی بھی خواہش۔“

”ہاں۔ کوئی بھی ایسی خواہش جو ہمارے بس میں ہو۔“ ظفر عالم نے کہا۔ ”کیا تمہارے دل میں ایسی کوئی خواہش ہے؟“

”ہاں انکل ہے۔ میں صرف دو دنوں کے لیے پولیس کا بہت بڑا آفیسر بننا چاہتا ہوں۔“ ارشد نے بتایا۔

”اچھا۔“ ظفر عالم حیران رہ گیا تھا۔ ”یہ تو بہت عجیب خواہش بتائی ہے تم نے۔“

”بس انکل۔ میری یہ خواہش پوری کروادیں۔“ ارشد نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ ہمارا ادارہ آئی جی صاحب سے بات کر کے تمہیں بتا دے گا۔ مجھے امید ہے کہ تمہاری یہ خواہش پوری ہو جائے گی۔“

دوسرے دن ہی ارشد کو بتا دیا گیا تھا کہ اس کی درخواست منظور کر لی گئی ہے۔ ”لیکن انکل۔ میری ایک شرط بھی ہوگی۔“

”چلو وہ بھی بتا دو۔“

”شرط یہ ہوگی کہ پولیس والوں کو میری بات ماننی ہوگی۔“ ارشد نے کہا۔ ”میں جو آرڈر دوں۔ وہ انہیں پورا کرنا ہوگا۔“

”بیٹا۔ یہ تو بہت کڑی شرط ہے۔“ ظفر عالم مسکرا کر بولا۔ ”تم یہ نہیں کیا آرڈر دو۔“

”میں مجرموں کے لیے ہی آرڈر دوں گا نا۔“ ارشد نے کہا۔ ”اور میرے ماتحت جو پولیس والے ہوں گے۔ ان کو میں خود رکھوں گا۔ اپنی مرضی سے۔“

”ارشد۔ اب تم مشکلات پیدا کرتے جا رہے ہو۔“ ظفر عالم نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے آئی جی صاحب تمہاری یہ بات نہ مانیں۔“

”تو پھر رہنے دیں مجھے نہیں بننا ہے پولیس آفیسر۔“

”اچھا۔ اچھا ناراض نہ ہو۔ میں یہ بھی کہہ کر دیکھ لیتا ہوں۔“

اس کا جواب تین دنوں کے بعد آیا تھا۔ آئی جی صاحب نے اس کی یہ درخواست بھی منظور کر لی تھی۔

”اور سنو۔ کل تمہیں آئی جی صاحب کے سامنے پیش ہونا ہے۔“ ظفر عالم نے بتایا۔ ”کیا تم چل سکو گے؟“

”کیوں نہیں۔“ ارشد ایک جوش کے عالم میں بستر سے اتر آیا تھا۔ ”انکل۔ اب میں اپنے ملک کا ایک بہادر اور طاقت ور پولیس آفیسر بنے جا رہا ہوں۔ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔“

ظفر عالم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اس نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔

ارشد بہت شان کے ساتھ آئی جی صاحب کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ اس کے سائز کی وردی تھی۔ جس پر آئی جی صاحب نے اس کے ایس ایس پی ہونے کا نشان لگاتے ہوئے اسے تقرری کا پروانہ دیتے ہوئے کہا۔ ”یک مین۔“

اب تم ہماری پولیس میں دو دنوں کے لیے ایس ایس پی ہو گئے ہو۔“

”ٹھیک یوسر۔“ ارشد نے سیلوٹ کرتے ہوئے شکریہ ادا کیا۔

”تمہیں وہ سارا پروٹوکول دیا جائے گا جو اس رینک کے پولیس آفیسر کو ملتا ہے۔ اس کے علاوہ تمہارے انڈر میں جو پولیس والے ہوں گے۔ ان کا فرض ہوگا کہ وہ تمہاری بات مانیں۔ مجھے امید ہے کہ تم اپنا فرض پوری دیانت داری سے ادا کرو گے۔“

”بس سر۔“

”ڈش یو گڈ لک۔ کیا تمہیں کچھ اور کہنا ہے؟“

”بس سر۔ میں اپنے انڈر میں دو دنوں کے لیے ایک پولیس انسپیکٹر کو رکھنا چاہتا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”گڈ۔ کیا تم اس خاص پولیس انسپیکٹر کا نام جانتے ہو؟“

”بس سر۔ نواز شاہ نام ہے ان کا۔ میں ان کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہتا ہوں۔“

”اوکے۔ نواز شاہ کی ڈیوٹی تمہارے ساتھ لگادی گئی۔“

ارشد کو دو دنوں کے لیے ایک دفتر بھی الاٹ کر دیا گیا تھا۔ نواز شاہ نے اس کے سامنے آ کر سیلوٹ کرتے ہوئے کہا۔ ”نواز شاہ جو انٹنگ رپورٹ کے ساتھ اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہے سر۔“

”نواز شاہ۔ تم دو دنوں تک میرے ساتھ رہو گے۔“

ارشد اپنی آواز میں بھاری پن پیدا کرتے ہوئے بولا۔

”بس سر۔“

”اب تم جاؤ۔ کچھ دیر بعد میں اسکوڈ کے ساتھ گشت پر نکلوں گا۔“

”بس سر۔“ نواز شاہ سیلوٹ کر کے باہر چلا گیا۔

اسے یہ ساری باتیں ظفر عالم نے بتائی تھیں۔ کس طرح آرڈر دیا جاتا ہے۔ کس طرح خاص ٹرمن استعمال ہوتی ہیں۔ کس طرح پروٹوکول کا خیال رکھا جاتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

نواز شاہ کو سامنے دیکھ کر اس کے دل کی حالت عجیب ہو گئی تھی۔ یہ وہی شخص تھا جس نے اس کے بغراط بھائی کو اس سے جدا کر دیا تھا۔

اور آج وہی شخص اس کے سامنے اس کا ماتحت بن کر کھڑا ہوا تھا۔ اس کے اندر کام کر رہا تھا۔

آئی جی نے ایک مشیر بھی اس کی سہولت کے لیے اس کے ساتھ کر دیا تھا جو اسے مشورے دیتا رہا اور اس کے احکامات کی پابندی کرتا رہا۔

ارشد نے یہ سارا وقت باقاعدہ ایس ایس پی کی حیثیت سے گزارا تھا۔ ٹھیک چار بجے اس نے اپنے اسکوڈ کو گشت کا حکم دیا تھا۔

اس کے لیے ایک گاڑی مہیا کر دی گئی تھی۔ ایک موٹر سائیکل تھی جس میں چار پولیس والے بیٹھے ہوئے تھے۔

اسے پوری سنجیدگی کے ساتھ پورا پروٹوکول دیا جا رہا تھا۔ نواز شاہ کو اس نے اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھالیا تھا جو پوری طرح المرٹ ہو کر اس کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔

”نواز شاہ ہمیں کون روڈ کی طرف جانا ہے۔“ اس نے آرڈر دیا۔ اس قافلے کا رخ کون روڈ کی طرف موڑ دیا گیا۔

اس روڈ کی شہرت اس لیے تھی کہ اس پر بے شمار کوچنگ سینٹر بنے ہوئے تھے اور یہ روڈ طالب علموں سے بھرا ہوا دکھائی دیتا تھا۔

اچانک ارشد نے گاڑی روکنے کا حکم دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے فٹ پاتھ پر کھڑے ہوئے ایک نوجوان کی طرف اشارہ کیا۔ ”نواز شاہ۔ گولی چلاؤ۔ یہ بہت بڑا ڈاکو ہے۔ مارو اس کو۔“

”جی۔“ نواز شاہ شیپ کر رہ گیا۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سر؟“

”ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ مار دو اسے۔ یہ ڈاکو ہے۔“

”نوسر۔ یہ ڈاکو نہیں ہے۔ یہ بیٹا ہے میرا۔ یہ ٹیوشن پڑھنے کے لیے آتا ہے۔ یہ دیکھیں اس کے ہاتھ میں کتابیں

بھی ہیں۔“

”تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے نواز شاہ۔ میرے بھائی کے ہاتھوں میں بھی تو کتابیں تھیں۔ جس کو تم نے ڈاکو کہہ کر گولی مار دی تھی۔“

”تم نہیں آپ۔“ وہ گرج کر بولا۔ ”میں آفیسر ہوں تمہارا۔ اور اس کو گولی مارنے کا حکم دے رہا ہوں۔“

”سیر۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ مجھے معاف کر دیں۔ میں نے واقعی جرم کیا تھا۔ اب مجھے احساس ہو رہا ہے۔“

”دائیں چلو۔ میرا کام ختم ہو گیا ہے۔“ ارشد نے کہا۔

”میں تمہیں یہی بتانا چاہتا تھا کہ میرا بھائی بھی کی کا بیٹا تھا اور وہ بھی اتنا ہی ہونہار طالب علم تھا۔ جتنا تمہارا بیٹا ہے۔“

ارشد اچانک بہت بڑا ہو گیا تھا۔ اگر ناکہ اس کی باتیں سن لیتی تو حیرت زدہ رہ جاتی۔ ”ارشد، یہ تم اپنی عمر سے بڑی باتیں کیوں کرنے لگے ہو؟“ وہ کہا کرتی تھی۔

”اس لیے کہ مجھے جانے کی جلدی ہے ناکہ باجی۔“

وہ جواب دیا کرتا۔ ”اس لیے جو کچھ کہنا ہے۔ وہ کہہ دینا چاہتا ہوں۔“

نواز شاہ کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ سامنے فٹ پاتھ پر نواز شاہ کا بیٹا دانش اب دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شاید وہ کوئی بس پکڑ کر اپنے گھر جا چکا تھا۔

ارشد کو اچانک کمزوری محسوس ہونے لگی تھی۔ اس نے کار کی سیٹ سے اپنا سر لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی رگوں میں آنکھیں سی ہو رہی تھیں۔ اور کچھ دیر بعد وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

نواز شاہ کے لیے یہ بہت بڑا شاک تھا۔ اس کے اندر ٹوٹ پھوٹ سی رہ گئی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ کتنا بے رحم شخص ہے۔

اس چھوٹے سے بچے نے اسے کتنا بڑا سبق دیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس پلاننگ میں خود قدرت نے اس کا ساتھ دیا ہو۔ اس کی بیماری۔ اس کی آخری خواہش۔ دانش سے دوستی اور آخر میں ایک باپ کو یہ حکم کہ وہ اپنے بیٹے پر گولی چلائے۔ یہ سب ایک خاص ترتیب سے رونما ہو رہے تھے۔

نواز شاہ کی ذہنی حالت بگڑتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے بیٹے دانش کو ابھی تک کچھ نہیں معلوم تھا۔ اس نے گھر والوں کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ اس کے باوجود اسے ایسا لگتا جیسے وہ سب طنز یہ لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھ رہے ہوں۔ اسے



ناز والے

جناب مدیر سرگزشت
السلام علیکم

آپ یقین کریں نہ کریں / یہ میری زندگی کا سب سے اہم واقعہ ہے جسے میں نہ ہلاکم و کاست رقم کر دیا ہے۔ اگر مناسب سمجھیں تو اس کے الفاظ میں درستی کریں لیکن التماس ہے کہ اسے شائع ضرور کریں تاکہ لوگوں کو سبق حاصل ہو اور وہ ایک جیسے نام رکھنے کی غلطی نہ کریں۔
فیاض الحسن
(فیصل آباد)

ویسے جب سے شادی کی تقریبات بارہ بجے ختم ہونے لگی تھیں میں نے شادیوں میں جانا شروع کر دیا تھا ورنہ پہلے بالکل نہیں جاتا تھا صرف اس خوف سے کہ ساری رات برباد ہو جاتی ہے۔

عام طور پر بارہ ساڑھے بارہ بجے رات آیا کرتی پھر دوسرے مراحل ہوتے تھے پھر کھانا وغیرہ کھاتے کھاتے تین بج جاتے تھے۔

اس کی دوست نے اسے آواز دی۔ ”ناز ذرا ادھر آؤ۔“
اور میں نے یہ جان لیا کہ اس خوبصورت، طرحدار اور دلکش لڑکی کا نام ناز ہے۔

یہ محلے کے ایک جان بچان والے قدیر خان کی شادی کی تقریب تھی چونکہ میرا تعلق بھی اسی محلے سے تھا اسی لیے ایک کارڈ میرے پاس بھی آ گیا تھا۔

گھر والوں نے مجھے معاف نہیں کیا تو پھر خدا ہی معاف نہیں کرے گا۔“

”ایک بات بتائیں بابا۔ آپ میں یہ تبدیلی کیسے آ گئی؟ یہ کیس تو دب ہی گیا تھا۔ خود آپ کے پولیس کے ساتھیوں نے اس معاملے میں آپ کا ساتھ دیا تھا۔“

”اسی بات کا تو رونا ہے بیٹا کہ ہم ایک دوسرے کو بچانے کے لیے بہت نا انصافیاں کر جاتے ہیں۔“

”آپ یہ بتائیں کہ آپ میں یہ تبدیلی کیسے آ گئی؟“

”اس بچے کی وجہ سے یہ تبدیلی آئی ہے۔ اس نے اتنی ہوشیاری اور ذہانت کے ساتھ مجھے احساس دلایا ہے کہ ہزار تقریریں سننے کے بعد بھی وہ اثر نہیں ہوتا۔ جواب ہوا ہے۔“

نواز شاہ نے پھر ساری کہانی سنا دی تھی۔

”میرے خدا! دانش لڑکا اٹھا تھا۔“ ارشد نے کس طرح آپ کو احساس دلایا ہے۔“

”جاء۔ میری طرف سے معافی مانگ لو۔“

”بابا۔ میں ایک بات کہوں۔ اگر مجھے یہ پتا چل جاتا کہ آپ نے ایک بے گناہ کو مارا تھا۔ تو شاید میں زندگی بھر آپ سے بات نہیں کرتا۔ لیکن اب میں خوش اور مطمئن ہوں کہ میرا باپ ایک باخیر شخص ہے۔ خدا آپ کی مدد کرے گا بابا۔“

دانش جب ارشد کے گھر پہنچا تو وہاں گھر کے باہر لگے ہوئے نمٹ کو دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا۔ ارشد کا باپ کچھ لوگوں کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ ہر طرف سوگوار کی سی کیفیت تھی۔

”انکل۔ یہ سب کیا ہے؟“ دانش نے پریشان ہو کر پوچھا۔

تم نے آنے میں دیر کر دی بیٹا۔ تمہارا بھائی اپنے بقراط بھائی کو یاد کرتے ہوئے اپنے خدا کے پاس چلا گیا ہے۔“

دانش گم صم ہو کر رہ گیا تھا۔ ارشد کا باپ کہہ رہا تھا۔

”اور جانتے ہو بیٹا کہ ارشد کی آخری خواہش کیا تھی؟“

”نہیں انکل۔ آپ بتائیں۔“ دانش کی آواز لرز رہی تھی۔

اس کی آخری خواہش یہ تھی کہ جس پولیس والے نے اس کے بھائی کو مارا ہے۔ وہ بس ایک بار مرنے والے کی قبر پر جا کر یہ کہہ دے کہ سوری۔ تم ڈاکو نہیں تھے۔ مجھ سے غلطی ہو گئی تھی۔“

دانش کی آنکھیں آنسوؤں سے دھندلائی چلی گئیں تھیں۔

دانش کی آنکھیں آنسوؤں سے دھندلائی چلی گئیں تھیں۔

تقریب سمجھ رہے ہوں۔

اس کی بے چینی جب حد سے بڑھنے لگی تو اس نے اپنے منکے کو اپنا استعفیٰ پیش کر دیا۔ ملازمت چھوڑنے کی وجہ اس نے یہ بتائی تھی کہ وہ اپنے منیر اور دل پر بوجھ لیے ہوئے زندہ نہیں رہ سکتا۔ وہ ایک معصوم نوجوان کا قاتل ہے۔ لہذا اسے سزا دی جائے۔

ایک ذرا سے حادثے نے اس کی دنیا بدل کر رکھ دی تھی۔ اس نے اپنی درخواست میں لکھا تھا کہ وہ خود اپنے اس جرم کا اعتراف کر رہا ہے اور جب تک اسے سزا نہیں ملے گی۔ وہ اسی طرح بے چین رہے گا۔

درخواست دینے کے بعد اس نے خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا تھا۔ محکمے میں کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ سب سے زیادہ حیرت دانش کو ہوئی تھی۔ اس نے لاگ اب میں اس سے ملاقات کرتے ہوئے پوچھا تھا۔ ”بابا۔ یہ آپ نے کیا کیا۔ کیوں ایسی درخواست دے دی۔ اپنے آپ کو کیوں گرفتار کرایا؟“

”اس لیے کہ میں قاتل ہوں۔“

”ہاں بیٹا۔“ میں قاتل ہوں اور میں نے بغیر کسی تصور کے ایک نوجوان کو گولی مار دی تھی۔ نہ جانے اس وقت میری کیا ذہنی کیفیت تھی۔ یہ میں نہیں بتا سکتا۔ پھر میں نے اپنے اس جرم کو چھپانے کے لیے اسے ڈاکو بنا کر پیش کر دیا تھا۔“

”او خدا! آپ اس کیس کی بات کر رہے ہیں۔ جس کا بہت شہرہ ہوا تھا۔“

”ہاں بیٹا۔ میں اس کی بات کر رہا ہوں۔ خدا مجھے معاف کرے۔ وہ ایک بے گناہ نوجوان تھا اور جانتے ہو وہ کون تھا؟ تم نے جس بچے کو اپنا بھائی بنا رکھا ہے۔ اس کا بڑا بھائی۔ جسے وہ پیار میں بقراط بھائی کہا کرتا تھا۔“

”بابا۔ یہ آپ نے کیا کر دیا تھا۔“ دانش لرز کر رہ گیا۔

”آپ نے کتنا بڑا غلط کیا تھا۔“

”اس لیے تو آج خود کو سکون دینے کے لیے پولیس کے سامنے پیش ہو گیا ہوں۔“ نواز شاہ نے کہا۔ ”مجھے امید ہے کہ کل جب میں خدا کے سامنے پیش ہوں گا تو وہ مجھے ضرور معاف کر دے گا۔“

”بابا۔ اب آپ کا کیا ہوگا؟“

”اب جو ہوگا وہ بہتر ہی ہوگا۔ اب بیٹا تم ایک کام کرو۔ تم میری طرف سے اپنے اس چھوٹے بھائی کے پاس جا کر معافی مانگ لو۔ اس سے کہو کہ اگر اس نے اور اس کے

اس کے بعد گھر واپس آ کر دیر تک سوتے رہو۔ دوسرے دن کا دفتر گول یا پھر لیٹ پہنچنا پڑتا تھا اسی لیے میں نے اپنے طور پر ایسی شادیوں کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ لیکن جب سے یہ بارہ بجے تک تقریب کے ختم ہونے کی پابندی لگا دی گئی تھی میں نے جانا شروع کر دیا تھا۔ اسی لیے قدیر خان کی شادی میں بھی شریک ہو گیا تھا۔ اور وہیں وہ لڑکی دکھائی دے گئی تھی۔ جس کا نام ناز تھا۔

میں ان معاملات میں ذرا غصے واقع ہوا ہوں۔ یا تو میرا مزاج ہی ایسا تھا یا پھر زندگی نے فرصت ہی نہیں دی تھی کہ میں اپنی زندگی میں اس قسم کے رویائوں کا تصور کر سکتا، ایک خشک اور محنت بھری زندگی گزر رہی تھی۔ ایسے میں کسی لڑکی کا مجھے پاگل بنا دینا میرے لیے بہت بڑی بات تھی۔

ایسا بھی نہیں تھا کہ میں نے لڑکیاں دیکھی ہی نہ ہوں خود میرے ساتھ دفتر میں کام کرتی تھیں اور وہ اپنی اپنی جگہ خوبصورت بھی رہی ہوں لیکن اس لڑکی میں جو بات تھی وہ بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔

اب مجھے اس کا نام بھی معلوم ہو گیا تھا، ناز وہ لڑکی واقعی ناز اٹھانے کے قابل تھی۔ میں اس کی طرف دیکھتا رہ گیا تھا۔ ماضی کی ساری محرومیوں نے اچانک کھلی آنکھوں سے ایک خواب دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ یہ خواب اسی لڑکی کا تھا۔ میں اپنے تصور میں دیکھ رہا تھا کہ اس لڑکی سے میری شادی ہو گئی ہے اور وہ لڑکی دلہن بنی ہوئی میرے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔

میں اس کے بارے میں کسی سے پوچھتا نہیں چاہتا تھا۔ خود اپنے طور پر معلوم کرنا تھا کہ وہ کہاں رہتی ہے؟ اس کا پس منظر کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ اور اس کا طریقہ یہ تھا کہ اس کا تعاقب کیا جائے۔

اتنی دیر میں کھانا لگ چکا تھا۔ میں نے جلدی جلدی اپنا کھانا ختم کیا اور ہال سے باہر آ کر کھڑا ہو گیا۔ کافی دیر بعد مہمان نکلتا شروع ہوئے۔

وہ لڑکی بھی ایک بڑی عمر کے صاحب کے ساتھ ہال سے باہر نکل آئی۔ سامنے ٹیکسیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ میں اپنی بائیک ہال کے سامنے ہی لے آیا تھا انہوں نے ایک ٹیکسی ہار کی اور میں نے اپنی بائیک پر ان کا تعاقب شروع کر دیا۔ یہ تعاقب کچھ دیر تک جاری رہا۔ وہ ٹیکسی ناظم آباد کے

ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے آ کر رک گئی اور میں بائیک کو آگے بڑھانے لگا۔

میں نے وہ مکان دھیان میں رکھ لیا تھا۔ وہ ایک منزلہ مکان تھا۔ ناظم آباد کا وہ علاقہ ایسا ہی تھا وہاں اسی قسم کے مکانات ہوتے تھے۔

میں نے زندگی میں پہلی بار ایسی چھوٹی حرکت کی ہو گی کہ کسی لڑکی کا تعاقب کرنا ہوا اس طرح اس کے گھر پہنچ گیا تھا۔ دوسری صبح دفتر چلا گیا تھا اور دفتر سے واپسی پر پھر اسی مکان کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔

اس مکان کے دروازے پر ایک نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ ”اٹھارہ الحق“ یہ اٹھارہ الحق اس کے والد ہی ہو سکتے تھے۔ اب سوال یہ تھا کہ گھر والوں یا اس لڑکی تک اپروچ کیسے کی جائے۔

میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہی لڑکی یعنی ناز مکان سے باہر آ گئی۔ اس کے ساتھ گیارہ بارہ برس کا ایک خوبصورت بچہ بھی تھا جو بھینا اس کا بھائی ہو گا۔

وہ دونوں آپس میں ہنستے بولتے ہوئے میری بائیک کے برابر سے گزر گئے۔ انہوں نے میرا ٹوٹا ہوا لباس دیکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ لڑکی مجھے نہیں جانتی تھی اور اگر رات کے وقت شادی کی تقریب میں مجھ پر نظر پڑی بھی ہوگی تو دھیان نہیں دیا ہو گا۔

وہ گزر گئے لیکن میں وہیں ساکت کھڑا رہ گیا تھا۔ اس کو حاصل کرنے کی خواہش اور زیادہ ہو گئی تھی۔ اس کے چلنے کا انداز، اس کی دل کشی، اس کی ہلکی سی ہنسی یہ سب میرے لیے ایک آزمائش بنتی جا رہی تھی۔

میں نے اپنی بائیک اسٹارٹ کی اور ان کے پیچھے ہو لیا۔ بہت بری حرکت تھی۔ اخلاق سے گری ہوئی لیکن میں تو اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو رہا تھا۔

وہ دونوں پیدل ہی جا رہے تھے، شاید قریب ہی میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ وہ دونوں محلے کے ایک جنرل اسٹور پر آ کر رک گئے تھے۔ میں نے بھی اپنی بائیک ایک طرف کھڑی کی اور ان کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا۔

وہ بچہ اس سے کہہ رہا تھا۔ ”ناز باجی کسٹرو پاؤڈر بھی لے لیں۔“

”وہ کیوں؟“ ناز نے پوچھا۔

”کسٹرو کھانا ہے نا۔ کب سے تو کھہ رہا ہوں۔“

مجھے ایک شرارت سوجھی میں نے آگے بڑھ کر دکاندار

سے کہا۔ ”بھائی جان کسٹرو پاؤڈر تو دیں۔“

اس وقت اس نے ٹھیکسی لگا ہوں سے میری طرف دیکھا۔ شاید اس بار اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ کیونکہ میں اپنی بائیک لیے اس کے مکان کے سامنے کھڑا ہوا تھا اور اب اس کا تعاقب کرنا ہوا اس دکان تک آ گیا تھا۔

اس نے کہا تو کچھ نہیں لیکن اس کے تپور بتا رہے تھے کہ وہ غصے میں ہے۔ دکاندار نے کسٹرو پاؤڈر میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے اس کی قیمت ادا کی اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ میں زیادہ دیر کھڑے رہ کر اسے غصہ دلانا نہیں چاہتا تھا۔

میں وہاں سے چلا تو آیا لیکن خود کو شاید اس لڑکی کے آس پاس ہی بھول آیا تھا۔ میں نے ہر قیمت پر اسے اپنانے کا ارادہ کر لیا تھا لیکن کس طرح کوئی تدبیر کچھ میں نہیں آ رہی تھی۔

پھر ایک دن قدرتی نے میری مدد کرنی دی کہا جاتا ہے کہ جہاں ارادے ہوں وہاں راستے خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں تو یہ راستہ اچانک سامنے آ گیا تھا۔

میں نے ایک پلاٹ خریدا تھا۔ اس پلاٹ کے کاغذات جانچنے کے لیے مجھے متعلقہ محکمے تک جانا پڑ گیا اور جو صاحب اس کی جانچ کیا کرتے تھے یہ وہی تھے یعنی اٹھارہ الحق صاحب۔

اس لڑکی ناز کے والد۔

یہ ایک بہت زبردست بات ہوئی تھی۔ میں اپنی فائل لے کر ان کے پاس پہنچ گیا۔ ”سر میں آپ کو جانتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”کس طرح جانتے ہو میاں؟“ انہوں نے فائل لیتے ہوئے کہا۔

میں نے شادی کی اس تقریب کا حوالہ دیا جس میں ان کو ان کی صاحبزادی کے ساتھ دیکھا تھا۔ ”آپ شاید اس دن اپنی صاحبزادی کے ساتھ تھے۔“

”ہاں میاں وہ بیٹی تھی میری۔“

بات کنفرم ہو گئی تھی میں نے پھر کہا۔ ”جناب اس فائل کو ذرا چیک کر لیجیے گا۔“

”ضرورت میں دو چار دنوں کے بعد چکر لگا لینا۔ ویسے اگر یہ فائل درست ہوئی تو پھر میں یہ کہوں گا کہ تم نے بہت موقع کا

شاہراہ سے بچھڑ کر ہم ایک ایسی سڑک پر آ گئے جو ایک خاموش اور پرسکون ہری بھری وادی میں جا رہی تھی۔ یہ لٹکا سڑک علاقہ تھا جہاں بنیاد پرست عیسائی رہتے تھے اور وہ جدید تہذیب کو اپنے لیے گناہ قرار دیتے ہوئے اس سے اجتناب کرتے تھے۔ زندگی کے وہی قدیم طور طریقے اپنائے ہوئے تھے جو صدیوں پیشتر ان کے آباؤ اجداد کے تھے۔ وہ ہر اس شے سے گریز کرتے تھے جو میکائی تھی، صرف سیاہ رنگ کی گھوڑا گاڑیوں میں سفر کرتے تھے، کار کے ذریعے سفر کرنا گناہ سمجھتے تھے۔ کھیتی باڑی میں بھی ٹریکٹر وغیرہ کا استعمال نہیں کرتے تھے۔ ہم پنجاب میں مل کے آگے تیل یا کبھی کبھار اونٹ

جوت لیتے ہیں اور وہ امریکا کی جدید ترین ریاست میں گھوڑوں کو استعمال کرتے ہیں۔ ٹیلی وژن سے بھی پرہیز کرتے ہیں اور ایک مخصوص سیاہ لباس کے علاوہ اور کچھ نہیں پہنتے۔ خواتین کا لباس بھی بے حد باپردہ ہوتا ہے یعنی سر پر سیاہ ٹوپی ہاتھوں تک آتا اسکرٹ اور سیاہ چادر۔ مرد لمبی لمبی داڑھیاں رکھتے ہیں البتہ موٹھیں منڈواتے ہیں، اپنے قبیلے سے باہر شادی نہیں کرتے، لڑکے اور لڑکی کا آزادانہ میل جول ممنوع ہے۔ البتہ وہ جوان ہونے والے لڑکوں اور لڑکیوں کو ”باہر“ کی دنیا میں جانے کی اجازت دو چار ماہ کے لیے دیتے ہیں کہ آپ اس معاشرے میں جا کر کچھ دیر زندگی بسر کرو جس کی اخلاقیات کو ہم قبول نہیں کرتے۔ جو جی چاہے کرو، موسیقی سنو، شراب پیو، آزادانہ میل جول کرو۔ اگر جی چاہے تو اس معاشرے کے ایک فرد بن جاؤ اور اگر تم اسے پسند نہ کرو تو لوٹ آنا اور پھر سے قدیم معاشرت کا حصہ بن جانا۔ خیرت انگیز امر یہ ہے کہ ان نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی اکثریت چند ماہ ”امریکا“ میں بسر کر کے یہ فیصلہ کرتی ہے کہ ہم اپنی پرانی اقدار کی جانب لوٹ جانا پسند کریں گے۔

مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامہ سے اقتباس مرسلہ: نصیر گویدل

نومبر 2011ء

255

ماہنامہ سرگوشٹ

نومبر 2011ء

254

ماہنامہ سرگوشٹ

پلاٹ خرید لیا ہے آگے چل کر اس علاقے کی بہت دلیلو ہونے والی ہے۔

”جی جناب یہی بات میرے دھیان میں تھی۔“
میں دونوں کے بعد ان کے پاس پہنچ گیا۔ ”مبارک ہو میاں۔“ انہوں نے فائل میری طرف بڑھا دی۔ ”تمہاری فائل طے کر رہی ہے۔“

”بہت بہت شکریہ جناب۔“
”ویسے کرتے کیا ہو؟“

مجھے تو بس اپنے بارے میں پوری تفصیل بتانے کا بہانہ چاہیے تھا۔ میں نے پوری تفصیل سے اپنے بارے میں بتا دیا۔ اپنا خاندانی پس منظر، باپ دادا کے حالات پھر اپنے حالات۔ کہاں تک تعلیم حاصل کر لی ہے اور کہاں ملازمت کر رہا ہوں وغیرہ وغیرہ۔

وہ میری تفصیل سے بہت خوش ہوئے تھے۔ ”بس میاں اسی طرح محنت کرتے رہو۔ آگے جا کر ترقی کر دو گے۔“
اس کے بعد یہ ہوا کہ میں کسی نہ کسی بہانے ان کے پاس پہنچنے لگا۔ وہ بھی مجھ سے بے تکلف ہو گئے اکثر ہم کینٹین میں آکر بیٹھ جاتے اور ہر ادھر کی باتیں ہونے لگتیں۔

ان کو شاعری کا بھی شوق تھا۔ خود بہت اچھے شعر کہتے تھے اور اتفاق سے میں بھی شاعری کا شوق رکھتا تھا۔ سیکڑوں اشعار یاد تھے مجھے اور جب میں انہیں سنایا کرتا تو وہ خوشی سے بے حال ہو جاتے۔ ”میاں تم نے مجھے متاثر کیا ہے ورنہ آج کل کے نوجوانوں میں تو ادب کا تو ذوق ہی ختم ہو گیا ہے۔“

”جی ہاں۔“ میں سعادت مندی سے گردن ہلا دیتا۔
میں نے انہیں اس بات کا اشارہ دے دیا تھا کہ میں تنہائی کی زندگی سے بے زار ہو چکا ہوں اور اب اپنا گھر بسانے کا سوچ رہا ہوں۔ انہوں نے میرے اس خیال کی بے حد حوصلہ افزائی کی تھی۔

”لو ہا گرم ہو چکا تھا۔ اب اس پر چوٹ مارنے کی دیر تھی اور چوٹ مارنے کے لیے میں نے اپنے دفتر کے ایک ساتھی کا انتخاب کیا وہ ایک معقول اور مہذب نوجوان تھا میں نے اسے رشتے کی بات کرنے کے لیے بھیج دیا تھا۔“ یاد رکھنا کہ ناز نام ہے اس کا۔“ میں نے بتایا۔ ”ہو سکتا ہے کہ ان کی کوئی اور بیٹی بھی ہو تم اس کا رشتہ دے آؤ۔“

”اچھا ہوا تم نے بتا دیا۔“ وہ مسکرا کر بولا۔ ”ویسے تم اب بے فکر ہو جاؤ تم دیکھ لینا میں بڑے میاں کو کس طرح شیشے میں اتارتا ہوں۔“

”بڑے میاں۔۔۔۔۔ شیشے میں اترے ہوئے ہیں۔“
میں نے کہا۔ ”تم کو صرف پیغام پہنچانا ہے۔“
وہ نوجوان اسی وقت اظہار صاحب کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کی واپسی گرچہ بہت دیر میں ہوئی تھی لیکن بہت خوش خوش واپس لوٹا تھا۔ ”مبارک ہو بھائی تمہارا رشتہ منظور ہو گیا ہے۔“ اس نے بتایا۔
”مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا۔“ کیا جی کہہ رہے ہو۔“

”ہاں بھئی وہ بڑے میاں تو تمہارے پیغام کے انتظار ہی میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہ فوری طور پر شادی کرو دینا چاہتے ہیں۔“

”ہاں ہاں میں بھی فوری شادی کے لیے تیار ہوں۔“
”اب کل شام کو انہوں نے شادی کی تاریخ طے کرنے کے لیے اپنے گھر بلایا ہے۔“ دوست نے بتایا۔
”مجھے بھی تمہارے ساتھ چلنا ہوگا۔“
”میرے دوست تم نے کیا بڑا دوست خبر سنا دی۔“ میں نے اسے گلے لگا لیا۔ ”خوش رہو جیتے رہو۔“

”یار کیا وہ لڑکی اتنی ہی خوبصورت ہے کہ تم اس کے لیے پاگل ہو رہے ہو؟“ دوست نے پوچھا۔
”ہاں جی ماشاء اللہ میری ہونے والی بیگم بہت خوبصورت ہیں۔“

”اوہو اسی لیے تو ابھی سے تمہارا یہ حال ہو رہا ہے کہ وہ بیگم بن گئی ہیں۔“

بہر حال ہم دوسرے دن اظہار صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ اظہار صاحب نے بہت گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا تھا۔ ڈھیر سا ناشتا تھا۔ ڈرائنگ روم اگرچہ چھوٹا سا تھا لیکن ایک ایک چیز سے سلیقے اور نفاست کا اظہار ہو رہا تھا۔

میں نے جس بچے کو ناز کے ساتھ دیکھا تھا وہ کئی بار ہمارے سامنے آیا۔ شاید اس نے مجھے پہچان لیا تھا اسی لیے اس کی مسکراہٹ میں گرم جوشی تھی۔

ہم کچھ دیر بیٹھے رہے معاملات بہت آسان تھے اسی لیے بہت جلدی طے پا گئے۔ اگلے مہینے کی سات تاریخ شادی کے لیے طے ہوئی تھی۔

قصہ مختصر یہ کہ ایک مہینے جیسے پلک جھپکتے گزر گیا۔ شادی ہو گئی۔ میری طرف سے دفتر کے ساتھیوں کے علاوہ دو چار دوست شریک ہوئے تھے جبکہ ان کی طرف سے ماشاء اللہ بہت سے لوگ تھے۔

میری اصل کہانی شادی کے بعد سے شروع ہوتی ہے۔“

رات دو بجے کے قریب محلہ عربی میں جانے کا موقع ملا تھا۔ ناز دہن بنی گھونگٹ نکالے بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے منہ دکھائی کے لیے ایک خوبصورت گھڑی خریدی تھی۔

”ناز۔“ میں نے بستر پر بیٹھتے ہوئے اسے پیار سے آواز دی۔ ”دیکھو آخر کار میں نے تمہیں حاصل کر ہی لیا نا۔“

”جی بہت بہت شکریہ۔“

میں نے آہستہ سے اس کا گھونگٹ اٹھا دیا اور اس کے ساتھ ہی میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ وہ ناز نہیں تھی بلکہ کوئی اور لڑکی تھی۔

ایک بہت کم صورت والی لڑکی۔ ”کک۔۔۔ کون ہو تم؟“
میں نے غصے سے پوچھا۔

”کیا ہو گیا ہے آپ کو؟“ اس نے حیرت اور پریشانی سے پوچھا۔ ”میں ناز ہوں آپ کی بیوی۔ پھر آپ سے نکاح ہوا ہے۔“

”جھوٹ بولتی ہو تم۔ تم ناز نہیں ہو۔“
”میں ناز ہی ہوں۔“ اس نے بتایا۔ ”آپ کو کیسا ثبوت چاہیے۔“

”اگر تم ناز ہو تو پھر وہ کون ہے جس کو میں نے تمہارے ابا کے ساتھ شادی کی تقریب میں دیکھا تھا؟“ میں نے کہا۔ ”وہ پہلے پتلے بدن، گورے رنگ کی ایک خوبصورت لڑکی تھی۔“

”وہ تو میری چھوٹی بہن ہے۔ اس کا بھی نام ناز ہے۔“ اس نے بتایا۔

”کیا بکواس ہے یہ۔ اس کا نام کیسے ناز ہو سکتا ہے یا پھر تم کیسے ناز ہو سکتی ہو؟“

”آپ یقین کریں ہم چار بہنیں ہیں اور چاروں ہی ناز ہیں۔ میں حمیدہ ناز ہوں۔ مجھ سے چھوٹی فریدہ ناز ہے اس سے چھوٹی سمیدہ ناز ہے اور سب سے چھوٹی صائمہ ناز ہے۔ آپ نے شاید صائمہ کو دیکھا ہوگا۔ ہم چاروں میں وہی سب سے خوبصورت ہے۔“

”میرے خدا! کیسا دھوکا ہوا ہے میرے ساتھ۔“ میں غصے سے بولا۔

”اس میں دھوکے کی کیا بات ہے۔“ اس نے کہا۔ ”آپ ذرا غصہ دل سے غور کریں کیا آپ نے رشتہ

بجھواتے ہوئے یہ بتایا تھا کہ آپ کس ناز کے لیے رشتہ بجھوا رہے ہیں۔“

”ارے تو مجھے کیا معلوم تھا کہ تم ساری کم بختوں کا ایک ہی نام ہے سب کے ساتھ ناز کا دم چھٹا لگا ہوا ہے۔“

”دیکھیں یہ تو مقدر کی بات ہے نا۔“ اس نے کہا۔ ”جو کچھ ہوا اس میں کسی کا بھی کوئی قصور نہیں ہے۔ ابا کو بھی نہیں معلوم تھا کہ آپ نے کس ناز کی بات کی ہے۔ آپ کا رشتہ آیا تو انہوں نے اصول کے مطابق سب سے بڑی والی یعنی میرا رشتہ طے کر دیا اب آپ خود انصاف کریں اس میں ابا کی کیا غلطی ہے۔“

”لعنت ہے ایسے ناموں پر۔“ میں اس وقت غصے سے پاگل ہونے لگا تھا۔ ”میں تمہیں قبول نہیں کر سکتا۔ میں نے اس ناز کے لیے رشتہ بجھوایا تھا۔ تم کہاں سے درمیان میں آ گئیں۔“

اس نے رونا شروع کر دیا تھا۔ میرا دل چاہا تھا کہ یا تو میں اس کو مار دوں یا خود مر جاؤں۔ کیا عظیم الشان المیہ ہوا تھا میرے ساتھ۔ میں نے اس کے رونے کی پروا نہیں کی اور اپنا ٹکیرا اٹھا کر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔

اس وقت میرا دماغ بھنار ہا تھا۔ سوچتے سمجھتے کی ساری صلاحیتیں ختم ہو چکی تھیں۔ میں نے ناؤ کے حوالے سے کیسے کیسے خواب دیکھے تھے اور کون سی ناز میرے سامنے آ گئی تھی۔

کیا کروں، طلاق دے دوں اس کو۔ اس دھوکے پر ہلکا نہ کروں لیکن دھوکا کیا یہ واقعی دھوکا تھا۔ اگر یہ دھوکا تھا تو کیا جان بوجھ کر دیا گیا تھا۔

اسی طرح کرو میں بدلتے ہوئے صبح ہو گئی تھی۔ یہ شادی کا گھر تھا۔ ہر طرف خوشی چھائی ہوئی تھی۔ حمیدہ ناز کمرے میں تھی اور میں باہر ڈرائنگ روم میں اپنی قسمت کو رو رہا تھا۔

نونج چکے تھے میں نے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ وہ بستر کے ایک کونے میں سٹ کر سوئی ہوئی تھی، اسی لباس میں ایک لمحے کے لیے مجھے اس پر افسوس بھی ہوا تھا آخر اس بے چاری کا کیا قصور تھا اسے کیوں سزا مل رہی تھی۔

میں ہاتھ منہ دھونے کے لیے داش روم کی طرف جا ہی رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہونے لگی۔ دروازہ کھولا تو وہی کھڑی ہوئی تھی۔ وہی۔۔۔ وہی والی ناز۔ میں جس کا دیوانہ ہو گیا تھا جس کو دیکھنے کے بعد میرے دل کی دنیا برباد ہو گئی



چاہت کے رنگ

راوی: آفاق احمد خان

قابل احترام عذرار سول صاحبہ

سلام تسنیت

میں ایک بالکل سچی سرگزشت بھیج رہی ہوں۔ یہ سرگزشت میری اپنی نہیں میرے ایک جاننے والے کی ہے۔ ان پر جو کچھ گزری ہے، اسے میں نے افسانوی انداز میں لکھنے کی کوشش کی ہے۔ تمام واقعات کو میں نے الفاظ کا پیرا بن توڑ دیا ہے پھر بھی استدعا ہے کہ اس میں اگر کوئی خامی رہ گئی ہو تو اسے درست کرالیں۔

نیر رانی شفیق

میں ایک پروڈکشن کمپنی کا ٹینک ڈائریکٹر ہوں۔ اسٹارٹ، خورد اور معقول آدمی ہوں پھر بھی ان دنوں انتہائی نامعقول قسم کی جذباتیت کا شکار ہوں جبکہ میں کوئی عام چھوڑا مرد ہوں، نہ ہی ٹین اسٹر۔ تین عدد خوبصورت بچوں کا باپ اور 39 سال کا سویر شخص ہوں۔ میری بیوی ایک تعلیم یافتہ، روشن خیال، سلیقہ مند اور خوش مزاج خاتون ہے۔ دوسری عورتوں سے قطعاً مختلف، وہ عام بیویوں کی طرح نشی ہے نہ ہی میری ٹوہ میں رہتی ہے۔ ہم دونوں مزاج آتشاوتوں کی طرح رہتے ہیں مگر اب میں احساس جرم میں مبتلا ہوں کہ اپنی باوقاف، محبت کرنے والی اور خوبصورت بیوی سے بے وفائی کر رہا ہوں۔

”کیا!“ میں یہ سن کر اور بھی بھڑک اٹھا تھا۔ ”اس کے باوجود تم لوگوں نے ایسی حرکت کی۔“

”ہاں۔“ وہ اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ”اور آپ سنتے رہیں کہ ہم نے ایسی حرکت کیوں کی۔“ آپ ایک بد نصیب لڑکی ہیں۔ ان کے لیے رشتے آتے اور دیکھ کر واپس ہو جاتے تھے۔ ان سے زیادہ عابد اور شا کر لڑکی کا آپ نے تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔ کیا زندگی بھی ان کی کچھ بھی نہیں سناپ کو شاید یہ جھوٹ معلوم ہو لیکن جب امی ابو نے آپ کے لیے آپا کو تجویز کیا تو سب سے پہلی مخالفت خود آپا نے کی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ آپ کو سب کچھ بتا دیا جائے۔ آپ کو اندھیرے میں نہ رکھا جائے لیکن میرے بد قسمت باپ کے ذہن میں یہی ترکیب آئی کہ نام کے الٹ پھیر کی وجہ سے آپ کی شادی آپا ہی سے کر دی جائے۔ یہ آخر وقت تک مخالفت کرنی نہیں سسکتی ابوی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر... خاموش ہو گئیں۔ اب آپ کی مرضی ہے آپ چاہیں تو ان کی بد نصیبی میں اور اضافہ کر دیں یا انہیں اپنا نہیں لیکن میں اتنا ضرور بتا دینا چاہتی ہوں کہ ایسی بیوی قسمت والے کو ملتی ہے۔ یہ آپ کی زندگی بدل کر رکھ دیں گی۔“

میں نے دیکھا کہ عہدہ ناز اپنے کمرے سے نکل کر دروازے کے درمیان آ کر کھڑی ہو گئی تھی ماں کی آنکھوں میں آنسو تھے شاید... اپنی چھوٹی بہن کی آواز اسے باہر لے آئی تھی۔ میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا پھر اپنی سابقہ چاہت کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”اچھا چلو میں ایک شرط پر خاموش ہو جاتا ہوں۔“

”وہ کیا؟“

”تم میری آدمی گھر والی ہوگی۔“

”وہ تو میں ہوں۔ وہ مسکرا کر بولی۔ ”سالی کو آدمی گھر والی ہی تو کہا جاتا ہے۔“

اور اب میں شکر گزار ہوں اس لڑکی کا جو میری بیوی ہے۔ اس نے واقعی میری زندگی بدل کر رکھ دی ہے۔ اتنا پیارا اتنی وفاداری اور اتنی خدمت اس دور میں شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہے جتنی مجھے ہے۔

ہاں ایک بات اور میں اپنی سسرال والوں سے کہتا ہوں کہ خدا کے لیے ہر لڑکی کے نام کے ساتھ یہی ناز والا چکر ختم کریں ورنہ ہر کوئی مجھ جیسا شریف اور سعادت مند نہیں ہوتا۔

تھی۔ میں نے کچھ کہے بغیر ایک طرف ہٹ کر اسے راستہ دے دیا تھا۔

اس نے اندر آ کر گہری نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور سیدھی کمرے میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ کمرے سے نکل کر میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس وقت میری عجیب کیفیت تھی۔

میں نے تو اس سے شادی کے لیے اسے جتن کئے تھے اور اس وقت وہ میری سالی بن کر میرے سامنے کھڑی تھی۔

”دو لہجائی۔“ اس نے دھیرے سے مجھے مخاطب کیا۔ ”میں آپ کی پریشانی سمجھ رہی ہوں۔ میں نے آپ کو اور آپا کو دیکھ کر یہ اندازہ لگا لیا ہے کہ آپ دونوں نے الگ الگ رات گزاری ہے اور مجھے یہ بھی اندازہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا ہوگا۔ آپ نے اپنا رشتہ میرے لیے بھیجا ہوگا لیکن آپ کی شادی آپا سے ہو گئی۔“

”ہاں میں نے یہ رشتہ تمہارے لیے بھیجا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”کیونکہ میں تمہیں جانتا تھا میں نے تمہیں دیکھا تھا۔ میں تمہارے لیے تمہارے مکان کے چکر لگایا کرتا تھا اور تم لوگوں نے شادی کسی اور سے کرادی۔“

”آپ یہ بتائیں کیا ہم نے آپ کے ساتھ کوئی دھوکا کیا؟“ اس نے پوچھا۔ ”ابو کو یہ کہاں اندازہ تھا کہ آپ نے جس ناز کے لیے رشتہ بھیجا ہے وہ آپا نہیں ہیں وہ میں ہوں۔ بتائیں کیا اس میں ابو کا یا کسی اور کا کوئی قصور ہے۔ آپ کیوں بے چاری آپا کو سزا دے رہے ہیں۔“

”سزا تو میں برداشت کر رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”آپ کیا برداشت کریں گے۔ آپ اس لڑکی کے دل سے پوچھیں جس کی سہاگ رات ایسی بھیانک گزری ہو۔“

”خدا کے لیے تم اپنی آپا کو لے جاؤ یہاں سے۔“ میں نے کہا۔ ”ورنہ میں اس کو دیکھ کر پاگل ہو جاؤں گا۔“ ”کسی پر ظلم کرتے ہوئے کیا آپ کو اچھا لگے گا۔“ اس نے پوچھا۔ ”اب چلیں میں آپ کو ایک بات بتا دیتی ہوں کیونکہ آپ ہمارے کرب کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ آپ کے ساتھ واقعی دھوکا ہوا ہے۔ اگر آپ اسے دھوکا سمجھتے ہیں تو۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ ہم یہ جانتے تھے کہ آپ نے یہ رشتہ کس کے لیے بھیجا ہے۔“ اس نے بتایا۔

میرے متعلق مشہور ہے کہ میں انتہائی باذوق اور نفیس آدمی ہوں۔ کپڑوں، جوتوں اور پرغوم سے لے کر زندگی کی ہر سلیکشن میں میرا انتخاب منفرد ہے۔ بہت سے چاند چہرے اور ستارہ آنکھیں مجھ پر قربان ہیں، بہت سی حسینا میں میری راہ میں "میری چاہ میں اور میری ایک نظر التفات کی منتظر ہیں مگر میں نے بھی بھی شعوری یا لاشعوری ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔ مجھے ضرورت بھی نہیں کیونکہ میری حسین ترین بیوی شعاع ماہ حقیقتاً میری زندگی کا روشن چاند ہے۔ وہ میرے مرحوم والد کے ہمدم ویرینہ اور بزنس پارٹنر انکل فاروقی کی انکولی بیٹی ہے۔ ہماری شادی شعاع کی چاہت اور میرے طوفانی عشق کا نتیجہ ہے۔ ہماری راہ میں روایتی ظالم سماج نہیں تھا۔ لہذا یہ شادی والدین کی رضامندی سے بخیر و خوبی انجام پائی۔ شعاع کو پا کر میری بے قرار یوں کو قرار آ گیا اور زندگی کا ہر پل ہماری چاہتوں کا امین بن گیا۔

زندگی کی گاڑی سبک انداز میں رواں دواں تھی کہ اچانک ایک دن "پلو" میری زندگی میں آن وار ہوئی بلکہ یوں کہنا بجا ہوگا کہ آہستہ آہستہ میرے معمولات، نفاستوں اور نزاکتوں کا بیز آفریق کرتی میری دنیا کو تہ و بالا کرنے لگی۔

پلو..... جی ہاں، بلوریں آنکھوں اور چپکتے چہرے والی سولہ سالہ پلو! ہماری ماسی کی بہو ہے۔ ماسی صغراں برسوں سے ہمارے ہاں کام کر رہی ہے۔ ابھی چند ماہ پہلے اس نے اپنے بیٹے اور بیٹی کا بیاہ کیا تھا۔ اس شادی سے پہلے شنو (ماسی صغراں) کی بیٹی اپنی ماں کے ساتھ کام کرنے آئی تھی مگر اب شنو کے وٹے میں بیاہ کر آنے والی ماسی کی بہو پلو نے اس کا کام سنبھال لیا ہے۔ پلو کی شادی ماسی صغراں کے بیٹے فدا حسین عرف فدا سے ہوئی ہے۔ وہ ایک سوکھا، لمبا، کالا سا

یارہ سال کا کھلنڈرا لڑکا ہے۔ یہ ایک انتہائی بے جوڑ شادی ہے۔ پلو اس سے تقریباً چار سال بڑی ایک بھرپور لڑکی ہے۔ بہت خوبصورت کتابتی چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں، رسیلے ہونٹ، سنہرے بال اور پُرکشش مجرا بھرا جسم۔ وہ ماسی صغراں اور اس کی بیٹی کی نسبت زیادہ صاف ستھری ہو کر آتی ہے۔ وہ یقیناً گدڑی میں اٹھ ہے۔ پہلے دن جب میں نے اسے دیکھا تو میں چونک گیا تھا کہ یہ لڑکی ماسی صغراں کی بہو اور فدا کی بیوی ہے؟ اس کے متعلق بتاتے وقت شعاع کا لہجہ ہمدردی اور تاسف سے لبریز تھا۔ مجھے بھی یہ جان کا بہت افسوس ہوا تھا کہ فدا کی کم عمری اور جنگی کا صرف ایک کمرہ ہونے کی وجہ سے ماسی صغراں بہو کو دن رات اپنے ساتھ رکھتی ہے اور اس ایک

کچے کمرے میں صغراں، اس کا چری شوہر اور ان کے چار بچے بھی رہتے ہیں۔ اب اس کمرے میں پلو کا اضافہ ہو گیا ہے۔ ماسی بہو دن رات گھروں میں کام کر رہی تھیں کہ کسی طرح اتنا جمع ہو جائے کہ ایک اور جنگی ڈال سکیں۔ جہاں پلو اور اس کا شوہر فدا اپنی زندگی گزار سکیں۔ اس میں سال دو سال بھی لگ سکتے تھے۔ اس عرصے میں کم عمر فدا بھی جوان ہو جاتا۔ یہ تمام باتیں مجھے شعاع نے بتائی تھیں جو کہ ماسی نے اس سے کی تھیں۔

مجھے شروع میں اس سے صرف ہمدردی محسوس ہوئی اور بعد ازاں میں نے محسوس کیا کہ پلو کی آنکھیں ہمہ وقت میرا طواف کرتی رہتی ہیں مگر یہ کوئی ایسی خاص بات نہ تھی۔ پھر میں نے نوٹ کیا کہ جب میں کمرے میں ہوتا تو وہ صفائی کے بہانے بہت دیر تک کمرے میں رہتی۔ جب میں شعاع کے ساتھ ہنس بول رہا ہوتا تو اس کی خوبصورت آنکھوں میں حسرت اور اداسی ہوتی۔ میں نے اسے اس کا احساس محسوس کر دیا اور یہ سوچ ہمدردی سے معمور ہوتی۔ میں اپنے آپ کو سمجھاتا، سمجھاتا کہ ایک معمولی سی نوکرانی کے لیے مجھے ہر وقت نہیں سوچنا چاہیے۔ اس حلقے میں ایسی ہزاروں ہوں گی جن کے ساتھ یہی کچھ ہوتا ہوگا مگر دل کسی ضدی کی طرح اصرار کرتا کہ نہیں، ایسی کم از کم کوئی نہیں ہوگی۔ نوکرانی ہے تو کیا ہوا؟ یہ بھی تو انسان ہے۔ اور پھر ایسی بھرپور جوان لڑکی شادی کے نام پر مصلوب کر دی جائے، اس کے جذبات کا گلا گھونٹ دیا جائے اور شوہر کی کم عمری کے باعث ماسی کے ساتھ رہنے پر مجبور کیا جائے، یہ کہاں کا انصاف ہے؟ ایسے میں اگر وہ کسی اور مرد میں دلچسپی لے رہی ہے تو یہ قطری بات ہے، اس کی حرکات کا تجزیہ کر کے میرا دل اس کے حق میں دلائل دیتا اور میں فوراً قائل ہو جاتا۔

میری بیوی اس کی فرمانبرداری اور سلیقے کے باعث کافی مہربان تھی۔ اس نے پلو کو اپنے بہت سے کپڑے حتیٰ کہ اس کی لپٹائی ہوئی نظروں کو دیکھ کر کچھ معمولی سا آرٹیفیشل زیور اور ریڈ کلر کی لب اسٹک تک دے دی۔ کچھ دن بعد اچھی خوراک، صاف اور اچھے لباس اور ہلکی پھلکی جیولری نے اس کا حلیہ بالکل بدل دیا۔

وہ میرے تمام کام بھاگ بھاگ کر کرتی۔ بچے بھی اس سے بہت خوش تھے اور شعاع بھی اس سے مطمئن دکھائی دیتی تھی۔ بہت مدت بعد اسے گھریلو مصروفیات سے کچھ آزادی ملی تو اس کی باہر کی مصروفیات بڑھ گئیں۔ سہیلیوں اور رشتے

داروں سے ملنا ملنا اور شاپنگ وغیرہ کے علاوہ رکے ہوئے بہت سے کام اسے یاد آ گئے۔

آفس سے واپسی پر شعاع مجھے گھر پر بہت کم ملتی۔ ماسی صغراں تو بارہ بجے کے بعد دوسرے گھروں کے کام کرنے چلی جاتی۔ البتہ پلو مغرب کے وقت تک یہیں رہتی۔ شعاع نے اضافی تنخواہ دے کر اس کا ٹائم بڑھالیا تھا۔ بعد از مغرب بھی فدا اور کبھی صغراں اسے آ کر لے جاتے۔

وقت گزرنے کا پتا بھی نہ چلا اور اسے ہمارے ہاں کام کرتے ہوئے مہینا گزر گیا۔ وہ اب اس گھر کا ایک اہم فرد بن چکی تھی اور مجھ سے تو بہت فری ہو چکی تھی بلکہ میری زندگی کا اہم حصہ بن چکی تھی۔ اگر کسی دن وہ نظر نہ آتی تو میں بے چین سا ہو جاتا۔ شعاع میرے اضطراب کو محسوس کر کے فوراً بتاتی کہ آج پلو فلاں بجوری کے باعث نہیں آ سکی اور میں چور سا بن جاتا۔ فوراً دھڑا دھڑا کر کے یہ ظاہر کرتا کہ اس معمولی نوکرانی کے بعد آنے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑا۔ اب شعاع مطمئن ہوئی یا نہیں اس نے مجھے بھی بتایا نہیں۔ پلو شاف و ٹا درہی چھٹی کرتی ورنہ وہ بہت رکیور تھی۔

"صاحب، یہ آپ کے کپڑے میں نے استری کر دیے ہیں۔ صاحب چائے لادوں؟ صاحب کیا چاہیے؟" وہ ہر وقت مستعد اور کھلی ہوئی دکھائی دیتی۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو وہ فوراً قبول کے جس کی طرح ہلکے جھپکتے حاضر کر دیتی۔

ایک دن میں شام کوئی وی لاؤنج میں بیٹھائی وی پر بیٹھ دیکھ رہا تھا۔ بچے ڈرائنگ روم میں ٹیوٹر سے پڑھ رہے تھے اور شعاع کسی تقریب میں گئی ہوئی تھی۔ پلو چائے کا کپ لے کر آ گئی۔

"لیجئے صاحب!" اس نے کپ میری طرف بڑھایا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ شعاع کا جامنی رنگ کا جارجٹ کا سوٹ جس پر زرد کڑھائی کی ہوئی تھی، اس کے بھرے بھرے گداز جسم پر بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ آج خلاف توقع اس نے سرخ لب اسٹک بھی لگا رکھی تھی اور مجھے یوں لگا کہ اس کے ہونٹوں کی جگہ دو انکار سے دھبے رہے ہیں۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہیں صاحب؟" وہ اٹھلائی۔ میری محویت نے اس کی نسوانی جبلت کو بیدار کر دیا تھا مگر شرمائے کے بجائے اس نے اپنے آپ کو مزید نمایاں کرنے کی کوشش کی تو میں بھی بے باک ہو گیا اور مسکراتے ہوئے بولا "پلو! اتنا بہت خوبصورت ہو۔"

البرٹ آئن اسٹائن سے کسی نے پوچھا "تیسری عالمی جنگ میں کون سے ہتھیار استعمال ہوں گے؟" اس نے جواب دیا "زمانہ اتنی تیزی سے ترقی کر رہا ہے کہ یہ بتانا مشکل ہے البتہ یہ بتا سکتا ہوں کہ چوتھی عالمی جنگ میں کون سے ہتھیار استعمال ہوں گے۔" "کون سے؟" سائل نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"پتھر!" آئن اسٹائن نے جواب دیا۔
مرسلہ: نعمانہ جعفری، راولپنڈی

"کہاں صاحب، میں کہاں خوبصورت ہوں؟ خوبصورت تو وہ ہیں جو آپ کے ساتھ رہتی ہیں۔" اس کا اشارہ واضح طور پر شعاع کی طرف تھا۔ پھر وہ آنکھوں میں آنسو اور لہجے میں حسرت بھر کر بولی "مجھے تو آپ نظر بھر کر بھی نہیں دیکھتے۔"

اس کی بات سن کر میں متحیر رہ گیا۔ اس کی حرکتوں سے چٹا تو صاف چلتا تھا کہ وہ خود سراپا سپردگی بنی ہوئی تھی لیکن منہ سے اظہار نہ کر رہی تھی۔ کیا تھا اور پھر پتا ہی نہ چلا کہ کس طرح وہ میرے جوابوں پر چھائی۔ کبھی اگر میں اخبار پڑھ رہا ہوتا تو وہ تصویریں دیکھنے کے بہانے مجھ پر تقریباً گری پڑتی اور میں اسے چھونے کو بے قرار ہو جاتا مگر شعاع کے تصور اور گھر کے تقدس نے میرے دل و دماغ پر پوری طرح گرفت قائم کر رکھی تھی اس لیے میں صرف سوچ کر رہ جاتا مگر خواہش کو عملی جامہ بھی نہ پہنا سکا۔ شعاع کے بے انتہا التفات اور ناز و دار یوں کو دیکھ کر بھی کبھی میں اپنے اوپر لعنت بھیجتا کہ میں ایسی پیاری بیوی کے ہوتے ہوئے ایک کام کرنے والی معمولی عورت کے چکر میں پڑ گیا ہوں مگر پلو کے ناز و انداز دیکھ کر میری توبہ ٹوٹ جاتی۔

میں آفس سے سیدھا گھر آتا اور اس وقت تک گھر پر موجود رہتا جب تک پلو اپنے گھر نہ چلی جاتی۔ موقع پا کر پلو کو کوئی نہ کوئی گفٹ بھی دے دیتا۔ گفٹ پا کر وہ اور بھی کھل اٹھتی۔ اب وہ اٹھلا اٹھلا کر فرمائشیں بھی کرنے لگی تھی اور میں بھی جی جان سے اس کی فرمائشیں پوری کرنے لگا۔

ایک دن جب شعاع بچوں کو لے کر اپنے بیگ لگی ہوئی تھی، پلو میرے پاس آ کر صوفے پر بیٹھ گئی بلکہ تقریباً مجھ سے جڑی گئی اور رو کر برا حال کر لیا۔ کچھ اس کی قربت اور کچھ

اس کے رونے سے میں تقریباً بولکھلا گیا۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ کچھ دنوں بعد دوسری جنگی ڈل جائے گی۔ یوں اسے اب باقاعدہ اپنے کم عمر شوہر کے ساتھ رہنا ہوگا اور جب وہ شاید کام کرنے بھی نہ آ سکے گی کیونکہ فدا کو اس کا کام کرنا پسند نہیں۔ یہ سن کر میں بھی پریشان ہو گیا اور ہاتھ تھام کر بولا۔

”نہیں پلو! کام مت چھوڑنا۔ شعلات تم سے بہت پیار کرتی ہے اور تجھے بھی تمہارے عادی ہو گئے ہیں۔“

”اپنی بات کریں۔“

”بی۔ پلو۔“ میں جذباتی ہونے لگا۔ ”مم۔۔۔ میں جھپیں ب۔۔۔ بہت چاہنے لگا ہوں۔“ میرا چہرہ ہنسنے لگا اور زبان لڑکھانے لگی۔

”اچھا۔۔۔!“ وہ ہنسی ”مگر میں تو فدا کی بیوی ہوں۔“

میں چپ سا ہو گیا مگر پھر وہ فوراً ہی بول اٹھی ”صاحب! اگر آپ چاہتے ہو کہ میں یہیں آپ کی نظروں کے سامنے رہوں تو مجھے فدا سے طلاق لینا ہوگی۔“

جوابات میرے دل میں بھی اور کہتے ہوئے ڈرتا تھا وہ اس نے بڑی آسانی سے کہہ ڈالی اور میں کھل اٹھا۔

”مگر صاحب۔۔۔ اس کے لیے۔۔۔“ وہ آدمی بات کہہ کر سوچ میں ڈوب گئی۔

”ہاں ہاں پلو! بولو کیا کہنا ہے؟ کیا کہنا چاہتی ہو؟“ میں نے بے تابی سے اس کی حوصلہ افزائی کی۔

”اصل میں ہمارا وعدہ سٹہ ہے۔ اگر طلاق لوں گی تو میرے بھائی کا گھر اجڑ جائے گا اور میرے گھر والے آکر مجھے لے جائیں گے۔“ یعنی اس طرح بھی پلو میرے ہاتھ نہ لگتی، میں پریشان ہو گیا۔

”کوئی حل سوچو پلو!“ میں بے قراری سے بولا۔

وہ بہت دیر سوچ میں ڈوبی رہی اور بولی ”ہاں البتہ ایک حل ہے۔“

”وہ کیا ہے؟“ میں بے تاب ہو گیا۔ اب میں مکمل اس پر انحصار کر رہا تھا۔

”اگر کہیں سے دس ہزار روپے مل جائیں تو میں شنو اور ماسی کو دے دوں گی۔ مگر دس۔۔۔ دس ہزار آئیں گے کہاں سے؟“ وہ ماتھے کو انگلیوں سے مسلتے ہوئے اڑھد پریشان لگ رہی تھی۔

”صرف دس ہزار۔۔۔؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں! اگر اتنی رقم مل جائے تو میرے بھائی کا گھر بسا رہے گا کیونکہ میرے بدلے انہیں دس ہزار مل جائیں گے

اور پھر میں آزاد ہو جاؤں گی اور پھر میری مرضی ہوگی جہاں چاہے رہوں۔“

میں نے جوش جذبات میں آکر اسے بازوؤں میں تھام لیا۔ ”بس اتنی سی بات؟ میں تمہاری قربت کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔“

دس ہزار میرے لیے سگریٹ کی ایش سے بھی زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے اور میری کھوپڑی پر پڑی ہوئی برف میں مزید اضافہ ہو گیا۔ مجھے اس وقت صرف پلو کا حصول نظر آ رہا تھا۔ میں نے سوچنے میں وقت ضائع کرنے کے بجائے سیف میں سے دس ہزار نکالے اور پلو کی گود میں ڈال دیے۔

پلو کو اتنی جلدی اپنی آرزو کی تکمیل کی شاید توقع نہیں تھی۔ اتنے روپے دیکھ کر اس پر شادی مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی۔

”پلو! یہ فدا کے منہ پر آج دے مارنا اور کل آزاد ہو کر آ جانا۔ پھر تمہارے متعلق کچھ سوچیں گے۔“ میں نے بڑے

شہانہ انداز میں کہا مگر وہ میری بات سن ہی نہیں رہی تھی۔ وہ جیسے جاگتے میں کوئی خواب دیکھ رہی تھی اور خوشی سے آنکھوں میں جھنجھک رہے تھے اور میں اس کی کیفیت سے محفوظ ہو رہا تھا۔ اب مجھے کسی کی بھی پروا نہیں تھی۔ اب پلو مکمل میری دسترس

میں ہوئی۔ میں شادی کے بعد اسے علیحدہ فلیٹ لے دوں گا۔ اب میں اسے چھو سکوں گا اور۔۔۔ اس سے آگے میں نہ سوچ سکا کیونکہ اسی وقت باہر سے فدا اور رشید کی آوازیں آنے لگیں اور میں بد مزہ ہو گیا۔

میں نے اپنے آپ کو تسلی دی کہ چلو صرف آج کی بات ہے۔ کل پلو مکمل یہیں آ جائے گی۔ اسی وقت فون کی کھنٹی بجی۔

میں فون کی طرف بڑھ گیا اور پلو باہر کی طرف لپکی۔ فون سن کر میں دوبارہ لاؤنج میں آیا تو وہاں پلو نہ تھی۔ میں نے رشید کو آواز دی مگر وہ بھی شاید باہر لان میں تھا۔ میں تنہائی سے گھبرا کر گاڑی کی چابیاں اٹھا کر پورچ کی طرف بڑھا۔

پورچ کے باہر اندھیرا سا تھا اور پودوں کی بازوؤں کے قریب سے سرگوشیوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں ٹھنک گیا۔ مزید آگے بڑھا تو سن ہو کر رہ گیا۔ وہ بلاشبہ پلو تھی اور اس کی آواز میں فدا کے لیے مضاس ہی مضاس تھی۔ ”بس فدا، تو ان بیسوں کو فوراً چھپالے، پورے دس ہزار ہیں۔ اب ہم اپنا پکا کوشا (کرا) ڈالیں گے، ایک کھڑا (چار پائی) خریدیں گے اور عیش کریں گے۔“

”دیکھ۔۔۔ پلو، سچ بتا میرے صاحب نے آخر اسے پیسے تجھے کیوں دیے؟“

”مجھ پر شک کرتا ہے؟“ وہ غرائی۔

”نہیں، پوچھتا میرا فرض ہے۔ آخر میں تیرا گھر والا ہوں۔“ وہ بالشت بھر کا لڑکا اس پر رعب ڈال رہا تھا اور وہ اس کے آگے کچھ جاری تھی۔ وہ رشیم سے لپچے میں بولی۔

”پاکل ہوا ہے۔ شک نہ کر مجھ پر، آخر میں تیری عزت ہوں۔۔۔۔۔“ پھر وہ مضبوط لپچے میں بولی ”کوئی مجھے ہاتھ تو لگائے۔ ٹوٹے ٹوٹے کر دوں گی۔“

میں نے مزید ایک قدم آگے بڑھایا تو وہ دونوں مجھے نظر آ گئے۔ وہ پیسے رومال میں باندھ کر کھڑی ہو رہی تھی ”فدا! جب صاحب شعلات بی بی سے پیار محبت سے بولتا تھا تو میرا سارا پنڈا جل اٹھتا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ تو بھی مجھے اسی طرح پیار کرے۔ میں بھی تیرے ساتھ رہوں۔ آخر کب تک اماں میرا سایہ بنی رہے گی۔“ اس کے لپچے میں صدیوں کی پیاس بھی مگر میں غصے سے گائب رہا تھا اور وہ مجھ سے بے خبر سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے فدا کو بتا رہی تھی ”صاحب اور بیکم صاحبہ کے ٹھاٹ دیکھ کر میں نے ایک چال سوچی۔ آخر ہم کیوں ہر چیز کو ترسیں۔ حتیٰ کہ دوسری صحبت کے لیے بھی ہمارے پاس پیسے نہ تھے کیونکہ ہم غریب ہیں۔ بس جو میں نے سوچا وہ پورا ہو گیا۔ اب تو چل کوئی آنے جائے۔“

”آف، کس بری طرح بے وقوف بنایا ہے مجھے۔ میرے دماغ پر بھی برف پھیلنے لگی، میں تھلا اٹھا“ تو پلو، تم نے مجھے مجھے بے وقوف بنایا۔ محبت کا نالک رچایا۔“ میں ایک دم دباڑا۔

پیلے تو وہ دونوں گھبرا گئے مگر پلو بہت جلد سنبھل گئی۔

”دیکھو صاحب، چلاؤ مت۔ جو خود بے وقوف بننا چاہے کوئی اس کا کیا کر سکتا ہے؟“

”تم یہ پیسے لے کر نہیں جا سکتیں۔ میں ابھی پولیس کو فون کرتا ہوں۔“

وہ ذرا بھی نہ گھبرائی اور چمک کر بولی ”میں بھی شور مچا دوں گی کہ تم نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے اور میری عزت کا سودا کرنے کے لیے تم نے خود یہ پیسے مجھے دیے ہیں۔“ اور ساتھ ہی عملی مظاہرہ بھی کر دیا یعنی زور زور سے چلائے لگی ”بچاؤ بچاؤ، مجھے بچاؤ۔“

میں اس صورت حال کے لیے تیار نہ تھا۔ گھبرا گیا اور زور سے چلا یا ”بکواس بند کرو اور یہاں سے دفع ہو جاؤ ورنہ۔“

”بچ پولیس کو بلا لوں گا۔“ اپنی آواز کا کھوکھلا پن مجھے خود بھی سنائی دے رہا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ اس کی چیخ پکار سے آس

ایک زمانہ تھا جب مشاہیر عالم خوشی خوشی دنیا میں آیا کرتے تھے اور برسوں یہاں مقیم رہتے تھے۔ بعض اوقات تو ایسا بھی ہوا ہے کہ دنیا کے کسی ایک ہی علاقے میں کئی مشاہیر عالم کیے بعد دیگرے پیدا ہو گئے اور ہم عصر بن کر جیتے رہے۔ ان مشاہیر میں بھی مناقشے برپا نہیں ہوئے۔ ان سب میں ان دنوں بڑا اتفاق ہوا کرتا تھا (اب جو کچھ رہا سہا اتفاق دنیا میں باقی ہے وہ صرف حسن اتفاق ہے۔ اتحاد بھی پایا جاتا ہے لیکن یہ صرف سازشوں اور منصوبوں کو ناکام بنانے کے لیے استعمال ہوتا ہے) قدیم مشاہیر عالم اپنی جگہ علم و دانش کی شمشیر برہنہ تھے لیکن ان میں سے کسی نے بھی اپنے لیے علیحدہ علیحدہ دنیا نہیں بنائیں۔ سمجھوں نے ایک ہی نیام میں رہنا قبول کیا۔ مشاہیر عالم یوں تو دنیا کے ہر علاقے میں نمودار اور وقوع پذیر ہوتے رہے لیکن عام طور پر یونان کا علاقہ انہیں بہت مرغوب ہوا کرتا تھا (یونانی حسن خود بہت مشہور چیز ہے اور کون سا مشاہیر عالم کسی دوسری جگہ پیدا ہو کر کفران نعمت کا الزام اپنے سر لیتا) یونان میں اور شاید روم میں بھی اچھی صحبتیں میسر تھیں اور مشاہیر اپنے اپنے خیالات تو سب کے لیے کے بغیر دوسروں کے گوش گزار کر سکتے تھے۔ کچھ مشاہیر عالم جو تنہائی پسند تھے، اپنے خیالات دیواروں کو سنا کر مطمئن ہو جاتے تھے۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ دیواریں بھی کان رکھتی ہیں (ان میں سے کئی کے رٹھات دماغ ہم تک نہیں پہنچ پاتے ہیں) ان مشاہیر عالم کی بیویاں بھی ہوا کرتی تھیں لیکن نہ تو وہ ان کی دانشوری کے راستے میں حائل ہو سکتی اور نہ اپنے اپنے شوہروں کی افسر راہلہ عامہ بنیں۔ (بیویاں صرف ازدواجی معاملات میں دخل تھیں اور وہ بھی ایک مناسب حد تک) ان مشاہیر عالم نے دنیا میں بہت روشنی پھیلانی لیکن عقیدت مند تو یہ تک کہتے ہیں کہ اگر چاند سورج کسی کے کہنے میں آکر کبھی دھرتا دے کر بیٹھ جائے یا کم روشنی دو کی تحریک شروع کر دیں تب بھی ان مشاہیر عالم کی پھیلائی ہوئی روشنی سب کے لیے ہوگی۔

یوسف ناظم کی کتاب ”بالکلیات“ سے انتخاب

مرسلہ: احمد بشیر چینی، لاہور

263

262

261

260

259

258

257

256

255

254

253

252

251

250

249

248



پل کی خبر نہیں

جناب ایڈیٹر صاحب
السلام علیکم

ایک ایسا واقعہ بھیجا ہے جو قابل عبرت ہے۔ بس نام مقام میں تبدیلی کردی ہے کیونکہ یہ تمام لوگ ذی حیثیت ہیں اور مجھ جیسے قلمکار کو منجھڑ کی طرح مسل دیں گے۔ اسی وجہ سے میں نے اسے افسانوی انداز میں بیان کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ انداز آپ کو بھی پسند آئے گا۔
بارون اشرف
(لاہور کینٹ)

ہوئے کہا۔
”بیچ کھیلنے کا مزہ ہے سردیوں میں یا گرمیوں میں اریلی مورنگ!“ کرمانی صاحب نے اظہار خیال کیا۔
”بس ایک بار آدمی کا ٹیپو خراب ہو جائے پھر کھیل اچھا نہیں ہوتا۔“ میرے نے اسکو اش کا گلاس لا کر فراز کے سامنے پیش کیا۔ ”اس بار تو میں اچھا نہیں کھیل سکا۔ آپ اُسے جانتے ہیں؟ کون ہے وہ آدمی؟“ اس نے کرمانی صاحب سے پوچھا۔
”کون.....؟ وہ جو تمہارے ساتھ کھیل رہا تھا؟“
”ہاں وہی۔“

انسان کی زندگی کیا ہے؟ پانی کا بلبلہ پھر بھی چین نہیں۔ یہی بات کہانیوں کو جنم دیتی ہے۔ اب بختیار اور کرمانی صاحب ہی کا واقعہ لے لیں، وہ شروع گرمیوں کی ایک نیم گرم شام تھی۔ تھکی ہوئی گرم ہوا کے جھوکے آرہے تھے۔ گولف کورس کے وسیع و عریض، ہرے بھرے فیروز پر کھیلنے والے کھیل کے تھے اور تھک ہار کر چھوٹے چھوٹے سفید تولیوں سے پسینا پونچھتے، کلب ہاؤس میں آ کر بیٹھ رہے تھے اور بیرے سرعت سے ان کے پاس پہنچ کر مشروبات کے آرڈر لے رہے تھے۔
”گرم دن ہے آج کرمانی صاحب! فراز نے بیٹھے

دونوں جیزوں کو ہاتھ سے ملا کر میرا منہ بند کر دیا۔ اسے میرے افیئر کی تمام تفصیل معلوم تھی۔ وہ ایک ایک کر کے بتاتے گئے۔

”مگر..... مگر تم نے مجھے یہ سب کرنے کی اجازت کیوں دی..... تم نے اپنا حق کیوں نہ استعمال کیا۔ تم نے مجھ سے لڑائی کیوں نہ کی؟“ میں نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔

وہ بڑی رسان سے بولی ”اس لیے آئی کہ میں جانتی تھی کہ ایسے میں سر کو قائل کرنا یا تصحیح کرنا، تیل کو سرخ کپڑا دکھانے والی بات ہوتی ہے اور ویسے بھی یہ دو ککے کی معمولی نوکرانی تمہارے لیے محض ایک نیا اور عجیب کھلونا تھی۔ وہ تمہاری محبت نہیں تھی، اس کی کھلی دعوت تمہارے لیے ترغیب تھی۔ اگر ایسی ہی کوئی دعوت گھر سے باہر ملتی تو میں بے خبر لڑتی۔ میں اس کا توڑ کیسے کرتی؟ میں نے خود تمہیں تنہائیاں فراہم کیں مگر ایک حد تک۔ کیونکہ میں جانتی تھی کہ ایسے وقت تم سے الجھنا مناسب نہیں بلکہ بہت جلد تمہیں میری محبت اور اس کی ہوس تمہیں گھر کا راستہ دکھا دے گی۔ مجھے اپنے آپ پر اور خدا کی ذات پر بھروسہ تھا۔“ اس کی آنکھیں جھمی ہوئے لگیں تو میں شرمندہ ہو گیا۔

”مگر تمہیں کیا معلوم کہ میں نے حد پھلانگی کہ نہیں؟“ میں نے اسے افسوس کیا۔

”جناب، ایک تو آپ کی شرافت کا یقین تھا، دوسرے رشید..... اپنا لگ، مالی، چوکیدار میرے جاسوس بن گئے۔ وہ آپ پر اور پلو پر نظر رکھتے تھے اور ساری رپورٹ مجھے دیتے تھے۔ اور آج کے ٹریجڈی کے ڈراما پلین کے چشم دید گواہ بھی ہیں وہ۔“

یہ سن کر مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ شعاع کھٹکھٹا کر ہنس پڑی۔ اس کی آنکھوں میں چاہت کے رنگ تھے اور میں کتنا بڑا احمق تھا کہ چاہت کے اصل رنگ چھوڑ کر اندھیروں کے پیچھے چل پڑا تھا۔

میں نے کہا تھا کہ وہ عام عورتوں اور عام بیویوں سے قطعاً مختلف ہے۔ اس نے میری بے وفائی پر چشم پوشی کر کے بڑے صبر اور طریقے سے مجھے دوبارہ مکمل ڈال لی تھی۔ میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی ”مجھے معاف کر دینا؟“

وہ مسکرائی ”صبح کا بھولا اگر شام کو گھر آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔“ اور میں نے اطمینان کا سانس لے کر شعاع کی جگہ گاتی آنکھوں پر اپنے لب رکھ دیے۔

پڑوس کے لوگ جو کئے نہ ہو جائیں۔ یہ ایک پوش علاقہ تھا اور کوئی کسی کے معاملے میں نہیں پڑتا۔ پھر بھی مجھے اپنی عزت بہت عزیز ہے۔ اسی وقت رشید کہیں سے آ گیا اور میری مدد کو لپکا۔ پلو نے ایک حقارت بھری نگاہ مجھ پر ڈالی اور ”ہونہہ“ کہہ کر گردن کو جھٹکا دیا اور قدو کا ہاتھ پکڑ کر جانے لگی۔

اس سارے تماشے میں قدو ہکا بکا خاموش کھڑا رہا۔ وہ جاتے جاتے پلٹ کر بولی ”صاحب! شعاع بی بی واقعی بہت اچھی ہیں، وہ غم سے بہت پیار کرتی ہیں مگر تم پیار کی قدر کیا چاہو؟“ یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئی۔

اس کی حقارت بھری وہ نگاہ اور آخری جملہ مجھے نظروں میں گرانے کے لیے کافی تھا۔ میں تھکے تھکے قدموں سے واپس آ کر بیڈ پر ڈھیر ہو گیا۔

☆☆☆

رات کو میں نے اپنی کوتاہیوں اور بے وفائی کی تلافی کے طور پر شعاع پر اپنے پیار کی برسات کر دی اور بولا۔ ”شعاع مجھے معاف کر دو۔ میں بہت برا ہوں۔“

شعاع بڑے مریبانہ انداز میں بولی ”نہیں آفاق، یہ عمر ہی ایسی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ Forty is Naughty۔“

”کیا مطلب؟“ میں گھبرا گیا۔
”ہاں آفاق، مجھے سب پتا ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ میں بہت بے خبر ہوں مگر ایسا نہیں ہے۔ میں نے تمہیں خود ڈھیل دی تھی کیونکہ میں جانتی تھی کہ تم تھوڑی سی بے وفائی تو کر سکتے ہو مگر میرا مان نہیں چھین سکتے۔“ اب وہ تابو توڑ جملے کر رہی تھی۔ میں متحیر سا اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”آفاق!“ وہ بہت پیار سے بولی۔ ”جب شوہر ٹریک سے اترتا ہے تو سب سے پہلے بیوی کو پتا چلتا ہے کیونکہ اس کے اندر خطرے کی گھنٹی بج اٹھتی ہے اور خطرے کی یہ گھنٹی پہلے ہی دن جب تم نے چوک کر بلو کو دیکھا تھا تو میرے اندر بج اٹھی تھی۔ میں جان گئی تھی کہ صرف مجھ پر مرنے والا اور کسی دوسری کو خاطر میں نہ لانے والا میرا پیارا شوہر کام سے گیا اور یہ میری اپنی حکمت عملی تھی کہ میں نے خود تمہیں مناسب حد مہیا کی کہ تم بے وفائی کا یہ کھیل، کھیل سکو۔ میں نے ایک رسک لیا تھا اور خدا کا شکر ہے کہ اس فضول افیئر کا ڈراما سین جلد ہو گیا اور لوٹ کر بدھو گھر کو واپس آ گئے ہیں۔“ لہجہ شوخی سے بھرا تھا۔

میں حیرت سے منہ پھاڑے اسے دیکھ رہا تھا۔ شاید میرا منہ زیادہ ہی کھل گیا تھا کیونکہ اس نے بڑی نرمی سے میرے

سگریٹ اور ہر نشے سے چھٹکارا ہمیشہ کیلئے



1 cigarette swallows
7 minutes of your life

تمباکو نوشی کا انجام - زندگی کا خاتمہ تمام



Reasons To Quit
SMOKING



اپنے اور اپنی فیملی کو کینسر سے بچائیں اور صحت پائیں۔
اپنے قریبی ہو میومیڈیکل اور سپر سٹور سے طلب فرمائیں۔

100% Result, No any Side effects, none toxic speedy treatment

ایلو ویرا
بے پناہ طاقت اور قوت کی واحد آزمودہ دوا
واعصابی کمزوری، جسمانی تھکاوٹ اور خاص
کیسپول: طور پر شوگر کے مریضوں کیلئے خاص تحفہ۔

ڈینگی پلس
صرف 3 دن میں ڈینگی بخار کا خاتمہ
انشاء اللہ پلس اور وائٹ سٹری تعداد تارل
بڑوں کیلئے -/Rs. 600
بچوں کیلئے -/Rs. 225

ایما ڈین سکن
نو جوان لڑکے لڑکیاں میں کھل مہاسے، جھوٹا
پائے جاتے ہیں۔ خصوصاً جن کی جلد زیادہ چمکناٹ والی ہو۔ ایما ڈین سکن کے استعمال سے
چہرے پر کھل مہاسے، جھوٹا، دھبے اور جھمکے کے پھوڑے پھٹیاں، ناسور، جھیل، جھلمھری
خاص طور پر آنکھوں کے گرد والے حصوں سے صرف 15 روز میں مہاسے حاصل کریں۔

آسٹھونل (SPRAY)
دور سانس کی دشواری ہر قسم کی الری کیلئے، الری،
دھنکی تھس یا دم تھننے کا احساس، سانس میں دقت ہونا، فلم کا افراز نہ ہونا آسٹھونل کے
استعمال سے سانس کی نالیوں کی سوزش ختم ہو جاتی ہے۔ مریض اپنے آپ کو پر سکون محسوس
کرتا ہے دوسرا الری سے مکمل تباہی مل جاتی ہے۔ خاص طور پر اسلام آباد اور کراچی کیلئے۔

FOREVER Naturo Pharma
Registration no. 613
Health Care Products
10-AI-Hamra Center, 10-Allama Iqbal Road, Bohar Wala Chowk, Lahore.
Ph: 042-36291685, 0345-4036128, 0322-4452133

”اور سناؤ چار منگ یک میں! کیا کر رہے ہو آج کل!“
”نظر ہی نہیں آتے۔“
”آج کل تو کہیں سے اپنے لیے ٹائم ڈھونڈ رہے ہیں
انکل!“ کرماتی صاحبہ نے لگے ”اتنے سارے بڑے بڑے
سنبھالنا کوئی آسان کام تو نہیں ہے۔ مہینے کے آخر میں بہت
تھک جاتا ہوں۔ گھر کو بھی وقت نہیں دے پاتا۔ آخری ویک
اینڈ پر بیوی بچوں کو لے کر دہلی یا مالدیپ چلا جاتا ہوں۔
وہاں کچھ وقت ملتا ہے فیملی کے ساتھ انجوائے کرنے کا۔“
”تو تم اپنا برون ہکا کیوں نہیں کرتے، بزنس سمیت
لو۔“

”دل نہیں چاہتا انکل، آخر اتنی محنت کی ہے۔“
”امپورٹ ایکسپورٹ کی کیا صورت حال ہے؟“
”اے ون۔ ویسے امپورٹ اور انٹرپورٹ ہی زیادہ
ہے۔ ایکسپورٹ کم ہے۔“
”یہ تو ہے۔“

”کراچی میں بندرگاہ کے پاس میں نے انٹرپورٹ
کے لیے تین اور گودام خرید لیے ہیں۔ گودام میں میرے پاس
کافی زمین ابھی باقی ہے۔ ایک ہاؤسنگ سوسائٹی کے بعد بھی
گوداموں کے لیے کافی جگہ نکل آئے گی، بندرگاہ تیار ہے۔“
”تو آتا جاتا کہاں ہے مال!“

”میرا! آپ کو کراچی اور گودام کی اہمیت کا اندازہ نہیں
ہے۔ فارایسٹ خاص طور پر غریب ملکوں اور انڈیا تک سے
سامان منگوا کر ہم ویسٹ میں ایکسپورٹ کر دیتے ہیں۔
ایران میں بھی مارکیٹ ہے اور عرب شیخوں کو جتنا چاہے لوٹ
لو، انہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

”عربوں کی دولت کئی سو سال تک ختم ہوتی نظر نہیں
آتی۔ تیل ختم ہو جائے تو سونے کے پہاڑ پڑے ہیں۔“
”بحرین کا ایک شیخ ہے، فواد بن قاسم الحمینی۔ وہاں کا
بڑا بزنس مین ہے۔ اس کے ساتھ پارٹنرشپ میں، میں امریکا
میں بھی قدم بجا رہا ہوں۔ دیکھیں کیا رزلٹ نکلتا ہے۔“

”تم نہیں گلبرگ والے بنگلے میں ہو؟“
”ابھی تک تو نہیں ہوں۔ مگر اتنے سال یہاں کام
کر کے ایک بات کا مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہ ملک رہنے کے
قابل نہیں ہے۔“

”ہماری ایلیٹ کلاس یہی سوچ رہی ہے گویا تم باہر
جار رہے ہو؟“
”ہاں، یہ گودام والے پروڈیکٹس ختم ہو جائیں تو میں

”کرل امیر حسین!“ وہ مسکرانے لگا ”مجھے معلوم ہے
ابھی تم کیا کہنے والے ہو۔ اس نے تنگ کیا ہوگا۔ اس کے
ساتھ کھینے والا ہر آدمی یہی کہتا ہے۔“
”سر، ایکدم وہابیات آدمی ہے۔ آپ یقین کریں
گے؟ تیسرا ہول ”پارٹری“ تھا۔ اس نے ”ٹی“ پر شارٹ
لگانے میں پورے پندرہ منٹ لگائے۔ خود شات لگانے لگے
تو کوئی نہ بولے اور جب میں شات لگانے لگا تو سلیم صاحب
سے اسٹاک آئیٹج پر لمبی چوڑی بحث شروع کر دی۔ میرا
دھیان نہیں رہا اور شات غلط لگ گیا۔“

”وہ ایسا ہی ہے۔“ کرماتی صاحبہ نے ہنس کر کہا۔
”میرے بڑوں کی توبہ جو میں آئندہ اس کے ساتھ
کھیلوں۔ ویسے آپ کا کوئی پرائز بنا کر مانی صاحب؟“
”فرسٹ گروس۔“

”یہ وٹرنز کے مزے ہیں، کوئی مقابلہ ہی نہیں ہوتا۔“
”مقابلہ کیوں نہیں ہوتا۔ خواجہ صاحب کی گیم دیکھی ہے
تم نے، آج پانچویں ہول پر ان کا بال بکر میں چلا گیا۔ پھر
ہول خراب ہو گیا ورنہ جیت گئے تھے وہ۔ پھر صوفی صاحب
اور سلیمان مجھ سے کہیں بہتر کھلاڑی ہیں۔ دونوں آج نہیں
کیلے۔“

کلب ہاؤس کا دروازہ کھلا۔ ایک بہت خوش لباس
آدمی، عمر پینتیس چالیس کے لگ بھگ، ایک حسین عورت
کے ہاتھ میں ہاتھ دے داخل ہوا۔ شکل کچھ خاص نہیں تھی مگر
انداز ریکسائٹ تھا۔ اس کی بیوی عورتوں میں چلی گئی، وہ کرماتی
صاحبہ کو پہچان کر ان کی طرف بڑھا۔ وہ بھی اسے دیکھ کر
مسکرائے ”وٹنگم مانی بوائے۔ آج راستہ کیسے بھول گئے؟“

”بس انکل، سنا تھا گورنر زکپ ہے۔ سوچا چل کر دیکھتے
ہیں، کوئی پرانے واقف ہی مل جائیں۔“
”فرزاد! ان سے ملو، بختیار حسین لنڈنگ انڈسٹریسٹ۔
ان کی اپنی بلڈنگ کمپنی ہے ”فیکٹورز“ گودام میں ڈولپمنٹ
کر رہے ہیں۔ امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس الگ ہے اور نہ
جانے کیا کیا ہے۔“ وہ دونوں ہنس پڑے۔ کرماتی صاحبہ
نے بیٹھے ہوئے کہا ”میرے بچپن کے دوست بختیار حسین کے
بیٹے ہیں۔ آہ اسی ڈانڈلا سٹائر۔“

”اور آپ؟“ بختیار نے فرزاد کے بارے میں پوچھا۔
”فرزاد احمد! آپ تو کل ٹریڈر ہیں۔“
”اچھا! آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔“ بختیار نے اس
سے معاف کیا۔ فرزاد خاصا مٹاثر نظر آ رہا تھا۔



سوئے کے کنگن

محترمہ عذرا رسول صاحبہ
مودبانہ سلام

امید قوی ہے بخیر و عافیت ہوں گی۔ ایک سچی روداد ارسال کر رہی ہوں۔ امید ہے کہ سرگزشت کے معیار پر پورا اترے گی۔ بہت جلد ایک غزالہ شاہین عبدالقیوم اور آپ بیٹی بھیجنے والی ہوں۔
(حیدر آباد)

مدیر مجھے کوہا تھ میں چمکتا ہوا سونے کا کنگن پہننے کا بہت شوق تھا۔ وہ چار کنگن تھے، مہنگائی کے اس مشکل دور میں ان کے والدین نے ان چاروں کو پہ مشکل اپنے اپنے گھروں کا کیا تھا۔ مدیر بہنوں میں سب سے چھوٹی تھی، اس نے اپنی والدہ سے کہہ دیا تھا کہ اسے جہیز میں کچھ نہ دیں، صرف ایک خوبصورت سونے کا کنگن بنوادیں۔ والدہ چند لمحے حیرت سے اسے دیکھتی رہیں، پھر بولیں۔ ”مدیر جان! ہم سونے کا کنگن دینے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔“

”تو میری شادی نہ کریں۔“ وہ منہ پھلا کے بولی۔
”چل بیٹی، اللہ تجھے تیرے نصیب سے دے گا۔“ تو

سیر یعنی شروع ہو گئی ہے۔ باہر چلتے ہیں۔ ”وہ دونوں باہر جا کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد اتار اُسر نے ویژنز کیلئے گری میں کرمانی صاحب کا نام پکارا۔ وہ مسکراتے ہوئے اٹھ کر انعام وصول کرنے گئے۔ ان کے دوستوں نے ویلڈن کرمانی، گریٹ جاب کرمانی کے نعرے لگائے۔ تالیوں کے شور اور کمرے کے فلپس کے غبار میں وہ ثرائی وصول کر کے واپس آ بیٹھے۔ چائے پر بھی وہ دونوں باتیں کرتے رہے۔ لگتا تھا بختیار نے انہیں پیسا کمانے اور زندگی عیش سے گزارنے کی کئی اور راہیں دکھا دی تھیں۔

چائے کے بعد فراز اپنی گاڑی تک آیا۔ کرمانی صاحب اور بختیار بھی واپس آ رہے تھے۔ فراز نے بڑھ کر کرمانی صاحب سے ہاتھ ملایا۔

”سبارک دسرا“
”جینک یہ فراز“
”کسی دن ہمارے ساتھ بھی کھیلیں۔“
”آف کورس۔ اس سفر سے کو کیسا رہے گا؟“
”بڈا رفل، واو کے سرا“
”او کے فراز، گڈ بائے۔“

گاڑیاں ایک دوسرے کے پیچھے پیچھے کلب سے نکلیں۔ پہلے اشارے پر رکنے کے بعد فراز آگے نکل گیا۔ منوعہ حد تک اونچا و پھیل کیریئر حرک موڑ مڑ رہا تھا۔ اس کا ایک پیسا گرین بلیٹ پر آ گیا۔ فراز اسی وقت اس کے پاس سے گزر گیا۔ ٹرک الٹ کر کرمانی صاحب اور بختیار کی گاڑی پر گر گیا۔ گاڑی بالکل بچک گئی۔

شاید اسی وقت بلوچستان کے مرطوب ساحلوں کے کنارے بسائے گئے ترقی پذیر شہر (جس کی منی عنقریب سونا بننے والی تھی) کے تھکے ہارے مزدور بختیار کی فیلڈ پر سارا دن کام کر کے گھروں کو جا رہے ہوں۔ اسی صبح ہانگ کا ٹنگ سے آنے والا بحری جہاز کراچی کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہو رہا تھا اور بختیار کا سامان اتار کر اس کے گودام میں محفوظ کر دیا گیا تھا۔ پیرس کے ایک خوبصورت علاقے میں اپنے آفس میں مشہور معمار جان پٹیس جزیرے پر ہونے والی تعمیرات کا نقشہ مکمل کر کے خود کو تازہ دم کرنے کے لیے کافی کا ایک پیالہ ہاتھ میں لیے کھڑکی سے باہر بادلوں بھرے آسمان کو دیکھ رہا تھا۔ یہاں فراز حیرت سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ کرمانی صاحب اور بختیار کی لاشیں نکالنا بھی فی الحال ناممکن نظر آ رہا تھا۔

باہر چلا جاؤں گا۔ انڈسٹریز تو میں نے اب تقریباً ختم ہی کر دی ہیں اور اب انڈسٹری میں رہا ہی کیا ہے۔ دن بہ دن زوال کا شکار ہوتی جا رہی ہے۔ اب آپ خود ہی دیکھیں، 12 میں سے 6 گھنٹے اگر لوڈ شیڈنگ رہے گی تو انڈسٹری کیا خاک چلیگی۔ یہ لسانی جھگڑے ہی ختم نہیں ہوتے تو ڈیم کہاں سے بنیں گے۔ ابھی کل ہی میں اخبار میں پڑھ رہا تھا کہ 2012 میں 24 میں سے 18 گھنٹے لوڈ شیڈنگ رہے گی۔ یہ تو حال ہے اس قوم کا۔“

”باہر کہاں جانے کا ارادہ ہے، امریکا؟“
”نہیں انکل، امریکا جا کر میں پابند ہو جاؤں گا۔ میں موبائل رہنا چاہتا ہوں لیکن جہاں بھی بزنس کا موقع ہو، میں وہاں پہنچ جاؤں۔ ایک جگہ بیٹھ کر مجھ سے کام نہیں ہوتا۔ اچھا ایک اور ویکسپ بات آپ کو بتاؤں، جب میں چھپلی بار بحرین گیا تو شیخ فواد نے اپنے جیٹ پر بٹھا کر مجھے گلف کی سیر کروائی۔ ایسے خوبصورت جزیرے ہیں بحرین کی حدود میں۔ بس میں تو انہیں دیکھ کر پاگل ہی ہو گیا۔ بس اسی وقت جزیرہ خرید لیا۔ جنت ہے بائے گاؤ!“

”ماروس۔۔۔۔۔ تم نکلے کبھی کے اصل جانشین۔ کسی دن چاند پر بھی پہنچ جاؤ گے۔“ بختیار قہقہہ لگا کر ہنسا۔ پھر اس نے پیرے سے کاغذ منگوائے اور قلم سے اس پر جزیرے کا نقشہ بنا کر کرمانی صاحب کو سمجھانے لگا۔ فراز انہیں رشک سے دیکھ رہا تھا۔

”میں نے ایک فرنج آرکیٹیکٹ کنسلٹ کیا ہے۔ اس نے کچھ اس طرح سے نقشہ بنایا ہے۔۔۔۔۔ یہ دیکھیں، یہاں پہلی پیڈ اور اس کے بالکل دوسری طرف چھوٹی سی جیٹی۔ یہ درمیان میں رہا کشتی حصہ۔ انکل، زندگی کا مزہ آ جائے گا۔ بڑا ماہر آرکیٹیکٹ ہے۔ یہاں تک کہ اس نے باغات ڈیزائن کیے ہیں۔ جزیروں کی پلاننگ کے لیے مشہور ہے۔“

”یار بختیار! تم تو بڑے استاد نکلتے۔ اپنے لیے جنت ڈھونڈ نکالی۔ میرے لیے بھی کچھ انتظام کرو۔“

”آپ جب حکم کریں، شیخ فواد کا بڑا گہرا دوست آئے لینڈ ڈویل کرتا ہے۔ آپ کو آسانی سے مل جائے گا۔“

”قابل اعتماد لوگ ہیں ناں؟“
”آپ بس مجھ پر یقین رکھیں۔ ابھی میرے ساتھ چلیں اور مجھے اپنا پاسپورٹ دے دیں۔ شیخ فواد بڑا لکڑا دے گا اور اگلے دیک اپنڈ پر میرے ساتھ چل کر جزیرے دیکھ لیں۔“
”ونڈرفل! میرے خیال میں پرائز ڈسٹری بیوشن

یہ تو اس کا نکلن بھی ہمارا ہوا۔ مدیحہ نے عجیب سی بات کہی تھی۔ واقعی، نکلن اس کی زندگی تھی۔ واجد نے تیز نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ اتنے میں نورین ادھر آ گئی۔ واجد نے زیورات کے ڈبے اسے دیتے ہوئے کہا کہ وہ انہیں سنبھال کر والدہ کو دے آئے۔ نورین چلی گئی، مدیحہ دل میں کھول کے رہ گئی۔ رات تین بجے پیاس کی شدت سے واجد کی آنکھ کھل گئی۔ ننھا فائز سو رہا تھا۔ مدیحہ کمرے میں نہیں تھی۔ واجد نے گھڑی دیکھی اور کمرے سے باہر آ گیا۔ وہ اس وقت ای جان کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں گہری خاموشی تھی۔ پھر وہ گھوم کر گھر کے عقب میں آیا جہاں بیٹم کا درخت تھا۔ چاندنی رات تھی۔ درخت کے تنے سے لگی ٹیٹھی مدیحہ اسے کچھ سوچتی نظر آئی، وہ حیرت سے اس کے قریب آ گیا۔

”کیا بات ہے، تم یہاں اس وقت کیا کر رہی ہو؟“ واجد نے کہا۔

مدیحہ کھڑی ہوئی ”کچھ نہیں، یونہی کچھ سوچ رہی تھی۔“

”وہی تو میں بھی پوچھ رہا ہوں کہ کیا سوچ رہی ہو؟“ واجد نے فیصلی آواز میں کہا۔

”سوچ رہی ہوں، میرا شوہر مجھے سونے کا نکلن بنوا کے

اسے نکلن کہاں سے دلاؤں۔“ وہ پریشانی کے عالم میں کمرے سے نکل آیا۔ اسے لگا مدیحہ کی یہ خواہش اس میں آکسیجن کم کر دیتی ہے۔ دل کو زخمی کر دیتی ہے۔ روح تک چھلنی ہو جاتی ہے۔ اگلے ماہ امی جان کی آنکھوں کا آپریشن بھی کرانا تھا۔ ادھر نورین کی سسرال والے شادی کی جلدی کر رہے تھے۔ ہاشم بھائی نے نورین کی شادی کے لیے زیور اور کھانے کے علاوہ مال کے اخراجات کا وعدہ کر لیا تھا لیکن اس کے علاوہ فرنیچر، کپڑے اور دیگر ہزاروں اخراجات کی ذمہ داری واجد پر تھی۔

واجدہ پہلے ہی اس صورت حال سے پریشان تھا مگر مدیحہ کے سونے کے نکلن کی خواہش اس کے پاؤں کی زنجیر بن گئی تھی۔ وہ مدیحہ کو کب سے نال رہا تھا۔ اگلے ماہ ہاشم بھائی اور اس نے مل کر اپنی والدہ سیکینہ بیگم کی آنکھوں کا آپریشن کروا دیا۔ آپریشن کامیاب رہا لیکن بعد میں مسلسل آنکھوں کی دواؤں کا استعمال لازمی ہو گیا تھا۔ نورین اور مدیحہ نے دل سے ان کی خدمت کر کے دعا میں سبھی تھیں۔ دو ماہ بعد نورین کی شادی کی تاریخ طے ہو گئی۔ واجد اپنی بہن کو بہت کچھ دینا چاہتا تھا لہذا اس نے آفس میں ٹیٹھی کے لیے بات کی جنوری طور پر قبول کر لی تھی۔ اس کے پاس کچھ مانڈر بھی پڑے تھے جنہیں اس نے کیش کروا دیا۔ بینک میں کچھ سیونگ رکھی تھی، سب مل کر تقریباً پونے دو لاکھ تھے۔

استاد بھائی اور ہاشم بھائی زیورات لے آئے، ان میں نورین کے لیے ایک سونے کا نکلن بھی تھا۔ چمکتا دیکتا، ٹیٹھوں سے جگمگاتا، جھللاتا۔ مدیحہ نے بے قراری سے نکلن اٹھالیا اور خوشی سے جلدی سے اپنی سپید کلائی میں ڈال لیا۔ اس کی سفید کلائی جگمگائی۔ خوشی سے اس نے نکلن چوم لیا۔ اس وقت کمرے میں مدیحہ کے علاوہ واجد موجود تھا۔ اس نے مدیحہ کو دیوانہ وار نکلن چومتے دیکھا۔ ایک حسرت بھری آہ اس کے لبوں سے آزاد ہوئی۔ وہ اب تک مدیحہ کو نکلن نہیں دلا۔ کا تھا۔ خاموشی سے اس نے نکلن مدیحہ کی کلائی سے اتار لیا۔ واپس ڈبے میں ڈالا اور باقی زیورات کے ساتھ رکھ کے نورین کو آواز دی۔

”کیا ہے واجد! تھوڑی دیر تو خوش ہونے دیتے۔“ وہ خفا ہو کے بولی۔

”جو چیز ہماری نہیں ہے، اس کی آرزو کیوں کریں؟“ واجد نے بھی خفا ہو کے کہا۔

”کیوں، کیا نورین ہماری نہیں ہے۔۔۔۔۔ نورین ہماری

ذمہ داریاں بھی سونپ دیں۔ مدیحہ کے بیٹھ ہاشم صاحب اور ان کی فیملی الگ رہتے تھے۔ اس گھر میں مدیحہ کی ساس، سسر، ایک سند نورین اور مدیحہ کے شوہر واجد تھے۔ اس نے خوش اسلوبی سے ڈنٹے داریاں اٹھالیں۔ واجد، مدیحہ جیسی بیوی سے بہت خوش تھا پھر ایک شام مدیحہ نے واجد سے کہا۔ ”ہماری شادی کو ڈیڑھ ماہ گزر چکا ہے، ہم کہیں گھومنے نہیں گئے۔“

”چلیں گے، بس اگلے ماہ مجھے بونس ملنے والا ہے۔“ وہ مسکرا کے بولا۔

”ہائے، بونس ملے گا آپ کو۔ بس تو آپ مجھے سونے کا نکلن بنوا دیجئے گا۔“ وہ جو شیلے لہجے میں بولی تو وہ حیرت سے اس کا منہ کھٹکے لگا۔

”مدیحہ! مجھے بونس تقریباً پینتیس ہزار ملے گا۔ جبکہ سونا تقریباً انا لیس ہزار کا ایک تولہ ہے۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ اور نکلن تقریباً دو تولے کا ہے جس کے لیے تقریباً آٹھ ہزار کی بے منت کرنی پڑے گی جو میرے لیے مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔“ واجد نے اچھی طرح وضاحت کر کے کہا۔ مدیحہ بے بسی سے اسے ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی۔

”واجدہ! مجھے اپنی زندگی میں نکلن چاہیے۔“

واجدہ نے دیکھتے سے مسکرا کے کہا ”میں نے آفس میں ایک کمیٹی ڈالی ہے، تقریباً ایک لاکھ کی کمیٹی ہے، کھلتے ہی تمہاری خواہش کے مطابق نکلن تمہارے خوبصورت ہاتھوں میں ڈال دوں گا۔“ واجد نے محبت آمیز لہجے میں کہا اور مدیحہ نہال ہو گئی۔

شادی کو ایک سال گزرا، مدیحہ نے ایک بہت خوبصورت گول منول بچے کو جنم دیا۔ پورے خاندان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ گھر کے تمام افراد خوشی سے سرشار تھے۔ واجد نے بہت پیار سے ننھے فائز کی پیشانی چوم لی۔ تب ہی مدیحہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”واجدہ! فائز کی پیدائش کی خوشی میں سونے کا نکلن دے دیں۔“

واجدہ نے ایک نظر اسے دیکھا پھر سمجھاتے ہوئے بولا ”مدیحہ، ابھی میری کمیٹی نہیں نکلی۔ مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔“

”میرے لیے یہی کافی ہے۔“ مدیحہ نے خوشی سے جھومتے ہوئے کہا اور واجد سوچنے لگا ”اف، مدیحہ کے ذہن سے یہ سونے کے نکلن کا بھوت کب اترے گا۔ اتنی منگالی ہے کہ مجھ جیسا قلیل تنخواہ پانے والا بہ مشکل گزارہ کرتا ہے۔“

شادی کے بعد اپنے شوہر سے کہہ کے ایک چھوڑ دو دو نکلن بنوا لینا۔“ ماں نے دلا سادیا۔ اس نے شرما کر سر جھکا لیا۔ بری میں دو لٹا والوں کی طرف سے ایک پکا زیور کا سیٹ تھا لیکن نکلن نہیں تھا، تب ہی وہ دل ہی دل میں رو دی۔ یہاں بھی اسے اماں نے دلا سادیا۔ وہ نئی امیگ کے ساتھ ماجد کے آنگن میں اتری۔ اس کی جھٹانی اسما نے چند ضروری رسومات کے بعد اپنی اور مدیحہ کی سند نورین کے ہمراہ اسے اس کے پھولوں سے سجے سنورے کمرے میں پہنچا دیا۔ کچھ دیر رشتے دار خواتین کی سرگوشیاں، ہنسی مذاق وہ سنتی رہی پھر دھیرے دھیرے سب کمرے سے کھٹکنے لگے۔ آخر میں صرف اس کی جھٹانی اسما اور مندرہ کھیں۔ دونوں نے باہمی اتفاق سے اس کا میک اپ کچھ درست کیا۔ اس نے جھٹانی کے ہاتھ میں سونے کا چمک دار نکلن دیکھ لیا تھا جس کی ڈیزائننگ میں بڑی نفاست تھی۔ وہ گرم صم اسی نکلن کو دیکھے جا رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد دونوں مسکراتی، اس پر شوخ جملے اچھالتی کمرے سے باہر چلی گئیں۔ اس کے ذہن میں تو جھٹانی کے ہاتھ میں جھللاتا سونے کا نکلن تھا۔ واجد کب آیا، اسے کچھ پتا نہ چلا۔ ہوش میں تو اس وقت آئی جب واجد نے اس کی نازک انگلی میں سونے کی نازک سی رنگ ڈال دی۔ رنگ میں گھینے مسکرا رہے تھے۔ وہ بے سادہ بیٹھی رہی۔ واجد اس سے کیا کہتا رہا، اس نے کچھ نہ سنا۔ وہ تو نکلن نہ ملنے پر گرم صم ٹھٹھی تھی۔ اس کی خاموشی کو واجد نے اس کا شرمانا سمجھا لیکن وہ مدیحہ کی طرف سے طویل خاموشی دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

”کیا ہوا مدیحہ! کچھ تو بولو۔“ واجد نے مسکرا کے کہا۔

”جی۔۔۔۔۔ وہ سونے کا نکلن۔۔۔۔۔ بے ساختہ مدیحہ کے منہ سے نکلا تو واجد جھجھ سا گیا۔ وہ کچھ گیا کہ مدیحہ کو اس کی رنگ پسند نہیں آئی۔

”آں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ سونے کا نکلن، ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے، میں تمہیں لے کے دوں گا۔“

”لیکن کب؟“ وہ بے چینی سے پہلو بدل کر بولی۔ اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ آج اس کی پہلی رات ہے۔ وہ پہلی دفعہ اپنے شوہر سے مخاطب ہے۔

”بہت جلد۔“ واجد نے جواب دیا۔ یوں مدیحہ نے ایک سکون اور اطمینان اپنے اندر محسوس کیا۔

☆☆☆

شادی کے بعد مدیحہ اور واجد کی دعوتوں کا طویل سلسلہ شروع ہوا۔ تقریباً ایک ماہ بعد مدیحہ کی ساس نے اسے گھر کی

Monthly Digest

مکتبہ املا و سہلا

Suspense

Sole Distributor

سپنس

SARGUZASHT

سرگزشت

PAKEEZA

پاکیزہ

JASOOSI

جاسوسی

ویلکم بک شاپ

WELCOME BOOK SHOP

P.O. Box 27869
Karima, Dubai
Tel: 04-3961016
Fax: 04-3961015
Mobile: 050-6245817

Email: welbook@emirates.net.ae

JD Group of Publications

کیا آپ
لبوبِ مُتَقَوِّیٰ اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے اعصابی کمزوری دور کرنے تھکاوٹ سے نجات اور مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے کستوری عنبر زعفران جیسے قیمتی اجزاء والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب ایک بار آزما کر دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت والی لبوب مقوی اعصاب ٹیلیفون کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی منگوائیں فون ٹیچ 10 بجے تا رات 9 بجے تک

المسلم دار الحکمت (جسٹس)۔

(ویسی یونانی دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061

0301-6690383

آپ صرف فون کریں۔ آپ تک

لبوب مقتوی اعصاب ہم پہنچا میں گے

ہو جاوایا۔ واجد کی پسندیدہ خوشبو والا پرفیوم پیکٹ میں سے برآمد ہوا۔ واجد نے بھی خوش دلی سے اسے غنیمت سمجھا۔ پھر دونوں نے اماں اور ابا سے دعائیں لیں اور بھئی خوشی اپنے بیڈ روم میں آ گئے۔ تھوڑی دیر بعد واجد تو سو گئے لیکن مدیحہ کو نیند نہ آئی۔ وہ دیر تک کھڑکی سے نظر آنے والے چاند کو دیکھ کر مسکراتی رہی۔ اپنی لکائی کمرنگن کو دیکھ کر وہ ہنسنے لگتی۔ غرض آج کی رات وہ خوشیوں میں رقصاں رہی۔

اچلے دن بھی وقت بہت لمبی خوشی گزارا۔ وہ واپسی پر خود ہی اسکول سے فائز کو لے کر آتی تھی۔ جبکہ واعدہ نے فائز کے لیے رکشا لگا دیا تھا۔ اس وقت خلاف توقع ایک موٹر سائیکل پر سوار دو لڑکے اس کے رکشا کے پیچھے لگ گئے۔ وہ آنے والے وقت سے بے خبر رکشا میں بیٹھی تھی اور رکشا اس کے گھر کی طرف چلا جا رہا تھا۔ اچانک ایک قدرے جوان مردک پر موٹر سائیکل، رکشے کے تین سائے آگئی۔ رکشے والا ہر ایک نہ لگتا تو موٹر سائیکل سوار ضرور اسے گولیوں کا نشانہ بنا دیتے۔ مجبوراً رکشا والے کو رکشا روکنا پڑا۔ ایک نوجوان لڑکا موٹر سائیکل پر سے اتار کر مدیجہ کے ہاتھ آیا اور تین اتارنے کو کہا۔

”زیادہ باغ نہیں ہے بی بی! جلدی سے اُتار دو۔۔۔۔۔“
 ”وہ! آنکھوں میں سنا کی لیے پستول لہراتے ہوئے
 بولا۔“

”مگر..... مگر..... نہیں، میں یہ سکتی نہیں دوں
گی۔“ وہ سننا نہ سکی۔

”او کے..... ہم خود لے لیتے ہیں۔“ فوجوان نے بے دردی سے نکلن ہاتھ میں سے اتارنے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیک مٹی تھیں، وہ نکلن لے کر مڑا تو اچانک ہی مدیحہ کے ذہن میں اپنی دوست شائلہ کا وہ واقعہ گھوم گیا جب وہ کسی پارلر سے نکل رہی تھی کہ اچانک ایک فوجوان نے اس کو پستول دکھا کر ہاتھ سے اس کے منونے کی چوڑیاں اتروالی تھیں۔ شائلہ نے صرف یہی کہا تھا ”ٹھیک ہے لے جاؤ..... لیکن یہ تو ننگی ہیں۔“ فوجوان نے ناگواری سے چوڑیاں پھینک دی تھیں اور شائلہ سونے کی وہ چوڑیاں اٹھا کر خوش خوشی آمٹی تھی۔ اس نے بھی یہی ترکیب آزمائی اور جلدی سے یونی ”لے جاؤ..... یہ تو ننگی ہیں..... تم اسے لے کر بہت بچھتاؤ گے۔“

نوجوان غصے سے مڑا اور اس نے مدیجہ کی توقع کے خلاف تین فائر فائزر کر دیے۔ بچہ سہاڑا تو بیٹھا تھا..... خون

نے نرمی سے کہا تو اسی نے دروازے سے واپس آ کر کہا۔

”آپ مجھے کیا گفٹ دے رہے ہیں؟“

”یہ تو سر پرانہ ہے..... کل ہی چٹا چلے گا۔“

”اوہ..... ٹھیک ہے۔ میں سامعہ کو لینے جا رہی ہوں.....“ فائزہ کو بھی صبح اسکول جانا ہے۔ ”کہتے ہوئے وہ جلدی سے سامعہ کو اچھی سے لینے چل دی۔“

اگلی صبح ہی اس نے تیاری شروع کر دی۔ شام پانچ بجے جب واجد گھر آئے تو گھر کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ فریج چرکی ترتیب بدلی ہوئی اچھی لگ رہی تھی۔ ان کا کہیں باہر جانے کا پروگرام تھا۔ گھر میں اس نے ساس سسر کے لیے پریشی کھانا بنایا کر دیا تھا۔ انہوں نے خوب انجوائے کیا۔ اچھا کھانا کھایا، ٹوٹا سا بیگ پر وہ دونوں فائز کو لے کر خوب گھومتے رہے۔ ایسی پرواجد نے اسے بتایا کہ گفٹ گھر پر ملے گا۔ مدیحہ نے بھی اسے بتایا کہ اس نے بھی واجد کے لیے گفٹ لے رکھا ہے۔ گھر آئے تو پہلے واجد نے مدیحہ کو ایک چمکتے دیا۔ چمکتے تھوڑا سا اس میں سے ایک نفیس سا زعفرانی برآمد ہوئی۔ مدیحہ کے ہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔

”کیوں..... پسند نہیں آئی کیا؟“ واجد نے پوچھا۔
 ”نہیں تو..... اچھی ہے۔ وہ دراصل کنٹن کے خیال نے
 فیصلہ کیا۔ اس کی بات ادھوری تھی کہ واجد بول مڑا۔“

”جناب، یہ پیکٹ بھی کھولیے۔“
مدیر نے دوسرا چھوٹا سا پیکٹ کھولا، وہ حیرانی اور خوشی
کی کیفیت سے جھوم اٹھی۔ ایک خوبصورت کنکرن پیکٹ میں
جو دوڑے میں جگمگا رہا تھا۔

”اوہ واجد! یو آر دی گریٹ..... تم کتنے اچھے
..... میرے تصور سے بھی بڑھ کر، بہت ہی سوٹ ہو تم.....“
ہاں نے اظہار تشکر کے طور پر ننگن کو بوسہ دیتے ہوئے جھٹ
ننگن اپنی گوری کلائی میں پہن لیا۔ جس ننگن کے لیے وہ بہت
س رہی تھی، اس کی خواہش نے آج تکمیل کی صورت دیکھی
ن۔ نازک جزاؤ تیکنوں کا ننگن اس کی کلائی پر خوب ج رہا
وہ خوشی سے دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل
تھا کہ ہواؤں میں اڑے، بادلوں کو چھوئے، جانور
ر کے..... اس کے چہرے پر خوشی کی قوس قزح اتر آئی تھی
ہی واجد نے کہا۔

”میرا گفٹ کدھر ہے جناب!“
 ”اودھ، یہ رہا آپ کا گفٹ.....“ اس نے جلدی سے
 اس سے ایک خوبصورت پیکٹ نکال کر اس کی طرف

دے سکے گا یا میں اس خواہش کو لیے دنیا سے گزر جاؤں گی۔“
اس کا اداس چہرہ واجد کو ترپا گیا۔

”مددیکہ..... پلیز..... کیوں سوچتی ہو ایسے..... فائز
جاگنے والا ہوگا..... شاید جاگ چکا ہوگا..... چلو اندر..... میں
کوشش کروں گا تمہیں جلد نکلن بنوادوں۔“
”جج.....!“ وہ خوشی سے گھبرا ہوئی۔

”جی!“ اس نے کہا اور اسے لیے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

نورین کی شادی بخیر و خوبی انجام پائی۔ ہر کام ٹھیک
 ٹھاک ہو گیا۔ وہ تمام وقت نورین کی کھلائی کو ہی دیکھتی رہی
 جہاں کنگن کی چمک اسے اچھی لگ رہی تھی۔ خود نورین نے
 بھی محسوس کیا لیکن وہ ٹال گئی۔ وقت گزرتا رہا۔ مددیحی نے
 دوسری بیٹی کو جنم دیا جو بیٹے کے مقابلے میں خاصی ساونولی تھی۔
 مددیحی کا دل ہی ٹوٹ گیا۔ بیٹی اور ساونولی، بھلا اسے کون پسند
 کرے گا؟ وہ دل میں خدشات لیے رہتی، اس کی زیادہ دیکھ
 حال دادی ہی کرتی تھیں۔ بیٹی سامعہ کی طرف سے بے
 پروائی و اجد کو بہت بری لگتی تھی لیکن وہ تو صرف فائز پر توجہ
 دے رہی تھی۔ و اجد اس کی طبیعت سے خاصا بیزار ہو گیا تھا،
 وہ کہتا۔

”ملا بھو! سامعہ بیٹی ہے تمہاری، تم اس کی اچھی کیئر کیوں نہیں کرتیں؟“
 ”داوی اس کی کیئر کرتی تو ہیں۔“ وہ بے پروائی سے کہتی۔

”داوی بوزھی ہو چکی ہیں..... جو کیترم کروگی وہ بھلا
 لیسے کر سکتی ہیں؟“ وہ افسردگی سے کہتا۔
 ”واحد، انہوں نے آپ کو پالا ہے، انیس پالنا آتا ہے،
 پ کیوں گھبراتے ہیں؟“ مدیحہ ہنسی۔

”فائز کی دفعہ تو تم نے ایسا نہیں کیا؟“ واحد شکایتی لہجے میں کہتا۔

”پلیز واجد! میں بہت تھک گئی ہوں، آپ مجھ سے
 شہ نہ کریں۔“ وہ قطعیت سے بات ختم کرنا چاہتی تھی۔

”اچھا اس وقت رات کے دس بج چکے ہیں، تم اسے
 راہی کے پاس سے لے آؤ۔“ واحد جڑتے ہوئے کہتے۔

وہ دروازے تک جاتے جاتے کہنے لگی ”واجبہ، ہماری
دی کو پورے چھ سال ہو چکے ہیں..... کل ہماری میرج

دوسری ہے۔ پیئرز..... سیکرٹ کریں گے۔“
 ”اگر تم کرنا چاہو تو اریج کر لینا..... ٹھیک ہے۔“ اس

حیدر آباد شہر ویسے تو اتنا قدیم نہیں ہے۔ دو سو سو او سو برس پہلے 1767ء میں اس کا سنگ بنیا رکھا گیا تھا۔

یہ شہر جس کو مہاشاہ کلہوڑو نے امن کا شہر قرار دیتے ہوئے جب قلعے پر چڑھی ٹھہر کر انی تھی تو اس پر ایک فارسی شعر لکھوایا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ یا خدا یہ شہر امن کا شہر ہے۔

سندھ پر حکمرانی کرنے والے کلہوڑو خاندان نے اپنا پایہ تخت یہاں سے دور دادو میں بسایا تھا مگر دریا کی پھیری ہوئی موجوں نے انہیں وہاں چین سے نہ رہنے دیا۔ اسی طرح ڈھائی ہزار سال پہلے منوں جو ڈوڈا جزا تھا۔ اسی طرح ان کا شہر بھی دریائے ڈوبے کناروں کے ساتھ ساتھ پانی میں ڈھلک گیا تو انہیں نئی بستی کے لیے نئے جگہ لانے کی تلاش ہوئی۔

کلہوڑوں کا دارالخلافہ خدا آباد تھا۔ وہاں کوئی 1757ء میں ہزار بردست سیلاب آیا۔ ان کا دارالخلافہ ڈوب گیا تو انہوں نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ کوئی نیا دارالخلافہ بنایا جائے چنانچہ انہوں نے یہ جگہ منتخب کی جہاں اب حیدر آباد ہے۔

کلہوڑوں نے سب سے پہلے قلعہ بنایا اور اس کے اندر رہنے لگے۔ تھوڑے ہی عرصے بعد تالپور خاندان کی حکمرانی ہوئی۔ وہ بھی اسی قلعے کے اندر رہ پڑے۔ قلعے میں اس کچھ عمارتیں تھیں۔ سادہ اور معمولی۔ جہاں اب کھیتی کا علاقہ اور محروان کا محلہ ہے یہاں پرانا شہر آباد ہوا۔ اور جہاں حاکموں کا قلعہ ہو جس کے صدر دروازے سے رات دن سواریاں آیا اور بنایا کرتی ہوں وہاں رونق کے کچھ اور اسباب پیدا ہو جاتے ہیں چنانچہ قلعے کے سامنے ہی بازار بن گیا جو آج تک شاہی بازار کہلاتا ہے۔ بقول ڈاکٹر مہارک علیؒ یہ بھی ایک پرانی اسلامی روایت تھی کہ مسلم شہروں کے اندر چھتے دار بازار ہوا کرتے تھے تاکہ گرمی اور بارش میں بچت ہو سکے۔ چنانچہ سندھ کے کئی شہروں میں شاہی بازار موجود ہیں۔

1843ء میں کلہوڑے بھی گئے تالپور بھی رخصت ہوئے اور اس درویش کی پیش گوئی سچ نکلی جس نے دریائے سندھ میں سفید فام انگریزوں کی کشتیوں کے پہلے بیڑے کو گزرتے دیکھا تو کہا کہ فرنگیوں نے دریا کا راستہ دیکھ لیا ہے۔ اب سندھ کی خیر نہیں۔ اس سرزمین پر انگریزوں کا قبضہ ہوا۔ حیدر آباد شہر کی شکل و صورت بدلنے لگی۔

1850ء میں انگریزوں نے قلعے کے جنوب کی جانب اپنی چھاؤنی بنائی۔ یہیں اپنے مشن اسکول بنائے۔ اسپتال بنائے اور اپنی دوسری عمارتیں بنا لیں جو آج بھی صدر کا علاقہ یا چھاؤنی کا علاقہ کہلاتا ہے۔

انتباس: شیر دریا از رضاعلی عابدی
تلاش: ظہیر جمیل صدیقی

ہے جن کی قسمت میں قہقہے ہوں، مسکرائیں ہوں، مجھ جیسے لوگ نہ جانے اس دنیا میں کیوں آ جاتے ہیں؟

☆ ☆ ☆
پھر ایک دن انہی خیالات میں غلطاں و پگھلاں جب میں نے میز پر بڑے رچی تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا ”میرے خیال میں یہ مومن یا نیر ہم نے تو نہیں منگوائی تھیں۔“ اور پھر اس نے جواب طلب نظروں سے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا جیسے اپنی بات کی تصدیق چاہتی ہو۔ اس کے ساتھی نے لمبی میں سر ہلایا اور کہنے لگا۔

”اے مسزادوں میں خواب مت دیکھا کرو۔“
میں نے نرے اٹھائی اور گھبراہٹ میں صرف اتنا کہہ سکا۔ ”معاف کیجئے یہ آؤر ساتھ والی میزوں کا تھا۔“ اور میں پھر دوسری طرف مڑ گیا۔

☆ ☆ ☆
میں نے اس دن فیصلہ کر لیا کہ دن کے فوایوں کو عملی جامہ ضرور پہناؤں گا اور دل میں ایک عزم لے کر میز کے سرے میں چلا گیا اور انہیں صاف صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ میں مزید نوکری نہیں کرنا چاہتا لہذا میرا حساب چکا دیا جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ گاؤں والدہ کو جو آخری خط لکھیں ان کے ساتھ کچھ پیسے بھی بھیج دوں۔ لیکن صاحب مجھے دیر تک سمجھاتے رہے کہ دیکھو تمہارا اب ہیڈ ویٹر کا چانس ہے۔ اسے ضائع مت کرو۔ مگر میں نہ مانا، آخر انہوں نے کہا۔

”تم یہ ماہ پورا کرو۔ چند دن کی تو بات ہے لہذا تم نے سال کے جشن کے بعد حساب لے کر جا سکتے ہو۔“

میں مان گیا اور دل میں فیصلہ کر لیا کہ حساب ملتے ہی پیسے گھر بھیج دوں گا اور خود اس زندگی سے جان چھڑاؤں گا۔ اور پھر سال نو کے جشن کا دن بھی آ گیا۔ ابھی تک میں اس فیصلے پر قائم تھا کہ زندہ ان لوگوں کو رہنا چاہیے جن کی قسمت میں مسکرائیں ہوں۔ میں جیتا بھی رہا تو کیا کروں گا؟ مگر زندگی سے اس قدر مایوسی کے باوجود نہ جانے کیوں میری یہ خواہش تھی کہ کاش، آج رات کو وہ بھی آئے۔ میں شام ہی سے گیلری اور ہال کے چکر لگاتا رہا مگر مایوسی ہوئی اور پھر ہال میں لگے ہوئے بڑے کلاک کی ”بگ بین“ جیسی مترنم آواز پورے ہال میں گونجنے لگی۔ نئے سال کا آغاز ہو چکا تھا۔ فضا میں قہقہے اور باتیں بھینھناہٹ کی شکل اختیار کر گئے اور میں گھبرا کر باہر نکل آیا۔

کوشش کی مگر ناکام رہا۔ یوں محسوس ہوتا تھا۔ وہ سیاہ مسکراتی ہوئی آنکھیں، روشندان، دیواروں اور کھڑکیوں میں ہر جگہ موجود ہیں اور مجھے گھور رہی ہیں۔ مجھے ہوش میں کام کرتے ہوئے عرصہ ہو گیا تھا مگر آج تک میں نے کسی لڑکی کے بارے میں نہیں سوچا تھا اور یوں بھی ایک غریب ویٹر کسی لڑکی کے بارے میں سوچ بھی کیا سکتا ہے؟ مگر یقین مانیے اس رات میں بالکل سونہ سکا۔ اس رات مجھے اپنی بستی کا گہرا اور شدید احساس ہوا تھا۔ سفید رنگ کی وہ وردی جس میں سنہرے بے لگے ہوئے تھے اور جسے میں بڑے غر سے پہنا کرتا تھا، اب مجھے کاٹ کھانے کو دوڑ رہی تھی۔ اس رات مجھے شدید احساس ہوا کہ میں ایک غریب ویٹر ہوں، ایک حقیر ویٹر اور بس!

☆ ☆ ☆
اور اس کے بعد وہ لڑکی اور اس کا ساتھی اکثر ہوٹل میں آنے لگے۔ یہ لوگ عموماً اسی میز پر بیٹھتے جس پر پہلے دن بیٹھے تھے اور یہ میز چونکہ میرے طبقے کی میزوں میں سے تھی، مجھے اس لڑکی کو اکثر قریب سے دیکھنے کا موقع مل جاتا۔ وہ چٹنی دیر ہوٹل میں رہتی، مسکراتی ہی رہتی اور کبھی کبھار کھلکھلا کر ہنس بھی دیتی۔ سننے پر اس کے سارے جسم میں ایک عجیب سی لرزش پیدا ہوتی۔ جس طرح واسن کے تے ہوئے تار گر پڑنے پر کافی دیر تک لرزتے رہتے ہیں، وہ بھی جب ہنستی۔۔۔۔۔ میرا جی چاہتا کہ میں اسے سینے سے لگا لوں تاکہ اس کے جسم کی لرزشیں میرے بدن میں سما جائیں۔ مگر یہ خواہش بھی اور بہت سی خواہشوں کی طرح کبھی پوری نہ ہو سکی۔ ویٹر کی میرے حواس پر چھائی گئی اور چٹنی وہ مجھے اچھی لگتی، اتنی ہی مجھے اپنے آپ سے نفرت سی ہونے لگتی۔ میں اکثر سوچتا کہ یہ کس قدر خوش نصیب ہے اور میں کس قدر بد نصیب ہوں۔ اسے کوئی غم بھی نہیں، اس کی کوئی بوڑھی ماں نہیں جو اس کے سہارے زندہ ہو۔ اس کی کوئی چھوٹی بہن نہیں جس کی اسے فکر ہو۔ میری طرح اسے ایک ایک پیسے کو خرچ کرتے ہوئے سوچنا نہیں پڑتا۔ یہ جب چاہتی ہے، کھلکھلا کر ہنس پڑتی ہے اور ایک میں ہوں جو ہنسنا بھی چاہوں تو آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ مجھے اسے آپ سے نفرت ہو جاتی تھی اور اس نفرت کی ذلت دار بی لڑکی تھی جس کی مسکراتی آنکھوں اور بے فکر قہقہوں نے مجھے اپنی بستی کا شدید احساس دلایا تھا اور پھر یہ احساس دن بہ دن گہرا ہوتا گیا۔ میں اکثر تنہائی میں سوچتا کہ میں آخر زندہ کیوں ہوں؟ اس دنیا میں زندہ رہنے کا حق صرف ان لوگوں کو

مجھے دی تھیں جن پر راحت ہوٹل کے سنہرے بے لگے ہوئے تھے۔ وہ شریف لوگ بھی میرے حسن ہیں جو پلیٹ سے سکوں کو اٹھانا کسر شان سمجھتے تھے اور میں انہیں سلام کرتا ہوا وہ سکے اٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لیتا تھا۔ میں اس بوڑھے کو بھی اپنا حسن سمجھتا ہوں جس نے اپنے کچے مکان کا ایک کمر مجھے تین سو روپے ماہوار کرائے پر دیا ہوا تھا اور جو کبھی بھی مجھے اپنی جوانی کے قصے سناتے سناتے میری آنکھوں کو کسی قدر بھگودیتا تھا اور یوں تو میری چار پائی میں چھپے ہوئے کھٹل بھی ایک طرح سے میرے حسن ہیں جو رات بھر مجھے کاٹ کاٹ کر زندگی کا احساس دلاتے رہتے تھے۔ مگر وہ لڑکی جو اپنی کہنیوں کو میز پر دیکے اپنی نازک ہتھیلیوں پر ٹھوڑی رکھے پیار بھری نظروں سے سامنے کی جانب دیکھ رہی ہے وہ میری سب سے بڑی محسن ہے۔

☆ ☆ ☆
بہت عرصہ پہلے جب ہلکے گلابی رنگ کی سازی پنے ہوئے پہلی مرتبہ اسے ساتھی کے ہمراہ وہ ہوٹل میں داخل ہوئی تھی تو اسے دیکھ کر مجھے یوں لگا تھا جیسے میرے تصور نے سٹ کر اس لڑکی کی شکل اختیار کر لی ہے اور پھر اسے میری خوش قسمتی ہی جانیے کہ یہ دونوں ایسی میز پر بیٹھے جو میرے طبقے میں بھی چنانچہ جب میں آؤر لینے کے لیے میز کے پاس پہنچا تو اس نے اپنے ساتھی سے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔

”کیوں حضور، کیا بیٹیں گے؟“ تو اس کے ساتھی نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا تھا۔

”ج پوچھو تو جب تم میرے سامنے ہوتی ہو تو میرا کچھ بھی پینے کوئی نہیں چاہتا۔“

واقعی وہ نوجوان ٹھیک کہہ رہا تھا۔ لڑکی اس جواب سے کچھ شرماسی گئی تھی اور اس کے گالوں پر ساڑی کا رنگ چھلکنے لگا تھا۔ اس دن انہوں نے صرف کافی پی تھی اور پھر جب آرکسٹرا کی دھمیں تیز اور اونچی ہو گئیں تو بہت سے جوڑے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ وہ لڑکی بھی اپنے ساتھی کی بانہوں میں ہلکورے لیتے ہوئے آہستہ آہستہ فرش پر پھسلے ہوئے دور نکل گئی تھی۔

☆ ☆ ☆
اس رات چار پائی پر لیٹے ہوئے میں دیر تک اس لڑکی کے بارے میں سوچتا رہا۔ چنانچہ اس رات مجھے کھٹل بھی نہیں کاٹ رہے تھے مگر اس کے باوجود میں ساری رات جاگتا رہا۔ میں نے اس کے خیال کو دماغ سے جھٹکنے کی بہت

1987ء سے خدمت میں مصروف

LEUCODERMA-VITILIGO

سفید داغ قابل علاج مرض ہے

پیشہ ورانہ

STERIODS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

ایوارڈز ہولڈر اجمل زیدی کے دور وادہ استعار کا مستقل درو کلام



ASIAN EXCELLENCE PERFORMANCE AWARD



AWARD PILLAR OF LEUCODERMA

اسلام آباد

9-اپریل 30۵ مئی
9-اگست 30۵ ستمبر
9-دسمبر 30۵ جنوری
فون: 2261636
0300-8566188
G-8/1، سید احمد شاہ، 20، ٹیکہ، اسلام آباد

AWARD OF BEST ACHIEVEMENT

لاہور

ہسٹل قاسم

14-فروری 27۵ فروری
14-جون 27۵ جون
14-اکتوبر 27۵ اکتوبر
فون: 7115015-19 (042)
سہیل: 0300-8566188

پشاور

ہسٹل لسیہ

یکم فروری 11۵ فروری
یکم جون 11۵ جون
یکم اکتوبر 11۵ اکتوبر
فون: 2218215-9 (091)
سہیل: 0300-8566188

ملتان

ہسٹل سلیس سلیس

28-مارچ 6۵ اپریل
28-جولائی 6۵ اگست
28-نومبر 7۵ دسمبر
فون: 4518081-62 (061)
0300-8566188 (0300)

کراچی

ہسٹل سمندر

13-مارچ 27۵ مارچ
13-جولائی 27۵ اگست
13-نومبر 27۵ دسمبر
فون: 706، 7، طرہ، سید احمد شاہ، کراچی
021-7012068-9
سہیل: 0300-8566188

www.leucodermatologist.com

E-mail: syedajmalzaidi@hotmail.com - syedajmalzaidi@yahoo.co.uk

تھا۔ اس نے پرس سے چھوٹا سا آئینہ نکالا اور پھر گالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

”بس، اب کوئی غم نہیں۔ غم اتنی دیر ہوتا ہے جتنی دیر ہم سوچتے رہتے ہیں۔“

میں چپ چاپ کھڑا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کیوں؟ مجھے خاموش کھڑے دیکھ کر اس نے کہا۔ ”تم..... تم میرا ایک کام کرو گے؟“

میں نے جلدی سے سر ہلا دیا۔ ”جی..... جی ضرور کروں گا کام بتائیں۔“

”ادھر آؤ۔“ کہہ کر وہ اسی بیچ کی طرف بڑھنے لگی تھی۔ میں کسی معمول کی طرح اس کے ساتھ ساتھ چلا آیا تھا۔ اس نے بیچ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”مجھ سے شادی کرلو۔“

پیشکش میرے چودہ طبق روشن کر گئی۔ ایک معمولی سے دھڑکاتی بڑی آفر۔ ایک ایسے باپ کی بیٹی شادی کی پیشکش کر دے، یہ معمولی بات نہیں تھی۔ میں گویا ہواؤں میں اڑنے لگا تھا۔ میری زبان بند ہو گئی تھی۔ ذہن جواب دینے سے قاصر رہ گیا تھا۔ میں پچھلی پچھلی آنکھوں سے اسے دیکھتا جا رہا تھا کہ اس نے پھر کہا۔

”اگر تم نے ہاں نہیں کی تو میں خودکشی کر لوں گی۔“

آج تک کسی لڑکی نے مجھے گھاس نہیں ڈالی تھی۔ کسی نے مجھے نظر بھر کر دیکھا بھی نہیں تھا کہ یہ لڑکی نعمت غیر مترقبہ بن کر میری زندگی میں آ رہی تھی۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

”یولو، جواب دو۔ میرا وقت بہت قیمتی ہے، فوراً فیصلہ سناؤ۔“

اور میں نے خواب میں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ جلدی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”اگلے دن صبح آٹھ بجے اسی سڑک پر ملنا۔“ کہہ کر وہ ہال میں داخل ہو گئی۔

وہ رات میں نے سوتے جاگتے گزاردی اور صبح اٹھتے ہی گھر سے نکل پڑا۔

اس سڑک پر کھڑے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ وہ پہنچ گئی۔ اس نے میرا بازو پکڑا اور تقریباً گھینٹتے ہوئے اپنی کار تک لے گئی پھر آندھی طوفان کی طرح ڈرائیور کرتے ہوئے میرج رجسٹرار کے دفتر پہنچی۔ اپنا اور میرا شناختی کارڈ جمع کرایا اور ہم میاں بیوی کی حیثیت سے رجسٹرڈ ہو گئے۔

باہر کافی سردی تھی اور چاندنی دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ میرا جی چاہا کہ برآمدے کے ستونوں سے لپٹ لپٹ کر روؤں اور خوب زور زور سے روتا ہی رہوں۔ باہر لان کے دوسری جانب روشوں پر لمبی لمبی چمکتی ہوئی کاریں کھڑی تھیں۔ میں ان سے کتراتے ہوئے ان کی دوسری جانب نکل گیا اور پھر چند ہی قدم چل کر ٹھٹھک گیا۔ دو دھیا چاندنی میں پتھر کی بنی ہوئی..... بیچ پر کوئی لڑکی سر کو بازوؤں میں لیے بیٹھی سسکیاں لے رہی تھی۔ اس کے بال بکھر کر پشت اور شانوں پر پھیل گئے تھے۔ میں جوں ہی اس کے قریب پہنچا، قدموں کی آہٹ سن کر اس نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا اور مجھے یوں لگا جیسے زمین اپنے اندر سے ہٹ کر کسی نامعلوم سیارے کی طرف بھاگنے لگی ہو اور بڑی بڑی عمارتیں کھلونوں کی طرح ایک دوسرے سے ٹکرا کر مجھ پر گر رہی ہوں۔ وہی لڑکی اس دن بیچ پر بیٹھی رو رہی تھی، اس کی آنکھیں کسی قدر سرخ ہو گئی تھیں۔ سارا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا اور بالوں کی ایک دولہن بھیک کر گالوں سے چٹ گئی تھیں۔ مجھے سکتہ سا ہو گیا اور میں صرف اتنا کہہ سکا۔

”میم صاحبہ! آپ..... آپ رو رہی ہیں؟“

اس نے مجھے دیکھا اور چہرے کو ٹشو پیچ سے صاف کرتے ہوئے کھڑی ہو گئی اور ہول کی طرف چل پڑی۔ اس کی چال میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ بھی تھی۔ برآمدے کے پاس پہنچتے ہی میں آگے بڑھ گیا اور پوچھا۔

”میم صاحبہ! آپ کیوں رو رہی ہیں؟“ تب اس نے اپنی حالت پر کسی قدر قابو پالیا تھا پھر وہ مسکرا دی۔ اسے مسکراہٹ تو نہیں کہا جاسکتا۔ بس صرف ہونٹ پھیل گئے تھے۔ آنکھوں میں ابھی تک وہ چمک لوٹ کر نہیں آئی تھی، پھر اس نے کہا۔

”کیوں..... تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”ویسے ہی میم صاحبہ! بتا دیجئے ناں..... آپ کو بھی کوئی غم ہے؟“ میں نے پوچھا۔

اپنی اور اس کی حیثیت کا فرق اس وقت میرے ذہن سے محو ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے بکھرے ہوئے بالوں کو کسی قدر درست کیا اور پھر کہنے لگی۔

”غم تھا تو کسی مگر اب کوئی غم نہیں۔“ اور ایک بار پھر وہ زبردستی مسکرا دی۔

”کیا مطلب؟“ میں نے پوچھا۔ جانے مجھ میں یہ جرات کس طرح آگئی۔ میں بڑی بے باکی سے سوال کر رہا تھا۔

”ارے مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ یہ تو چھوٹی سی نہر ہے، اتنی زیادہ گہری بھی نہیں ہے، اس میں بھلا کوئی کیسے ڈوب سکتا ہے؟“

میں نے اس کا دل رکھنے کو غلط بیانی سے کام لیا حالانکہ وہ نہر بہت گہری تھی اور گریوں میں تو اس میں پانی کا بہاؤ بہت شدید ہوتا تھا۔ میں نے تو اچھے اچھوں کو اس کی گہرائی اور تند بہاؤ سے خوف کھاتے دیکھا تھا۔

ہمارا گاؤں شکار کی قدرتی مناظر سے مالا مال تھا۔ ہر طرف سبزہ اور ہریالی نظر آتی تھی، یہاں آم، جامن اور دوسرے پھلوں کے باغات تھے لیکن وہ تمام باغات چودھری ولاور کی ملکیت تھے۔ گاؤں میں دور دور تک پھیلے ہوئے کھیت بھی اسی کی ملکیت تھے۔ ہاں تھوڑی بہت زمینیں غریب کسانوں کی بھی تھیں جنہیں چودھری ہنسر کرنا چاہتا تھا۔

میرے سب شوق لڑکوں والے تھے۔ کئی ڈنڈ اکھیلنا، پتنگ اڑانا اور تیراکی کرنا۔ مجھے موقع ملتا تو میں گھڑ سواری بھی ضرور کرتی لیکن ہمارے پاس گھوڑا تو دور کی بات ہے، کھانے کو روٹی بھی نہیں تھی۔

میرے بابا کا اس وقت انتقال ہو گیا تھا جب میں صرف دو سال کی تھی۔ بابا کھیت مزدور تھے اور انہیں چودھری سے اتنا اناج مل جاتا تھا کہ ہم دو وقت پیٹ بھر روٹی کھا لیا کرتے تھے۔

بابا کی موت کے بعد اماں چودھری کی حویلی میں کام کرنے لگیں اور یوں روکھی سوکھی کھا کر ہماری زندگی کی گاڑی کھنٹی رہی۔

گاؤں میں یوں تو کئی لڑکیاں تھیں لیکن نیلم میری واحد دوست تھی۔ ہم دونوں ہم عمر تھے اور جب سے ہوش سنبھالا تھا، ایک دوسرے کے ساتھ تھے۔ یوں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہماری دوستی بڑھتی رہی۔ نیلم مجھے دیوانوں کی طرح چاہتی تھی۔ یہی حال میرا بھی تھا۔ میری طرح نیلم بھی ایک کھیت مزدور کی بیٹی تھی۔ میرے بابا کی طرح اس کے ابو بھی چودھری کے کھیتوں میں مزدوری کرتے تھے۔

میرے کھیل کو وہ دیکھ کر اماں اکثر کہتی تھیں ”اگر تیرے یہی لچھن رہے تو کون تجھے بیاہنے آئے گا؟“

”تو نہ آئے۔“ میں بے نیازی سے جواب دیتی۔

ان دنوں میری عمر غالباً دس یا گیارہ سال تھی۔ میں حسب معمول نیلم کو ساتھ لے کر چودھری کے باغ سے آم توڑنے نکلتی تھی۔ باغ کامالی بہت ہی اکھڑ مزاج تھا، وہ کسی کو

بھی باغ میں قدم نہیں رکھنے دیتا تھا۔ میں بیٹ باغ کی پشت کی باڑھ سے گزر کر کسی بھی درخت کے ذریعے اوپر چڑھ جاتی اور آم توڑتو ذکر نیچے پھینکتی جاتی۔ نیلم انہیں اپنے چھوٹے سے دوپٹے میں باندھ لیتی، پھر ہم اسی راستے سے واپس آ جاتے۔ باغ کے رکھوالے کو اس چوری کی کانوں کان خبر نہ ہوتی۔

اس دن بھی میں باغ کے ارد گرد گھوم کر اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ میں نے باڑھ میں جو شکاف لگایا تھا، وہ شاید رکھوالے نے بند کر دیا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ اس کانٹوں دار باڑھ کو کیسے ہٹاؤں؟ اس کے لیے تو درانتی کی ضرورت پڑے گی۔

ابھی میں یہ سوچ ہی رہی تھی کہ ہمارے نزدیک سے ایک جیب گزری۔ وہ جیب آگے جا کر رک گئی۔ اس میں سے لپٹا ہوا موچھوں والا ایک آدمی اُترا اور بولا ”اوچھو پو! تمہیں چھوٹے چودھری ملارہے ہیں۔“

”چھوٹے چودھری؟“ میں نے حیرت سے پوچھا ”کہاں ہیں؟“

”وہ جیب میں بیٹھے ہیں۔“ موچھوں والے نے جواب دیا۔

مجھے حیرت تھی کہ چھوٹے چودھری ہمیں کیوں بلا رہے ہیں؟ میں نے تو انہیں دیکھا بھی نہیں تھا، ہاں بڑے چودھری ولاور کو اکثر کھیتوں میں دیکھا تھا۔

ہم دونوں ڈرتے ڈرتے جیب کے پاس پہنچے۔ جیب میں ہمارا ہی ہم عمر ایک لڑکا بیٹھا تھا، اس نے آدمی آستین کی قمیض اور نیکر پکھن رکھی تھی۔

میں نے موچھوں والے سے کہا ”کہاں ہیں چھوٹے چودھری؟“

”تم کیا اندھی ہو؟“ موچھوں والا غرا کر بولا ”یہی چھوٹے چودھری شہزاد ہیں۔“

میں نے ڈرتے ڈرتے اس لڑکے کو سلام کیا۔ اس نے مسکرا کر جواب دیا پھر بولا ”تم دونوں یہاں کھڑی کیا کر رہی تھیں؟“

”ہم تو جی آم دیکھ رہے تھے، کتنے پیلے پیلے، بڑے بڑے آم ہیں۔“ نیلم جلدی سے بولی۔

”تم شکاری ہی میں رہتی ہو؟“ چھوٹے چودھری نے مجھ سے پوچھا۔

”جی، ہم اسی گاؤں میں رہتے ہیں۔“ میں نے جواب

دیا۔

مجھے خوف تھا کہ ابھی چھوٹے چودھری ہم دونوں کی پٹائی لگوائیں گے کہ تم نے میرے آسموں کی طرف دیکھا بھی کیوں؟ میں نے چودھری ولاور کے بارے میں ایسی ہی باتیں سنیں تھیں۔

”تمہیں آم پسند ہیں؟“ چھوٹے چودھری نے مزید نرم لہجے میں پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”آؤ، گاڑی میں بیٹھو، میں آج تمہیں جی بھر کے آم کھلاؤں گا۔“

میں ہم کر پیچھے ہٹ گئی۔

”اور موت!“ چودھری شہزاد نے کہا ”آؤ گاڑی میں بیٹھو۔“

ہم دونوں ڈرتے ڈرتے گاڑی میں بیٹھ گئے۔

مجھے چھوٹے چودھری کے اس انسانی رویے پر شدید حیرت تھی ورنہ میں نے تو پہچان ہی سے یہ سنا تھا کہ یہ چودھری اور وہ بڑے قسم کے لوگ انسان نہیں ہوتے۔

اس دن ہم دونوں نے خوب دل بھر کے آم کھائے۔

”تم بڑھتی ہی ہو؟“ چودھری شہزاد نے پوچھا۔

”ہم کہاں پڑھیں گے جی!“ میں نے حسرت سے کہا۔

”نہ تو شکاری میں کوئی اسکول ہے، نہ بڑے چودھری صاحب گاؤں کے کسی آدمی کو پڑھنے کی اجازت دیتے ہیں۔“

پچھلے سال نور دین کہہا کا بیٹا پڑھنے کے لیے دوسرے گاؤں چلا گیا تھا تو پڑے چودھری صاحب نے نور دین کے گھر کو آگ لگوا دی تھی۔

”تم دل بھر کے آم کھاؤ۔“ چودھری شہزاد کو نور دین کا موضوع شاید پسند نہیں آیا تھا ”اور جتنے بیج جاکیں انہیں باندھ کر ساتھ لے جاؤ۔ میں باغ کے راکھے سے کہہ دوں گا کہ یہ لڑکیاں جب بھی یہاں آئیں، انہیں باغ میں آنے سے مت روکنا۔“

نیلم اپنے دوپٹے میں آم باندھ رہی تھی کہ وہی موچھوں والا آدمی دوڑا ہوا آیا اور بولا ”ہاں کون ہے؟“

”میں ہوں بانو۔“ میں نے گھبرا کر کہا ”کیا بات ہے چاچا؟“

”بیٹا، تو میرے ساتھ گھر چل۔“ اس نے نرم لہجے میں کہا ”تیری اماں کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔“

”سانپ نے ڈس لیا ہے۔“ میں نے حیرت سے اس

برونائی کے سلطان حاجی حسن البلقیہ

جنوب مشرقی ایشیا میں واقع ”برونائی دارالسلام“

میں گزشتہ 600 برسوں سے بادشاہت چلی آ رہی

ہے۔ 62 سالہ سلطان حاجی حسن البلقیہ تیل کی دولت

سے مالا مال اس چھوٹی سی مسلم سلطنت کے 29 ویں

تاجدار ہیں۔ ان کی ذاتی دولت کا اندازہ 20 ارب

ڈالرز لگایا جاتا ہے۔ سلطان حسن البلقیہ قیمتی اور نایاب

کاروں کے شوقین ہیں۔ ان کے اس شوق کا اندازہ اس

بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے پاس تقریباً 6 ہزار

کاریں موجود ہیں۔ ان میں سے بیشتر ایسی ہیں جو دنیا

میں ان کے سوا کسی دوسرے شخص کے پاس نہیں۔

سلطان کی سرکاری رہائش گاہ کا نام ”آستانہ

نورالایمان“ ہے۔ یہ دنیا کا سب سے بڑا محل ہے۔ اس

کی وسعت و عریضی اُنی میں نیٹھولک عیسائیوں کے

مرکز ”وٹیکن سٹی“ سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ مجموعی

طور پر 21 لاکھ 52 ہزار 782 مربع فٹ رقبے پر پھیلے

اس محل کی تعمیر پر 350 ملین ڈالرز خرچ کیے گئے

تھے۔ اس میں 1788 کمرے اور 257 غسل

خانے ہیں۔

مرسلہ: نصر فریدی، کالام

کی شکل دیکھی۔ پھر بے اختیار رونے لگی۔ میرے ساتھ نیلم

بھی رونے لگی۔ چودھری شہزاد کے کہنے پر موچھوں والا ہمیں

جیب میں بٹھا کر گھر لے گیا۔

گھر کے مختصر سے کچے چھن میں اماں کی لاش رکھی تھی۔

ان کا پورا بدن نیلا ہو گیا تھا اور منہ سے جھاگ بہہ کر گردن

تک چلا گیا تھا۔ میں نے ایک دل خراش چیخ ماری اور اماں کی

لاش سے لپٹ کر رونے لگی۔

اماں کے بعد اماں ہی تو میرا سہارا تھیں، وہ بھی اس دنیا

میں نہیں رہی تھیں۔ میرا دل غم سے پھٹا جا رہا تھا۔

اس موقع پر پہلی دفعہ چودھراں ہمارے گھر آئی۔ وہ

بہت نیک عورت تھی۔ اس نے پیار سے میرے سر پر ہاتھ

پھیرا اور بولی ”بانو بیٹا! تیری اماں اس دنیا میں نہیں رہی تو کیا

ہوا۔ میں تو ہوں۔ آج سے تو میرے ساتھ حویلی میں رہے گی

اور کام میں دوسری ملازمتوں کا ہاتھ بٹائے گی۔
اماں کی موت کے تیسرے ہی دن مالکن نے مجھے حویلی
بلا لیا۔ چودھری شہزاد کی بیوی کو سب لوگ مالکن کہہ کر
پکارتے تھے۔

ان کے صرف دو بیٹے تھے، شہزاد اور صاحبہ شہزاد
میرا ہم عمر تھا اور صاحبہ مجھ سے تین چار سال چھوٹی ہوگی۔
میں حویلی میں آ کر چھوٹے موٹے کام کرنے لگی لیکن
نیلیم کے بغیر وہاں میرا دل نہیں لگ رہا تھا۔
ایک دن میں نے مالکن سے کہا ”مالکن! اگر آپ میری
سہیلی نیلیم کو حویلی میں بلا لیں تو آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔“
”بس، اتنی سی بات!“ مالکن مسکرائی۔ ”میں ابھی اسے
بلاوائے لیتی ہوں۔“

تھوڑی دیر بعد نیلیم بھی حویلی پہنچ گئی۔ وہ مجھ سے مل کر
بہت خوش ہوئی۔ میرے جسم پر ڈھنگ کا لباس تھا اور میرے
گھٹے لمبے بھورے بال بھی سنورے ہوئے تھے۔ نیلیم مجھے اس
حال میں دیکھ کر بہت خوش ہوئی، پھر وہ بھی حویلی میں کام
کرنے لگی۔

چودھری دلاور کی بیٹی صاحبہ قصبے کے اسکول میں پڑھتی
تھی۔ وہ اور شہزاد صوبے کے اسکول کی وردی چکن کر
اور خوبصورت ہستے گلے میں ڈال کر جیب میں بیٹھ کر چلے
جاتے اور میں حسرت سے انہیں دیکھتی رہ جاتی۔

صاحبہ کو دیکھ کر مجھے بھی تعلیم حاصل کرنے کا شوق پیدا
ہو گیا۔ صاحبہ پڑھنے پڑھتی تو میں بھی اس کے ساتھ بیٹھ جاتی۔
اسے قصبے سے کوئی استانی پڑھانے آتی تھی۔ وہ اسے جو کچھ
پڑھاتی، میں اسے ذہن نشین کر لیتی بعد میں صاحبہ کی ایک
پرانی کاپی پر لکھنے کی مشق بھی کرتی۔

صاحبہ کے ساتھ بیٹھ بیٹھ کر میں اچھا خاصا لکھنا پڑھنا
سیکھ گئی اور اب میں مزید پڑھنا چاہتی تھی۔
میں نے ایک دن چودھری شہزاد سے کہا ”چھوٹے
چودھری صاحب! آپ شہر سے مجھے کچھ کتابیں لادیں
گے؟“

”کتابیں؟“ شہزاد نے حیرت سے پوچھا ”تم کتابوں
کا کیا کرو گی؟“

”پڑھوں گی۔“ میں نے ہنس کر کہا ”میں نے صاحبہ بی
بی کی ہر کتاب پڑھ لی ہے۔“
”تم نے صاحبہ کی ہر کتاب پڑھ لی؟“ شہزاد حیران تھا
”اچھا، مجھے اسے بی سی سناؤ۔“ اس نے کہا۔

میں نے فوراً اسے بی سی ڈی سنادی اور بولی۔ یہ تو
بہت آسان ہے، آپ مجھ سے کوئی مشکل سوال کریں۔“
شہزاد نے ایک کاپی اور پینسل مجھے دے کر کہا۔ ”اس پر
اپنے گائوں کا نام لکھو۔“

”انگریزی میں یا اردو میں؟“ میں نے پوچھا۔
”انگریزی اور اردو دونوں میں لکھو۔“

میں نے جھٹ پٹ اپنے گائوں شلکاری کا نام لکھ دیا۔
”ارے واہ!“ چودھری شہزاد خوش ہو کر بولا ”اب میرا
اپنا اور اپنے بابا کا نام لکھو۔“ اس نے کہا۔

میں نے انگریزی اور اردو میں وہ بھی لکھ دیا۔
”میں تمہیں بڑی کلاس کی کتابیں لادوں گا۔“ شہزاد
نے کہا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

دوسرے دن وعدے کے مطابق وہ میرے لیے کتابیں
کاچیاں اور پینسلیں وغیرہ لے آیا۔
میں لکھنا پڑھنا سیکھ ہی چکی تھی۔ ان کتابوں کو بہت توجہ
اور شوق سے پڑھنے لگی۔

انسان کے جہاں جن ہوتے ہیں وہیں سوداگر بھی
ہوتے ہیں اور میرے دشمن تو کچھ زیادہ ہی تھے۔
میں تو نیلیم سے بھی کہتی تھی کہ کچھ پڑھ لکھ لو، آئندہ
تمہارے کام آئے گا۔

”اپنی اس خواہش سے باز آ جا یا ناوا“ نیلیم مجھ سے
کہتی ”جس دن بھی بڑے چودھری صاحب کو یہ معلوم ہوا کہ
گائوں کے ایک کمی کی بیٹی ان کی حکم برداری کر رہی ہے، وہ تجھے
بہت بڑی سزا دیں گے۔“

”کیا سزا دیں گے؟ زیادہ سے زیادہ جان ہی سے
مار دیں گے نا، تو مار دیں۔ ہم اگر چودھری دلاور کی غلامی
زندگی بھر بھی کریں گے تو ہمیں وہ دولت نہیں مل سکے گی، تعلیم
کی بات ہی اور ہے نیلیم! میری بات مان جا، تو بھی کچھ لکھ
پڑھ لے۔“

”نہ بابا، نہ!“ نیلیم نے کہا ”مجھے تو معاف ہی رکھو۔“
بات آخر تک چھپ سکتی تھی، آخر چودھری دلاور کو
ایک دن معلوم ہوئی گیا کہ اس کی دونوں کرائیاں علم حاصل
کر رہی ہیں۔

اس نے اسی وقت ہمیں طلب کر لیا۔ چودھری دلاور اس
وقت اپنی آرام دہ کرسی پر بیٹھا تھے کے کش لگا رہا تھا۔ میں
اور نیلیم اس کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو اس نے انتہائی
درشت لہجے میں کہا ”میں نے سنا ہے، تم دونوں کو تعلیم حاصل

کرنے کا مرض لگ گیا ہے؟ آج کے بعد اگر میں نے ایسی
کوئی خبر سنی تو تم دونوں کی کھال کھنچوا دوں گا۔“

”چودھری صاحب!“ نیلیم نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا
”مجھے تو پڑھنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ میں تو بانو سے بھی کہتی
ہوں کہ پڑھنا لکھنا چھوڑ دے، اس میں کیا رکھا ہے لیکن یہ باز
ہی نہیں آتی۔“

”تو اس لڑکی کو بھی تو ورغلائی ہے؟“ چودھری نے چیخ
کر کہا ”تو جانتی ہے کہ ہماری جاگیر میں تعلیم حاصل کرنا کتنا
بڑا جرم ہے؟“

”اگر یہ گناہ ہے چودھری صاحب! تو پھر صاحبہ بی بی
کیوں پڑھ رہی ہیں؟ چودھری شہزاد کیوں پڑھ رہے
ہیں؟“ میں نے بے خوفی سے کہا۔

چودھری دلاور کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ وہ پھر کرکھڑا
ہو گیا اور میرے منہ پر اتنے زور سے پھینکا مارا کہ میں لوٹھرائی
کاٹوں میں سانس سانس ہونے لگی۔ دو گھنٹے کی نوکرائی کی
گی بیٹی ہو کر میرے سامنے نہان کھوتی ہے۔ نوکری ہو کر
میرے بچوں کی برابری کرے گی۔ آئندہ اگر تو نے تعلیم کا نام
بھی لیا تو میں تیری چوڑی اور بیڑوں لگاؤں گا۔“

”چودھری صاحب!“ میں نے کہا ”صاحبہ بی بی اور
چھوٹے چودھری پڑھنا چھوڑ دیں، میں بھی تعلیم کا نام نہیں
لوں گی۔“

چودھری تو یہ سن کر آپ سے ہی باہر ہو گیا۔ اس نے چیخ
کر کہا ”ارباب خان!“

اس کا ملازم خاص ارباب خان فوراً حاضر ہو گیا۔ ”حکم
چودھری اہی!“

”اس لڑکی کی منہ سے اتنی چٹائی کرو کہ اس کی کھال
اتر جائے، پھر اسے تھخانے میں ڈال دو، لے جاؤ اسے۔“
ارباب خان نے مجھے بالوں سے پکڑ لیا اور کھینچتے ہوئے
باہر کی طرف نکلا۔

نیلیم بری طرح رونے لگی اور چودھری دلاور کی خوشامد
کرنے لگی ”چودھری صاحب! بانو کو معاف کر دیں، آئندہ یہ
تعلیم کا نام نہیں لے گی۔ میں اسے سمجھا دوں گی، آپ کو اللہ کا
واسطہ اسے معاف کر دیں۔“ اس نے چودھری کے پاؤں
پکڑ لیے۔

چودھری دلاور نے اسے ایک زوردار لٹ رسید کی اور
بولا ”تو زیادہ بکواس کرے گی تو تجھے بھی اس کے ساتھ ہی بند
کر دوں گا۔“

یہ باتیں سن کر مجھے دریائے سندھ کے ان
سیلابوں کا خیال آیا جو تاریخ میں رقم ہیں۔ کہتے ہیں کہ
1830ء کے عشرے میں ایک بڑا سا ٹکڑی ٹوٹ کر
دریائے شیوک میں گر گیا تھا اور اس نے دریا کا راستہ
روک دیا تھا چنانچہ اس کے پچھواڑے بہت بڑی جھیل
بنی گئی اور بعد میں کچھ تو ٹکڑی ٹوٹ کر اور اس کا دل پکھلا
کچھ پانی کے ذخیرے نے دباؤ ڈالا اور پھر جو پانی کا
ریلا آیا تو دریائے سندھ ابل پڑا۔ کہتے ہیں کہ
دریائے کابل جو انک کے مقام پر دریائے سندھ میں
گرتا ہے الٹا بہنے لگا اور وادی پشاور میں دریائے ایک
عورت نکلی گئی جو بھینر کی کھال پہنے ہوئے تھی اور کوئی
اجنبی زبان بولتی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ وہ بیتی ہو۔ اس
صورت میں وہ دریائے سندھ میں تین سو میل بھی
ہوگی۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ اس بات کو سچ نہ سمجھنا
چاہیے۔

دریائے سندھ میں بدترین تباہی 1841ء میں
آئی تھی۔ کہتے ہیں کہ اس سے پہلے دریائے وادی میں
بہت ساری بستیاں تھیں اور خوب کھیتی باڑی ہوتی تھی۔
پھر 1840ء کے چاروں میں رنگا پر بت کے دامن کا
ایک پورا پہاڑ ٹوٹ کر دریا میں آ رہا۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں
استورا آ کر سندھ میں گرتا ہے۔ پہاڑ گرنے سے دریا میں
بڑا سا ڈیم بن گیا اور چھ مہینے کے اندر وادی میں
35 میل لمبی ایک جھیل بن گئی جس کا دوسرا سر اشہر گلگت کو
چھونے لگا۔

کچھ عرصے بعد یہ ڈیم ٹوٹا۔ لوگوں کو معلوم تھا کہ
ایک نہ ایک دن یہ ہوتا ہے چنانچہ وہ پہلے ہی اپنے
ڈیرے اٹھا کر اونچے مقامات پر چلے گئے لہذا جانی
نقصان تو بہت کم ہوا لیکن زمین تباہ ہو گئی اور گائوں
دیہات بہہ گئے۔ سندھ کے زیریں علاقوں میں لوگ
اس سیلاب کے لیے تیار نہ تھے۔ وہاں اب تک یہ
داستان مشہور ہے کہ ایک مرتبہ پہاڑوں کی طرف سے
بے حد اونچی لہر آئی تھی۔

1885ء میں بھی دریائے گلگت یا شاید ہنزہ میں
ایسا ہی ڈیم بن گیا تھا۔ وہ جب ٹوٹا تو تین سو میل نیچے تک
دریا صرف ایک دن میں نوے فٹ اونچا ہو گیا تھا۔
اقتباس: شیر دریا از رضا علی عابدی
ملاحظہ: اظہر جیل صدیقی

ارباب خان مجھے گھسیٹتے ہوئے تہ خانے کی طرف لے چلا اور آہستہ سے بولا "سن بانو اتیرا باب میرا بہت اچھا دوست تھا۔ میں تجھے ہنتر سے ماروں گا کیسے لیکن میں تجھے اللہ کا واسطہ دیتا ہوں، تو اپنی ضد سے باز آ جا۔ یہی ضد دینو کھار کے بیٹے کی تھی اور تعلیم کے لیے شہر چلا گیا تھا۔ تو اچھی طرح جانتی ہے کہ چودھری نے اس کے خاندان کے ساتھ کیا کیا تھا؟"

ارباب خان کی یہی مہربانی کیا کم تھی کہ اس نے مجھے مارا نہیں تھا ورنہ میں جانتی تھی کہ چڑے کے اس ہنتر سے جسم کی کھال ادھر جاتی ہے اور انسان ادھ موا ہو جاتا ہے، کبھی تو اس کی موت بھی واقع ہو جاتی ہے۔

تہ خانے کے دروازے پر خوں خوار چہرے والے ایک لحیم عجم آدمی کی ڈیوٹی تھی۔ وہ اپنے حلیے اور شکل صورت سے انسان کم اور دیو زیادہ لگتا تھا۔ اس نے مجھے تاریک تہ خانے میں پھینک دیا۔

جب میری آنکھیں اندھیرے سے کچھ مانوس ہوئیں تو مجھے وہاں کچھ اور لوگ بھی نظر آئے۔ میں ان سب کو پہچانتی تھی۔ وہ سب ہلکاری ہی کے لوگ تھے اور اچانک ہی کم ہو گئے تھے۔ چودھری نے کسی بات پر خفا ہو کر انہیں بھی مرنے کے لیے تہ خانے میں پھینک دیا تھا۔

میری اس وقت عمر ہی کیا تھی؟ گیارہ سال! میں اس صورت حال پر سسک سسک کر رونے لگی۔ وہ لوگ جو آب ڈھانچوں میں تبدیل ہو چکے تھے، مجھے دور ہی دور سے تسلی دیتے رہے۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ بے چارے زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔

تہ خانے میں عجیب قسم کا تعفن پھیلا ہوا تھا۔ میں نے سوچا، رونے دھونے سے کام نہیں چلے گا۔ مجھے اس قید خانے سے نکلنا ہوگا لیکن کیسے؟ وہاں صرف ایک دروازہ تھا جس پر وہ دیونما انسان بیٹھا رہتا تھا۔ اس کے کندھے سے رائل بھی لٹکی رہتی تھی۔ اس صورت میں فرار کے بارے میں سوچنا بھی حماقت تھی۔

رات کا وقت تھا۔ مجھے اس تہ خانے میں آئے ہوئے دو گھنٹے گزر چکے تھے۔

اچانک تہ خانے کا دروازہ کھلا اور دو آدمی بڑی بڑی پراتوں میں روٹیاں اور دال لے کر تہ خانے کی سیڑھیاں اترنے لگے۔ یہ بھی مجھے قیدیوں نے بتایا تھا کہ ہمیں چوبیس گھنٹوں میں صرف دو روٹیاں اور پانی جیسی پتلی دال ملتی

ہے۔ میرے ساتھ انہوں نے کسین سمجھ کر یہ رعایت کی تھی کہ میرے پاؤں میں زنجیر نہیں ڈالی تھی۔ میں نے دیکھا، کھانا لانے والے دونوں آدمی کچھ دیر اس دیو سے خوش گپیاں کرتے رہے، پھر وہ کھانا لے کر سیڑھیاں اتر گئے۔

انہوں نے ہر قیدی کے سامنے میلا سا سلور کا ایک پیالا رکھا۔ اس میں پتلی پانی جیسی دال تھی اور دو روٹیاں یوں پھینک دیں جیسے جانوروں کے آگے پھینکی جاتی ہیں۔ میں نے دیکھا اس وقت بھی تہ خانے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ان لوگوں کو یہ خدشہ تو تھا نہیں کہ کوئی قیدی فرار بھی ہو سکتا ہے۔ وہ بے چارے تو پہلے ہی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔

میں نے سوچا، فرار کا یہی موقع ہے۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ میں سیدھی زینے کی طرف دوڑی۔ جب تک کھانا تقسیم کرنے والے کچھ سمجھتے، میں اوپر کی سیڑھی پر پہنچ چکی تھی، دوسرے ہی لمحے میں نے جھپاک سے باہر چھلانگ لگا دی۔ کھانا دینے والے اور وہ دیوہنوں جیتے ہوئے میرے پیچھے دوڑے لیکن میں جان توڑ کر دوڑ رہی تھی۔ میں جانتی تھی کہ حویلی کی دیواریں بہت بلند ہیں اور بڑے بھانگ پر بھی دو، تین تین چوکیدار ہوتے ہیں۔

میں نے حویلی کی چھت کا رخ کیا۔ وہاں نیم اور برگد کے کئی درخت تھے۔ میں جانتی تھی کہ میں درخت پر چڑھ کر حویلی کی چار دیواری عبور کر سکتی ہوں۔

مجھے اپنے پیچھے اب بہت سے لوگوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ شاید حویلی کے دوسرے ملازمین بھی میرے پیچھے بھاگ رہے تھے۔

مجھے درختوں پر چڑھنے کی مہارت تھی۔

میں برق رفتاری سے ایک نیم کے درخت تک پہنچی اور اس سے پہلے کہ وہ لوگ مجھ تک پہنچے، میں بلی کی طرح درخت پر چڑھ گئی۔ پھر میں نے ایک مضبوط شاخ کو تھاما اور اس کے ذریعے تیزی سے کھسکتے ہوئے دیوار تک پہنچی۔ وہ دیوار خاصی بلند تھی۔ وہاں سے کودنے میں میری ہڈی پٹلی بھی ٹوٹ سکتی تھی لیکن قید خانے کی اس مزاند سے تو بہتر تھا کہ میں ایک کوشش ضرور کروں۔ میں نے ایک ڈالی تھامی اور اسے پکڑ کر دیوار کی طرف لٹک گئی۔ پھر میں نے شاخ چھوڑ دی اور دھپ سے نرم زمین پر گر پڑی۔ مجھے گھٹنے میں تھوڑی سی چوٹ آئی تھی یا پھر درخت پر چڑھنے اور اترنے میں کچھ

خراشیں پڑ گئی تھیں۔ یہ وقت اپنی چوٹیں شمار کرنے کا نہیں تھا۔ میں جانتی تھی کہ وہ لوگ اس حویلی کے صدر دروازے سے میرے پیچھے آئیں گے۔ اگر میں ان کے چنگل سے نکل گئی تو چودھری اس دیوہنیت دوسرے تمام ملازمین کی کھال کھینچا دیتا۔ ان سب کو بھی اپنی زندگی عزیز تھی اس لیے وہ آسانی سے میرا پیچھا چھوڑنے والے نہیں تھے۔

میں پوری قوت سے نہر کی طرف بھاگی۔ اس وقت میرے ذہن میں یہی آیا کہ میں نہر میں کود کر ہی ان سے جان بچا سکتی ہوں۔ میں جانتی تھی، ان لوگوں میں بہت سے تیراک بھی ہوں گے لیکن میں نے سنا تھا کہ آج کل نہر میں پانی کا بہاؤ بہت شدید ہے۔ ایسے میں شاید ہی کوئی ہمت کر پاتا لیکن میری کیفیت تو یہ تھی کہ آگے کنواں اور پیچھے کھالی اونٹوں صورتوں میں موت میرا مقدر تھی۔

میں نے اللہ کا نام لے کر نہر میں چھلانگ لگا دی۔ کوئی چیخ کر بولا "وہ نہر میں کود گئی ہے۔"

"تو ایسی حماقت مت کر!" ایک دوسری آواز آئی "وہ نہر میں کودی ہے تو زندہ نہیں بچے گی۔ چودھری صاحب سے کہہ دیں گے کہ بانو نے نہر میں کود کر جان دے دی۔"

پھر ان کی آوازیں آہستہ آہستہ معدوم ہو گئیں کیونکہ پانی کا بہاؤ واقعی بہت شدید تھا اور میں اسی رخ پر بہہ رہی تھی۔ اس کے باوجود تیرنے کے لیے محنت کی ضرورت تو ہوتی ہے۔ میں اگر تیرنا نہ جانتی ہوتی تو اب تک واقعی ڈوب چکی ہوتی۔ میرے ہاتھ پاؤں ٹل ہو رہے تھے لیکن مجھے اپنی زندگی بچانا تھی سو میں تیرتی رہی۔

اس نہر کی چوڑائی زیادہ نہیں تھی، مشکل سے دو ڈھائی سو فٹ رہی ہوگی۔ میں چاہتی تو دوسرے کنارے پر نکل سکتی تھی لیکن میں جانتی تھی کہ چودھری دلاور کی جاگیر میلوں تک پھیلی ہوئی ہے اور مجھے اندازہ تھا کہ ابھی میں اس کی جاگیر سے باہر نہیں نکلی ہوں۔

تیرتے تیرتے ایک وقت ایسا بھی آیا کہ میرے ہاتھ پاؤں بالکل ہی ٹل ہو گئے اور میں پانی میں ڈوبنے لگی۔ مجھے اپنے کانوں میں پانی کی خوفناک گڑگڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔

میں نے اپنے جسم کی پوری قوت مجتمع کی اور ہاتھ پیر مار کے پھر اوپر آ گئی۔ اب مجھ میں مزید تیرنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ میں چودھری دلاور کی جاگیر سے

باہر نکل آئی ہوں۔ میں نے کنارے کی طرف تیرنا چاہا تو مجھے شدید دشواری ہوئی کیونکہ پانی کا شدید بہاؤ مجھے کنارے تک نہیں پہنچنے دے رہا تھا۔

میں بہ مشکل تمام کنارے تک پہنچی، اوپر پہنچتے ہی چند قدم چل کر زمین پر گر گئی۔ پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔ میرے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔

مجھے ہوش آیا تو ایک بوڑھا شخص مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ اس کی سفید داڑھی سے اس کا چہرہ مزید نورانی ہو گیا تھا۔

مجھے آنکھیں کھولتے دیکھ کر اس نے کہا "شکر ہے اللہ کا! اس بچی کو ہوش تو آیا۔"

میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن بوڑھے نے مجھے اٹھنے نہیں دیا اور بولا "بیٹی! تمہیں ابھی آرام کی ضرورت ہے۔" پھر وہ بڑے سے ایک پیالے میں دودھ لے آیا اور مجھے سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے بولا "یہ دودھ پی لو، لگتا ہے، تم بھوکے بھی ہو۔"

مجھے یاد آیا کہ میں نے تہ خانے میں قید ہونے سے پہلے دوپہر کا کھانا کھایا تھا۔ رات کے کھانے کے وقت تو میں فرار ہو گئی تھی۔

دودھ پی کر واقعی مجھے توانائی کا احساس ہوا۔

"تم کون ہو بیٹا اور نہر میں کیسے گر پڑیں؟"

"یہ کون سا علاقہ ہے بابا!" میں نے اٹانان سے سوال کر دیا۔

"یہ حسن پور ہے بیٹا!" اس نے جواب دیا "تم کس گاؤں کی ہو؟"

حسن پور کا نام سن کر مجھے سکون ملا کہ میں چودھری کی جاگیر میں نہیں ہوں۔ میں نے آہستہ سے کہا "بابا! میں ہلکاری کی رہنے والی ہوں۔"

"ہلکاری؟" بوڑھے نے حیرت سے کہا "وہ گاؤں تو یہاں سے بہت دور ہے بیٹا!"

میں نے جواب میں اسے اپنی پوری کہانی سنا دی۔ میری آنکھوں میں بار بار آنسو آرہے تھے۔

بوڑھے نے میرے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "تم تو بہت بہادر لڑکی ہو۔ اتنی دیر تک تیرتے رہنا بہت مشکل ہے بیٹا۔"

میں اس وقت کچے سے ایک جھونپڑے میں تھی۔ کھلے دروازے سے میری نظر باہر پڑی تو مجھے بہت سی بکریاں نظر آئیں۔ باہر دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔

میں اٹھ کر بیٹھ گئی، بوڑھے نے کہا "میں تمہارے لیے

ہارمونٹک ٹوٹھ پیسٹ سے منہ، مسوڑھے اور دانت بہترین صاف ہوتے ہیں
ہارمونٹک ٹوٹھ پیسٹ سے خون، پیپ، بدبو، درد، پان، نسوار، سگریٹ کے داغ ختم
صرف ایک بار کے استعمال سے بھی آپ واضح فرق محسوس ہوگا۔ ایک دن چھوڑ کر ایک دن ضرور استعمال کریں

دانت اور مسواحوں کی اہمیت انسانی صورت پر اثراتی ایجاد ہوتی ہے۔ اس کا اعجاز اس طرح سے ہوتی گئی کہ سنا ہے کہ دانت لٹنے سے عمل کرتے رہا بھی بچوں کی عقل ایک جیسی ہوتی ہے۔ دانتوں سے انسانی صورت، صحت، حیرت اور شخصیت میں نمایاں فرق آتا ہے۔ مسواک اور دانت صحت مند ہوں تو شخصیت اور شخصیت بھی متاثر ہوتی ہے کہ انسان محل کرنا مفید، مدعا بیان کن کرنا اہل اور نئی مقام کوئی ہے محل کر غرضی کا اظہار کر سکتا۔ بلکہ دانتوں کی تحلیف اور بدلی کی وجہ سے شراب کو دھوا جائے۔ جس سے اس کی شخصیت اعلیٰ دماغی اور سیاسی اثراتی پکڑے رہتی ہے۔

اثرات مسائل وندوان:

ان مسائل کے مسائل میں جہاں ممکن آواز اور چلنے کے واسطہ سے اتار چڑھا کر دوسروں کو سمجھاتا اور مددگار بن جاتا۔ ان الفاظ و دیگر الفاظ، تعلیم کے سلسلے میں بچوں سے واقف نہیں ہوا یا اتار چڑھا کر خود سرائے میں لکھ کر ایک ایک ٹھیکہ بندی گزارا کرتا ہے۔ بچہ ان مسائل کے مسائل کے اثرات چلنے سے کے ضد و بدل پر بھی پڑتا ہے۔ چہرے میں معمولی فرق سے ایک صورت دوسری سے پیدا ہوتی ہے۔ کبھی بہت خوبصورت تو کبھی قیام صورت۔ اور یہ جسم کا فرق چھپ سکتا ہے مگر چہرے کا نہیں اور ان احوال کا تو کھٹکھٹ کی آواز سے بھی آواز کی لہروں سے ظاہر ہو جاتی ہے۔

و اہمیت اور شخصیت:

اگر ہم مسئلہ صومالیہ اور افغانوں کی محبت اور ان کی برائیوں پر غور کریں تو ان کے ساتھ ملحق ہے۔ صومالیہ میں مسلمانوں اور افغانوں کے ساتھ ایسی چیز ہے جسے افغان اور افغانستان سے بہت حد تک ملتا ہے۔ لوگ ان کی باتوں کو سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ افغان بہت حد تک ان کے ساتھ ملتا ہے۔ صومالیہ سے ملتا ہے۔ ایسی چیز ہے جسے صومالیہ میں مسلمانوں اور افغانوں کے ساتھ ملتا ہے۔

[illegible][illegible][illegible][illegible]

لازم :
ہر صبح اور رات کو دھوا اور صوفیہ سے صاف کر لیں۔ بخلا کر پی لیں۔
سوالی: Mouth Wash کی ضرورت ہے۔

صحت اور زندگی:
 ہائپر ٹینشن اور ذیابیطس کے ساتھ غلڑاگ پر انحصار کر کے جس میں ان کا قریبی معیار (Level) of Sugar & Blood Pressure کو زیرِ نظر رکھنا ضروری ہے اور معیار صحت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہے۔

نوراک کی اہمیت:

اسبق مقدمہ کا تجزیہ اور صحیح معنایں خود ان کے سانس اور لہجہ کا چلنے سے کے ساتھ ساتھ معمولی مہارت کی
 حاصل تھا اور ان کی بیچوتھی کیلئے دیکھا تو ان کی بھرا کر لے کیلئے کافی ہے اور اگر کچھ سے کہیں گا اور کچھ
 کی طرح تو دور دور کے کام کا محنت کیلئے کافی ہے۔ اس سے کہ جتنی تھیں مجھے بھی تو موقوفہ اہل
 کی طرح ہو کر جوڑوں کا دور دورہ دیکھ کر ان کے گونے کیلئے بہت متحیر ہیں۔ غرض کہ جو بھی کہتا ہے وہ ان کی
 کی جتنی سانس اور لہجہ چلنے اور معمولی مہارت کی ادا ہوگی اور دور دور کے کام کا محنت اور دور دور کی
 کیلئے ضروری تو ان کی مہارت سے پریشان ہوتا ہے۔ اصل خبر کا یہ ہے کہ فطرتاً غایت جوانی ہے اگر اس پر
 کر کے اس کو صاف نکال دیا ہے کہ ہم جس نوراک کا اندھنوں کی کہنے فطرتاً کی شکل میں غایت کرے ہیں۔ اور اسے
 غایت ہوئی ہے وہ دور دورہ ہو کر کے غایت ہوئی ہے۔ جتنی تو ان کی ساتھ میں جو کچھ اور بھی اسے ہوں
 غرض جو کچھ اور یہ فطرتاً غایت کرے ہے۔ اس کو اسے قتل کی دوا اور بھی کا سانس کا کرنا ہوتا ہے۔

تیار کردہ: اے۔ کے۔ کا سکوپاٹڈ، مینگورہ (سوات)
042-37666818, 0300-9486848

051-5552509, 5535650	سپر سونچہ مشورہ پورچہ پانی اور اور پانی	021
0321-5557537	مرکز الادویات پانہ پانہ اور اور پانی	041
	طست و ادویات پانہ پانہ اور اور پانی	042
022-3641343	امراض پانہ پانہ اور اور پانی	042
0300-9376764	2018/22	

35673194, 0300-2858664 **فاب برائی ٹاپ نمبر FU69** اور اسٹاک منیجر کراچی صدر
 2636215, 0300-6628069 **میر تقیال پاکستان** دوسرا مشورہ میٹروپولیٹن بازار فیصل آباد
 37640516, 0321-4444542 **نور علیہ** رانا اختر پارس لاہوری گیٹ لاہور
 6314149, 36375769 **اس ایس انٹرپرائز** 22 علامہ اقبال روڈ نواز محلہ بہتانال انارک
 4586946, 0300-6308784 **صالحین موٹی** والے چوری چورس بازار، ملتان

میں ہنس کر رہ گئی۔ اسی وقت گھر میں ایک نوجوان داخل ہوا۔ ساڑھ اس کی طرف ”ساجد بھائی“ کہہ کر دوڑی اور اسے بتایا کہ ہمارے گھر میں ایک لڑکی مہمان آئی ہے۔ بابا کہہ رہے تھے کہ اب وہ یہیں رہے گی۔

ساجد نے سر تا پا میرا جائزہ لیا اور ہنس کر بولا ”بھئی، تمہاری مہمان تو بہت خوبصورت ہے۔“
مجھے اس کے دیکھنے کا انداز اور وہ جملہ بالکل پسند نہیں آیا لیکن میں بولی کچھ نہیں۔

اس رات میں بہت پر سکون نیند سوتی۔
صبح میں نے سارہ سے پوچھا "تم اسکو نہیں جانتی
"ہو؟"

”میں اسکول جا کر کیا کروں گی؟“ سائرہ نے کہا۔
 ”اے بھئی، پڑھو گی نہیں تو جاہل رہ جاؤ گی۔“

بابا کچھ خاصے پریشنے ہماری باتیں سن رہے تھے۔ انہوں نے کہا ”بالو بیٹا میں جانتا ہوں کہ تجھے پڑھائی کا بہت شوق ہے۔ میں تجھے ضرور پڑھاؤں گا۔ اس بہانے ساتھ بھی کچھ لکھنا پڑھنا سکھ جائے گی۔“

اسکول وہاں سے دو میل دور تھا۔ بابا نے سائرہ کا اور میرا داخلہ کرا دیا۔ اسکول میں میرا ٹیسٹ لیا گیا اور پچھروں نے کہا کہ اس بچی کو پانچویں کلاس میں داخل کرادیں۔ یہ تو پہلے ہی سے بہت کچھ جانتی ہے۔ یوں میرا داخلہ پانچویں اور سائرہ کا پہلی کلاس میں ہو گیا۔

پھر تو میری دنیا ہی بدل گئی۔ میں خوب دل لگا کر پڑھنے لگی۔ میں نے پڑھائی میں اتنی محنت کی کہ اس سال کلاس میں میری دوسری پوزیشن آئی۔

ساجد بھائی بھی اب مجھ سے بہت بے تکلف ہو گئے تھے لیکن میں ان کی آنکھوں سے ڈرتی تھی۔ وہ بہت عجیب انداز میں میرا جائزہ لیتے تھے۔ سب سے بڑے ساجد بھائی تھے جو ریلوے میں ملازم تھے اور لاہور میں رہتے تھے۔ ان کا شادی ہو چکی تھی۔ ان کے بیوی بچے بھی ان کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ اس دوران میں وہ دوبار حسن پور آ چکے تھے۔ مجھے وہ بابا کی طرح پہلی ہی نظر میں بہت اچھے لگے۔

پھر تو وقت کا پہلا اتنی رفتار سے کھوما کہ احساس بھی نہ ہوا
ور میں میٹرک میں پہنچ گئی۔

اس دوران میں پروین باگی اور فہیدہ باگی کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ سائرہ نے پانچویں کلاس پاس کرنے کے بعد ہی سکول چھوڑ دیا تھا۔

کچھ کھانے کو لاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ اس کمرے میں ایک طرف گیا۔ ایک چنگیر میں دو روٹیاں اور ساگ لے کر آ گیا۔ ایک کنوڑی میں مٹھن بھی تھا۔

رونی دیکھ کر میرے پیٹ میں اتھن سی ہونے لگی اور میں کھانے پر گویا ٹوٹ پڑی۔ میں نے تھوڑی ہی دیر میں دونوں روٹیاں، ساگ اور مٹھن سب کچھ صاف کر دیا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ یہ کھانا تو شاید بابا اپنے لیے لایا ہوگا۔ میں سوچے سمجھے بغیر سب کچھ کھا گئی۔

”اب تم کہاں جاؤ گی باؤ بیٹا؟“ بابا نے پوچھا۔
 ”جدھر منہ اٹھے گا چلی جاؤں گی۔ ویسے بھی میرا اس دنیا
 میں ہے ہی کون؟“ میں نے افسردہ گی سے کہا۔

”اگر تم مناسب سمجھو تو میرے گھر چلو۔“ بابا نے کہا۔
میں بھی تین بیٹیوں اور دو بیٹوں کا باپ ہوں۔ میں سمجھوں گا
کہ اللہ نے مجھے ایک بیٹی اور دو بیٹے دیے۔“

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ جہاں اس وقت میں تھی، وہ تو بابا کا بکریوں اور بھینسوں کا باڑا تھا۔ وہاں انہوں نے کچھ مرغیاں بھی پال رکھی تھیں۔ باڑے میں ایک چوکیدار بھی تھا۔ بابا کا گھر وہاں سے کچھ فاصلے پر تھا۔

بابا مجھے اپنے ساتھ کھلے گئے تو ان کی پیشیوں نے
حیرت سے مجھے دیکھا۔ بابا نے انہیں بتایا کہ یہ ہاتھ اور یہ
آج سے نہیں رہے گی۔

بابا کی سب سے بڑی بیٹی پروین بہت ہنس مکھ اور خوش اخلاق تھی۔ ان سے چھوٹی فہیدہ باجی تھیں۔ وہ بہت کم گو تھیں لیکن انہوں نے میری آمد پر کسی ناگواری کا اظہار نہیں کیا۔ سب سے چھوٹی سائرہ میری ہی ہم عمر تھی۔ وہ فوراً ہی میرے ساتھ گھل مل گئی۔

”تمہارے امی ابو کہاں رہتے ہیں ہانوس؟“ اس نے پوچھا۔

”میرے امی ابو دونوں اس دنیا میں کہیں ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”میری امی بھی اللہ میاں کے پاس چلی گئی ہیں۔“
سائرہ نے کہا۔

پروین باجی نے مجھے سائرو کا ایک جوڑا دیا اور کہا کہ تم
 نہا کر کپڑے بدل لو۔ تمہارے کپڑے تو بہت میلے ہو رہے
 ہیں۔

میں نہا کر نکلی تو وہ لوگ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ سائڑہ
میں کر بولی ”اے واہ! تم تو بہت خوبصورت ہو۔“

میں ہی پڑھائی کے جنون میں مبتلا تھی اور رات دن محنت کر رہی تھی۔ اُن دنوں میرے میٹرک کے امتحانات نزدیک تھے، اس لیے میں رات رات بھر جاگ کر امتحان کی تیاری کرتی تھی۔

میٹرک کے تمام پرچے میں نے بہت اچھے کیے تھے۔ نویں جماعت میں بھی میری اچھی پوزیشن تھی اور میری ٹیچروں کو یقین تھا کہ بائو میٹرک میں ہمارے اسکول کا نام روشن کرے گی۔

میں اُن دنوں فارغ تھی اور میٹرک کے رزلٹ کا انتظار کر رہی تھی۔ میں اکثر فرصت کے اوقات میں باڑے میں چلی جاتی تھی۔ بابا اب بہت ضعیف ہو چکے تھے۔ وہ زیادہ تر یا تو لیٹے رہتے یا پھر ایک موٹے سے پر بیٹھ کر مگروں کا جائزہ لیتے رہتے۔

میں اس دن باڑے میں پہنچی تو بابا کے بجائے وہاں ساجد بھائی بیٹھے تھے۔

”آؤ باؤ! تم کہاں بھول پڑیں؟“ وہ مسکرا کر بولے۔

”بابا کہاں ہیں ساجد بھائی؟“ میں نے پوچھا۔

”بابا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ میں نے انہیں چوکیدار کے ساتھ گھر بھیج دیا ہے۔ تم بیٹھو تو کھٹی۔“ انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر بٹھانا چاہا۔

”نہیں ساجد بھائی! میں گھر جاؤں گی۔“ میں نے سر دھجے میں کہا۔

انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر تھسٹ لیا اور بولے ”کبھی دو گھنٹی ہمارے ساتھ بھی بیٹھ جایا کرو۔“

”میرا ہاتھ چھوڑیں۔“ میں نے درشت لہجے میں کہا۔

وہ مزید دست درازی پر اتر آئے۔ انہوں نے دھکا دے کر مجھے چنگ پر گرا دیا اور میرے دونوں ہاتھ جکڑ لیے۔

”تم مجھ سے اتنی دور دور کیوں رہتی ہو باؤ! میں نے تو پہلی ہی نظر میں تمہیں دل میں بسالیا تھا۔“ انہوں نے میرا دوپٹا کھینچ کر ایک طرف پھینک دیا۔

ان پر شیطان سوار تھا۔ مجھے اپنی عزت خطرے میں نظر آرہی تھی۔ چنگ کے پاس ہی ایک ڈنڈا پڑا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر وہ ڈنڈا اٹھالیا اور پوری قوت سے ساجد کے سر پر رسید کر دیا۔ وہ کراہ کر پیچھے کی طرف گرا۔ مجھے اس وقت اتنا اشتعال تھا کہ میں نے دوسرا ڈنڈا اس سے بھی زیادہ زور سے مارا۔ ساجد نے ایک ہنگامی اور اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

میرے ہاتھ پیر پھول گئے۔ غصے اور اشتعال میں میرے ہاتھوں ایک قتل ہو چکا تھا۔ قتل بھی اس محسن کے بیٹے کا جس نے مجھے پناہ دی اور مجھے بڑھایا لکھایا۔

میں نے سوچا، اب پولیس آئے گی اور مجھے گرفتار کر لے گی، پھر وہ لوگ مجھے پھانسی پر لٹا دیں گے۔ میں یہ سوچ کر لرز گئی اور وہاں سے بھاگ نکلی۔

مجھے اب راستوں کی پہچان ہو گئی تھی۔ میں وہاں سے سیدھی بسوں کے اڈے پر پہنچی۔ میرا ارادہ تھا کہ میں وہاں سے لاہور یا پھر کراچی چلی جاؤں گی لیکن اچانک مجھے احساس ہوا کہ میرے پاس تو بھونی کوڑی بھی نہیں ہے۔ میں بغیر پیسوں کے کہیں بھی نہیں جاسکتی تھی۔

مجھے اچانک ہی سونے کی اس جین کا خیال آیا جو بابا نے مجھے آٹھویں جماعت میں پاس ہونے پر انعام کے طور پر دی تھی۔

میں لاہور جانے والی بس میں سوار ہو گئی۔

کنڈکٹر نے ٹکٹ مانگا تو میں نے کہا ”بھائی! میں اپنے گھر والوں کے ساتھ لاہور جا رہی تھی۔ بس یہاں رکی تو میں اتر کر ہاتھ روم کی طرف چلی گئی۔ میں واپس آئی تو بس جا چکی تھی۔ میرے پاس پیسے تو نہیں ہیں، تم یہ سونے کی جین رکھ لو۔“

”کوئی بات نہیں بہن!“ کنڈکٹر نے کہا ”تم اپنی جین اپنے پاس رکھو۔ ہاں، تمہیں وہاں بس کے اڈے پر اتر کر گھر جانے کے لیے بھی تو پیسوں کی ضرورت ہوگی، تو میری طرف سے یہ رکھ لو۔ یہ ایک بھائی کی طرف سے ہے۔“ اس نے سو روپے کا نوٹ زبردستی میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

میں لاہور پہنچی تو شہر دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اتنا بڑا شہر، اتنے انسان، اتنی بڑی بڑی عمارتیں۔

اب پھر وہی سوال مجھے ڈس رہا تھا کہ میں کہاں جاؤں؟ اچانک مجھے ایک تانگے والے کی آواز سنائی دی ”آؤ داتا دربار۔۔۔ داتا دربار!“

میں نے داتا دربار کا نام سن رکھا تھا۔ میں تانگے میں بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر میں تانگے والے نے مجھے داتا دربار پہنچا دیا۔

وہاں بھی لوگوں کا ایک مجمع تھا۔ وہاں پہنچ کر مجھے بہت سکون ملا۔ میں نے مزار پر فاتح پڑھی اور وہیں رک کر کونے میں بیٹھ گئی۔ وہاں بے شمار نورتیں، مرد، بچے اور بوڑھے بیٹھے ہوئے تھے۔

پھر شاید بیٹھے بیٹھے مجھے اذگہ آگئی تھی۔ یوں بھی میں رات بھر کی جاگی ہوئی تھی۔ بس ساری رات چلتی رہی تھی اور صبح کا اُجالا پہلنے کے بعد لاہور پہنچی تھی۔

کسی نے میرا کندھا ہلایا کر مجھے دکھایا تو میں سمٹ کر بیٹھ گئی۔ وہ کوئی بزرگ تھے۔ مجھ سے بولے ”بیٹی! چل لنگر تیار ہے۔ میں تجھے صبح سے یہیں بیٹھا دیکھ رہا ہوں۔“

لنگر میں تو مرد، روٹی اور ٹھیکری۔ میں نے خوب سیر ہو کر کھایا اور ایک مرتبہ پھر مزار پر آ گئی۔

وہاں فاتحہ پڑھنے والے ایک آدمی کے بغل میں ایک اخبار دبا ہوا تھا۔ وہ فاتحہ پڑھنے لگا تو اخبار اس کی بغل سے گر کر اڑتا ہوا میری طرف آ گیا۔

میں نے اس خیال سے اخبار اٹھالیا کہ وہ صاحب فاتحہ پڑھ کر فارغ ہوں گے تو انہیں دلوں گی۔

میں نے یونہی اخبار کی سرخیوں پر نظر ڈالی تو چونک اٹھی۔ اخبار کے پہلے ہی صفحے پر خبر تھی۔ نامعلوم افراد نے حسن پور کے ایک نوجوان ساجد کو ڈنڈے مار کے شدید زخمی کر دیا۔ تاہم اس کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ پولیس کا خیال ہے کہ یہ کسی پرانی دشمنی کا نتیجہ ہے۔ ساجد کے باپ کو ڈہرا صدہ، ان کی جوان بیٹی لاپتا ہے۔ انہیں شبہ ہے کہ جن لوگوں نے ساجد کو زخمی کیا ہے، وہی بانو کے اغوا کے ذمے دار ہیں۔“

گویا میرے سر پر پولیس اور گرفتاری کی جوتلواری لٹکی ہوئی تھی، وہ اب نہیں رہی تھی۔

میں نے سوچا کہ میں لاہور کے کسی بڑے گھر میں برتن مانجھ کر اور ہمارے دوپٹے پا کر کے اپنی زندگی گزار دوں گی۔ وہاں کسی نہ کسی بیٹلے میں کام مل ہی جائے گا۔

میں تانگے میں بیٹھ گئی۔ گلیوں پر چلتے چلتے میں نے سب سے پہلے جس بیٹلے میں داخل ہونے کی کوشش کی، وہاں کے چوکیدار نے مجھے ڈانٹ کر بھگا دیا۔ وہ مجھے کوئی بھکارن سمجھا تھا۔ دوسرے بیٹلے میں بھی یہی ہوا۔ تیسرے بیٹلے میں مجھے اندر جانے کا موقع مل گیا۔ وہاں تیس بیس سال کا ایک جوان آدمی اور ایک بوڑھی خاتون تھیں۔

میں نے خاتون سے کہا ”میں بہت ضرورت مند ہوں، اگر آپ کے گھر مجھے کوئی کام مل جائے تو بہت مہربانی ہوگی۔“ ”ہاں، ہاں، کیوں نہیں؟“ خاتون سے پہلے اس نوجوان نے کہا ”تمہیں یہاں کام بھی ملے گا اور رہنے کا ٹھکانا

بھی۔“

مجھے اس کی آنکھوں میں وہی شیطانی چمک نظر آئی جو میں ساجد کی آنکھوں میں دیکھ چکی تھی۔

”تنخواہ کیا لوگی؟“ خاتون نے پہلی دفعہ کہا۔

مجھے وہاں کام کرنا ہی نہیں تھا اس لیے میں نے کہا ”میں دس ہزار روپے لوں گی اور۔۔۔“

”بی بی! اتنے خرچے اچھے نہیں ہوتے۔“ خاتون نے منہ بنا کر کہا ”جاؤ، کوئی اور گھر دیکھو۔“

میں خاموشی سے باہر آ گئی۔

پانچویں بیٹلے میں مجھے ایک خوش اخلاق اور مہذب خاتون ملی۔ میں نے ان سے اپنا مدعا بیان کیا تو وہ بولیں ”بیٹا! اپنی بات چیت سے تو تم پڑھی لکھی لگتی ہو، پھر یہ کام کیوں کر کرنا چاہتی ہو؟“

”اصل میں میرا اس دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے۔“ میں نے جواب دیا ”والدین بس کے ایک حادثے میں چل بسے۔ مجھے ملازمت کے ساتھ ساتھ سر چھپانے کو ایک ٹھکانا بھی چاہیے۔“

”اگر ایسی بات ہے تو تم یہاں کام کر سکتی ہو۔“ بیچے سے ایک مردانہ آواز آئی۔

میں نے سر کر دیکھا۔ وہ صاحب بچپن اور سانحہ کے لگ بھگ تھے۔ سر کے بال بالکل سفید تھے لیکن صحت قابل رشک تھی۔ ان کے چہرے پر بہت نفیس فریم کا چشمہ تھا اور ہاتھ

میں انگریزی کا ایک اخبار تھا۔ وہ خاتون کے شوہر تھے۔ خاتون نے مجھے بتایا کہ میں اور میرے شوہر دونوں درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ ہیں۔ خاتون کی کانج میں پرنسپل تھیں اور ان کے شوہر آفتاب صاحب ریٹائر ہو چکے تھے۔ دو بیٹے تھے، وہ دونوں امریکا میں جا بسے تھے۔ ایک بیٹی تھی، اس کی بھی شادی ہو چکی تھی اور وہ کراچی میں تھی۔ یوں دونوں میاں بیوی اس وسیع و عریض بیٹلے میں بالکل تنہا تھے۔

ان کا صرف ایک ملازم تھا جو ان کا چوکیدار، مالی اور ڈرائیور کبھی کبھار تھا۔

”تم تنخواہ کیا لوگی؟“ آفتاب صاحب نے پوچھا۔

”مجھے سر چھپانے کو صرف ایک ٹھکانا اور دو وقت کی روٹی چاہیے۔“ میں نے کہا ”آپ جو بھی مناسب سمجھیں دے دیجئے گا۔“ پھر میں کچھ سوچ کر بولی ”لیکن میری ایک شرط ہے۔“

آفتاب صاحب نے چونک کر مجھے دیکھا ”اچھا، تمہاری

کوئی شرط بھی ہے؟

”میں پڑھنا چاہتی ہوں۔“ میں نے کہا ”میں نے میٹرک کا امتحان دیا ہے۔ رزلٹ آنے کے بعد میں کالج میں داخلہ لوں گی۔ کالج کے بعد میں تمام وقت آپ کو دوں گی۔“ ہمارے گھر میں اتنا کام نہیں ہوتا جی ”خاتون نے کہا“ کھانا تو میں خود ہی بنا لیتی ہوں۔ دو آدمیوں کا کھانا ہی کتنا ہوتا ہے۔ بس مجھ سے اس گھر کی صفائی نہیں ہوتی، اس کے لیے بھی ایک ماسی آتی ہے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ آپ لوگوں کو میری ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے مایوسی سے کہا ”پچھلے کوئی بات نہیں، میں کہیں اور قسمت آزمائی ہوں۔“

”بیٹا! زمانہ بہت خراب ہے۔“ آفتاب صاحب نے کہا ”تم ابھی بچی ہو اور تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ ایک جوان، خوبصورت اور تہا لڑکی کے لیے کتنے مسائل ہوتے ہیں۔“ مجھے اندازہ ہے۔“ میں نے کہا ”اسی لیے تو میں نے دو تین جگہ کام کرنے سے انکار کر دیا۔“ یہ کہہ کر میں جانے کے لیے مڑی۔

”سنو! خاتون نے کہا ”میں نے یہ تو نہیں کہا کہ تم یہاں سے چلی جاؤ۔ تم یہاں رہ سکتی ہو۔“

ان کی بات سن کر مارے خوشی کے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

میں وہاں رہنے لگی۔ وہاں زیادہ کام نہیں تھا۔ میں صبح اٹھتے ہی پورے گھر کی صفائی کر دیتی تھی، پھر ناشتا تیار کرتی اور میمونہ بیگم اور آفتاب صاحب کے ساتھ خود بھی ناشتا کرتی۔ ان خاتون کا نام میمونہ بیگم تھا۔ وہ کالج چلی جاتیں تو میں اخبار لے کر بیٹھ جاتی۔ وہاں صرف انگریزی کے اخبارات تھے۔ میں ڈکشنری کی مدد سے انہیں پڑھنے کی کوشش کرتی۔

ایک ہی مہینے میں میری انگلش اتنی اچھی ہو گئی کہ میں ڈکشنری کے بغیر بھی اخبار پڑھنے لگی۔ کوئی لفظ سمجھ میں نہ آتا تو ڈکشنری دیکھ لیتی۔

ان ہی دنوں ایک دن میٹرک کا رزلٹ آ گیا۔ آفتاب صاحب خوشی خوشی میرے پاس آئے اور بولے ”ہانوا تمہارے لیے ایک خوش خبری ہے۔“

”کیسی خوش خبری انگل؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

میمونہ بیگم بھی چونک کر انہیں دیکھنے لگیں۔

”تم میٹرک میں پاس ہو گئی ہو۔“ انہوں نے اخبار

میرے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔

”لیکن آپ کو کیسے معلوم ہوا۔“ میں نے پوچھا ”آپ کو تو میرا رول نمبر بھی معلوم نہیں ہے۔“

”مجھے رول نمبر کی ضرورت بھی نہیں ہے۔“ انہوں نے اخبار میرے سامنے ڈال دیا۔

اس میں پہلے ہی صفحے پر میری تصویر کے ساتھ کچھ دوسرے طالب علموں کی تصویریں بھی تھیں۔ میں نے پورے بورڈ میں دوسری پوزیشن لی تھی۔

وہ دن واقعی میرے لیے بہت خوشی کا دن تھا۔ میمونہ بیگم بھی بہت خوش تھیں۔ وہ بار بار یہی کہہ رہی تھیں کہ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم پڑھنے میں اتنی اچھی ہو۔ اب میں تمہارا داخلہ اپنے ہی کالج میں کراؤں گی۔ پھر انہوں نے اپنے ذرائع سے میرے اسکول سے کانڈنٹ منگوا لیے۔ یوں میرا داخلہ میمونہ بیگم کے کالج میں ہو گیا۔ کالج میں انہوں نے یہی بتایا تھا کہ ہانو میری بھانجی ہے۔

میں پھر رول لگا کر پڑھنے لگی۔ میں اس گھر میں ملازمہ نہیں بلکہ گھر کے ایک فرد کی طرح تھی۔

میں نے اس دن ایم بی بی ایس کا امتحان بھی بہت

اختیاری نمبروں سے پاس کیا تھا اور اب میں ہاؤس جاب کر رہی تھی۔ ہاؤس جاب سے فارغ ہو کر مجھے لاہور ہی کے ایک سرکاری اسپتال میں جاب مل گئی۔ میں بھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ہلکاری کے ایک کمی کی بنی بھی ڈاکٹر بن سکتی ہے۔

ایک دن میں اولی ڈی میں مریضوں کو دیکھ رہی تھی کہ ایک مریض کو دیکھ کر چونک اٹھی۔ وہ ماجد بھائی تھے۔ وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ بوڑھے لگ رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ مجھے کچھ عرصے سے کھانسی کی شکایت ہے۔ رات کو تو کھانسی کی وجہ سے نیند بھی نہیں آتی۔

میں نے انہیں مختلف ٹیسٹ کرانے کو کہا پھر ان سے بولی۔

”ماجد بھائی! آپ نے مجھے پہچانا؟“

انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر چند لمحے غور کرنے کے بعد وہ خوشی سے چلائے ”ہانو..... تم ہانو ہونا؟“

”جی ماجد بھائی! میں ہانو ہوں۔“ میں نے کہا ”اور میں نے ڈاکٹر بننے کے لیے بہت محنتیں کیں ہیں۔“

”ہانو بیٹا! ماجد بھائی نے کہا ”تو گھر چھوڑ کر کیوں آ گئی؟“

ساجد نے اپنی اس غلیظ حرکت کا اعتراف کر لیا تھا۔ وہ اسپتال سے صحت یاب ہو کر آیا تو بابا نے اسے گھر سے نکال

دیا۔“

”ماجد بھائی! بابا کیسے ہیں؟ سائرہ، فہمیدہ باجی اور پروین باجی کیسی ہیں؟“ میں نے ایک ہی سانس میں سب کے بارے میں پوچھ لیا۔

”سب خوش ہیں، سائرہ کی بھی شادی ہو گئی ہے، پروین اور فہمیدہ کی شادی تو پہلے ہی ہو گئی تھی۔“

”پھر تو بابا اس گھر میں اکیلے رہ گئے ہوں گے؟“ میں نے کہا۔

”ہاں، بابا اب اکیلے ہیں، بالکل اکیلے۔ وہ ایسی جگہ ہیں جہاں انسان اکیلا ہی رہتا ہے۔“

”میں بھی نہیں ماجد بھائی! بابا کہاں ہیں؟“

”بابا کا انتقال ہو چکا ہے۔“ ماجد بھائی نے افسردگی سے کہا۔

بابا کی موت کی خبر سن کر میری آنکھوں سے بھی بے اختیار آنسو بہنے لگے۔

ماجد بھائی نے کہا ”ہانو بیٹا! بابا آخری وقت تک یہی کہتے رہے کہ ہانو کے ساتھ بہت زیادتی ہوئی ہے۔ اسے کہیں سے ڈھونڈ لاؤ۔ ساجد کی طرف سے بھی میں اس سے

بھائی مانگ لوں گا۔ ساجد نے اس کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔“

ماجد بھائی ریشٹا نہ ہو چکے تھے۔ انہوں نے لاہور ہی کے ایک چھوٹے علاقے میں پرچون کی دکان کھول لی تھی۔

میں نے لگ کر ان کا علاج کیا۔ سگریٹ نوشی کی زیادتی کی وجہ سے ان کی کھانسی بڑھتی جا رہی تھی، اس سے پیپھڑے بھی متاثر ہو رہے تھے۔ میں نے سب سے پہلے تو ان کی سگریٹ چھڑائی۔ پھر ان کا علاج کیا تو وہ ایک مہینے کے اندر

اندر ٹھیک ہو گئے۔

وہ ایک دن بہت اصرار کر کے مجھے اپنے گھر لے گئے۔ وہ گڑھی شاہو کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے۔

بھائی اور بچے بھی مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ ماجد بھائی انہیں پہلے ہی میرے بارے میں بتا چکے تھے۔

اچانک ایک دن میرا تبادلہ ہو گیا۔ میں سرکاری اسپتال میں جاب کرتی تھی اس لیے تبادلہ تو کہیں بھی ہو سکتا تھا۔ میں نے تبادلے کا لیٹر دیکھا تو مجھے معلوم ہوا کہ مجھے پنجاب کے ایک دور دراز علاقے ہلکاری بھیجا جا رہا ہے۔ ہلکاری کا

نام پڑھ کر میں بری طرح چونک اٹھی۔

میں نے اپنے ایم ایس سے پوچھا ”سرا جہاں تک مجھے

یاد پڑتا ہے، ہلکاری میں تو کوئی اسپتال نہیں تھا۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں ڈاکٹر!“ ایم ایس نے مسکرا کر کہا ”وہاں ابھی دو سال پہلے ہی اسپتال تعمیر ہوا ہے۔ آپ وہاں جا کر خوش ہو جائیں گی۔ وہ بہت چرچا اور خوبصورت علاقہ ہے۔ ہر طرف سبزہ اور ہریالی ہے۔ اسپتال کے افتتاح کے موقع پر میں بھی ہلکاری گیا تھا۔ پھر آپ نے تو خود بھی یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ آپ کسی گاؤں میں کام کرنا چاہتی ہیں۔ گاؤں اور دیہات میں ڈاکٹر عموماً جانے سے گریز کرتے ہیں۔“

میں نے سوچا کہ اب مجھے وہاں کیا نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اب میں کسی کمی کی بنی اور چودھری دلاور کی نوکرائی نہیں بلکہ ایک سرکاری اسپتال کی ڈاکٹر ہوں۔ میں نے ہلکاری جانے کی ہائی بھری۔

میں ہلکاری پہنچی تو وہاں تھوڑی سی تبدیلی کے علاوہ سب کچھ ویسا ہی تھا۔ وہی ہریالی اور شادابی، وہی لہلہاتی فصلیں اور وہی شفاف پانی کی نہر!

میں نے وہاں کسی کو بھی اپنے بارے میں نہیں بتایا۔ ہاں، میں نیلم سے ملنے کے لیے تڑپ رہی تھی۔ نہ جانے وہ کس حال میں ہوگی؟

اسپتال کی عمارت نئی تھی۔ معلوم ہوا کہ یہ عمارت چودھری شہزاد نے اپنے خرچ سے تعمیر کی ہے۔ پھر مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی کہ گاؤں میں ایک پرائمری اسکول بھی ہے

جہاں گاؤں کی لڑکیاں بھی پڑھتی ہیں۔ وہ اسکول بھی چودھری شہزاد نے بنوایا تھا۔

میں حیران تھی کہ یہ انقلاب کیسے آ گیا؟ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ابھی چودھری دلاور نہ صرف زندہ ہے بلکہ اس کی صحت بھی قابل رشک ہے۔

میں نے تنہائی کے خیال سے پہلے میمونہ آنٹی کو ہلکاری بلوانا چاہا لیکن وہ اپنی ملازمت چھوڑ کر کیسے آ سکتی تھیں۔

اسپتال کے ساتھ ہی چودھری شہزاد نے ڈاکٹر کے لیے ایک بنگلا بھی بنوایا تھا۔

میں نے ماجد بھائی اور بھائی کو اپنے ساتھ رہنے پر آمادہ کر لیا۔ وہ ہلکاری آ کر بہت خوش ہوئے۔

اب زندگی میں ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔ بس ابھی تک چودھری دلاور یا چودھری شہزاد سے میرا سامنا نہیں ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر نہ جانے چودھری دلاور کا کیا رد عمل ہوتا۔

گاؤں کی تقریباً تمام ہی عورتیں اب عظیم کو چھوڑ کر

دوبلے کے کسی بھی گوشے میں اور ملک گھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 600 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 6,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 5,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد
رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ ہم اسی حساب سے
ارسال کریں ہم فوراً آپ کے فیے ہوئے پتے پر
رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے پیراوں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ، منی آرڈر یا ویسٹرن یونین
کے ذریعے بھیجی جاسکتی ہے۔ مقامی حضرات دفتر
میں نقد ادائیگی کر کے رسید حاصل کر سکتے ہیں

رابطہ: شمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
C-63 فیروز ٹی وی سٹیشن ہاؤس، اتحادی بین کوریڈر، کراچی
فون: 35895312، فیکس: 35802551

کے لیے میلوں کا سفر طے کر کے لے جانا پڑتا تھا۔
”یہ کام تو آپ نے بہت اچھے کیے ہیں چودھری
صاحب! اللہ.....“

”بانو!“ شہزاد نے میری بات کاٹ دی ”کیا تم مجھے
صرف شہزاد نہیں کہہ سکتیں۔ چودھری صاحب کے الفاظ سے
غیر یہ کیوں آتی ہے۔“

”میں بھلا آپ کا نام کیسے لے سکتی ہوں؟“ میں نے
نظریں جھکا کر کہا۔

”میں تمہارا نام لے رہا ہوں۔“ شہزاد نے کہا ”اپنے
لوگ چودھری صاحب اور مالک کہتے ہوئے اچھے نہیں
لگتے۔“

”اپنے لوگ!“ میں نے دھڑکتے دل سے اسے
دیکھا۔

”ہاں اپنے لوگ!“ شہزاد مسکرا کر بولا ”تم مجھے برسوں
بعد ملی ہو اب بھی غیروں کی طرح باتیں کرتی ہو۔ بانو! میں
تو تمہیں اسی دن سے پسند کرتا ہوں جب تمہیں پہلی بار دیکھا
تھا حالانکہ اس وقت تو مجھے محبت کا مطلب بھی نہیں آتا تھا۔“
میں نے شرما کر نظریں نہ کالیں۔

پھر تو شہزاد روز ہی اسپتال آنے لگا۔ ہم لوگ گھنٹوں
بیٹھے باتیں کرتے رہتے۔
ہمارے یوں ملنے سے اسپتال کے دوسرے ملازمین چہ
میگوئیاں کرنے لگے۔

میں نے ایک دن شرما تے ہوئے شہزاد سے کہا ”شہزاد!
ہم اب کب تک ایسے ملتے رہیں گے، اب تو لوگ بھی باتیں
بناتے لگے ہیں۔“

”ہاں بانو! مجھے بھی اس بات کا احساس ہے۔“ شہزاد
نے کہا ”میں جلد ہی بابا کو تمہارے بھائی کے پاس بھیجوں گا۔“
گاؤں کے دوسرے لوگ ماجد بھائی کو میرا رشتے کا
بھائی سمجھتے تھے۔

”بس مجھے اماں کی واپسی کا انتظار ہے۔ وہ دو چار دن
میں آنے والی ہیں۔ اب میں اس وقت آؤں گا جب ہماری
شادی کی بات بنی ہو جائے گی۔“

میں نے شرما کر پھر نظریں جھکا لیں اور شہزاد مسکراتے
ہوئے چلا گیا۔ اس کے جانے سے کمر ایک دم خالی خالی سا
لگنے لگا۔ اس کی پر فیوم کی مہک ابھی تک کمرے میں پھرا رہی
تھی۔ اس خیال ہی سے میرا دل ڈوبا جا رہا تھا کہ اب شہزاد نہ
جانے کب آئے گا؟ لیکن اپنی رسوائی کے خیال سے مجھے یہ

میں مسکرائی ”میں تو آپ کو پہلی ہی نظر میں پہچان گئی لیکن آپ
مجھے نہ پہچان سکے۔“

اس نے ایک مرتبہ پھر مجھے غور سے دیکھا، پھر خوشی سے
لرزتی ہوئی آواز میں بولا ”بانو..... تم بانو ہونا؟“ وہ اچانک
ہی آپ سے تم پر آ گیا۔

”ہاں، میں وہی بانو ہوں جسے آپ کے باپ نے تہ
خانے میں قید کر دیا تھا۔“

”لیکن تم تو شہر میں کوئی تھیں۔ ہمارے ایک ملازم نے
بتایا تھا کہ بانو ڈوب کر مر گئی۔“

”اگر مجھے تیرا نہ آتا ہوتا تو میں یقیناً مر جاتی۔“ میں
نے کہا پھر مختصر اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

”صائمہ کیسی ہیں؟ مالک کا کیا حال ہے اور سب لوگ
کیسے ہیں چودھری صاحب؟“

شہزاد کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ وہ
افردہ لہجے میں بولا ”صائمہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔“

میرے باپ کی جہالت نے اس کی جان لے لی۔ بابا نے
اسے کاری قرار دے کر جان سے مار دیا۔ اس کا قصور صرف
یہ تھا کہ وہ اپنی پسند سے شادی کرنا چاہتی تھی لیکن وہ شخص

میرے باپ کی نظروں میں کمی تھا۔ وہ بے چارہ تو اپنی جان
سے گیا ہی لیکن بابا نے صائمہ کو بھی نہ چھوڑا۔ اس اُن دنوں
تعلیم کے سلسلے میں ملک سے باہر تھا۔

صائمہ کی موت کی اطلاع ملی تو میں فوراً ہلکاری واپس
آ گیا اور بابا سے صاف صاف کہہ دیا کہ اب ہلکاری کے
تمام معاملات میں دیکھوں گا۔ آپ اس میں کوئی دخل نہ دیں
گے۔ اگر آپ کو یہ منظور نہیں تو میں ابھی اور اسی وقت واپس
چلا جاؤں گا۔ پھر آپ کبھی میری شکل نہ دیکھ سکیں گے۔“

صائمہ کی موت کی خبر نے مجھے بھی ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میری
آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے۔ شہزاد کی آنکھیں بھی نم
تھیں۔

اس نے مجھ سے کہا ”یہ سب جہالت کی کرشمہ سازی
ہے بانو! میں نے اسی دن فیصلہ کر لیا تھا کہ اب گاؤں میں
ہر آدمی تعلیم حاصل کرے گا۔ میں نے فوری طور پر گاؤں میں
اپنے خرچ سے ایک وسیع و عریض اسکول تعمیر کرایا۔ اس میں
لڑکے اور لڑکیاں علیحدہ علیحدہ پڑھتے ہیں۔ وہ اسکول ابھی تو
پرانٹری ہے لیکن اگلے سال تک میں اسے مڈل اور پھر میٹرک
کا درجہ دلوا دوں گا۔ اس کے بعد میں نے گاؤں والوں کی
سہولت کے لیے یہ اسپتال بنایا۔ ان بے چاروں کو اسپتال

میں سے پاس آنے لگی تھیں۔
ایک دن میں نے ایک مریضہ سے پوچھا ”تم نلیم کو
جاتی ہو؟“
”کون نلیم جی؟“ اس عورت نے پوچھا۔
”نلیم کا باپ کھیت مزدور تھا اور وہ چودھری صاحب کی
حویلی میں کام کرتی تھی۔“
”اچھا، آپ اس نلیم کی بات کر رہی ہیں۔ ہاں جی،
اسے جانتی ہوں۔ مالک نے اسے ایک مزارع سے اس کی
شادی کرادی ہے لیکن اولاد کوئی نہیں ہے۔ وہ اب بھی
چودھری دلاور کی حویلی میں کام کرتی ہے۔“
”تم میرا ایک کام کرو گی؟“ میں نے پوچھا ”تم نلیم کو
جا کر بتا دو کہ ڈاکٹر صاحب نے تمہیں بلا دیا ہے۔“
”لیکن نلیم تو بی مالک کے ساتھ کل ہی گجرات گئی ہے۔
وہاں مالک کے بڑے بھائی رہتے ہیں۔ وہ ڈیڑھ دو مہینے سے
پہلے نہیں آئے گی۔“
میں نے مایوسی سے کہا ”اچھا، جب وہ آئے، اسے
میرا پیغام پہنچا دینا۔“

☆ ☆ ☆
اس دن میں اولی ڈی سے فارغ ہوئی تھی کہ اسپتال
کے گیٹ پر ایک گاڑی آ کر رکی۔ میرے کیا غور نے بتایا
کہ ڈاکٹر صاحب، چھوٹے چودھری صاحب آئے ہیں۔ وہ کل
بھی آئے تھے لیکن آپ کسی مریض کو دیکھنے گئی ہوئی تھیں۔“

”انہیں اندر لاؤ، باہر کیوں بٹھایا ہے؟“ میں نے کہا۔
تھوڑی دیر بعد شہزاد کمرے میں داخل ہوا۔ میں اسے
دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ اس وقت اچانک مجھے احساس ہوا کہ
شہزاد کو تو میں اُس وقت سے چاہتی ہوں جب میں حویلی میں
کام کرتی تھی۔ میں اس کے احترام میں کھڑی ہو گئی تھی۔
وہ بھی پُرشوق نظروں سے میرا جائزہ لے رہا تھا۔
ہم دونوں غلطی باندھے چند لمحوں تک ایک دوسرے کو
دیکھتے رہے پھر شہزاد ہی نے خاموشی کو توڑا ”اچھا تو آپ ہیں
اس اسپتال کی ڈاکٹر؟“

”جی ہاں، آپ تشریف رکھیے۔“
وہ کرسی پر بیٹھ گیا لیکن کچھ الجھا ہوا سا تھا۔ اس نے
پُر خیال انداز میں کہا ”ڈاکٹر صاحب! آپ میرے اس طرح
دیکھنے کا برا مت مانیے گا۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا ہے
جیسے میں نے آپ کو پہلے بھی نہیں دیکھا ہے۔“

”آپ نے یقیناً مجھے دیکھا ہے چودھری صاحب!“

☆ ☆ ☆
اس دن میں اولی ڈی سے فارغ ہوئی تھی کہ اسپتال
کے گیٹ پر ایک گاڑی آ کر رکی۔ میرے کیا غور نے بتایا
کہ ڈاکٹر صاحب، چھوٹے چودھری صاحب آئے ہیں۔ وہ کل
بھی آئے تھے لیکن آپ کسی مریض کو دیکھنے گئی ہوئی تھیں۔“

”انہیں اندر لاؤ، باہر کیوں بٹھایا ہے؟“ میں نے کہا۔
تھوڑی دیر بعد شہزاد کمرے میں داخل ہوا۔ میں اسے
دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ اس وقت اچانک مجھے احساس ہوا کہ
شہزاد کو تو میں اُس وقت سے چاہتی ہوں جب میں حویلی میں
کام کرتی تھی۔ میں اس کے احترام میں کھڑی ہو گئی تھی۔
وہ بھی پُرشوق نظروں سے میرا جائزہ لے رہا تھا۔
ہم دونوں غلطی باندھے چند لمحوں تک ایک دوسرے کو
دیکھتے رہے پھر شہزاد ہی نے خاموشی کو توڑا ”اچھا تو آپ ہیں
اس اسپتال کی ڈاکٹر؟“

”جی ہاں، آپ تشریف رکھیے۔“
وہ کرسی پر بیٹھ گیا لیکن کچھ الجھا ہوا سا تھا۔ اس نے
پُر خیال انداز میں کہا ”ڈاکٹر صاحب! آپ میرے اس طرح
دیکھنے کا برا مت مانیے گا۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا ہے
جیسے میں نے آپ کو پہلے بھی نہیں دیکھا ہے۔“

”آپ نے یقیناً مجھے دیکھا ہے چودھری صاحب!“

☆ ☆ ☆
اس دن میں اولی ڈی سے فارغ ہوئی تھی کہ اسپتال
کے گیٹ پر ایک گاڑی آ کر رکی۔ میرے کیا غور نے بتایا
کہ ڈاکٹر صاحب، چھوٹے چودھری صاحب آئے ہیں۔ وہ کل
بھی آئے تھے لیکن آپ کسی مریض کو دیکھنے گئی ہوئی تھیں۔“

”انہیں اندر لاؤ، باہر کیوں بٹھایا ہے؟“ میں نے کہا۔
تھوڑی دیر بعد شہزاد کمرے میں داخل ہوا۔ میں اسے
دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ اس وقت اچانک مجھے احساس ہوا کہ
شہزاد کو تو میں اُس وقت سے چاہتی ہوں جب میں حویلی میں
کام کرتی تھی۔ میں اس کے احترام میں کھڑی ہو گئی تھی۔
وہ بھی پُرشوق نظروں سے میرا جائزہ لے رہا تھا۔
ہم دونوں غلطی باندھے چند لمحوں تک ایک دوسرے کو
دیکھتے رہے پھر شہزاد ہی نے خاموشی کو توڑا ”اچھا تو آپ ہیں
اس اسپتال کی ڈاکٹر؟“

”جی ہاں، آپ تشریف رکھیے۔“
وہ کرسی پر بیٹھ گیا لیکن کچھ الجھا ہوا سا تھا۔ اس نے
پُر خیال انداز میں کہا ”ڈاکٹر صاحب! آپ میرے اس طرح
دیکھنے کا برا مت مانیے گا۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا ہے
جیسے میں نے آپ کو پہلے بھی نہیں دیکھا ہے۔“

”آپ نے یقیناً مجھے دیکھا ہے چودھری صاحب!“

☆ ☆ ☆
اس دن میں اولی ڈی سے فارغ ہوئی تھی کہ اسپتال
کے گیٹ پر ایک گاڑی آ کر رکی۔ میرے کیا غور نے بتایا
کہ ڈاکٹر صاحب، چھوٹے چودھری صاحب آئے ہیں۔ وہ کل
بھی آئے تھے لیکن آپ کسی مریض کو دیکھنے گئی ہوئی تھیں۔“

”انہیں اندر لاؤ، باہر کیوں بٹھایا ہے؟“ میں نے کہا۔
تھوڑی دیر بعد شہزاد کمرے میں داخل ہوا۔ میں اسے
دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ اس وقت اچانک مجھے احساس ہوا کہ
شہزاد کو تو میں اُس وقت سے چاہتی ہوں جب میں حویلی میں
کام کرتی تھی۔ میں اس کے احترام میں کھڑی ہو گئی تھی۔
وہ بھی پُرشوق نظروں سے میرا جائزہ لے رہا تھا۔
ہم دونوں غلطی باندھے چند لمحوں تک ایک دوسرے کو
دیکھتے رہے پھر شہزاد ہی نے خاموشی کو توڑا ”اچھا تو آپ ہیں
اس اسپتال کی ڈاکٹر؟“

”جی ہاں، آپ تشریف رکھیے۔“
وہ کرسی پر بیٹھ گیا لیکن کچھ الجھا ہوا سا تھا۔ اس نے
پُر خیال انداز میں کہا ”ڈاکٹر صاحب! آپ میرے اس طرح
دیکھنے کا برا مت مانیے گا۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا ہے
جیسے میں نے آپ کو پہلے بھی نہیں دیکھا ہے۔“

”آپ نے یقیناً مجھے دیکھا ہے چودھری صاحب!“

☆ ☆ ☆
اس دن میں اولی ڈی سے فارغ ہوئی تھی کہ اسپتال
کے گیٹ پر ایک گاڑی آ کر رکی۔ میرے کیا غور نے بتایا
کہ ڈاکٹر صاحب، چھوٹے چودھری صاحب آئے ہیں۔ وہ کل
بھی آئے تھے لیکن آپ کسی مریض کو دیکھنے گئی ہوئی تھیں۔“

”انہیں اندر لاؤ، باہر کیوں بٹھایا ہے؟“ میں نے کہا۔
تھوڑی دیر بعد شہزاد کمرے میں داخل ہوا۔ میں اسے
دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ اس وقت اچانک مجھے احساس ہوا کہ
شہزاد کو تو میں اُس وقت سے چاہتی ہوں جب میں حویلی میں
کام کرتی تھی۔ میں اس کے احترام میں کھڑی ہو گئی تھی۔
وہ بھی پُرشوق نظروں سے میرا جائزہ لے رہا تھا۔
ہم دونوں غلطی باندھے چند لمحوں تک ایک دوسرے کو
دیکھتے رہے پھر شہزاد ہی نے خاموشی کو توڑا ”اچھا تو آپ ہیں
اس اسپتال کی ڈاکٹر؟“

”جی ہاں، آپ تشریف رکھیے۔“
وہ کرسی پر بیٹھ گیا لیکن کچھ الجھا ہوا سا تھا۔ اس نے
پُر خیال انداز میں کہا ”ڈاکٹر صاحب! آپ میرے اس طرح
دیکھنے کا برا مت مانیے گا۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا ہے
جیسے میں نے آپ کو پہلے بھی نہیں دیکھا ہے۔“

”آپ نے یقیناً مجھے دیکھا ہے چودھری صاحب!“

☆ ☆ ☆
اس دن میں اولی ڈی سے فارغ ہوئی تھی کہ اسپتال
کے گیٹ پر ایک گاڑی آ کر رکی۔ میرے کیا غور نے بتایا
کہ ڈاکٹر صاحب، چھوٹے چودھری صاحب آئے ہیں۔ وہ کل
بھی آئے تھے لیکن آپ کسی مریض کو دیکھنے گئی ہوئی تھیں۔“

”انہیں اندر لاؤ، باہر کیوں بٹھایا ہے؟“ میں نے کہا۔
تھوڑی دیر بعد شہزاد کمرے میں داخل ہوا۔ میں اسے
دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ اس وقت اچانک مجھے احساس ہوا کہ
شہزاد کو تو میں اُس وقت سے چاہتی ہوں جب میں حویلی میں
کام کرتی تھی۔ میں اس کے احترام میں کھڑی ہو گئی تھی۔
وہ بھی پُرشوق نظروں سے میرا جائزہ لے رہا تھا۔
ہم دونوں غلطی باندھے چند لمحوں تک ایک دوسرے کو
دیکھتے رہے پھر شہزاد ہی نے خاموشی کو توڑا ”اچھا تو آپ ہیں
اس اسپتال کی ڈاکٹر؟“

”جی ہاں، آپ تشریف رکھیے۔“
وہ کرسی پر بیٹھ گیا لیکن کچھ الجھا ہوا سا تھا۔ اس نے
پُر خیال انداز میں کہا ”ڈاکٹر صاحب! آپ میرے اس طرح
دیکھنے کا برا مت مانیے گا۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا ہے
جیسے میں نے آپ کو پہلے بھی نہیں دیکھا ہے۔“

”آپ نے یقیناً مجھے دیکھا ہے چودھری صاحب!“

کڑوا گھونٹ پینا ہی تھا۔

میں شام کو اکثر اپنے چوکیدار کے ساتھ نہر کے کنارے ٹہلنے نکل جاتی تھی۔ وہاں پہنچ کر میری بچپن کی یادیں تازہ ہو جاتی تھیں۔ خاص طور پر وہ جگہ تو میرے ذہن میں نقش تھی جہاں سے میں نے اپنی زندگی بچانے کے لیے چھلانگ لگائی تھی۔

اس دن بھی میرا دل بہت گھبرا رہا تھا۔ میں نے اپنے چوکیدار غفور کو بلایا اور کہا ”غفور! ذرا میرے ساتھ نہر تک چلو، میں کھلی فضا میں سانس لینا چاہتی ہوں۔“

غفور فوراً میرے ساتھ ہو گیا۔

میں نہر کے کنارے پہنچی تو مجھے شدید دھچکا پہنچا۔ چودھری دلاور وہاں اپنے ملازم خاص ارباب خان کے ساتھ موجود تھا۔ چودھری دلاور خاصا بوڑھا ہو گیا تھا لیکن اس کے چہرے پر وہی رعب تھا۔ وہ ارباب خان کا سہارا لے کر چل رہا تھا۔ ارباب خان بھی پہلے کے مقابلے میں عمر رسیدہ اور خاصا فربہ ہو گیا تھا۔

وہ دونوں کی بات پر اتنے محو تھے کہ انہیں وہاں میری موجودگی کا احساس بھی نہ ہوسکا۔ چودھری دلاور کے دو ملازم بھی اس سے کچھ فاصلے پر کھڑے ہوئے تھے۔

بات کرتے کرتے چودھری اچانک ارباب خان کی طرف ٹھوٹا۔ اب اس کی پشت نہر کی طرف تھی۔ نہر میں اس دن بھی پانی کا بہاؤ بہت شدید تھا۔

چودھری دلاور نے جوش میں آ کر ارباب خان سے کچھ کہنا چاہا اچانک اس کا پاؤں پھسلا اور وہ چھپاک سے پانی میں گر گیا۔

ارباب خان چیخنے لگا ”ارے کوئی دوڑو، چودھری صاحب کو بچاؤ، وہ ڈوب رہے ہیں۔“

چودھری دلاور کے دونوں ملازمین جھجک کر پیچھے ہٹ گئے۔ ارباب خان خود بھی تیرنا جانتا تھا لیکن اس عمر میں وہ تیر نہیں سکتا تھا۔

یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا، میں نے آؤدیکھا نداؤ، اپنی چادر اتار کر چھٹکی اور دوڑ کر نہر میں چھلانگ لگا دی۔

چودھری دلاور شاید خود بھی تیرنا جانتا تھا ورنہ وہ اب تک ڈوب چکا ہوتا۔ وہ پانی کے بہاؤ میں خاصا آگے نکل گیا تھا۔ میں تیز رفتاری سے تیرتے ہوئے چودھری کی طرف بڑھی اور ہاتھ بڑھا کر اس کی ایک ٹانگ پکڑ لی۔ میں اس کے ہاتھوں کی پٹلی سے دوڑ رہنا چاہتی تھی۔ اگر ڈوبنے والا، بچانے

والے کو پکڑنے تو پھر وہ دونوں ہی ڈوب جاتے ہیں۔

میں چودھری دلاور کی ٹانگ پکڑ کے اسے کھینچتے ہوئے کنارے تک لائی اور اسے کسی نہ کسی طرح اوپر پھینکا دیا۔

ارباب خان نے فوراً اسے سنبھال لیا اور مجھ سے بولا ”آپ کا بہت بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب! آپ نے چودھری صاحب کی جان بچا کر بہت بڑا احسان کیا ہے۔“

”میرا شکریہ بعد میں ادا کرنا، پہلے تم چودھری صاحب کو اسپتال پہنچاؤ۔ میں بھی وہیں جا رہی ہوں۔“ میں نے اپنی چادر اٹھا کر اسے جسم کے گروپینٹے ہوئے کہا۔

چودھری دلاور کے پیٹ میں خاصا پانی چلا گیا تھا جو بروقت طبی امداد سے نکال دیا گیا۔ میں نے اسے ایک انجکشن دیا اور ارباب خان سے کہا ”انہیں حویلی لے جاؤ اور چار پارچے لٹینے تک مکمل آرام کراؤ۔“

”تیرا بہت شکریہ، بہت مہربانی بیٹی!“ چودھری صاحب نے کہا۔

”چودھری صاحب! شکر تو اللہ کا ادا کریں جس نے اس وقت وہاں مجھے بھیج دیا۔ آپ کا کوئی آدمی تو نہر میں کودنے پر تیار ہی نہیں تھا۔“

”ڈاکٹر صاحب! مجھے تیرنا تو آتا ہے لیکن میں پچھلے دو سال سے دسے کے سر میں جٹلا ہوں۔ نہر میں کودتا تو میں بھی اپنی جان سے جاتا۔ باقی دو ملازموں کو سرے سے تیرنا ہی نہیں آتا۔“

اس واقعے کے تیسرے دن چودھری دلاور اور مالکین ہمارے گھر آ گئے۔ ماجد بھائی نے ان کا استقبال کیا اور انہیں بہت عزت اور احترام سے پیشکش میں بٹھا دیا۔

چودھری صاحب نے چائے وغیرہ پینے کے بعد لگی لپٹی رکھے بغیر کہا ”ماجد میاں! آج میں تم سے کچھ مانگنے آیا ہوں، انکار کر کے میرا دل مت توڑنا۔“

”مجھے غریب کے پاس کیا ہے چودھری صاحب!“ ماجد بھائی نے کہا ”آپ حکم کریں، اگر میرے بس میں ہوا تو میں کبھی انکار نہیں کروں گا۔“

”میں تمہاری بیٹی کو اپنی بیٹی بنانا چاہتا ہوں۔ میں ڈاکٹر بیٹی سے اپنے بیٹے شہزاد کی شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

”چودھری صاحب! یہ تو ہماری خوش بختی ہے کہ آپ خود چل کر یہاں تک آئے ہیں۔ میری طرف سے تو کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن میں ایک دفعہ بانو بیٹی سے بھی تو معلوم کر لوں۔“

”ضرور معلوم کرو۔ ہمیں بھی ایسی کوئی خاص جلدی نہیں ہے۔ ایک ہفتہ بہت ہوتا ہے۔“ مالکین نے کہا۔

”ایک ہفتہ؟“ ماجد بھائی چونک کر بولے۔

”ہاں، اگر تمہیں یہ عرصہ زیادہ لگ رہا ہے پتا تو کم کر لو۔“

اس بات پر سب لوگ ہنسنے لگے۔ میں دوسرے کمرے سے سب کچھ سن رہی تھی۔

بھائی نے مجھ سے میری مرضی پوچھی۔ مجھے ہسلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ میں نے فوراً ہی اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔

میری رضامندی کی اطلاع ملتے ہی مالکین نے شادی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ پورے گاؤں میں تین دن پہلے ہی سے جشن کا سماں تھا۔ میں بھی ان دنوں خوشیوں کے ہندولے میں جمبول رہی تھی۔

ایک دن میں اسپتال میں بیٹھی تھی کہ چودھری دلاور آ گئے۔ انہوں نے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور مجھے ٹوٹوں کی ایک گڈی دیتے ہوئے بولے ”بیٹی! یہ میں اپنی ہونے والی بیوہ کو دے رہا ہوں، انکار مت کرنا۔ یہ تیرا انعام ہے۔ تو نے میری جان بچائی تھی نا!“

”بابا! آپ شاید مجھے بچانے نہیں؟“ میں اب انہیں بابا کہنے لگی تھی ”میں جانتی ہوں کہ آپ کو حقیقت کا علم ہو جائے گا کہ بعد میں.....“

”میں تجھے اسی دن پہچان گیا تھا بیٹی، جس دن تو نے نہر سے مجھے نکالا تھا۔“ چودھری دلاور نے مسکرا کر کہا ”تو بانو ہے نا؟“

میں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

”مجھے معاف کر دینا بیٹی! میری آنکھوں پر جہالت کی ایسی پٹی بندھی تھی کہ میں ہرے سے تعلیم ہی کا مخالف ہو گیا۔ میں نے تجھ پر بہت ظلم کیا ہے بیٹی! اگر میں نے خود بھی اسی طرح تعلیم حاصل کر لی ہوتی تو شاید یہ حالات نہ ہوتے۔“

”مجھے شرمندہ مت کریں بابا! اگر میں اس وقت اپنی ضد سے تھوڑا بہت پڑھ لکھ لیتی تو شاید آج اس مقام پر نہ ہوتی۔“ میں نے کہا ”ہر کام اور ہر بات میں اللہ تعالیٰ کی کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے بابا!“

چودھری دلاور تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد واپس چلے گئے۔ میں گھر پہنچی تو بہت تھکی ہوئی تھی اور ہاتھ پاؤں کی کچھ دیر کے لیے لیٹ جاؤں۔

مراکش کے بادشاہ شاہ محمد ششم

مراکش کے 46 سالہ بادشاہ محمد ششم اپنے والد شاہ حسن دوم کی وفات کے بعد 23 جولائی 1999ء کو سلطنت کے تخت پر فروس ہوئے۔ ان کے والد نے انہیں ابتدائی عمر سے ہی دینی اور سیاسی تعلیم دلائی شروع کر دی تھی۔ چار سال کی عمر میں محمد ششم کی قرآنی تعلیم کا آغاز شاہی محل کے اندر ہی ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ انہیں مذہبی اور روایتی تعلیم سے بھی آراستہ کیا گیا۔ پرائمری اور سیکنڈری تعلیم کی تکمیل کے بعد انہوں نے 1981ء میں رائل کالج سے گریجویشن کیا اور پھر 1985ء میں رباط کی محمد پنجم یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری حاصل کی۔ شاہ محمد ششم انفرادی طور پر ڈیڑھ ارب ڈالرز سے زائد اثاثوں کے مالک ہیں۔ انہوں نے مراکش کے قومی معاشرے کو جدید خطوط پر استوار کرنے اور ملک میں احتساب کا رواج ڈالنے سمیت سماج سدھار کے حوالے سے کئی کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ دار الحکومت رباط میں واقع شاہ محمد ششم کے محل کے دروازے ہر وقت عوام کے لیے کھلے رہتے ہیں۔ اس محل میں شاہ نے اپنے ذاتی سرمائے سے ایک شاندار مسجد بھی تعمیر کروائی ہے۔ یہ محل اپنے انتہائی خوبصورت اور سرسبز و شاداب باغات اور حقیقی شاہانہ وقار کے مظہر داخلی دروازوں کے حوالے سے شہرت رکھتا ہے۔

مرسلہ: فرید عطاری، حیدر آباد

اچانک ماجد بھائی نے مجھے آواز دی ”بانو!“ پھر وہ خود ہی میرے کمرے میں آ گئے اور بولے ”میں آج اسپتال گیا تھا بیٹی! میں نے تیری اور چودھری صاحب کی باتیں سن لی ہیں۔ تو تو بہت بڑے ظرف کی مالک ہے بیٹا! معاف کرنے والوں کو تو اللہ بھی پسند کرتا ہے۔“

”اب تو وہ میرے بزرگ بھی ہیں ماجد بھائی!“ میں نے نظریں جھکا کر کہا۔

”بانو بیٹا، میری ایک بات ماننے کی؟“

”ارے ماجد بھائی! آپ بھی مجھ سے یہ بات پوچھ رہے ہیں؟ آپ کے گھر میں تو مجھے اس وقت پناہ ملی تھی جب

”جی مالکن!“ وہ چمک کر بولی ”اب تو آپ بھی مالکن ہیں۔ آپ میرا نام بھی جانتی ہیں؟“

”میں نہ صرف تمہارا نام جانتی ہوں بلکہ تمہیں بھی اچھی طرح جانتی ہوں۔“ میں نے گھونٹ اٹھ دیا۔

نیلیم نے صرف ایک لمحے کے لیے مجھے دیکھا پھر وہ دیوانہ وار مجھ سے لپٹ پڑی اور ہلکے ہلکے کر رونے لگی ”بانو! تو کہاں چلی گئی تھی بانو! ہم تو یہ سمجھے تھے کہ خدا نخواستہ تو اس دنیا میں نہیں ہے۔“

میں بھی رو رہی تھی۔ میں نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا ”دیکھ لے نیلیم! تعلیم سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں نے تعلیم حاصل کی تو آج میں اس حویلی میں مالکن کی حیثیت سے موجود ہوں ورنہ مجھے بھی کسی کی سے بیاہ دیا جاتا اور تیری طرح میں بھی زندگی بھر مالکن کی خدمت کرتی رہتی۔ ویسے اب بھی دیر نہیں ہوئی ہے۔ تو چاہے تو اب بھی پڑھ سکتی ہے۔“

”نی الحال تو دولہا میاں اندر آنے والے ہیں، پہلے تو تو انہیں محبت کا سبق پڑھا۔“ کہہ کر وہ معنی خیز انداز میں ہنسنے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی اور میں آنے والے لمحات کے خیال سے مسکرا کر سمٹ کر بیٹھ گئی۔ اللہ تعالیٰ کبھی کبھی چھپتر بھاڑ کر خوشیاں دیتا ہے اور کبھی ناراض ہوتا ہے تو پلک جھپکتے میں سب کچھ نیست و نابود کر دیتا ہے۔ میں نے تعلیم کے سلسلے میں جو جد مسلسل کی، اللہ نے مجھے اس کا بھرپور صلہ دیا۔

یہ اکیسویں صدی ہے اور اس صدی میں بھی ہم برسوں سے تعلیم و رواج میں جکڑے ہوئے ہیں۔ میں ان عام لوگوں سے اکیلے کرتی ہوں کہ خدائے اڑکیوں کو تعلیم حاصل کرنے سے مت روکو۔ ایک اچھی ماں ہی اچھی قوم کو جنم دے سکتی ہے۔

Friends Korne.com

اللہ کے سوا کوئی میرا نہیں تھا۔ میں آپ کی ایک نہیں ہزار باتیں مانوں گی۔ اگر آپ کو یہ رشتہ پسند نہیں ہے تو میں اس سے بھی انکار کر سکتی ہوں۔“

”ایسی بات نہیں ہے بیٹا!“ ماجد بھائی نے متاثر ہو کر کہا ”تو نے چودھری دلاور کو معاف کر کے اعلیٰ قدرتی ثبوت دیا ہے، اب اپنے ایک اور گناہ گار کو بھی معاف کر دے۔“

”میں مجھیں نہیں ماجد بھائی!“ میں نے کہا ”آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟“

”بانو بیٹا! میں ساجد کی بات کر رہا ہوں۔ وہ اپنے کیے پر بہت شرمندہ ہے اور تجھ سے معافی مانگتا چاہتا ہے۔“

ساجد کا نام سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا ”ماجد بھائی! آپ جانتے ہیں کہ اس نے میرے ساتھ کیا حرکت کی تھی؟“

”میں جانتا ہوں بیٹی لیکن توبہ کرنے والے کو تو اللہ بھی معاف کر دیتا ہے۔“

اسی وقت ساجد کمرے میں داخل ہوا اور میرے قدموں میں گر گیا اور گڑ گڑا کر بولا ”بانو! بہن! مجھے معاف کر دو۔ کاش میں اس دن مر گیا ہوتا۔ مجھے..... معاف کر دو۔“

اس کی حالت بہت ابتر تھی۔ جسم پر میلا پھیلا لباس، سر اور ڈاڑھی کے بال بڑھے ہوئے، جسم لاغر، ہڈیوں کا ڈھانچا!

میں نے کہا ”میرے پیر پکڑ کر مجھے گناہگار مت کریں ساجد بھائی! میں نے آپ کو معاف کیا، میرے والد نے آپ کو معاف کیا۔“

”بس، اب میں سکون سے سر سکوں گا۔“ ساجد نے کہا۔

”میرے ذہن پر ایک بوجھ تھا جو میں اتارنا چاہتا تھا۔ مجھے کینسر ہے بانو اور اب وہ کسی دوا سے نہیں ہٹا رہا۔“

بھی وقت میری سانس کی ڈور ٹوٹ سکتی ہے۔“

میں نے ساجد کو فوراً اسپتال میں منتقل کر دیا لیکن اس کا کینسر واقعی بہت پھیل چکا تھا اور اس کے نیچے کی امید بہت کم تھی۔

میری شادی کے موقع پر پروین باجی، فہمیدہ باجی اور سائرہ بھی آئی تھیں۔ میرے گھر میں بھی عجیب گہما گہما تھی۔ جس دن میں رخصت ہو کر حویلی میں پہنچی، نیلیم اور مالکن نے میرا استقبال کیا۔ حویلی کی دوسری عورتیں اور مہمان خواتین جب ایک ایک کر کے رخصت ہو گئیں اور صرف نیلیم میرے پاس رہ گئی تو میں نے اس سے کہا ”نیلیم!“

شمارہ اکتوبر 2011ء کی منتخب سچ بیانیہ

ہماری پیش کش..... آپ کا انتخاب

☆ اول: آئینہ..... ضمیر بٹ..... (لاہور)

☆ دوم: برق رفتار..... ثنا..... (کراچی)

☆ سوم: وہ ایک لمحہ..... سعید الرحمن..... (کراچی)

پہلے دہرے اور پھر انا کے لیے آپ ہی منتخب کیجئے
ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے